پلیتہ

ناول

پیغام آفاقی

پلیتہ

(ناول)

پیغام آفاقی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

PALEETA
(Novel)

by
Paigham Afaqui

Year of Edition 2011
ISBN 978-81-8223-816-9

نام کتاب : پلیتہ (ناول)
مصنف : پیغام آفاقی
پتہ : Flat No.1, Police Station Rajouri Garden
New Delhi-110027
e-mail- paigham56@yahoo.com
Mob: 9810792624
سنِ اشاعت : ۲۰۱۱ء
:
سرورق : عثمان علی
کمپوزنگ : محمد اسلام خاں
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

پلیتہ

انتساب

بارودی سرنگوں کے نام

1

ہر چند کہ نوجوان خالد سہیل کی نوخیز شخصیت خود اپنی زندگی میں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پائی لیکن جس کمرے میں وہ مرا تھا اس کے در و دیوار اب لرزہ خیز انداز میں چیخ رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی موت کے بعد اس کے کمرے میں پائی گئی اس کی جستہ جستہ تحریروں کو جمع کر کے جو کتاب مرتب کی گئی تھی یہ ایک عجیب و غریب کتاب تھی جو ہر اگلے اڈیشن کے ساتھ موٹی ہوتی جا رہی تھی جیسے اس کے اندر بند خیالات میں مسلسل ایٹمی دھماکے ہوتے چلے جا رہے ہوں۔ خود قدرت نے بھی ایٹمی ہتھیاروں کے تجرباتی دھماکوں کے طرز پر ہی اس کتاب کے وجود میں آنے کے لئے معاشرے کے جانے مانے مقامات سے بہت دور ایک گمنام بستی کا انتخاب کیا تھا جہاں جنگل میں واقع ایک ویران کمرے میں خالد سہیل نے اس کو جنم دیا تھا اور اس کتاب کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی موت ہو گئی تھی کیونکہ وہ اس کی تخلیق کے دوران جسمانی اور ذہنی طور پر بے حد نحیف ہو گیا تھا۔

❖❖

2

یہ کتاب اس کے مقامی شہر سے ہی شائع ہوئی تھی۔ اس کی کتاب کے مسودے کو اس کے گاؤں والوں نے بار بار پڑھوا کر بہت ہی دلچسپی سے سنا تھا اور یہ کتاب چھپنے سے پہلے ہی ان کے ذہنوں پر چھا چکی تھی۔ اس کے بعد یہ مسودہ چھپنے کے لئے ایک مشہور پبلشر کو دیا گیا تھا۔ طباعت کے لئے دئے گئے مسودہ کے ساتھ بھی ایک پراسرار واقعہ ہوا تھا۔ اس کتاب کے چھپنے سے پہلے اس کا اصل اور پہلا مسودہ پراسرار انداز میں گم کر دیا گیا تھا۔ لوگوں نے بے چینی کے عالم میں یادداشت کی بنیاد پر اس کتاب کو از سر نو قلمبند کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد لوگ یہ بھی سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کتاب کو دبانے کی کوشش کیوں گئی تھی۔

اس کے علاقے کے عوام میں یہ کتاب بے حد مقبول ہوتی چلی گئی تھی۔ اتنے کم عرصے میں اس کتاب کے کئی اڈیشنوں کی لگاتار آمد اپنے آپ میں ایک زبردست خبر بن گئی تھی۔ یہ کتاب اور باتوں سے زیادہ خود عوام کی اپنی کمزوریوں کی اور ان کی طرف سے ان کی دردانگیز ناامیدی کی عکاسی کرتی تھی۔ اس کتاب نے لوگوں کے اندر ایک نادر قسم کا شعور بیدار کر دیا تھا۔ اس کے علاقے میں لوگوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی کے حالات یقیناً پہلے کے مقابلے میں اتنے بدل گئے تھے کہ وہ گذشتہ تمام کتابوں کو نگل گئے تھے' اور زندگی میں اندھیرا بہت بڑھ گیا تھا' زندگی بہت سخت اور دشوار ہو گئی تھی' خطرات بہت بڑھ گئے تھے اور قذاق زندگی کے چاروں طرف اس طرح گھیرا ڈال رہے تھے کہ کسی ضرب کلیم کے بغیر ان کی زد سے نکلنا ممکن نہیں تھا اور ایسے میں اس کتاب کی سخت ضرورت تھی کہ ذہنی خشک سالی کے ایک لمبے عرصے میں اس سے پہلے فکر و بصیرت کو جھنجھوڑنے والی کوئی ایسی کتاب نہیں آئی تھی اور یہ کہ زمانہ حال میں اس کتاب کی سخت ضرورت تھی۔

اپنی تاثیر میں یہ کتاب کچھ ایسی تھی کہ جنہوں نے نہیں پڑھی تھی انہیں اس کتاب کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا تھا اس پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جنہوں نے یہ کتاب پڑھ لی تھی وہ اب اندر سے بدلے ہوئے لوگ تھے۔ کتاب میں کیا تھا یہ بتانے اور سمجھانے سے ہر شخص قاصر تھا اور ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ یہ کتاب پڑھے جانے سے تعلق رکھتی ہے اور بغیر پڑھے ہوئے اس کے بارے میں صرف سن کر کوئی قطعی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کتاب میں کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کچھ متضاد رائیں بھی تھیں۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اس کتاب میں اس عہد کے بارے میں کچھ بھی نہیں تھا لیکن اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ ہمارے اپنے عہد کی تصویر کا حصہ تھا۔

غرض کہ جتنے منہ اتنے باتیں۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور ادراک کے مطابق اس کتاب کے بارے میں ہونے والے چرچوں کی اپنی توضیح پیش کر رہا تھا۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ ایک بے ضرری کتاب تھی تو کچھ دوسرے لوگوں کو برطانوی ممبر پارلیامنٹ کارلائل کی وہ تقریر یاد آ رہی تھی جس میں اس نے کتابوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انقلاب فرانس سے قبل فرانس میں شائع ہوئی ایک کتاب THE SOCIAL CONTRACT کے بارے میں برطانوی پارلیامنٹ میں کہا تھا کہ جب وہ کتاب چھپی تھی تو کچھ لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا لیکن جب اس کتاب کا دوسرا اڈیشن چھپا تھا تو ان لوگوں کے چمڑے سے اس کتاب کی جلد باندھی گئی تھی جنہوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ بہرحال اس کتاب کا کسی نے بھی مذاق نہیں اڑایا تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایسی کئی کتابوں کی تاریخ لوگوں کے سامنے تھی۔

ایک اور بات جس پر سبھی متفق تھے وہ یہ تھی کہ اس کتاب کے پڑھنے اور سننے والوں کے سوکھے ہوئے چہروں پر آمدِ بہار والی تازگی پیدا ہونے لگتی تھی۔ اس کتاب سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت کے بارے میں لوگوں کا بیان یہ تھا کہ یہ کتاب گویا ساحل پر کھڑے

اپنے پڑھنے والوں کو کسی سمندر کے تلاطم میں داخل ہونے کا بے پناہ حوصلہ دیتی تھی اور ساتھ ہی یہ اپنے پڑھنے والے کو اس مقام پر پہنچا دیتی تھی جہاں اسے موت اور تیراکی کے بیچ کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا تھا کیونکہ یہ کتاب اپنی خیرہ کن روشنیوں سے موجودہ زندگی کے پرفریب ساحلوں کے وجود کو ہی مکمل طور پر تباہ کر دیتی تھی۔

یعنی یہ کتاب آدمی کو زندگی کے عین منجدھار میں بے جھجک کود پڑنے پر آمادہ کر دیتی تھی۔ اس کتاب کے بارے میں لوگوں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ یہ کتاب اپنے قاری کو کسی کے بھی خلاف نہیں اکساتی تھی اور اس کے باوجود یہ ایک انقلاب پرور کتاب تھی۔ اسے پڑھ کر لوگ اپنے آپ کو ہی کوستے تھے۔

اپنے آپ پر تنقید کروا دینے والی حتیٰ کہ اپنے آپ سے نفرت تک پیدا کروا دینے والی اپنی نوعیت کی یہ عجیب و غریب اور پہلی کتاب تھی۔

اکثر لوگ تو اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو گالیاں دینے لگے تھے۔

اور یہ آخری بات ہی اس کتاب کی زبردست پہچان بننے لگی تھی۔

❖❖

3

جس انداز میں خالد کی موت ہوئی تھی وہ عجیب و غریب ضرور تھا لیکن کسی بھی شخص نے اس تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اس کی موت کسی سازش کا نتیجہ تھی۔ خالد کی زندگی کے پورے حالات اور اس کی موت سے متعلق ایک ایک تفصیل سب کے سامنے موجود تھی۔ ویسے بھی خالد کی شخصیت میں اتنی نرمی و بردباری اور خیالات میں اتنی پاکیزگی تھی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی کے دل میں اس کو قتل کرنے کا خیال آ سکتا ہے۔ اس کی فرشتہ صفت طبیعت کے سبھی قائل تھے۔ لیکن اس کی موت ایک بہت بڑا دھماکہ تھی۔ اس کی موت اپنے پیچھے ایک ایسی متحرک خط منحنی چھوڑ گئی تھی جو لگاتار ایک نئی دنیا کے اولین خاکے کی تخلیق کرتی جا رہی تھی۔

عام طور پر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ خالد نے جکارتا میں حقوق انسانی کے موضوع پر منعقد ہوئے عالمی کانفرنس میں اپنی جس تقریر میں خودمختار شہریوں پر مشتمل ملکوں کے قیام کی عجیب و غریب تجویز پیش کی تھی وہی تقریر اس کی بربادی کا پیش خیمہ بن گئی اور میڈیا نے جس شدت سے اس تقریر کے جملوں کو بار بار دکھایا اور اس موضوع پر خالد کے انٹرویوز بار بار نشر کیے اس نے اس کی زندگی کو مکمل طور پر سیل بند کر دیا کیونکہ اس سے متعلقہ ارباب اقتدار کو یہ پختہ یقین ہو گیا کہ خالد ناقابلِ اصلاح تھا۔ ایک طرح سے یہ بات درست بھی تھی۔

پچھلے چند برسوں میں خالد سہیل کا نام بار بار ملکی اور عالمی سطح پر اخباروں اور ٹی۔ وی۔ کے نیوز میں ابھرا تھا۔ پہلی بار دنیا نے اس کا چہرہ تب غور سے دیکھا تھا جب اس

نے اب سے تین چار سال قبل جمہوری قدروں پر منعقد نوجوانوں کے ایک عالمی سیمینار میں انگریزی میں انتہائی کرشماتی انداز میں بولتے ہوئے کہا تھا۔

'اب بہت ہو چکا۔ بہت ہو چکا۔' ('No :more. No more.')

وہ انگریزی میں تقریر کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی نشر ہو رہا تھا جسے اس کے بہت سے جاننے والے ٹی۔ وی۔ پر دیکھ اور سن رہے تھے۔

اس نے اتنی خود اعتمادی سے اپنی مخصوص صاف آواز میں یہ الفاظ کہے تھے کہ اس کے اگلے الفاظ کی ادائگی سے قبل ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اس جملے کی چوٹ سے جمہوریت مخالف قوتیں پسپا ہونے لگیں تھیں اور جمہوری قدریں زمین کے ہر خطے پر آسمان میں لہرانے لگی تھیں۔

(No more this world will be governed by rulers.)

'اس دنیا سے حکمرانوں کا اقتدار ختم ہونا چاہئے۔'

(So those who want to rule this world should do away with their wish to rule.)

وہ لوگ جو دنیا پر حکومت کرنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ اپنے اس خواب کو سمیٹ کر رکھ دیں۔

(I can say, I should be ruled only if I offer to be ruled.)

میں اپنا یہ دعوی پیش کرنا چاہتا ہوں کہ میری مرضی کے خلاف میرے اوپر کوئی حکومت نہیں تھوپی جا سکتی۔

سامعین اس عالمی سیمینار میں دئے گئے اس پیغام پر سکتے میں آ گئے تھے اس میں پورے معاشرے کو بدلنے والے ایک ایک نقشے کا تصور پیش کیا گیا تھا جو ہر چند کہ ایک

خوشنما خواب سے معمور تھا لیکن------اس کے ساتھ ہی بے پناہ تغیرات اور تنازعوں کا حاس تھا اور اس کے اظہار کے لئے نا قابلِ یقین جرات کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی بات کو اور واضح کیا۔

(I reject the very format of the rulers and ruled in which the world is divided)

میں دنیا سے حاکم اور محکوم کے رشتے کو ہی مٹا دینا چاہتا ہوں۔

اس کے الفاظ اس دنیا کے نظام کو ایک نئے انداز میں دیکھنے کی دعوت دے رہے تھے۔

سمندر کے کنارے ایک ساحل پر لگے خوبصورت خیموں کے درمیان سے نکلنے والی اس کی یہ آواز سمندر کی طوفانی لہروں کی آواز سے بے تکلفی سے گلے مل رہی تھی۔ اس کی آگے کی تقریر میں پیغمبرانہ شان جھلک رہی تھی۔

(The world needs new mental flyovers to cross over red-lights.)

اس دنیا کو ایسے فلائی اوورس کی ضرورت ہے جس سے ہو کر ہم دنیا کو بانٹنے والی لال بتیوں کے اوپر سے گزر جائیں۔

(My freedom is my high way to relationship with the universe.One's life is a matter between him and the universe. We are only his neighbors and friends not masters.)

میری آزادی پوری کائنات سے اپنا رشتہ استوار کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر شخص کی زندگی اس کے اور کائنات کے بیچ کا معاملہ ہے۔ دوسرے

صرف اس کے پڑوسی ہیں۔

(So the governments and the corporate should be enlightened and should know that they are going to clear the way for the civil society which has remained humble from time immemorial.)

اس لئے حکومتوں اور کاروباری گھرانوں کا ذہن اس معاملے میں روشن ہو جانا چاہئے کہ وہ اس سول سوسائٹی کے لئے راستہ صاف کرنے جا رہے ہیں جو نامعلوم زمانوں سے کم مائگی کی شکار ہے۔

(My friends, the dawn of the self confidence of the civil society and self rule must glow with our energy, and this is the supreme most task of our lives.)

دوستو، سول سوسائٹی کی خود اعتمادی کی صبح صادق نمودار ہو رہی ہے اور اس کو ہماری قوت کی روشنی سے چمکنا ہے اور اس کو چمکانا ہی ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔

(No more human beings should be ruled with the instrument of fear.)

اب وقت آ گیا ہے کہ انسانوں کو خوف کے ہتھیار کے سائے میں رکھ کر ان پر حکومت نہیں کی جائے۔

(In a good democracy it is the government which should fear the people and not the vice versa.)

ایک اچھی جمہوریت میں سرکار کو عوام سے ڈرنا چاہئے نہ کہ عوام کو سرکار سے۔

اس کے یہ جملے مختلف عالمی اخباروں میں چھپے تھے اور اس کو تقریر کرتے ہوئے کئی ٹی۔وی۔ چینلوں پر دکھایا گیا تھا۔ ممکن ہے ان میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنھیں اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہوں۔

No more. No more کے اوپر اس نے جس طرح زور دیا تھا اس کا وہ انداز دیکھنے والوں کے ذہن میں اس کے بولتے ہوئے چہرے کے ساتھ نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

oo

اس کے بعد پچھلے چند برسوں میں خالد سہیل کا نام بار بار اخباروں اور ٹی۔وی۔ کے اسکرین پر ابھرا تھا اور اس موضوع پر اس سے سوالات ہوتے رہے اور وہ اسی انداز میں سوالوں کے جواب دیتا رہا جس انداز میں اس نے پہلی بار پوری دنیا کے سامنے تقریر کی تھی۔

ایک بہت پڑھا لکھا شخص، جسے وہ پہچانتا نہیں تھا، ایک جلسے میں اس سے ملا بھی تھا اور انگریزی میں اس سے کہا تھا۔

You should refrain from giving expression to such dangerous ideas and contain yourself.

خالد نے جواب میں پوچھا تھا۔

'What is wrong in it.'

'You will never be able to realize this dream. You will never be able to make it come true. The system all over the world is so vast and so powerful that it is unmanageable.'

'But how the present system can be accepted as permanent feature of this human world. I just cannot imagine this torturing situation remaining eternal.I just cannot digest it.'

س کے بعد سے ہی اس کی زندگی میں زوال آ گیا۔ کچھ دنوں بعد اسے محسوس ہوا جیسے ان تمام لوگوں کو بھی جنھوں نے اسے بلندیوں پر بٹھا کر اس کے انٹرویو پوری دنیا کو دکھائے تھے، سانپ سونگھ گیا ہو۔

وہ در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ کئی جگہ اس نے جوب کے لئے درخواستیں دیں لیکن ہر جگہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے منع کر دیا گیا جیسے پورے معاشرے میں اس کے خلاف ایک جال سا بچھا ہوا ہو۔ جن لوگوں نے اس بارے میں سنا ان میں بہت سے لوگوں نے خالد کے لئے ہمدردی کا اظہار کیا کیونکہ اسے ایک بیباک نوجوان سمجھا جاتا تھا لیکن چند لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ جو کچھ ہوا تھا اس کے لئے وہ خود ہی ذمہ دار تھا اور اب اسے بغیر شکوہ کے اس انجام کا سامنا کرنا چاہئے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح اس کے دوست بھی اسے بھول بھال گئے۔

❖❖

4

اس کے بعد ایک دو سال گزر چکے تھے۔ اس درمیان خالد کہاں تھا، کیا کر رہا تھا، یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ صرف ایک بار اس کے ایک دو دوستوں سے سنا گیا تھا کہ وہ مقابلے کے امتحان میں بھی شریک ہوا تھا اور ناکام ہونے کے بعد عدالت میں بھی گیا تھا لیکن مقدمہ ہار گیا تھا اور پھر وہاں سے سیدھے اپنے گاؤں واپس چلا گیا تھا۔

البتہ اب ایک بات سامنے آئی تھی جس کی اہمیت اچانک اب بڑھ گئی تھی۔ اس کی موت کی خبر ملنے پر یونیورسٹی میں اس کے نجی دوستوں نے ایک تعزیتی نشست کی تھی۔ خالد کے ایک قریبی دوست نے جو اس کو آخری بار اسٹیشن چھوڑنے گیا تھا لوگوں کو اسی محفل میں یہ بات بتائی تھی کہ دلی سے واپس جاتے وقت وہ بہت بے چین ہو گیا تھا۔ اس کی آواز بدل گئی تھی اور جانے سے پہلے اس نے ریلوے اسٹیشن کے باتھ روم کی دیوار پر لکھا تھا۔

O, my city of dream. I am leaving you because you are under control of undesirable forces. I will come back and liberate you.

دیوار پر یہ الفاظ لکھنے کے بعد اسے کچھ سکون مل گیا تھا۔

رفتہ رفتہ جب اس کی موت کے بارے میں کچھ غیر معمولی باتیں یہاں پہنچنے لگیں تو ایک دن اس موضوع پر باقاعدہ ایک بڑا جلسہ ہوا اور اس کی موت پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا اور یہ طے پایا کہ اس کے دوستوں اور طالب علموں کا ایک وفد اس کے گاؤں میں

جا کر اس سے متعلق حقایق کی چھان بین کرے کہ خالد کی موت کی وجہ کیا تھی۔

راستے بھر ٹرین میں اس وفد میں شامل ہو کر جا رہے طالب علم خالد کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے۔ ان دنوں کی باتیں جب وہ جامعہ ملیہ میں طالب علم تھا۔ پتلا دبلا، لمبا، ستواں ناک اور گھنگھرالے بالوں والا خوبصورت خالد زیادہ تر سنجیدہ ہی رہتا لیکن جب کبھی مسکراتا یا ہنستا تو اس میں ایک عجیب سی کشش پیدا ہو جاتی۔ انتہائی خوش دل اور ارادے کا پکا خالد کبھی بھی کوئی بات غیر ذمہ دارانہ طور پر نہیں کہتا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت لائبریریوں کی کتابوں کے بیچ گزرتا اور اس کے ہاتھ میں کسی نہ کسی اہم اور مارکیٹ میں تازہ تازہ آئی ہوئی کتاب کا ہونا اس کا Logo بن گیا تھا۔ اس کی تقریریں بڑے مزے کی ہوتی تھیں۔ وہ بہت سہل انداز میں بات کرتا لیکن اس کی گفتگو کو تھوڑی دیر سننے کے بعد سننے والا کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ وہ خود کہیں سوچوں میں گم ہو چکا ہے۔

اس چھوٹی سی ٹیم میں مختلف طرح کے لوگ تھے۔ اس میں ایک میزو نوجوان تھا جو اپنی نادر قسم کی ایسی فلمی کہانیوں کے لئے مشہور تھا جو انسانی زندگی کے نادر نادر مسائل کو اپنی کہانیوں میں پیش کر کے سوچنے والوں کی نظر کا ایک مرکز بنتا جا رہا تھا۔ ایک لڑکا ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالرز کی تنظیم کا پریزیڈنٹ تھا۔ ایک لڑکی عورتوں اور کمزور طبقات کی قوت افزائی کے لئے بنائی گئی ایک بین الاقوامی تنظیم میں کام کر رہی تھی اور ان سب میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور کم گو نوجوان جیلانی تھا جس نے پچھلے کئی برسوں میں انٹرنیٹ کی دنیا میں اپنے شائع کئے ہوئے بلوگس کے ذریعہ ایسی غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ اس کا شمار مقبول ترین پانچ بلاگ نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک یا تو پہلے سے خالد سہیل کو ذاتی طور پر جانتا تھا یا پھر اس کی شخصیت کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ان سب کو وہ دن یاد تھے جب خالد اپنی یونیورسٹی کے ذہین ترین طالب علم کے طور پر جانا جاتا تھا اور اپنی سوچ اور شخصیت سے نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بنا ہوا تھا۔

ہر چند کہ خالد کی موت ہو چکی تھی لیکن اس کے ان ساتھیوں کو بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے گاؤں جا رہے تھے۔ خالد کی محبت ان کے دلوں میں عود کر آئی تھی۔ بلکہ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہاں کے لوگوں کو وہ اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ وہ ابتک وہاں کیوں نہیں آسکے تھے۔

خالد کی کتاب کے نئے ایڈیشن کی ایک دو کاپیاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ یہ کتاب بہت معمولی کاغذ پر اسی کے شہر کے کسی پبلشر کے یہاں سے چھپی تھی۔

نوجوانوں کی یہ ٹیم جب خالد کی جائے پیدائش کے مقامی اسٹیشن پر ٹرین سے پہنچی تو رات کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ انہوں نے اسٹیشن سے باہر نکل کر سامنے دیکھا تو پارکنگ میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ انہوں نے ایک قلی سے سواری کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں رات میں پہنچنے والے زیادہ تر مسافر اسٹیشن پر ہی رک کر صبح کا انتظار کیا کرتے تھے کیونکہ علاقہ میں بڑھتے ہوئے کرائم کی وجہ سے رات میں کہیں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس کوئی خاص سامان نہیں تھا تو قلی نے انہیں پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مختصر جملوں میں کہا۔

'تلاشی بعد میں ہوتی ہے۔ خاموشی پہلے۔'

پھر مزید کچھ سوچ کر بولا۔

'کچھ نہیں ملنے پر گردے تک نکال لیتے ہیں۔ سیدھے جنگل میں لے جاتے ہیں، اور وہاں سے گاڑیوں میں ٹھونس کر مخصوص اسپتالوں میں۔'

ٹیم کے لوگ یہ سن کر نہ صرف حیرت زدہ ہوئے بلکہ کانپ سے گئے۔ انہیں اب اندازہ ہونے لگا تھا کہ خالد کی تقریروں میں جو شدت دکھائی دیتی تھی اس کے پیچھے کچھ بہت

ہی سنگین حقائق موجود تھے۔

وہ وہیں رک کر چائے پینے لگے۔ اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے پاس میں ہی کھڑے اس قلی سے مزید یہاں کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ قلی نے ان کو دھیرے دھیرے بہت کچھ بتایا۔

'اس دھرتی نے تو پوری دنیا کو امن کا پیغام دیا تھا لیکن آج مسلسل خراب سرکاروں اور اس کی وجہ سے پھیلی بیکاری نے یہاں کے نوجوانوں کو درندہ بنادیا ہے۔ ان کے لئے مزدوری تک کے راستے بند ہیں۔ اب انہیں جو کوئی پیسے دے کر کچھ بھی کرنے کی لئے کہہ دے، وہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ والدین تک دھیرے دھیرے ان کی حرکتوں کو قبول کر لیتے ہیں۔

صبح کو وہ ایک جیپ میں سوار ہو کر اس علاقے کو بغور دیکھتے ہوئے چلے جہاں بستیوں کے آدھے ادھورے اینٹوں سے بنے مکان، جینس اور پینٹ پہنے ہوئے نوجوان اور راستوں میں میلے کچیلے یونیفارم میں پیدل اسکول جاتے ہوئے بچے دکھائی دے رہے تھے۔ خالد کی بستی میں پہنچے تو یہ محسوس کر کے انہیں خوشی ہوئی کہ ان کے مقصد کو جان کر لوگ ان سے بہت تپاک اور محبت سے مل رہے تھے۔ انہوں نے ہی بتایا کہ اپنے اس مقصد کے لئے وہ اس شخص سے ملیں جو خالد کی قبر اور اس سے متعلق ساری چیزوں کا ذمہ لئے ہوا ہے۔

دلی سے ایک ہزار دو سو بیس کیلو میٹر دور اس مقامی ریلوے اسٹیشن سے خالد کی بستی لگ بھگ بارہ تیرہ کیلو میٹر دور تھی۔

لیکن اس بستی کا یہ کرشمہ اب دور دور تک کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔

اس ٹیم سے پہلے بھی صحافی اور ٹی۔ وی۔ چینل والے یہاں آچکے تھے۔ لیکن

تحقیقات کے لئے اس طرح ٹھہرنے والی یہ پہلی ٹیم تھی۔ مقامی لوگوں سے یہ جان کر انہیں بڑی راحت ملی کہ انہیں یہاں کے جرائم کے ماحول سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ یہاں کا بچہ بچہ خالد کو ایک انسانیت پرست فلسفی اور ایک بڑی روحانی ہستی سمجھنے لگا تھا اور اس کے حوالے سے آنے والوں کا بہ دل سے استقبال کرتا تھا۔

خالد کی قبر سے کچھ ہی دوری پر لوگوں نے ایک پھوس کی چھت والا ہال سا بنا دیا تھا جہاں پانی نکالنے والا ایک ہاتھ پمپ بھی لگا ہوا تھا۔ یہاں آنے والوں کے لئے لوگ گاؤں سے چائے وغیرہ بھیج دیتے تھے۔ گاؤں والوں نے ان کا سامان اتروا کر اسی ہال میں رکھوا دیا۔ مجاور اس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔ اس بیچ وہ گاؤں والوں سے بہت ساری باتیں سنتے رہے لیکن وہ بہت مستند باتیں جاننا چاہتے تھے۔

شام میں ان کی ملاقات مجاور سے ہوئی۔

❖❖

5

کھچڑی بالوں والا مجاور کوئی جاہل گنوار نہیں تھا' وہ ایک کالج میں تاریخ کا لکچرر رہ چکا تھا اور کبھی خالد کو پڑھا بھی چکا تھا اور کافی دنوں سے ریٹائرمنٹ کے بعد تنہائی اور خلوت کی زندگی گزار رہا تھا۔ خالد کے واقعہ میں خصوصی دلچسپی محسوس کر کے وہ کئی دنوں سے ادھر ہی آ بیٹھا تھا اور گھر بھی نہیں گیا تھا۔ وہ پہلے سے ہی پھٹے پرانے کپڑے پہنتا تھا' یہاں بیٹھے بیٹھے اس کے کپڑے اب اور بھی میلے کچیلے ہو چکے تھے۔

مجاور نے بتایا۔

یہاں عام طور سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی موت کا تعلق بنیادی طور پر اس کے کالا پانی کے سفر سے تھا۔ اس سے ایک سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ خالد کے کالا پانی کے سفر میں وہ کون سی بات تھی جو اس کی موت کا سبب بن گئی؟ کالا پانی کے بارے میں تو ساری دنیا جانتی ہے اور بہت سے لوگ وہاں جاتے آتے رہتے ہیں۔

تو اب میں آپ کو اس کے انڈمان کے جزیروں اور کالا پانی کے تجربے کے بارے میں بتاتا ہوں کیونکہ اس کے اندر اسی تجربے سے بھونچال پیدا ہوا تھا اور وہ آج کی پوری دنیا کو اس سے بھی کئی گنا زیادہ بڑا کالا پانی سمجھنے لگا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ اس تصویر کو جس پیمانے پر دیکھنے لگا تھا وہ پوری طرح حقیقی تھی۔ وہ تخلیقی ذہن رکھتا تھا اور تخلیقی ذہن والے چیزوں کو خوردبینی نگاہ سے بڑا کر کے دیکھنے لگتے ہیں اور خوردبین میں چیونٹی ہاتھی کے برابر بھی دکھائی دی سکتی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر خوردبین کو پلٹ کر اس سے دیکھا جائے تو

ہاتھی چیونٹی کے برابر دکھائی دیگا۔ لہذا اس بات کو چھوڑ دیجئے کہ کون سی بات کتنی بڑی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی چیز موجود ہے یا نہیں اور خوردبین کا استعمال عموماً اسی کے لئے ہوتا ہے۔

یہاں عام طور سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی موت کا تعلق بنیادی طور پر اس کے کالا پانی کے سفر سے تھا۔ لیکن خالد کے کالا پانی کے سفر میں وہ کون سی بات تھی جو اس کی موت کا سبب بن گئی؟ کالا پانی کے بارے میں تو ساری دنیا جانتی ہے اور بہت سے لوگ وہاں جاتے آتے رہتے ہیں۔

کالا پانی جدید جمہوری نظام کے پیٹ سے دنیا کے عوام کی زندگیوں میں نکلے ہوئے ان بچھوؤں میں سے ایک تھا جنہوں نے انسان کے جمہوری خوابوں کو خواب پریشاں بنا رکھا ہے۔

کالا پانی کے سفر کے دوران اس نے دیکھا کہ کس طرح جمہوری ڈھانچے کے اندر کالا پانی کے زمانے میں جزائر انڈمان میں سرکاری دہشت کا ایک پورا نظام بے روک ٹوک کارفرما تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کی مثال اس سے پہلے تاریخ میں کہیں موجود نہیں تھی۔ کالا پانی جمہوری نظام کی ایک ایسی عجیب وغریب 'حیرت انگیز، چونکا دینے والی اور بظاہر غیر فطری پیداوار تھی جس کو اس سے پہلے مورخ بھی یا تو دیکھ نہیں پائے تھے یا اس سے آنکھ بچائی تھی یا پھر کوتاہ اندیشی میں اس کا تجزیہ نہیں کر پائے تھے۔ غالباً اس لئے بھی کہ کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایک ایسے معاشرے میں جس میں ایک پارلیامنٹ مکمل طور پر کام کر رہا ہو اور جس کی حکومت کے چاروں طرف صحافیوں کا جال بچھا ہوا ہو اس معاشرے میں یہ سب کچھ ممکن تھا۔

کالا پانی میں اسے حکومتوں کے کردار کا مکمل اور بے نقاب نظارہ کرنے کا موقع اس لئے دستیاب ہو گیا کہ جزائر انڈمان کی ناقابلِ عبور تنہائی نے برٹش حکومت کو اپنی بربریت

کا اتنا کھلا موقع دیا تھا اور حکومت نے وہاں اپنے اوپر سے احتیاط کے پردے نہایت بے فکری سے ہٹا دئے تھے جس کی نتیجے میں ان کے ہاتھوں وہاں ایک ایسا بڑا واقعہ ظہور میں آ گیا جس نے حکومتوں کے کردار کو مکمل طور پر بے نقاب کر دیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ حاکموں کے دل اور دماغ دراصل کس طرح کام کرتے ہیں۔

یہ ہے کالا پانی کی وہ اہمیت جس کی وجہ سے میں نے کہا کہ کالا پانی وہ جگہ تھی جہاں خالد کو زندگی کی ایک پوشیدہ حقیقت کا عرفان ہوا۔ خالد کے ذہن کے لئے انڈمان کا سفر ایک دھماکہ خیز واقعہ ثابت ہوا تھا۔ خالد کی موت کا ذمہ دار کالا پانی کا مردہ بھوت نہیں بلکہ خالد کی موت کا ذمہ دار آج کی دنیا کا وہ نہ دکھائی دینے والا بھوت ہے جو اسی بھوت کی ترقی یافتہ اولاد ہے۔ دراصل خالد اس تضاد پر بھی حیران تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو حکومتیں عوام کے تحفظ کی ذمہ داری اٹھانے کی دعویدار ہوتی ہیں وہی عوام کو مسلسل خوف کے بادلوں کے سائے میں رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ اب حکومتوں کے بادلوں میں چھپے ہوئے اس غیر مرئی آسیب کے خدوخال، اس کے ماخذ اور اس کو مضبوطی سے قائم رکھنے میں دلچسپی رکھنے والے انسانی دماغوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔

اس نے یہ کتاب صرف اس چلمن کو تار تار کرنے اور عوام کو براہ راست یہ منظر دکھانے کے لئے نہیں لکھی بلکہ اس کتاب میں اٹھنے والا سوال یہ تھا کہ دہشت کے اس چہرے سے نپٹا کیسے جائے۔

آخری لمحے میں اس کو یقین ہو گیا تھا کہ آج کی مافیائی قوتیں معاشرے پر اس قدر حاوی ہیں کہ لوگوں کی رائیں اپنے مشاہدے سے نہیں بلکہ ترسیل وابلاغ کے ذرائع سے بنتی بگڑتی ہیں اور دنیا اب سامنے سے لڑائی نہیں کرتی بلکہ خاموشی سے مختلف بہانوں سے اور مختلف شکلوں میں سازشوں کے ذریعہ امن کے پاسبانوں اور مجاہدوں پر حملہ کرتی ہے تاکہ جس پر حملہ ہو رہا ہے اس کے ہمدرد بھی گمراہ ہو کر اس سے متنفر ہو جائیں۔

قدرت کس لمحے اور زندگی اور دنیا کے کس مقام پر انسان کے دل و دماغ میں روشنی ڈال دے کوئی نہیں جانتا۔ ایسا مفکروں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔

خالد کے لئے کالا پانی کا سفر کسی جزیرے کا سفر نہیں تھا بلکہ خود اس کی اپنی موجودہ زندگی کے اندر سے گہرائی سے گزرنے کا سفر تھا۔ کالا پانی کی کہانی نے خالد کے سامنے خود اپنے زمانے کی کئی طاقتوں کے ذہن میں وقت بہ وقت ظہور میں آسکنے والے بھیانک خطرات کے امکانات کو بے نقاب کر دیا تھا۔ اور وہ سمجھ گیا تھا کہ ان خطروں کو سیل بند کئے بنا وہ بے خوف آسمان والی سول سوسائٹی کا تصور کر ہی نہیں سکتا کہ ایماندار اور معصوم شہریوں پر کسی بھی لمحے بجلی گرائی جا سکتی تھی۔ ایسی بجلیوں کو گرتے ہوئے اس نے دیکھا بھی تھا اور یہ بجلی خود اس کے اوپر بھی گر چکی تھی۔ یہ بجلی اس کے ملک اور اس کی دنیا میں یہاں وہاں اکثر گرتی رہتی تھی۔ اسے کالا پانی کی کہانی میں ہر جگہ موجودہ زندگی کا کوئی منظر گزرتا دکھائی دینے لگا تھا اور یہ منظر وہ ہوتا تھا جو خود آج کی زندگی پر براہِ راست لکھی جانے والی کہانیوں میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا اور اسی وجہ سے کالا پانی کی کہانی نے خالد کے دل و دماغ کو جکڑ لیا تھا کہ یہ دراصل ایک آئینے کے اندر دکھائی دینے والی خود اپنے دور کی ہی انوکھی ریکارڈنگ تھی۔ اور ایسا ہوتا ہے۔ مہابھارت کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے آج کے کردار زیادہ کھل کر سامنے آنے لگتے ہیں جبکہ خود آج کی کہانیاں ان کرداروں کے متعلق ہمارے ذہن کو اتنا روشن نہیں کرتیں۔ اور خالد سہیل کیلئے کالا پانی کی زمین کا وہ دور اپنے آپ میں دراصل مہابھارت کی طرح کی ہی ایک بڑی کہانی کی کتاب تھی جس میں ہمارے دور کے عذابوں کی حقیقت سے متعلق وہ سب کچھ تھا جو مہابھارت میں موجود نہیں ہے۔ یہ مہابھارت میں اس لئے موجود نہیں کہ دراصل یہ جدید جمہوریت کے عہدِ آغاز کی کہانی ہے جب جدید جمہوریت کے خدو خال ابھر رہے تھے اور جو خدو خال بعد میں پختہ تر ہوئے ہیں اور یہ کہانی جدید جمہوریت کے اسی عہد کی روح کی ایک تاریک کروٹ کی ریکارڈنگ تھی۔

اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ خالد کسی اتنے شدید طور پر الجھے ہوئے مسئلے سے نبرد آزما ہے تو ہم اس کے بالکل قریب ہو کر اس کے ذہنی جدوجہد میں شامل ہو گئے ہوتے اور وہ شاید اس شدید تنہائی کے احساس سے نہیں گزرتا جس نے اس کی جان لے لی۔ اس کتاب کے اندر کہی گئی باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے مصنف کی صورتحال کا موازنہ ان نبیوں، اوتاروں، فلسفیوں اور سائنسدانوں سے کیا جا سکتا ہے جن کے منظرِ عام پر آنے کے بعد شدید مخالفت ہوئی، زد و کوب ہوا، انہیں زہر دیا گیا، جلایا گیا، جلاوطن کیا گیا۔ لیکن دراصل ہم عظیم انسانوں کو اس وقت تک سمجھ ہی نہیں پاتے جب تک وہ ہمارے درمیان ہوتے ہیں کہ چاند ہو، پہاڑ ہوں، دریا ہو، آفتاب ہو، ان کو دیکھنے کے لئے مناسب دوری چاہئے اور اسی لئے لوگ اس کو بروقت سمجھ ہی نہیں پائے اور اب افسوس کرتے ہیں اور اس کی قبر پر جا جا کر خاموش نگاہوں سے ادھر ادھر ٹکر ٹکر تاکتے ہیں یا وہاں کی اداسی سے متاثر ہو کر رونے لگتے ہیں، ہچکیاں شروع ہو جاتی ہیں، سینہ کوبی کرنے لگتے ہیں۔

آخری دنوں میں وہ انتہائی پریشان کن افکار کی زد میں آ گیا تھا۔ ایک عام آدمی جو صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے وہ تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے جس میں نسلِ انسانی کا دکھ اتنا بھرا ہو کہ وہ اس غم میں بیمار ہو جائے۔ اس کا کھانا پینا کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گیا تھا۔

انڈمان سے لوٹنے کے بعد ہی اس کی صحت دنوں دن گرتی چلی گئی۔ اداس رہتے رہتے وہ خاموش رہنے لگا تھا۔ اس کو بھائی صاحب نے ڈاکٹر سے دکھایا تو ڈاکٹر نے کہا کہ اسے کوئی بیماری نہیں، بلکہ ڈاکٹر نے اس سے کہا بھی کہ وہ زیادہ سنجیدہ اور اداس نہ رہا کرے اور اتنا زیادہ نہ سوچے۔ ایسے انسان کا معاشرے کے غم میں مر جانا ہی وہ بات ہے جو ہر جاننے اور سننے والے کے اندر لرزہ پیدا کر کے پاگل بنا دیتی ہے۔ اور یہ جو سب آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک نہ سمجھ میں آنے والا طوفان کھڑا ہوتا جا رہا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

جس طرح خالد کی موت ہوئی تھی' اس کی دوسری کوئی مثال میرے علم میں نہیں۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحے میں قلم نہ ملنے پر کمرے کی تنہائی میں موت سے پہلے دیواروں پر کچھ لکھ ڈالنے کیلئے اپنی انگلی کا اس طرح استعمال کیا کہ اس کی کلمہ کی انگلی آدھی سے زیادہ گھس گئی تھی بلکہ یوں سمجھئے کہ جڑ تک گھس گئی تھی۔ وہ تحریر ابھی تک دیواروں پر موجود ہے۔ مجھے اس طرح کا ایک ہی دوسرا واقعہ پڑھنے کو ملا جس میں روس کے ایک زلزلے کے ملبے میں دبی ایک عورت نے اپنی انگلیوں کے خون سے اکیس دنوں تک اپنے بچے کو زندہ رکھا تھا۔

خالد کی ماں کا کہنا ہے کہ خالد کے اوپر کالا پانی سے ہی کوئی آسیب سوار ہو گیا جس نے اس کی جان لے لی کیونکہ وہ جگہ ہی ایسی تھی جو ہزاروں معصوموں کی جان مار کر پھلی اور بڑھی تھی۔ وہ بار بار بھائی صاحب کو کوستی ہیں اور وہ چپ رہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ بھائی صاحب کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ آسیب کیا تھا۔

خالد کے مرنے کے بعد ایک دن انہوں نے خالد کی ماں سے کہا تھا کہ 'میرا بیٹا مرا نہیں' شہید ہوا ہے'۔

اس پر خالد کی ماں نے انہیں جھڑک دیا کہ

'شہید وہید کی باتیں مت کیجئے۔ آپ نے میرے بچے کی جان لی ہے۔ آپ کو معلوم تھا وہ کس مزاج کا بچہ تھا پھر اس کو وہاں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود نہیں جا سکتے تھے اس قبرستان اور مرگھٹ میں' اگر کچھ پتہ کرنا تھا تو'۔

خالد کو دراصل اس کے والد نے ہی کالا پانی کا سفر کرنے کا حکم دیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ جرنلزم کا کورس کرنے کے بعد سہیل پیشے کے طور پر اب صحافت کی دنیا میں آ گیا تھا لیکن لوگ جانتے ہیں کہ کسی نے اسے نوکری نہیں دی۔ ہر ادارہ اس کے لڑنے والے تیور سے گھبراتا تھا ورنہ اس کی سوچ اور قوتِ تحریر کا کوئی منکر نہیں تھا۔ بالآخر اس نے اپنا نجی نیوز ویب سائٹ کھول کر اس پر ایک خاص طرح کا نیوز چینل چلانے کا فیصلہ کیا لیکن اس طرح کا ویب سائٹ چلانے کے لئے خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ اسی سلسلے میں وہ گھر آیا تھا۔ اور اس کی زندگی کی ایک دوسری بڑی کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یوں تو دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ ساری بڑی کہانیوں کا مرکز دارالسلطنت ہی ہے لیکن خود دارالسلطنت کی جڑیں ان دیہاتوں تک میں کتنی گہرائی سے گھسی ہوئی ہیں اس کا اندازہ صرف اہلِ نظر لگا سکتے ہیں۔

خالد کے والد شیخ عبدالرحمان بن خدا بخش بن میر علی کے پاس نقد پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے ایک زمین بیچنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک سیکڑوں سال پرانی پوری دنیا ابھر کر سامنے آ گئے۔

رجسٹری دفتر سے ایک عجیب سا اعتراض ہوا کہ زمین کو بیچنے کے لیے یہ ثابت کرے کہ اس کے پردادا میر علی کو جو قتل کے الزام میں کالا پانی بھیجے گئے تھے' کوئی دوسری اولاد نہیں تھی' ان کی جائداد انہیں اپنے نام سے کرانی پڑے گی۔ اس نکتے کے ابھرنے سے میر علی کی جملہ جائداد کے تئیں ایک سنگین معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جائدادیں قیمتی تھیں۔ سبھی چونک گئے۔ شیخ عبدالرحمان کا ماتھا بھی ٹھنکا کہ ہو نہ ہو دشمن خاندان نے اسی زمانے سے ایسا کوئی ریکارڈ بنا رکھا ہو کہ فلاں شخص یا فلاں فلاں شخص میر علی کی اولاد ہیں۔ اس تشویش کے مدنظر فوری طور پر میر علی کے بارے میں ریکارڈ سے یہ دریافت کرنا ضروری ہو گیا۔ قبر سے مردہ

اکھاڑنے والا مسئلہ اپنی پوری سنگینی کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔

خالد کے والد نے خالد کو اپنے کمرے میں آواز دیکر بلایا اور پوری بات اسے بتاتے ہوئے اسے اس سلسلے میں فوراً جزائر انڈمان جا کر اپنے پردادا کے متعلق پوری تفصیل معلوم کرنے کے لئے کہا۔

oo

'اپنے پردادا کے کالا پانی بھیجے جانے والا واقعہ سہیل کے دل و دماغ میں بچپن سے ہی کھٹکتا تھا۔ اس کے تصور میں اکثر ایک نوجوان ایک لق و دق ویرانے میں بھوکا پیاسا بھٹکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس زمانے سے جب بھی گھر میں اس واقعہ کو دہرایا جاتا تو اس کی روح میں ایک سنامی سا اٹھنے لگتا۔ اس سنامی میں اسے ایک جزیرے پر ایک پچیس چھبیس سال کا مجبور نوجوان دنیا کے لوگوں سے آزادی اور زندگی کی بھیک مانگتا دکھائی دیتا تھا۔ وہی واقعہ اس کے اندر ایک بیج سے پورا برگد کا پیڑ بن گیا۔'

مجاور کی آنکھوں میں بھی اس واقعہ کا تصور کر کے سیاہ شعلے لہرا رہے تھے۔

'ویسے بھی یہ بات کسی بھی سننے والے کے لئے انتہائی تعجب خیز تھی۔ ہر شخص یہی سوچتا تھا کہ انگریزی سرکار سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی تھی۔ ایک کتے کے قتل کے مقدمے میں ایک شخص کو اتنی بڑی سزا ہو جائے یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ لیکن پورے گاؤں والے جانتے ہیں کہ اب سے لگ بھگ ڈیڑھ سو سال قبل یہ ہوا تھا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ کلکتہ جا کر وائسرائے تک کے یہاں سب کچھ صاف صاف لکھ کر دیا گیا تھا پھر بھی کچھ نہیں ہوا۔'

خالد ابھی پانچ سال کا بچہ تھا جب اس نے کسی کو یہ کہتے سنا کہ جب کالا پانی جانے سے پہلے لوگوں نے جا کر میر علی کو سب سے بڑی عدالت میں بھی ان کی اپیل رد ہونے کی خبر دی تو یہ خبر سن کر ایک لمحے میں ان کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور وہ بچوں کی طرح چاروں طرف ایسے دیکھنے لگے تھے جیسے دنیا کو پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔

یہ سنتے ہی خالد بےچینی کے عالم میں سامنے پڑے سامان اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا تھا۔

تب سے لوگ اس کے سامنے اس واقعہ کا ذکر کرنے سے کترانے لگے تھے۔

کالا پانی جانے کے بعد ان کے بارے میں کچھ سننے کو نہیں ملا تھا۔ یہ ضرور سنا گیا تھا کہ وہاں کچھ قیدیوں نے قیدی عورتوں سے شادیاں بھی کی تھیں۔ سوال یہ تھا کہ کیا انہوں نے شادی کی تھی۔ سزا کے وقت ان کی عمر ہی کیا تھی۔ اور خوبصورت اتنے تھے کہ کئی کہانیاں محض ان کے نقش قدم سے پیدا ہو کر ان کو پریشان کر چکی تھیں۔ انتہائی شریف اور شرمیلے لیکن پھر بھی بدنامیوں سے جان نہیں بچی تھی۔ بات اب اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ ان سوالوں کی قصے کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔

خالد کے گھر میں کئی اسلحے جیسے تلواریں، برچھیاں اور ڈھال وغیرہ اور کئی زرہ بکتر جو میر علی سے وابستہ تھے بڑے احتیاط اور توجہ سے دیواروں پر لٹکا کر رکھے گئے تھے اور ان میں سے کئی ایک سے ان کی بہادری کی شاندار داستانیں وابستہ تھیں۔ خالد سہیل کو بچپن سے ہی بہادری اور بدقسمتی کی یہ کہانیاں سنتے سنتے میر علی کی یادوں سے گہرا لگاؤ ہو گیا تھا۔

خالد کو اب محسوس ہوا کہ ایسی بہت سی باتیں تھیں جنہیں اس کو جاننا چاہئے تھا لیکن وہ نہیں جانتا۔ اس نے اپنے والد سے شکایت کے لہجے میں کہا۔

'ابا، مجھے آپ لوگوں نے کبھی یہ واقعہ ٹھیک سے نہیں بتایا کہ پردادا کالا پانی کیوں بھیجے گئے۔'

اس کے والد شیخ عبدالرحمان بن خدا بخش بن میر علی سنجیدہ ہو گئے اور اس دن انہوں نے بیٹے کو تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتایا۔

'واقعہ کچھ یوں ہوا تھا کہ اس بستی میں ایک ایسا خاندان تھا جو سہیل کے خاندان کے مقابلے میں کمزور تھا۔ سہیل کا خاندان اب سے تین پشتوں پہلے پورے علاقہ میں اپنے

دبدبہ کے لیے جانا جاتا تھا اور یہ خاندان اس دوسرے خاندان کو کئی موقعوں پر زیر کرتا آیا تھا۔ جب وہ دوسرا خاندان اپنے مقصد میں کسی طرح کامیاب نہیں ہو پایا تو اس نے ایک انوکھی سازش رچی۔ اس خاندان نے ایک کتا پالا اور اس کا نام چندو رکھا۔ جب وہ کتا اپنے نام سے مشہور ہو گیا تب ایک دن رات کے وقت انہوں نے کتے کو بھالے سے مار ڈالا۔ چوکیدار سازش میں شامل تھا۔ اس نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی کہ میر علی نے چندو کو بھالا مار کر ہلاک کر دیا۔ چندو کے باپ کی جگہ اس کے مالک کا نام لکھوایا جو چندو کو بیٹا کہہ کر پکارتا تھا۔ چوکیدار کے رپورٹ کا سہارا لے کر داروغہ نے چوکیدار کی طرف سے قتل کا مقدمہ درج کر دیا اور تفتیش کو شدید بارش کا موسم ہونے کے بہانے التوا میں رکھ دیا۔ مقدمہ خاموشی کے ساتھ کاغذ پر پڑا رہا اور تفتیش میں تاخیر ہوتی رہی۔ اسی درمیان داروغہ نے میر علی کو مفرور قرار دے دیا اور عدالت سے میر علی کی گرفتاری کا وارنٹ نکلوا لیا۔ اس کے بعد میر علی کو اپنے کاغذوں میں مزید مفرور دکھاتے ہوئے یک طرفہ مقدمہ جاری رکھا گیا۔ یک طرفہ عدالتی کارروائی میں میر علی کو سزائے موت سنا دی گئی۔

سزائے موت سنائے جانے اور اپیل کی مدت گزرنے کے بعد ایک دن ایک پولیس پارٹی میر علی کے گھر پہنچی اور انہیں حراست میں لیکر کسی دوسری جگہ کے جیل میں بھیج دیا۔ میر علی کے خاندان والوں نے مقدمہ کی پیروی شروع کی لیکن تب تک اپیل کی مدت گزر چکی تھی اور پھانسی کی سزا کنفرم ہو چکی تھی۔ جب کہانی کی اصلیت پولس کے اعلیٰ حکام اور عدالت کو بتائی گئی تو پولس اور عدالت نے ہر قدم پر مزاحمت شروع کر دی کیونکہ بقول ان کے اس سے عدالت اور انتظامیہ کی بڑی بدنامی ہونے کا اندیشہ تھا لیکن بعد میں یہ اندازہ ہوا کہ یہ بھی صرف ایک بہانہ تھا کیونکہ سچائی کے سامنے آنے کے باوجود ایک دن عدالت نے سزائے موت کو سزائے کالا پانی میں تبدیل کر کے انہیں کالا پانی بھیج دیا۔

دلی اور دوسری جگہوں پر سرکاری، نیم سرکاری اور بڑے تجارتی گھرانوں کی طرف سے اپنے اوپر تمام دروازے بند ہونے کے بعد خالد کو احساس ہوا کہ اس سطح پر مفاد اور

پالیسیوں کی ایک گھٹ بندھن موجود ہے لیکن ابھی بھی اسے یہ علم نہیں ہوا تھا کہ یہ گٹھ بندھن اتنا وسیع ہے کہ یہ گاؤں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے۔ چونکہ وہ کم عمری میں ہی دلی کے ایک ہوسٹل میں آ گیا تھا اس لئے وہ گاؤں کے بارے میں زیادہ جاننا بھی نہیں تھا۔ لیکن اب اسے اس بات کا ادراک ہو رہا تھا کہ اس نے شہر میں جس چیز کے وجود کو محسوس کیا تھا وہ صرف گلیسیر کا اوپری حصہ تھا اور یہ نہ صرف ہر جگہ موجود تھی بلکہ اس کی جڑیں تاریخ کے اندر بھی بہت دور تک گھسی ہوئی تھیں۔ لیکن اس انکشاف نے اس کے حوصلے کو پست یا کمزور کرنے کے بجائے اس کے ارادے کو اور مضبوط کیا۔ اور اسے اس بات سے اطمینان حاصل ہوا کہ ایک اندیکھی چیز اس کے علم کا حصہ بن رہی تھی۔ اس نے اپنے ذہن کو اور مضبوطی سے اپنے نشانے پر مرکوز کیا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ جن لوگوں نے عظیم کارنامے انجام دئے ہیں ان کے سامنے مہم کے آغاز کے بعد مخالف قوتیں بتدریج زیادہ وسیع ہو کر سامنے آتی رہی ہیں۔

خالد کے نازک ہاتھ جس ڈھانچے کے ٹٹول رہے تھے وہ اندر سے ایک ایسی چکی تھی جس میں حکمرانوں سے لیکر مزدوروں تک سبھی کولہو کے بیل کی طرح جتے ہوئے تھے۔ یہ ایک مشین تھی جس میں فرد کی کوئی اہمیت تھی۔ جو شخص اس میں جہاں داخل ہو جاتا تھا وہیں بے دست و پا ہو کر اس مشین کی دی ہوئی زندگی کو جینے پر مجبور ہو جاتا تھا اور رفتہ رفتہ اسی رنگ میں رنگ جاتا تھا۔ مختلف عہدوں اور پیشوں کی طرح اس مشین میں جتے ہوئے لوگوں کو ظالم اور مظلوم کا کردار بھی یہ مشین ہی عطا کرتی تھی۔ اس میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ہمیشہ حاکم رہا ہو، کوئی ایسا نہیں تھا جو ہمیشہ بڑا تاجر رہا ہو۔ بس جس کو جو دنیا جتنی دیر کے لئے مل جاتی تھی وہ اسی دنیا میں مگن ہو جاتا تھا۔ یہی تو اس نظام کا کمال تھا کہ اس میں مواقع سب کو ملے ہوئے تھے۔ دائمی پس منظر میں اپنی آنے والی اولاد تو دور خود اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد کے دنوں تک کی کسی کو فکر نہیں تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے سوچنے سے کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ اس مکمل نظام کو سدھارنے کی سوچ تو صرف خالد سہیل جیسے کسی غیر معمولی انسان کے ذہن میں ہی جگہ پا سکتی تھی۔ اور خالد اب اس بھول بھلیوں والی کائنات کے دروازے کے پٹ کھول رہا تھا۔

اس کا ذہن اس واقعے کی طرف پوری طرح مڑ گیا جو اس کے پرداداکے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس واقعے نے ہر قدم پر نئے سوالات بھی پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اس کے اس سفر میں اس کے معصوم تصورات جن میں سے بیشتر اسے اپنے ہی سماج کے بزرگوں سے ملے تھے، ایک ایک کر کے کمزور ثابت ہونے لگے۔

.خالد نے انڈمان جانے کی تیاری شروع کر دی۔

اس کے پردادا کو کتے کے قتل میں جھوٹے طور پر پھنسایا گیا یہ بات تو اپنی جگہ سنگین طور پر غلط تھی ہی لیکن اس کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات بھی ایک اہم سوال بن کر ابھرنے لگی کہ انہیں کالا پانی کیوں بھیجا گیا تھا کیونکہ اگر ان کی سزا عمر قید میں تبدیل ہوئی تھی تو ان کو یہاں کے کسی جیل میں بھی رکھا جا سکتا تھا۔ اور خصوصاً جب ان کی سزا اس بات کے مدنظر کم کی گئی تھی کہ ان کا مقدمہ مشکوک تھا تو پھر ان کو اس قسم کی خصوصی طور پر سخت سزا دینے کی کیا وجہ تھی۔ یہ سزا موت سے کم کیسے تھی یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ سزا کیسے تھی یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کوئی پر اسرار بات تھی جو اس سزا سے نہیں خود کالا پانی سے وابستہ تھی۔ شاید انہیں یہ سزا اس لئے دی گئی تھی کہ وہاں قیدیوں کو جنگلوں میں رہنے کے لئے کم از کم آزاد تو چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اسے یہ بات زیادہ سمجھ میں آنے والی لگی اور اس کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہاں بھی قید خانہ تھا لیکن بنا بنایا نہیں تھا بلکہ وہاں جا کر انہیں خود اپنے قید خانے کی تعمیر کرنی تھی جس طرح حضرت عیسی کو صلیب ڈھونی پڑی تھی۔

وہ تو یہی سوچ رہا ہوگا کہ اس کے پردادا میر علی کے ساتھ، جو معصوم تھے، نرمی کا رویہ قائم رکھا گیا ہوگا اور ان کا کالا پانی بھیجا جانا انگریزوں کی حکومت کی انصاف پسندی اور دوراندیشی کی دلیل تھی۔'' اور یہ کہ انگریز حکومت ضرور کرتے تھے جنگوں اور بغاوتوں میں انہوں نے خونریزیاں ضرور کیں لیکن قانون کی عملداری میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔'

حکومتوں کے رعب سے متاثر ہو کر لوگ عام طور سے حکومتوں کی نیت پر بھی بھروسہ کرنے لگتے ہیں۔ کالا پانی کے بارے میں جاننے کے بعد آپ پر یہ بات روشن ہونے لگے گی کہ یہ کتنی بڑی غلط فہمی ہے اور اس غلط فہمی کو پیدا کرنے کے لئے حکومتیں کیا کیا جتن کرتی ہیں۔

کہانی سناتے سناتے ایک مجذوب سا مجاور آدمی اپنے آپ میں اتنا کھو گیا کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ خالد کے دل و دماغ کے بارے میں اتنا جانتا ہو جیسے وہ خود خالد سہیل ہو۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور گہری سانس لی۔

یہ سوچنے کے باوجود کوئی چیز اس کے ذہن کو بار بار منتشر کرتی رہی اور وہ چیز تھی وہ عجیب و غریب جگہ۔ وہ سمندری منظر جو شیر' اژدہا یا بھیڑیا کی طرح اس کے دادا کو نگل گئی۔ کالا پانی سمندر میں موجود ایک ایسا نہنگ تھا جو شکاری کی طرح اس کے پردادا کو سمندر میں کھینچ کر لے گیا تھا اور کوئی انہیں بچا نہیں پایا تھا۔

والد کی جذباتی گفتگو نے اس کے دل میں موجود اس کے بچپن کے اس زخم کے اس درد کو تازہ کر دیا جس کا خیال آتے ہی وہ تلملا جایا کرتا تھا۔ اس کے والد نے دوران گفتگو انتہائی جذباتی ہو کر کہا تھا کہ کبھی کوئی ان کی قبر پر جا بھی نہیں سکا اس لئے وہاں پہنچ کر وہ سب سے پہلے ان کی قبر پر اور اگر قبر نہیں ملے تو متعلقہ قبرستان میں فاتحہ پڑھے گا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد کہا تھا کہ وہ وہاں سے ان کی قبر کی یا کم از کم قبرستان کی تصویر لانا نہیں بھولے۔ سفر

کرنے سے پہلے وں کئی دنوں تک اداس رہا۔ اس دوران اسے کبھی کبھی خیال آتا کہ اس کے خاندان پر سیکڑوں برس پہلے سے ہی کوئی آسیب طاری ہو گیا تھا جو اس کا خاندان کو کسے گہری کھائی میں گرا کر مکمل طور پر تباہ کرنے پر آمادہ تھا اور وہ یہ عمل آہستہ روی سے کر رہا تھا تا کہ اس خندان کے افراد کو اس کی تکلیف کا تجربہ ایک لمبے عرصہ تک ہو۔ کبھی کبھی یہاس آسیب کا گھونسلہ اسے اپنے دشمن خاندان کے ذہنوں میں دکھائی دیتا تھا جہاں سے وقت بہ وقت نکل کر وہ حملہ آور ہوتا تھا اور اسے بے خبری کے عالم میں حملہ کرنے میں یاک خاص لذت محسوس ہوتی تھی۔ کبھی اسے یہ خیال آتا تھا کہ اس آسیب کو اس بات میں زیادہ لذت ملتی تھ کہ وہ ایسے لوگوں کو ستا رہا تھا جو معصوم ہونے کی بنا پر محفوظ رہنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ اسی سوچ کے دوران اسے محسوس ہوا کہ اس کی ذات میر علی کی تقدیر سے باہر نہیں تھی بلکہ یہ سب ایک ہی معاملے کے الگ الگ صفحات تھے۔ وہ کبھی کبھی اسے انسانوں کے رویے سے جوڑ دیتا اور اسے تب محسوس ہوتا کہ یہ انسانی زندگی میں ہمہ گیر سطح پر موجود مصیبتوں کے پیڑ سے نکلے ہوئے زہریلے پھلوں کا ایک گچھا تھا جو اس کے خاندان کے حصے میں آ گیا تھا کیونکہ انگریزوں کی تو پوری حکومت تھی اور انہوں نے انگریزوں کے ساتھ ایسا کچھ کہاں کیا تھا کہ وہ انفرادی طور پر اس کے دادا کے ساتھ ایسا کرتے۔ لیکن، اسے پھر خیال آیا، انہوں نے ایک ایسا ماحول اور کلچر ضرور پیدا کر رکھا تھا جس میں اگر کوئی پولس والا ایسا کر بھی دے تو اس کو اس کی سزا دینے کے بجائے کامیابی سے دہشت پیدا کرنے کے عوض میں اس کی حمایت کیجائے۔ اور یہ کہ کہیں نہ کہیں انگریزوں کی پوری اسکیم میں اس کی بھرپور گنجائش تھی اور یہ حکومت کرنے کی ان کی دانش اور مہارت کا ایک عملی عنصر تھا۔

یہ سوچ کر خالد کا دل اور اداس ہو گیا کہ انگریزوں کے اس ملک کو چھوڑ کر چلے جانے کے بعد بھی وہ آسیب اس ملک میں زندہ تھا اور ہمہ وقت لوگوں کو کاٹتا رہتا تھا۔ اس خیال سے ایک بار اس کا درد اور شدت اختیار کر گیا اور یہ سوچ کر اسے دردناک گھٹن کا احساس ہوا کہ پورا معاشرہ اس درد میں گرفتار ہے لیکن جہاں معاشرے کے عام لوگ اس کا خاتمہ چاہتے ہیں وہیں کچھ لوگ اپنی مفاد اور مصلحت پسندی کے تحت انگریزوں کے زمانے کی اس

چیز کا نہ صرف یہ کہ خاتمہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس کو اور مضبوط کرنے میں کوشاں تھے۔ اپنی ذاتی زندگی کے پسِ منظر میں جس میں اس کو انسانیت کے فلاح کا پرچم اونچائی تک بلند کرنے کی سزا دی گئی تھی اور اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا دور ماضی تک پھیلا ہوا یہ پیڑ سیکڑوں سال پرانے برگد کی طرح ایک ایسا منظر دکھا رہا تھا جس میں ہزاروں سانپ لٹکے ہوئے تھے اور جن سے لڑنے کے بجائے لوگوں نے پشتوں پہلے ان کی ناقابلِ تسخیر قوت کو اپنے مقدر کا آقا مان کر ان کو دیوتاؤں کا درجہ دے کر اس کی عبادت کرنے لگے تھے اور اب معتوب وہ ہو جاتا تھا جو اس سے بغاوت کرنے کی بات کرتا تھا اور وہی اب آنکھوں کا کانٹا بن جاتا تھا۔

جب وہ دلی کی عمارتوں میں دربدر ٹھکرایا گیا تھا تب تو اسے ایسا لگا تھا کہ وہ کسی پہاڑی نالے میں گرایا گیا ہے لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ بہتے بہتے کسی وسیع دریا میں آ گیا ہے اور اب بہتا ہوا سمندروں کی طرف جا رہا ہے اور اگر وہ اپنے پرداداسے متعلق معلومات اور کاغذات نہیں لا سکتا تو اپنے خوبوں کی بات کرنے سے پہلے ایک تناؤ بھرے معاشی جدوجہد سے گزرنا پڑے گا۔ اور یہی تو وہ چیز تھی جو برسرِ اقتدار طبقہ اسے دکھا کر اس کو انسانیت نوازی اور انسانیت پرستی کے بھیانک انجام کا سبق دینا چاہتا تھا اور ہر عہد اور ہر دور میں انسانیت کی بات کرنے والوں کو اسی طرح سبق دیا گیا ہے کہ یہ دنیا، یہ کائنات اور انسانوں کی آبادی بنیادی طور پر ایک سیاہ رات ہے جس میں جرائم پیشہ اپنا کاروبار چلاتے ہیں اور وہ روشنیوں کے دشمن ہیں لیکن روشنی پیدا ہوتی رہتی ہے کیونکہ جب انسانیت پرست شہید کر دیے جاتے ہیں تو تو ان کے خون سے روشنی کی کرنیں نکلتی ہیں اور ان میں وہ انرجی توانائی ہوتی ہے جسے اندھیرے پنجوں کی مٹھیوں میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ اب ان سمندروں میں جا رہا تھا جہاں دور بہت دور روشنیاں چمک رہی تھیں۔ وہ ابھی اس بات سے واقف نہیں تھا کہ دراصل ساری روشنی تو انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ اسے تو صرف ماچس کی تلاش ہوتی ہے اور وہ تلاش ہی اس کے اندر وہاں جانے کی شدومد پیدا کر رہی تھی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ قدرت کچھ خاندانوں کو سیکڑوں سال تک آگ میں تپا کر کندن بناتی ہے اور پھر اس کے بعد اس کندن سے کچھ مخصوص کام لیتی ہے۔

'اگر سیکڑوں سال تک تپانے والی آگ اپنا کام نہیں کر رہی ہوتی تو یہ حیرت انگیز کتاب وجود میں کیسے آتی۔' کہانی سنتے سنتے جیلانی کے ذہن میں خیال آیا۔ جیلانی نے دراصل خالد کی کتاب کو دلی سے روانہ ہونے سے پہلے ہی غور سے پڑھ رکھا تھا اور وہ تو اب صرف اس کتاب کے وجود میں آنے کے رموز و اسرار کو سمجھنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے بغیر کتاب کو سمجھنا اسے ایک نامکمل عمل لگنے لگا تھا۔ جیلانی نے کو محسوس ہوا کی کتاب کے وجود میں آنے کی روئداد سننے سے اس کی سحر انگیزی کی وجوہات ظاہر ہونے لگی تھیں۔

وہ پھر مجاور کی آگے کی باتیں سننے لگا۔

مجاور اپنی آنکھیں کبھی کھولتے ہوئے اور کبھی بند کرتے ہوئے اسی مونولاگ والے انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ان تمام باتوں کے گھیرے میں آ کر اب خالد اتنا بے چین ہو گیا تھا کہ وہ اب آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

وہ اب سوچتے رہنے کے بجائے اس جگہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔

خود وہاں جا کر۔

تصویروں میں نہیں۔

انٹرنیٹ پر نہیں۔

اس نے کوشش کر کے اپنا کلکتے کے ٹرین کا ریزرویشن بھی اڈوانس کروا لیا تاکہ یہاں سے جلدی روانہ ہو سکے۔

❖❖

6

ٹرین میں رات کے وقت سونے سے پہلے کافی دیر تک اس کی نیند اچاٹ رہی اور کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کا وجود اندر سے کہیں زبردست ہیجان کا شکار تھا۔ بہت سے باتیں اس کے ذہن میں اُلجھتی چلی جارہی تھیں جیسے وہ اس کے سونے سے پہلے اپنا جواب مانگ رہی ہوں یا اپنے آپ کو اس کی یادداشت میں مضبوطی سے قائم کردینا چاہتی ہوں۔

اسے انڈمان جانے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ کیا پتہ وہاں تمام ریکارڈس نہیں ہوں۔ اس زمانے میں پورٹ بلیر کا ہیڈکوارٹر تو کلکتہ ہی رہا ہوگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جزائر انڈمان جانے سے پہلے وہ کلکتہ میں رک کر وہاں کی لائبریریوں اور دفتروں کے پرانے ریکارڈس سے اس زمانے کی معلومات حاصل کرے گا۔

اسے اپنے مقدمے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور اس کو استعمال کرنے کے ساتھ ہی اسے اپنے پردادا کے مقدمے کے حوالے سے اس مسئلہ کو دنیا کے سامنے ایک سوال بنا کر اٹھانا چاہئے کہ اتنی بڑی حکومتیں ایسی غلطیاں کیوں کرتی ہیں۔ بچپن سے ہی اس کا مزاج ایسا تھا۔ وہ تو بحیثیت ایک جرنلسٹ ہر اس معصوم کا وکیل ہے جس کی معصومیت کے بارے میں اس کے پردادا کی طرح حکومتوں کو جانکاری ہونے کے باوجود بڑی بڑی سزائیں دی گئی ہیں۔ اسے یہ مقدمہ پوری تیاری کے بعد اور پوری تیاری کے ساتھ لڑنا چاہئے۔

ایسے واقعات میں سرکار کی اعلیٰ ترین سطح کا ملوث ہونا جس کے پورے امکانات اس کو دکھائی دے رہے تھے، اتنی لرزہ خیز انکشاف تھی کہ اس کے خاندان کے سامنے جو معاملہ کھڑا ہوا تھا وہ محض اس کا ایک معمولی سا حصہ لگنے لگا کیونکہ اس کے سامنے اس طاقت کا چہرہ ابھر آیا تھا جس کا آج بھی عالمی پیمانے پر انسانوں کی زندگی پر اختیار تھا اور اپنا دارالسلطنت بھی اپنے تمام بازوؤں کے ساتھ صرف اسی تاریخی اور عالمی طاقت کی توسیع تھا جس نے اس کے پردادا کو کالا پانی بھیجا تھا۔

وہ سوچنے والا ذہن رکھتا ہے۔

اس کی سوچ بالکل الگ اور نئی اور خطرناک تھی اور اتنی مختلف تھی کہ اس سے ابتک کی تمام مروجہ سوچوں کی جڑوں کے ہل جانے کا خطرہ تھا۔

ایک جگہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ

'ہمیں اپنی روایات کو محفوظ رکھنے سے زیادہ ان کو توڑنے پر محنت کرنی چاہئے۔'

''دراصل خالد کے دل و دماغ پر کالا پانی اس کے آنکھ کھولنے کے بعد سے ہی ایک عجیب وغریب تصویر بناتا چلا گیا تھا اور یہی تصویر اچانک طوفانی ہواؤں کی طرح پوری شدت کے ساتھ برآمد ہو کر اس کے ذہن میں چھا گئی تھی اور اس نے اس کو اس طرح اپنی زد میں لے لیا کہ وہ اس سے باہر آہی نہیں سکتا تھا۔' مجاور نے یہ کہتے ہوئے نیلے آسمان میں جھانکا۔

'بڑا عجیب لڑکا تھا۔ ایک دن کچھ لوگ گپ شپ کر رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے خالد سے پوچھا کہ اس کی سب سے بڑی تمنا کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اس کی تمنا ہے کہ وہ کسی قتل کے جھوٹے الزام میں پھنس جائے اور اس کو پھانسی کی سزا مل جائے اور وہ اس جھوٹے مقدمے سے نکلنے کی کوشش کرے۔ لیکن ایسی خواہش رکھنے کی اس نے ایک بہت

ٹھوس وجہ بتائی۔ اس نے کہا کہ وہ ایسا اس لئے چاہتا ہے کہ وہ محسوس کر سکے کہ جب کوئی معصوم کسی جھوٹے مقدمے میں پھنستا ہے اور عدالتیں جھوٹے مدعی اور پولس کا ساتھ دیتی ہیں تو اس بے قصور ملزم کو کیسا لگتا ہے۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے معاشرے کا کتنا سنگین مسلہ ہے۔ اور اس کے درد کو تو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو اس سے گزرا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں اس حد تک سنجیدہ ہے کہ اگر یوں نہیں ہوا تو وہ سچ مچ کسی کو اسی مقصد کے لئے مار کر مقدمے میں پھنسنا چاہے گا۔ وہ یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا کہ ہم بھی اچانک سناٹے میں آ گئے تھے۔ اس نے آگے کہا تھا کہ جس شخص کو اس طرح کی صورتحال کا تجربہ نہیں ہو وہ معاشرے کے لئے لڑائی کیا کرے گا۔'

تخلیقی سوچ والے اپنے تصور میں اسی طرح سوچ کر تخلیقی تجربوں سے گزرتے ہیں لیکن اس کا یہ کہنا اس کی سوچ کی طرف بامعنی اشارا کرتا ہے۔

'اس طرح کی اس نے اور بھی بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس کا ذہن غیر معمولی حد تک اوروں سے مختلف نوعیت کا تھا۔ جیسا میں نے ابھی بتایا تھا اس نے لکھا ہے کہ 'ہمیں اپنی تہذیب کے ڈھانچوں کو بچانے سے زیادہ توڑنے پر توجہ دینی چاہئے۔ وہ مثال دیتا ہے کہ وقت اور ضرورت کے مطابق ہم اپنے مکان کو توڑ کر اسے نئے سرے سے بناتے ہیں اور کبھی یہ نہیں کرتے کہ پرانے مکان کو صرف اس بنا پر بچا کر رکھ لیں کہ یہ ہماری یادگار ہے۔ یہی حال ہم اپنے شہروں کا کرتے ہیں۔ ہم تو آثار قدیمہ کو بچانے کی بات صرف تب کرتے ہیں جب ان کو توڑنے کی ضرورت نہ ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ در اصل روایتوں کو توڑنا تخلیقی عمل ہے اور حاکم و محکوم کے رشتے کو بھی وہ اسی طرح کی ایک روایت سمجھتا تھا۔'

❖❖

کالا پانی کی سزا اور کالا پانی کا وجود ایسے سنگین حقائق ہیں جنھوں نے اس کے خاندان کے ساتھ گھناؤنا کھلواڑ کیا ہے۔ اسے تو اپنے سارے دوسرے کاموں کو پس پشت ڈال کر اس معاملے کی تہ میں جانا چاہئے اور اس جرم کے لیے جو تاریخی کردار ذمہ دار ہیں ان پر تاریخ کی عدالت میں ایک مقدمہ قائم کر کے اپنے پردادا اور ان جیسے دوسرے قیدیوں کو پوری دنیا کے سامنے سرخ رو کرنا چاہئے اور ان ظالمانہ حملوں کا بھرپور جواب دینا چاہئے چاہے۔ سچ تو یہی تھا کہ میر علی جیسے بہادر اور جری ایک معمولی انسان کے خلاف سازش میں بے پناہ طاقت والی سرکاری مشین کا استعمال کیا گیا تھا اور ظلم کرنے والے یہ کردار آج بھی اپنے کئے پر نادم نہیں ہیں۔

سوچتے سوچتے اسے محسوس ہوا کہ اس کا پورا وجود اب دلی سے واپس آیا ہوا وہ شخص نہیں رہ گیا تھا جو اپنے طور پر کوئی روزگار حاصل کرنے تک کو ہی ایک مسئلہ سمجھتا تھا بلکہ اس کے خاندانی جائداد کے حوالے سے جو میر علی کے کالا پانی کے دنوں کے حقائق سے جا جڑی تھیں، اس کا وجود اس مینڈک جیسا ہو گیا تھا جسے تختی پر ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھوک کر پھیلا دیا گیا ہو اور سینے سے پیٹ تک اسے چاک کر کے پیٹ کی جلد کو دونوں طرف کھینچ کر انہیں بھی کیلوں سے ٹھوک دیا گیا ہو اور اب بغیر ان کیلوں کو اکھاڑے ہوئے اور اپنے آپ کو دوبارہ درست کئے ہوئے آزادی ممکن نہ ہو۔

دیر تک اس کا ذہن مسلسل اس سوچ میں مشغول رہا اور مختلف کڑیوں میں یہ سوچ آگے بڑھتی رہی اور سوچتے سوچتے سونے سے پہلے اب اس کی جمہوری فکر کو جھٹکا لگنے لگا۔ اس نے دنیا کے بارے میں جو خواب دیکھا تھا اس خواب کے مد مقابل بھیانک تاریکیاں ابھر کر سامنے آنے لگی تھیں۔ ان تمام گرہوں کے کھل جانے کے بعد

اسے نیند آ گئی۔

خالد سہیل اپنے پردادا امیر علی کی زندگی کے حالات کی دریافت کے لیے جاتو رہا تھا اور وہ اس مقدمے کو ایک تاریخی لڑائی میں بھی تبدیل کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اس بات کا قطعی سان وگمان ہی نہیں تھا کہ اس دریافت کے اندر سے کوئی اور ایسا مقدمہ سامنے آجائے گا جس کے دائرہ کار میں پورا کرہ ارض اور پوری انسانی تاریخ سما جائیں گے اور وہ مقدمہ اس مقدمے سے بھی کروڑوں گنا زیادہ ناگزیر اور سنگین نوعیت کا ہوگا جس میں اس کی خاندانی جائداد اور زندگی داؤ پر لگی تھی۔'

'خالد کے خاندانی جائداد کا مقدمہ اپنی جگہ درست لیکن ایسے مقدمے تو آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن اس مقدمہ کو اس زمانے سے کیسے جوڑا جاسکتا ہے۔ اب تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ بات تو بہت پرانی ہو چکی۔' ایک لڑکے نے مجاور کو ٹوکا تو مجاور کے اندر شدید ردِ عمل ہوا۔

'سورج کی آگ پرانی ہوگئی ہے کیا؟ سورج کی آگ کی طرح بالکل تازہ ہے۔ تازہ نہیں ہوتی تو اس وقت آپ یہاں نہیں ہوتے۔'

خالد مر چکا تھا لیکن اس کے پیچھے اسے طرح کی لڑائیاں چل رہی تھیں۔

ایک وقفے کے لئے خاموش ہونے اور ایک لمبی سانس لینے کے بعد مجاور نے آگے کہا۔

'یہ تو محض آئینہ تھا۔ وہ تو دراصل اس بڑے واقعہ میں اپنے ہی موجودہ معاشرے اور ملک کو دیکھ رہا تھا البتہ اس کو اس وقت اس کا بالکل شعور نہیں تھا۔'

'اس نے لڑکوں کی آنکھوں میں دیکھا۔

'جیسے آپ کو نہیں ہے۔'

سبھی مجاور کے اس اندازِ تخاطب پر بکتے میں آ گئے۔

'دراصل خالد کو خود معلوم نہیں تھا کہ اس کے اوپر قدرت کی طرف سے کیا عمل ہو رہا تھا۔ وہ تو قربانی کا بکرا تھا جسے خوبصورت چراگاہ کی سیر کرائی جا رہی تھی۔'

لڑکے اس کو بہت غور سے دیکھنے لگے۔

'میاں، اصل نقطہ تو اسی میں ہے۔'

اس کی آنکھیں ناچ رہی تھیں۔

❖❖

وفد کے لوگ مجاور کے ساتھ اس بستی کی مختلف جگہوں پر بھی گھومتے رہے اور یہاں کے لوگوں سے ملتے رہے کیونکہ ان کے کھانے کے بارے میں وہاں کے لوگوں نے طے کر دیا تھا کہ یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں کے یہاں روزانہ ان کی دعوت رہے گی۔ گاؤں کی بہت سی بوڑھی عورتوں سے بھی ان کی ملاقات ہوئی جنھیں نے بہت پر جوش انداز میں خالد کی شخصیت کی تعریف کی۔ دو تین دنوں تک خالد کے والد کی اجازت سے وہ خالد کے اس اسٹڈی روم میں بھی رہے جس میں وہ بچپن سے پڑھتا لکھتا اور رہتا آیا تھا۔ اس کے کمرے میں ابھی تک اس کا پرانا ریمنگٹن کا انگریزی ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا جس سے اسنے اپنی بہت سی تحریریں ٹائپ کی تھیں۔

وہیں انہوں نے وہ کمرہ بھی دیکھا جس کو خالد نے پورٹ بلیر سے لوٹنے کے بعد امیر علی کی یادوں سے جڑی چیزوں کے ساتھ ان کی انڈمان کی زندگی سے متعلق مختلف مقامات اور تحریروں اور جیل میں قیدیوں کو اذیت پہنچانے کی لئے استعمال کئے جانے والے اوزاروں کی تصویروں کو جمع کر کے اسے ایک میوزیم میں تبدیل کر دیا تھا۔

مجاور خالد کی کہانی ان کو صرف اسی وقت سناتا جب سب کو مکمل ذہنی یکسوئی دستیاب ہوتی۔ وہ کبھی کسی کی چھت پر ان کو لے کے بیٹھ جاتا، کبھی دور جنگل میں کسی پیڑ کے نیچے منڈلی جما دیتا۔ ایک دن تو وہ انہیں لیکر اپنے علاقے سے ہو کر بہنے والی ندی میں پہنچ گیا اور خود اپنے ہاتھوں سے چپوؤں کو چلاتا ہوا ان کو ادھر ادھر کے مناظر بھی دکھاتا رہا اور خالد کی داستان بھی سناتا رہا۔

اس وقت وہ گنے کے ایک کھیت کی ہری گھاس سے ڈھکی ہوئی میڑ پر بیٹھا انتہائی

محبت آمیز انداز میں ان کو گنے کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر کھلا رہا تھا۔

'تو بات کو جاری رکھیں'۔

'جی'۔

' خالد سہیل کے سامنے آنے والی باتوں میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس کی سمجھ سے بعید تھیں اور اس کو اندازہ ہوا کہ شاید عام لوگ اس سے واقف ہی نہیں تھے'۔

وہ محو بیان تھا۔

اب تصویر مزید کھل کر ابھر رہی تھی۔

'انگریزوں نے یہاں کے بہادر قبائلیوں کے ساتھ جیسا انسانیت سوز سلوک کیا تھا، یہاں لائے گیے قیدیوں کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا تھا۔ یہاں کے جیلر کو یہ اختیار تھا کہ بھاگنے کی کوشش کرنے والے سیکڑوں قیدیوں کو ایک ساتھ سزائے موت سنا دے اور بغیر اپیل انہیں پھانسی کے پھندے پر چڑھا دے'۔

'قیدیوں کے ذہنوں پر کیا دہشت کا ماحول طاری رہتا ہوگا'۔

'جب خالد کو یہ سب معلوم ہوا جو اس سے بالکل برعکس تھا جو اس نے اپنے طور پر انگریزوں کے بارے میں سوچا تھا تو خالد کیلئے، ظاہر ہے، یہ ایک بہت ہی اہم اور تکلیف دہ واقعہ تھا۔ یہ تاریخ کی عجیب وغریب چیز تھی جسے خود اس کے پردادا نے بدن کی آنکھوں سے دیکھا اور یہاں کسی کو آج تک اس کی جانکاری نہیں ہوئی کیونکہ تاریخ کے عجائب گھر میں بہت سارے چلن الٹے ہوتے ہیں'۔

اس کے ذہن میں کئی سوال اٹھنے لگے۔

انگریزوں کو اس لق و دق جگہ میں آباد ہونے کی ضرورت کیوں پڑی؟

اور پھر جب ایک اتنا بڑا واقعہ ہوا تھا کہ ایک قیدی نے وائسرائے لارڈ میو کا قتل کیا تھا تو اس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں دکھائی کیوں نہیں دیتا؟

اور دوسری طرف ایک کتے کی موت کے مقدمے میں کسی کا یہاں بھیج دیا جانا۔

اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اور اچانک تاریخ سمیت کالا پانی ایک وادئ اسرار بن گیا۔

وہ ایک ایسی وادئ تنہائی میں اتر گیا تھا جہاں اسے شاہراہ سے اتر کر ناہموار جگہوں سے گزرنا تھا۔ اس کا ذہن ہلکے ہلکے لڑکھڑانے لگا تھا۔ ان راستوں پر چلنے میں جہاں سے لوگ پہلے گزر چکے ہوتے ہیں کتنی آسانی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں تو سب کچھ ناہموار تھا۔

وہ جان گیا تھا کہ کوئی خطرناک پس منظر ہے۔ جس میں اس کا خاندان تب بھی الجھا ہوا تھا اور اب بھی الجھا ہوا ہے۔

وہ بے چین ہو گیا تھا۔

کیا ہمارے جیسے لوگوں کے آباواجداد کے دکھوں پر سوچنے والا کوئی نہیں۔ کیا ہم اب بھی کہیں نہ کہیں بادشاہوں اور حکمرانوں کی جاگیر سمجھے جاتے ہیں کہ ہمیں صرف انہیں کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے؟

اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی پنجرے کا پنچھی ہو۔

پنجرہ کا توتا۔

اگر ان لوگوں کی اولاد میں جو بے قصور کالا پانی بھیج دیئے گئے تھے کوئی مورخ ہوتا تو یہ موضوع ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں دل اور جگر جیسا مقام رکھتا لیکن کسی اور کو کیا پڑی ہے۔

دور سمندر میں موجود اس جزیرہ مقصود کی ان پراسرار کہانیوں کو سمجھنے کے لئے اس سمندر کے قزاقوں کے بارے میں تفصیل سے جاننا ضروری ہو گیا تھا۔

میر علی کو اٹھا کر انڈمان نکوبار کے دور دراز جزیروں میں ڈالا جانا خالد سہیل کو الف لیلیٰ کے سندباد کی کہانیوں کی پراسرار وسعتوں میں لے کر چلا گیا۔

اسے محسوس ہوا کہ اسے دور دیسوں کی گپھاؤں، صحراؤں اور پہاڑوں اور شہروں کی نادر اور عجوبہ دنیاؤں کے اندیکھے کوہ قافوں میں بھی جانا پڑ سکتا ہے کہ دراصل کبھی سورج غروب نہ ہونے والی حکومت کے اسرار الف لیلوی داستانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز، ہوش ربا اور ہولناک تھے۔

اسے یہ خیال کر کے جھرجھری سی آ گئی کہ کسی کو یہاں بھیجنا اسے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچا دینے کے مترادف تھا۔ کوئی شخص نہ اپنی مرضی سے وہاں جا سکتا تھا نہ کوئی قیدی کسی بھی قیمت پر وہاں سے نکل سکتا تھا۔ اچھے موسموں میں بھی بیچ سمندر میں درختوں کی اونچائی کے برابر لہریں اٹھتی تھیں جنہیں پار کرنا کسی بھی معمولی کشتی یا جہاز کے لیے اس لئے اور بھی ناممکن تھا کہ ان لہروں سے زیادہ اونچی تھیں انگریزی فوجوں کی وہ نگاہیں جو دوربینوں سے ان سمندروں کی نگرانی کرتی تھیں۔ اس زمانے کی پوری دنیا الگ طرح کی تھی۔

اس کے نشانات اسے کتابوں کے اوراق اور پرانے میوزیم میں موجود بوسیدہ.

جناتی مکانوں کی تصویروں، کتابوں اور مجسموں میں مل رہے تھے۔

اس نے کنگھی سے اپنے بال ٹھیک کیے۔

انگریزوں کے مقامی دارالسلطنت کلکتہ میں جو بگھی تھے ان کو گھوڑے نہیں، ننگے پاؤں ہندوستانی نیم سیاہ عوام اب تک کھینچ رہے تھے۔

اس کی انگلی گال پر آ گئی اور وہ کچھ سوچنے لگا۔

'جب کلکتہ میں یہ عالم تھا تو کالا پانی میں کیا عالم ہوگا جہاں ہر شخص کی پیشانی پر جرم کا مہر لگا ہوا تھا' خالد سہیل کو اپنی پڑھی ہوئی تاریخ نئے سرے سے یاد آنے لگی۔ جن باتوں کو وہ ابتک بے رحمی سمجھتا تھا اس میں مکاری کے سائے نمودار ہونے لگے۔

'یہ وہی انگریز تھے جنھوں نے بنگال میں ایسے ایسے معاشی ہتھکنڈے استعمال کیے کہ لاکھوں لاشیں فاقہ سے کھیتوں، بستیوں، سڑکوں اور شہر کی گلیوں میں کتوں اور گدھوں کی خوراک بن گئی تھیں'

ان انگریزوں نے کالا پانی ایسی چیز بہت سوچ سمجھ کر بنائی ہوگی۔

خالد کے ذہن نے انگریزوں کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

اب اسے شک ہونے لگا۔

'غالباً وہ لوگ بہت سادہ لوح ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں نے انصاف کے تقاضے پورا کرنے کے لیے اتنی دشوار گزار جگہ پر مچھروں اور قبائلیوں کے حملوں کو جھیل کر قیدی بستیاں آباد کی تھیں'

ایک پرانے رسالے میں اس نے ایک تحریر پڑھی۔

"۱۸۵۷ء میں بنگال کے ظلم کی وبا کو پورے ہندوستان میں پھیلنے سے بچانے کے لیے عوام نے جنگ آزادی کا مشعل اٹھایا تھا، اور تلواریں اور بندوقیں کھینچ لی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب جنگ آزادی کے مجاہدین کو بھوکا ننگا کر کے، جوٹ کے کپڑے پہنا کر کولہوں پہ کوڑے مار مار کر جہازوں پر سوار کیا جاتا تھا تو انڈمان کے اسرار سے واقف انگریز ان کی چیخوں اور کراہوں کو سن کر مسکراتے تھے۔"

'اس کے پردادا کی کہانی اسے کہاں لئے جا رہی ہے۔' خوفناک تنہائیوں میں آگے بڑھتے ہوئے بار بار اس خیال پر اس کے اندر جھرجھری پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ اتنی پرانی کہانی کا تعاقب کر رہا تھا جس میں کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن ایسے میں اس کو ایک آدمی ملا۔

لائبریری میں تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک آدمی کو جب معلوم ہوا کہ وہ انڈمان کے ماضی پر کچھ پڑھ رہا ہے تو وہ اس کے قریب آیا۔

'آپ جزائر انڈمان پر ریسرچ کر رہے ہیں؟'

'نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'

'پھر اس قدر دلچسپی۔ میں دیکھتا ہوں آپ روزانہ اسی موضوع پر کتابیں اور دستاویز ڈھونڈتے ہیں۔ میں اسی لائبریری میں ہوں اور آپ کو یہ سب نکال کر میں ہی دیتا ہوں۔ آپ کو اس موضوع میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟'

کیوں؟ یہ آپ کیوں جاننا چاہتے ہیں، میں بھی تو جانوں۔

میں آپ کو اس موضوع پر بہت سی باتیں زبانی بتا سکتا ہوں۔ انگریزوں کے زمانے میں سب کچھ لکھا تھوڑے ہی جاتا تھا۔ آج بھی نہیں لکھا جاتا ہے جبکہ جمہوریت ہے۔ اصل تاریخ تو زبانی چلتی ہے۔ کاغذی تاریخ کی برتری کا دعویٰ تو وہ کرتے ہیں جن کا طباعت کے اوپر اختیار ہوتا ہے۔

پھر خالد نے اس کو بتایا کہ اس کے والد نے دراصل اس کو اپنے پرداد کے بارے میں یہ معلوم کرنے کی لئے بھیجا ہے کہ کیا انہوں نے کالا پانی کی سزا کے دوران شادی کی تھی اور اگر کی تھی تو کیا اس شادی سے ان کو اولاد تھی اور اگر تھی تو وہ کون لوگ ہیں کیونکہ کچھ لوگوں نے کہیں خاموشی سے یہ سوال اٹھا کر ان کی جائداد کی فروخت پر پابندی عائد کردی ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس معاملے میں لمبا مقدمہ چلے اور بہت سی جعلسازیاں سر اٹھائیں۔

لائبریری کے اس اسٹاف نے ہی خالد کو بتایا کہ اس دور کے بارے میں اس طرح کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا اور دراصل اس زمانے میں پورٹ بلیر رنگون کی عملداری سے جڑا ہوا تھا اور رنگون اب برما میں تھا۔

لیکن بہت ممکن ہے کہ اس وقت کے کچھ کاغذات کہیں انڈمان میں ہی پڑے ہوں۔

جب یہ بات انجام تک پہنچی تب خالد نے بتایا کہ وہ اس زمانے کے حالات کی تفصیل اس لئے جاننا چاہتا ہے کہ وہ اپنے پردادا کے اوپر ہونے والے ظلم کی نوعیت کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اس پر اس آدمی نے بہت کچھ بتاتے ہوئے آگے کہا۔

'مسٹر خالد، اصل معاملہ یہ تھا کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مغربی قوموں میں سمندروں اور دوسرے بڑاعظموں پر قبضہ کرنے اور تجارت پھیلانے کا جو مقابلہ چل رہا تھا اس میں مشرقی ایشیا کے ان جزائر کی حیثیت کلیدی تھی کیوں کہ ہندوستان، ملشیا،

انڈونیشیا اور برما کے بحری راستے کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے سمندری جہازوں اور بیڑوں کے لیے خراب سمندری موسم میں پناہ گزیں ہونے اور پینے کے پانی کا ذخیرہ لینے کے لیے یہ بے حد معاون تھے کیونکہ یہاں چھوٹے چھوٹے جزیروں کا درمیان کار آمد بندرگاہیں بنانے کے لئے مناسب ترین جگہیں تھیں۔'

وہ خالد کو ایسے بتا رہا تھا جیسے اسے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے بہت دنوں کے بعد کوئی ملا تھا۔ وہ بتاتا جاتا تھا اور اسے دیکھتا جاتا تھا اور اس کی مشاق آنکھیں اشارے سے ہر اہم نکتے پر زور ڈالتی جاتی تھیں۔ وہ خالد کو بہت سیدھا سادہ لڑکا سمجھ کر بات کر رہا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں مچکاتا تھا۔ جیسے کچھ ایسا کہنا چاہتا ہو جو اصل اور سچ ہو لیکن ایک باشعور عالم کی حیثیت سے ویسا تبصرہ کرنا تاریخ دانی کے اقدار اور ضابطہ علم کے خلاف ہو۔

'شروع سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی اس مفید جگہ سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔'

اس نے آنکھ ماری۔

'لیکن یہ آسانی سے ممکن نہ تھا۔ انڈمان کے گھنے جنگلوں اور غیر آباد جزیروں میں جنگلی قبائل رہتے تھے، جو تیروں سے لیس تھے اور کسی بھی اجنبی کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ زمانہ قدیم میں ملیشیا کے لوگ ان قبائلیوں کو پکڑ کر تجارت کیلئے لے جاتے تھے۔ اور غلام کے طور پر فروخت کر دیتے تھے۔ اپنے قبیلے کے افراد کے اس طرح کے خاتمہ کو دیکھ کر نفسیاتی طور پر یہ قبائلی برافروختہ ہو گئے تھے اور مہذب دنیا سے ان کو نفرت ہو گئی تھی۔

جب انڈمان کی زمین پر بدیسی چہرے نظر آئے تو ان قبائلیوں میں پھر کھلبلی ہوئی اور کئی جھڑپیں ہوئیں۔ ان قبائلیوں نے بڑے طاقتور حملے کیے۔

لیکن انگریز ہار ماننے والی اور اپنا ارادہ بدلنے والی قوم نہیں تھی۔'

اس نے آنکھ ماری۔

'ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی ڈائرکٹروں نے اس بات پر زور دیا کہ جو انگریز ان جزیروں پر جاتے ہیں ان کی جان کی حفاظت کا مناسب انتظام کیا جائے۔ اسی زمانہ میں ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے برطانی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ حکومت نے جنگ آزادی کے جن رہنماؤں اور شرکا، کو قید کیا تھا انہیں تاجروں کے پروجکٹ کو پورا کرنے کے لیے بھیج دیا۔'

اس نے آنکھ ماری۔

'تو مسٹر خالد، یہ تھا پروجکٹ 'کالا پانی'۔'

وہ بے حد روانی کے ساتھ بولتا جا رہا تھا۔

پچھلی تین چار صدیوں میں یورپ میں ہوئے ان انقلابات اور تبدیلیوں اور ترقیوں میں صرف سائنٹفک ایجادات ہی نہیں ہوئی تھیں بلکہ زمینوں اور سمندروں میں بھیانک جنگیں بھی ہوئی تھیں بلکہ یورپ سے باہر کی دنیا میں دوسرے ملکوں اور جزیروں کو قبضے میں لینے کے لئے ہوئی تھیں اور جن میں ان چھوٹے چھوٹے ملکوں نے ان بڑی بڑی لڑاکو اور مشاق فوجوں والی حکومتیں کو چیر پھاڑ کر رکھدیا تھا۔

'خالد کے ذہن کے اندر انگریزی شوروم کے نہاں خانوں کا چلمن دھیرے دھیرے اٹھتا جا رہا تھا۔ انگریزی حکومت کے نام پر آخر یہ لوگ تھے کون جن کا ان ذمے داریوں سے کوئی لینا دینا نہیں تھا جن ذمے داریوں کو انگریزی عوام کے لیے انگریز سیاسی بائبل کی آیات سمجھتے تھے؟' وہ ان کے بارے میں اور جاننا چاہتا تھا۔

وہ لائبریری کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

وہ اب بال ٹھیک کرنا بھول چکا تھا۔

انگریزوں کا پورا کردار جو خالد کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا وہ تیزی سے بدلنے لگا۔

دوسرے دن وہ آدمی پھر ملا۔

مسٹر خالد، کہاں تک پہنچے؟ اس نے خصوصی دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔

'کچھ اور بتائیے۔'

وہ خالد کو لیکر لائبریری کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

'اب میں آپ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالکوں کا کردار بتاتا ہوں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سرکاری نہیں بلکہ اس کے برعکس ایک تجارتی تنظیم تھی۔ اس کے ڈائرکٹرس برطانیہ کے وہ تجارتی لوگ تھے جن کے پاس کافی کارخانے، زمینیں، دکانیں اور نوکر چاکر تھے۔ جن کے پاس کوٹھیاں تھیں۔ آرائش کے سامان تھے، بڑی آمدنی تھی، گھر میں بھی نوکر چاکروں کی کمی نہ تھی۔ جن کی بیویاں خوبصورت ترین لباس اور قیمتی زیورات سے مزین، ادب وفنکاری سے شوق رکھتی تھیں، چرچ میں جاتی تھیں، کلبوں میں ڈانس کرتی تھیں، اور ان کی کوٹھیوں کے بڑے بڑے ڈرائنگ روم یورپ کی اعلیٰ ترین پینٹنگ اور پورٹریٹ سے مزین ہوتے تھے جس میں مریم کا پورٹریٹ بھی ضرور ہوتا تھا۔'

اس نے آنکھ ماری۔

'یہ لوگ برطانوی جمہوریت کے روح رواں تھے اور تجارتی معاملات سے تعلق رکھنے والی پالیسیوں میں حکومت عملاً ان کا آلہ کار تھی۔'

اس نے آنکھ ماری۔

وہ مسکراتا جا رہا تھا اور بتاتا جا رہا تھا۔ بہت دنوں بعد اسے کوئی ملا تھا جو انگریزوں کی تہذیب اور علوم کے بجائے ان کے کردار کو سمجھنا چاہتا تھا۔

'وہ الیکشن میں خود حصہ لیتے تھے یا پھر امیدواروں کی مدد کرتے تھے۔ وہ جمہوری کتابیں چھپوانے میں مدد کرتے تھے تاکہ جمہوریت کے سرپرستوں کے طور پر حکومت پر ان کا اثر قائم رہے۔'

اس نے آنکھ ماری۔

خالد نے موجودہ ہندوستان کے اوپری تجارتی اور سیاسی طبقوں کے اس کردار کی روشنی میں اس آدمی کی ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جو اس وقت کے برطانوی معاشرے اور سیاستدانوں کے اصلی کردار کے بارے میں بتا رہا تھا اور خالد کو اپنے ہم عصر معاشرے کی روشنی میں اس معاشرے کی اور اس معاشرے کی روشنی میں ہم عصر معاشرے کی تصویر دکھائی دینے لگی تھی۔ اور تھوڑی دیر میں دونوں اس کے ذہن میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے کہ سنتے سنتے ایک ہی موضوع بن گئے۔

'اخبارات ناول اور رسالے خریدتے اور پڑھتے تھے۔ خوش لباس، ایک مخصوص قسم کی اعلیٰ آرائش کرتے تھے۔ ملنے جلنے کے طور طریقے، آداب محفل اور دوسری ضروری معاشرتی اصولوں کے قائل تھے۔ لیکن ان کے اس عیش کے لئے دانہ پانی کہاں سے آتا تھا؟'

اس نے خالد کو آنکھ ماری۔

'ان کی آمدنی کا ذریعہ وہ تجارت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے منسلک تھی۔'

اس نے آنکھ ماری۔

'انہوں نے ایک خود ساختہ بے حسی کا چادر اپنے اوپر اوڑھ کر اسے قبول کر لیا تھا۔'

وہ مسکرایا۔

اور خالد کی آنکھوں میں یہ دیکھنے کے لئے جھانکا کہ وہ سمجھ رہا ہے کہ نہیں۔

اس نے آنکھ ماری۔

اسی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنکروں کے انگوٹھے کٹوائے تھے۔

اس نے آنکھ ماری۔ اس کی پلکوں کے جھپکنے کے ساتھ ساتھ خالد کے ذہن کی کھڑکیاں کھلتی چلی گئیں۔

'یہ لوگ تاجر اور حاکم نہیں تھے، بہت خطرناک اور ظالم شکاری تھے۔ ان لوگوں نے جزائر انڈمان میں مجرم بستی کے نام پر جو آبادی قائم کی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا وہ ہندوستان کے مجرموں کو صرف وطن سے دور رکھنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ یہ تو صرف ان کے دکھانے کے دانت تھے۔ انہیں تو انڈمان کو اپنے فوجی مقصد کے لئے آباد کرنا تھا۔ اور پولس اور عدالتوں کو باقاعدہ خفیہ ہدایات تھیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سزائے کالا پانی دیکر بھیجا جائے۔'

'ایسا کسی سرکار کے لئے کیسے ممکن ہے۔' خالد دماغ کی بہت گہرائی سے چونک گیا۔

تو مسٹر خالد کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے دادا کو یونہی قتل کے الزام میں وہاں بھیج دیا گیا؟

اور پھر وائسرائے تک شکایت بھی تو ہوئی اور کسی نے نہیں سنی۔ کالا پانی ایک سرکاری پروجکٹ تھا۔ اور اس کے لئے پورے ملک سے قانونی جال کے ذریعہ لوگوں کا شکار کیا گیا تھا۔ بالکل ایسے جیسے تالاب سے مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔

'لیکن انگریز تو قانون پرستی کے لئے مشہور تھے۔'

'قانون پرستی کے لئے نہیں اپنے قانون کا خوف پیدا کرنے کیلئے مشہور تھے۔ اتنی دہشت بٹھا رکھی تھی کہ کسی میں ان کی خرابیوں کو دکھانے کی ہمت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے کو قانون پرست دکھانا چاہتے تھے اور اس بات کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

اسی لئے تو وہ امن کے دنوں میں قانون کی بالادستی کی بات کرتے تھے۔ اور اس وقت اپنے شکار کو قانونی جال سے پکڑتے تھے تاکہ کاروبار کے ساتھ ساتھ قانون کے شوروم کی چمک دمک بھی باقی رہے۔ اور پھر انہیں پوری دنیا میں اپنی جمہوریت کا ڈنکا بھی بجانا تھا۔

ان سب باتوں کے اندر سے جو خالد کلکتے کے آدمی سے سن رہا تھا اور جو مواد وہ دیکھ رہا تھا، اس کی گہری دلچسپی کچھ اس طرح تصویریں اخذ کرتی رہی جیسے کسی کے محبوب کا خط ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا گیا ہو اور وہ دن رات لگ کر ان ٹکڑوں کو تلاش کر کے از سر نو جوڑ رہا ہو۔ اور ان گمشدہ ٹکڑوں کو بھی ڈھونڈ لیتا ہو جو عام آدمی کی نظر میں آ ہی نہیں سکتے ہوں۔ اور اس طرح بالآخر تمام ٹکڑوں کو جوڑ کر اس نے اوریجنل خط کو تیار کر لیا ہو۔

'میں پھر آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا کوئی حکومت ایسا کر سکتی ہے۔ حکومتیں تو لازمی طور پر قانون سے چلتی ہیں۔' خالد کے لئے یہ انکشاف اتنا بڑا تھا کہ اسے اپنے اندر جذب کرنے سے پہلے اس سے متعلق ہر شبہ کو دور کر لینا لازمی ہو گیا تھا۔

وہ آدمی زور سے ہنسا۔ جیسے اب خالد کی سمجھ کا مذاق اڑا رہا ہو۔

خالد پریشان ہو اٹھا۔

اب خالد کو جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ تیزاب کی طرح اس کے دل کو کاٹنے لگا تھا۔ اس کی نگاہ پوری طرح جزائر انڈمان پر ٹک گئی تھی۔

یہ حکومت تھی۔

یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ وہ تو دراصل اس نظام کو سمجھنے کے لئے چلمنوں کے پیچھے جھانک کر اس کو دیکھنے کی سعی کر رہا ہے جو انسانی تاریخ کا سب سے بڑا درندہ ہے۔

اس سے پہلے موسیٰ، عیسیٰ، محمد، کرشن اور گاندھی۔ ہر ایک نے اس درندے کی جھلک دیکھی تھی۔

لائبریری میں یہ اس کا آخری دن تھا۔

❖❖

7

خالد نے کلکتے میں جو چند دن گزارے تھے ان دنوں میں ان میں وہ وہاں کی ہر قدیم سڑک اور ہر قدیم عمارت کو انگریزوں کے زمانے کے سائے کے طور پر ہی دیکھتا رہا۔ یہ وہ کلکتہ تھا جو اس عہد میں جب اس کے پردادا کالا پانی بھیجے گئے تھے، ہندوستان کا دارالسلطنت تھا اور یہیں سے سارے احکامات جاری ہوتے تھے۔ یہیں وہ ہائی کورٹ بھی تھا اور یہیں وہ وائسرائے بھی رہتا تھا جہاں سے ان کی اپیل مسترد ہوئی تھی۔ بھلے ہی اس زمانے میں انہوں نے اس کے پردادا کی درخواست رد کردی تھی لیکن آج وہ ایک آزاد شہری ہونے کے ناطے پورے معاملے پر خود ہی نظر ثانی کرسکتا تھا۔ وہ تو ہر اس بات پر نظر ثانی کرنا چاہتا تھا جو طاقت اور اقتدار کے نشے میں کی جاری تھی چاہے وہ اس کے پردادا کی سزا تھی یا خود اس کے اپنے مقابلے کے امتحان والے مقدمے کا انجام تھا یا اس کی نوکری کی درخواستوں کو نظر انداز کئے جانے کی بات تھی۔ وہ یہ محسوس کرتا ہوا کہ بحیثیت ایک شہری اس کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان تمام باتوں کا جائزہ لیکر خود اپنا فیصلہ سنا سکتا ہے یہ کام پوری ذمہ داری اور دیانتداری سے حقائق کی مکمل چھان بین کی بنیاد پر کرنا چاہتا تھا۔

کلکتے میں اس نے جو چھان بین کی، ہندوستان میں انگریزوں کے اولین دنوں کے بارے میں ان کی بو باس کو سونگھ کر جو اندازے لگائے اور لائبریری میں اس نے جو کچھ سنا اس کے بعد اب یہاں سے اس کا دل اچاٹ ہوگیا اور وہ اب سیدھے اس میدان کارزار میں پہنچنا چاہتا تھا جس کا سامنا اس کے پردادا نے کیا تھا۔

کالا پانی اب اس کے لئے ایک ایسی کہانی تھا جس میں اس کے پردادا خود ایک

سچ مچ کے کردار تھے اور اس طرح کالا پانی اس کے لئے ایک کہانی بھی تھا اور ایک مقدمہ بھی تھا۔ اور وہ بھی سوا سو سال پرانا ایک ایسا مقدمہ جو پورے شد و مد کے ساتھ آج بھی ایک مقدمہ کے طور پر زندہ تھا۔ اپنے وجود کی کم مائگی اور اپنے وجود کے چاروں طرف موجود اس بے پناہ طاقت والی چیز کے ادراک سے وہ ایک بار پھر لرز گیا۔ لیکن وہ ایک ڈھیٹ شکاری کی طرح اس پر نظریں گڑائے رہا جیسے اس کی نظر پھانسی کے کسی ایسے پھندے پر لگی ہو جو کچھ دیر بعد اس کے گلے میں پڑنے والا ہو۔ اس نے طالب علمی کے زمانے میں جمہوریت اور انسانیت کے حوالے سے بہت بڑی باتیں سوچی تھیں اور انتہائی یقین کے ساتھ اپنی تقریروں میں اس کا اظہار کیا تھا اور اس پر بہت تالیاں بجی تھیں لیکن حقیقی جنگ میں کیا ہوا تھا؟

اس نے محسوس کیا کہ اس طاقت کو گہرائی سے سمجھنے کے لئے انڈمان کے جزیروں کی دنیا اس کے ذہن کی بہترین آماجگاہ بن سکتی ہے۔ وہ جس جھیل میں پاؤں رکھ رہا تھا وہ کس طرح ایک دن اس کی موت کا سامان بن جائیگا اس کا اس کو سان وگمان بھی نہ تھا۔ لیکن وہ اتنا ضرور محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک ایسی گہرائی میں اتر رہا ہے جو اس کا مقدر ہے کیونکہ جس سول سوسائٹی کا وہ خواب دیکھتا ہے اس کا سامنا کن طاقتوں سے ہے اس سوال کا بہت کچھ جواب ان جزیروں میں ملے گا۔ کہاں وہ آزادی کے اتنے بلند خواب دیکھتا ہے اور کہاں آزادی کے نعرے لگانے والوں نے خود ہی قید و بند کا ایک ایسا عجائب گھر قائم کر رکھا تھا جس کے تصور سے اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

اس نے اچانک محسوس کیا کہ اس نے سول سوسائٹی کی آزادی کا جو خواب دیکھا تھا جو کچھ سوچا تھا وہ ابھی تک صرف اس کے تخیل کی تیز ہواؤں کا جھونکا تھا اور اب وہ پہلی بار اس جدوجہد کی تیاری کے لئے عملی قدم اٹھا رہا ہے یعنی اپنے خوابوں کی رنگینی سے ہٹ کر ان خوابوں کے دشمنوں کی تاریخ کو سمجھنے جا رہا ہے۔ اسے یہ بات اب اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی کہ اس نے جو بات عالمی سیمینار میں کہی تھی یہ اسی منزل کے راستے کا سفر تھا۔۔

❖❖

8

اس کے بعد خالد اس وادی پراسرار کی طرف کوچ کر گیا تھا جہاں سے وہ گھر لوٹا تو ضرور لیکن اس کی ہولناکی کے پنجوں سے وہ درحقیقت کبھی نکل نہیں پایا اور ایک کتاب کی تخلیق کرتے کرتے اس نے کچھ ایسا دیکھا کہ اس کتاب کی تکمیل کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ خیر اس کتاب کا وہ آخری نقطہ کون سا تھا یہ میں آپ کو آخر میں بتاؤں گا کیونکہ اس کو سمجھنے کیلئے خالد کی زندگی کے ان دنوں کو سمجھنا ضروری ہے جو اس نے انڈمان کے جزیروں میں گزارے۔

مجاور خیالوں میں ایسے کھو گیا جیسے پورا بحر ہند اس کی آنکھوں میں اتر آیا ہو۔

شام ڈھل گئی تھی۔ مزار پر ایک چراغ جل رہا تھا۔ اور اس کی لو ہلکی ہلکی چلتی ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی تھی۔

مجاور مدھم آواز میں بتاتا رہا۔ اس کے کمرے میں اس وقت بجلی نہیں ہونے کی وجہ سے ایک موٹی سی موم بتی جل رہی تھی جس کی لہراتی ہوئی لو کی روشنی سے مجاور کے بیان میں ایک بیک گراؤنڈ میوزک سی پیدا ہو رہی تھی۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی پراسرار لگ رہا تھا اور پوری فضا اس زمانے کا احساس دلا رہی تھی جب اس دنیا میں ابھی بجلی کی روشنی نہیں آئی تھی اور راتوں میں بجلی کے بلب نہیں بلکہ مشعل جلتے تھے۔

مجاور نے بغل میں رکھا ہوا ایک کمبل کھینچ کر اپنے اوپر ڈال لیا اور اس کے اندر پاؤں آگے تک پھیلا لئے۔ اس کی نظریں خلیج بنگال میں پہنچ گئیں۔

اب وہ تخیل کی بے انتہا گہرائیوں میں ڈوب کر خالد کی داستان اس طرح سنا رہا تھا کہ لگ رہا تھا کہ جیسے پورا منظر اس کے سامنے سے گزر رہا ہو۔

کالا پانی جانے کے لئے خالد نے مغربی بنگال کے دمدم ہوائی اڈے سے جزائر انڈمان کے شہر پورٹ بلیر کی فلائٹ لی تھی۔ ہوائی جہاز میں جا کر بیٹھنے سے پہلے اس نے اس کلکتے کی سڑکوں اور عمارتوں کو بھی دوبارہ بہت غور سے دیکھا تھا جو کلکتہ وہ دارالسلطنت تھا جہاں سے جزائر انڈمان کے لئے سارے احکامات جاری ہوتے تھے لیکن دمدم ہوائی اڈے سے جب بوئنگ نے پرواز کیا تو کالا پانی پوری طرح سے خالد کے ذہن میں چھایا ہوا تھا۔ اس جگہ پر جب اس کی نظر پڑے گی تو وہ جگہ کیسی دکھائی دے گی یہ جاننے کا اور اس کے منظر کے ابھرتے ہی جہاز کی کھڑکی سے اسے دیکھنے اور دیکھتے جانے کا اشتیاق اس کے دل میں بہت گہرائی سے جاگا ہوا تھا۔

جب جہاز آسمان کی بلندی پر آیا اور جہاز سے اناؤنس ہوا کہ ڈیڑھ گھنٹے لگیں گے تو وہ جزائر انڈمان کے خیال کو چھوڑ کر فی الوقت دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ جہاز جنوب کی طرف مڑا تو اس جانب صرف پانی ہی پانی دکھائی دی جبکہ شمال کی طرف ہگلی ندی اور کلکتہ شہر کے مناظر نیچے دیوار پر پھیلے کسی اٹلس کے نقشے کی طرح چھوٹے دکھائی دینے لگے۔

آسمان کی اس بلندی پر اسے گہرائی سے محسوس ہوا کہ کالا پانی کے قیدی کس لق ودق دنیا میں لے جائے گئے تھے، اور وہ بھی ان دنوں میں جب ہوائی جہاز نہیں تھا۔ ان قیدیوں نے ان دوریوں کی شدت کا سامنا کیسے دل وجگر سے کیا ہوگا، انھیں اپنا دل کیسا کڑا کرنا پڑا ہوگا۔ انہوں نے اس جلاوطنی سے کیسے جذباتی طور پر مصالحت اور ہم آہنگی پیدا کی ہوگی یہ سوچ کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے سامنے وہ سارے چہرے بھی ابھرتے چلے گئے جو اس زمانے میں وائسرائے رہے تھے یا اس کے ماتحت بڑے عہدوں پر کام کر چکے تھے اور جو صعوبتوں بھری اس دنیا کو وجود میں لانے کے ذمہ دار

تھے۔ ان میں بہتوں کی تصویریں اس نے کلکتے کی لائبریری میں دیکھی تھیں۔

ہر چند کہ وہ خود ہی اس وقت ہوائی جہاز کی بلندیوں پر تھا لیکن وہ دراصل اس منظر کو اپنے پردادا کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے سانس بھینچنے لگی اور اسکی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے جسے اس نے اپنے رومال سے صرف چھپالیا، اپنے اداس چہرے کو ساتھ بیٹھے مسافر سے چھپانے کے لئے۔ اور اس نے اپنا چہرہ بھی پوری طرح جہاز کی کھڑکی کی طرف موڑلیا اور نیچے سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

انتہائی بلندی پر پہنچنے کے بعد نیچے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا یعنی پانیوں کا ایک طویل سفر جو ہوائی جہاز کے لیے بھی ایک لمبا سفر تھا۔ ان پانیوں میں اس کے پردادا کو جانے والے جہاز نے کئی دنوں میں سفر طے کیا ہوگا۔ یہ ساری کہانیاں جو وہ اپنے پیاروں کو ضرور سنانا چاہتے ہوں گے ان کے ساتھ ہی مر چکی تھیں لیکن چونکہ وہ ان کا پوتا تھا وہ ان کہانیوں کو از سرِ نو دیکھ سکتا تھا۔

وہ پانی کے رنگ کو ان بیکراں دوریوں کو دیکھنے لگا تھا جہاں سمندر آسمان سے ملتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈیڑھ سو سال کی دوریاں گویا ختم ہوگئی تھیں۔ اس سمندر میں تو اس وقت بھی ایسا ہی پانی، لہریں، یہی ہوش ربا وسعتیں تھیں جواب ہیں۔ اسے ایک چیز تو ایسی دکھائی دے رہی ہے۔

ایک دن اس نے کلکتہ کے ہوٹل کی بالکونی سے گہری رات میں بے چینی کے عالم میں کمرے سے باہر آکر کھلی فضاؤں میں جھانکا تھا تو اس کی نظر درختوں اور عمارتوں سے کافی اوپر چاند پر پڑی تھی۔ تب بھی اسے یہی خیال آیا تھا کہ یہ چاند بھی بالکل ان دنوں کا تھا، اس کے پردادا نے جب کالا پانی میں چاند دیکھا ہوگا تو یہ بالکل اسی طرح کا دکھا ہوگا۔ اس چاند نے زمینوں اور سمندروں میں ہوئی کتنی بھیانک جنگوں کو دیکھا ہوگا۔ انسانوں کو تنہا دنیاؤں میں آگے بڑھتے، لڑتے مرتے اور تباہ ہوتے ہوئے۔

وقت نے تو صرف انسانی زندگی اور شہروں کی بناوٹ میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی کی تھی ورنہ زمین و آسمان اور سماج و حکومت کی ہزاروں لاکھوں چیزیں بالکل ویسی کی ویسی اور وہی کی وہی تھیں جیسا اس کے پردادا کے زمانے میں تھیں۔ یہ سب اس کے اندر، اس کے ذہن میں، اس لیے ساتھ جا رہے تھے کہ وہ اس راستے سے وہاں تک پہنچنے میں ان مناظر کا سیڑھیوں کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ کلکتے میں اکتانے کے بعد اس نے چاند کو دیکھا تھا، انڈمان میں اکتانے کے بعد انھوں نے چاند کو دیکھا ہوگا۔ انھیں یہ بھی خیال آیا ہوگا کہ اسی وقت ان کے گاؤں کے کھلیانوں میں لیٹے ہوئے ان کے عزیز اور ہم وطن بھی اسی چاند کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اس سے ان کے دل میں اپنے ہم وطنوں اور عزیزوں سے ایک خاص طرح سے جڑے ہونے اور اس حوالے سے ہزاروں میل کی اس دوری کو مٹا دینے کا احساس بھی جاگا ہوگا۔

اچانک ایک آواز پر اس کا دھیان ٹوٹا۔ جہاز میں اعلان ہو رہا تھا۔

اب آپ اپنی سیٹ بیلٹ کھول سکتے ہیں۔

اور اس نے دراصل اپنے ذہن کے سارے بیلٹ کھول دئے۔ ہر چند کہ وہ ایک ہوائی جہاز میں جا رہا تھا لیکن ذہنی طور پر وہ اس وقت انیسویں صدی میں بیٹھا ہوا تھا اور کھڑکی سے باہر اسے اسی صدی کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔

جس رفتار سے جہاز رن وے پر دوڑا تھا وہ تو اس نے دیکھا ہی تھا اس بلندی پر جہاں ہوا کا وزن کم تھا اور اس کی مزاحمت بھی کم ہوگئی یہاں اڑتے رہنے کے لیے جہاز کی رفتار اور بڑھائی گئی ہوگی اور اس رفتار سے چلنے کے بعد ایک گھنٹہ پچاس منٹ اس جزیرے میں داخل ہونے میں لگیں گے اس کے بعد وہ اس جزیرے پر چل رہا ہوگا جہاں اس کے پردادا قید کے دنوں میں رہ چکے تھے۔

اس کی نظروں کے سامنے آج کے اخبار پڑے تھے اور ساتھ ہی ایرلائنس کا

ایک انتہائی دیدہ زیب رسالہ رکھا تھا۔ اس نے میگزین نکالا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ناشتہ لگایا جانے لگا۔ وہ ہڑبڑاہٹ میں ہی بریڈ میں مکھن اور جام لگا کر کھاتا رہا پھر کافی پی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد گھڑی دیکھی ابھی پورا سوا گھنٹے باقی تھا اب کھڑکی کے باہر یک رنگی سی چل رہی تھی۔ کبھی کھلا منظر آتا اور کبھی نیچے چمکتے ہوئے بادل دکھنے لگتے۔ لیکن اس میں اب کوئی ندرت نہیں تھی۔ اس نے دور تک دیکھنے کی کوشش کی کہیں کوئی ساحل نہیں دکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جزائر انڈمان سے پہلے صرف سمندر ہی سمندر تھا۔ پانیوں کی اس عظیم وسعت کے سناٹے میں کچھ قیدیوں نے کیسے اپنے معمولی بیڑے دوڑانے کی کوشش کی تھی۔ اس پر سوچتے سوچتے اس کے اوپر انسانی روح کی پراسرار عظمت رونما ہونے لگی۔ کمزور انسان کو بھی جب کوئی طاقت چنوتی دیتی ہے تو وہ کہاں تک سوچ سکتا ہے یہ اس کی مثال تھی۔ اسے ان لوگوں کی ہمت اور جرأت پر رشک آیا پھر اسے اس صورت حال کا خیال سوال بن کر پریشان کرنے لگا کہ جس نے انہیں پھر پھڑا کر اس طویل سمندر سے ہو کر نکل بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ اس سے پہلے کتنے دنوں تک انہوں نے سوچا ہوگا؟ کیا کیا پلان بنائے ہوں گے؟ کیسے کیسے اپنے ذہن میں موجود آدھے ادھورے علم کو سمندری بیڑا بنانے اور سمندر کا خطرناک سفر طے کرنے کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ پھر اتنے جری اور بہادر لوگ انگریزوں کے چنگل میں گرفتار کیسے ہو گئے۔

پھر اسے گرفتار کرنے والوں کے ذہنوں کی وسعت کا خیال آیا۔

اپنے ملک کے لوگوں کی یہ تاریخ جو اس کے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہی تھی اور جس پر اس نے پہلے کبھی یکسوئی سے دھیان نہیں دیا تھا اس تاریخ نے اب اس کو اپنے اندر جکڑنا شروع کر دیا تھا۔

ہندوستان جیسا بڑا ملک انگریزوں جیسی چھوٹی قوم کے چنگل میں اتنی بری طرح کیسے گرفتار ہو گیا یہ ایک پیچیدہ سوال تھا اور اس کا جواب جاننے کے لئے انگریزوں کی آمد ان

سے لڑی گئی جنگوں اور ان کے کردار کا گہرا مطالعہ ضروری تھا کیونکہ یہ انگریز آج بھی نہ صرف دنیا میں تھے بلکہ اسی مقام پر تھے جہاں پہلے تھے۔ دیکھنا تو یہ تھا کہ ہندوستان بدلا تھا یا ہندوستان بھی وہیں تھا جہاں وہ پہلے تھا۔ اگر دونوں وہیں تھے تو یقیناً کالا پانی بھی وہیں ہوگا جہاں پہلے تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سارا کھیل بیہوشی کی دوا کی طرح ذہنوں پر پڑے ہوئے پردوں کا تھا؟ کس کے بل بوتے پر انہوں نے نہ صرف جنگیں جیتیں بلکہ پشت در پشت حکومت بھی کرتے رہے۔ وہ کون سے طاقت تھی جس نے ان ہندوستانیوں کو وفادار بنا کر رکھا جو انگریزی حکومت کے ستون بن کر اپنے ہی ملک کے لوگوں کا خون چوسنے میں انگریزوں کی مدد کرتے رہے؟ اگر یہ تب ممکن تھا تو یہ ہر زمانے میں ممکن ہے۔

کیا عام ہندوستانی ایک مختلف دنیا میں تھے۔ کیا ان کے ذہن میں جنگ اور حکومت کے کردار کے بارے میں جو تصورات تھے' جو مشرق کی تہذیبی زندگی سے وراثت میں ملے تھے' مختلف تھے۔ اور کیا اسی وجہ سے وہ ان نئے حاکموں اور ان کے کردار کو کبھی سمجھ نہیں پائے۔ آسمان کی اس بلندی پر اس کے یہ خیالات بھی پوری بلندی کے ساتھ جگمگا کر ابھرنے لگے تھے اور اس جگمگاہٹ میں اسے محسوس ہوا کہ نیچے اسی طرح کے عالمی نوعیت کے سیکڑوں سوالات ایک دوسرے میں گڈمڈ حالات میں موجود ہیں اور آج عوام کی زندگی انہیں والانوں میں پھنسی ہوئی ہے۔

یہ سوالات اس کے ذہن میں گونجتے رہے، اسی بیچ سامنے سے جزیرے نمودار ہونے لگے۔ پھر ایک شہر آبادیوں کے ساتھ دکھائی دینے لگا۔ کیپٹن کے کیبن سے سیٹ بلٹ لگانے کی ہدایت نشر ہوئی۔

تو یہ تھے وہ جزیرے۔ خالد کی نظر چاروں طرف پھیلے لامتناہی سمندر کے درمیان ابھرتے ہوئے ہرے بھرے جزیروں پر پڑی۔

وہ ان جزیروں کو ایسے دیکھنے لگا جیسے کوئی سرجن اس مریض کو دیکھ کر اپنا ذہن تیار کرنے لگتا ہے، جس کا اسے آپریشن کرنا ہوتا ہے۔

9

پورٹ بلیئر کے ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد وہ سیدھے اس ٹورسٹ ہوم میں گیا جہاں اس نے انٹرنیٹ پر ایک کمرہ بک کرا رکھا تھا۔ وہ ٹورسٹ ہوم سمندر کے کنارے کچھ بلندی پر واقع تھے۔ راستے بھر وہ یہی اندازہ لگاتا رہا کہ اس جزیرے میں اس کے پردادا کا قبرستان کہاں ہوسکتا ہے۔ اپنے دادا کی یادوں کے ساتھ خود کالا پانی کا تصور اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پورے جزیرے پر کالا پانی کے آثار جابجا دکھ رہے ہونگے لیکن یہاں اسے ایسا کچھ بھی نہیں دکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل کچھ ڈوبنے سا لگا تھا لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیا کہ وہ تحقیق کے ذریعہ سب کچھ تلاش کر لیگا۔

ٹورسٹ ہوم کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس نے شعوری طور پر اس حقیقت کو محسوس کیا کہ وہ اس جگہ آچکا ہے جس کو اسے سمجھنا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں یہ طے کرنے لگا کہ اس جگہ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے وہ کن کن چیزوں میں دلچسپی لے۔ اسے آج کے پورٹ بلیر میں دلچسپی نہیں تھی کیونکہ یہاں جو کچھ آج تھا ویسا ہر جگہ موجود تھا۔ اسے سیلولر جیل میں بھی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ یہ کالا پانی کے اس دوور کے بہت بعد وجود میں آیا تھا جس دور میں اسے دلچسپی تھی۔ پھر بھی مچھلی مارنے والے کانٹے کی طرح اپنی نظروں کو گہرائی میں ڈالنے کے لئے وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور کاریڈارسے ہوتا ہوا اس نے ٹورسٹ ہوم کے پیچھے جا کر دیکھا۔ اس منظر میں اس زمانے کی بیشمار کہانیاں پنہاں تھیں۔ اور عہدِ رفتہ کی انہیں کہانیوں کے بیچ، سامنے سمندروں میں جہاز کھڑے تھے۔ کشتیاں چل رہی تھیں۔ ادھر اس کے آگے چاروں طرف مختلف بلندیوں پر عمارتیں تھیں جن میں کچھ اینٹوں کی تھیں اور کچھ لکڑی سے بنی

ہوئی تھیں۔ ٹورسٹ ہوم کے نچلے حصے میں سمندر کے پانی سے محض چند فٹ کی دوری پر دو جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جو انتہائی دیدہ زیب تھیں۔ اس میں چار پانچ سفید چہرے والے غیر ملکی سیاح مرد عورت اور بچے باہر نکل کر اس جگہ کا نظارہ کر رہے تھے۔

خالد ان کے پیچھے پرانے کالا پانی کو ڈھونڈتا رہا لیکن کسی ایسی چیز کا نام ونشان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہاں آتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ پورٹ بلیئر میں جا بہ جا ان جگہوں پر تختیاں لگی ہوں گی جہاں لوگوں کی قبریں بنی تھیں یا پرانی عمارتیں محفوظ کر کے رکھی گئی ہوں گی جن سے کالا پانی کے دنوں کی کوئی یادوابستہ ہوگی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے لوگ دنیا کو دیکھنے سے کتراتے ہیں۔ 'لوگ جب زندگی کی تلخ حقیقتوں کو دیکھنے کی اذیت کو برداشت نہیں کر پاتے تو اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں اور زندگی کو نئے رنگوں میں ڈھال کر اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہتے ہیں کہ اپنے دکھوں پر قابو پانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

کئی لوگوں سے اس نے دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کچھ نہیں بتا پایا۔
لیکن اس جگہ کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اس لئے اسے صاف صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت اس جگہ کی محض اوپری سطح کو دیکھ رہا تھا جس میں ایک عجیب اور حیرتناک تاریخی اور سماجی دنیا پوشیدہ تھی۔ یہ جگہ جو آج تفریح کا مرکز بن گئی تھی اس کے پیچھے خونی داستانیں تھیں اور اسی خون آشام ماحول میں جینے کی وہ کوششیں تھیں جو آج کے لوگوں کے لیے چونکانے والی تھیں۔

اسے معلوم تھا کہ یہاں کی آبادی کے ہندو اور مسلم بلا تکلف آپس میں شادی کرتے تھے۔ یعنی زندگی نے ان جزیروں میں مذہب پر اپنی برتری قائم کر رکھی تھی لیکن کوئی بھی شخص یہ نہیں بتا پا رہا تھا کہ ایسا ماحول کیسے پیدا ہوا۔ جب کہ یہ اس ہندوستان کا حصہ تھا جس میں ایسی شادیاں بغاوت کے بغیر ممکن نہیں تھیں۔ یہاں کے سماج کے اس رویے اور

فیصلہ کے پیچھے ضرور کچھ نہ رہا ہوگا۔ ضرور لوگوں کے کوئی ایسی بات دریافت کی جسے انہوں نے اس وقت بھی اپنایا اور آج بھی۔ انہوں نے اس روایات کو جینے سے انکار کیا تھا۔ خالد کے لیے دلچسپ بات یہ تھی کہ کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کب اور کیوں ہوا تھا۔

چونکہ اس کے ذہن میں اپنے پردادا سے متعلق ایک سوال اٹکا ہوا تھا کہ انہوں نے یہاں شادی کی تھی یا نہیں اور اگر کی تھی تو اس شادی سے کوئی اولاد تھی یا نہیں اس لئے اس کے لئے یہ بات دلچسپ پہلو رکھتی تھی۔ اب اس میں ایک نیا سوال یہ آ ملا تھا کہ اگر انہوں نے شادی کی تھی تو کس سے کی تھی اور اب تو یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی اولاد ہندوؤں کی آبادی میں شامل ہو۔ لیکن یہ بات اب اس پر کھلنے لگی تھی کہ یہاں بھی زندگی ایسے مقام پر آ پہنچی تھی جہاں آزادی کے سوال کے سامنے یہ تمام چیزیں بے معنی ہوگئی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایسے ہی بامعنی تجربوں کی تو اس کو تلاش تھی۔

بالکونی سے وہ واپس آگیا اور ٹورسٹ ہوم کے کاؤنٹر پر آیا۔ وہ ایک ادھیڑ آدمی بیٹھا کچھ حساب و کتاب لکھ رہا تھا۔ اس کے قریب جا کر خالد سہیل نے اس سے دریافت کیا۔

یہاں کے قابل دید مقامات کو دیکھنے کی کیا سہولیات مہیا ہیں۔

'یہاں کی جیل کا ریکارڈ کہاں مل سکتا ہے۔'

'سیلولر جیل میں جیلر کے یہاں ملے گا۔ پھر اس نے کچھ کچھ سوچ کر پوچھا 'آپ کو کب کا ریکارڈ چاہئے؟'

'اس وقت کا جب قیدی وائپر آئی لینڈ میں رکھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں میرے ایک دادا کو کالا پانی کی سزا ہوئی تھی۔'

'اوہ۔ اس کا ریکارڈ آپ کو نہیں مل پائیگا۔ یہاں ایک بڑا خطرناک جیلر ہوتا تھا ڈاکٹر واکر۔ اس نے جانے سے پہلے سارے ریکارڈ جلوا دئے تھے اور رپورٹ لکھ دی تھی کہ ریکارڈ روم میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے بعد کے زمانے کے ریکارڈ بھی بارش کے پانی میں سڑ کر ختم ہوگئے۔ ایک بار یہاں ایک ریسرچ اسکالر آئے تھے، کلکتہ سے۔ میں ان کو ساتھ لیکر سیلولر جیل گیا تھا۔ وہاں صرف کافی بعد کے زمانے کے کچھ ریکارڈ تھے۔ وہ بھی بہت بوسیدہ ہوگئے تھے۔ الٹنے سے ٹوٹ رہے تھے۔

اسے بہت مایوسی ہوئی۔

'وائپر آئی لینڈ یہاں سے کتنی دور ہے۔ وہاں کیسے جایا جاسکتا ہے۔'

'سنا ہے، ہفتے میں ایک چھوٹا بوٹ وائپر آئی لینڈ جاتا ہے۔ وہاں پرانا پھانسی گھر ہے لیکن اب وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ کھنڈر ہوگیا ہے۔'

'اور ماؤنٹ ہیریٹ کہاں ہے؟'

'ماؤنٹ ہیریٹ وہ سامنے رہا' سامنے دھند میں ڈوبا ہوا ایک کالا سا اونچا پہاڑ دکھائی دے رہا تھا۔

''یہاں جن لوگوں کو پھانسی دی گئی ان کی قبریں ہیں؟''

اس کے بارے میں آپ کو ایک آدمی بتائے گا۔ وہ اس وقت کے جلاد کی اولاد میں سے ہے۔ اکیلا آدمی بچا ہے۔ وہ جنگلی گھاٹ میں رہتا ہے۔

خالد اس کا پتہ لیکر جنگلی گھاٹ گیا۔ جن لوگوں سے اس نے اس آدمی کا پتہ پوچھا ان کے تاثرات سے انداز ہوا کہ لوگ اس خاندان سے نفرت کرتے تھے، حالانکہ، خالد نے

سوچا، وہ تو صرف مزدوری کرتے تھے۔

لیکن یہ خیال آتے ہی اس کے ذہن میں ایک بڑا سوال آ کھڑا ہوا۔' کیا یہ مزدوری جائز تھی۔' اس نے پھر اس سوال کو ذہن سے جھٹک دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس آدمی کا مکان بالکل الگ تھلگ تھا اور صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں شاید ہی کوئی آتا جاتا ہوگا۔

اس سے مل کر خالد نے اپنے آنے کا مقصد بتایا کہ وہ اس کی مدد سے وائپر آئی لینڈ کے پھانسی گھر کو دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ آدمی تیار ہو گیا۔ وہ پھانسی گھر پہنچے۔ خالد کو لیکر وہ پھانسی والی کوٹھری میں گیا۔ اندر غالباً نمونے کے طور پر پھانسی کا پھندا لٹک رہا تھا۔ خالد نے انتہائی انہماک سے در و دیوار کو دیکھا۔

پھانسی سے پہلے آخری خواہش پوچھی جاتی تھی کیا۔

یہ سب کہانیاں ہیں۔ دراصل پھانسی کی سزا کسی نافرمانی یا گستاخی کی وجہ سے دی جاتی تھی۔ پھانسی کی سزا سنانے کے بعد تو آدمی مر جاتا تھا لیکن افسروں کا غصہ سرد نہیں ہوتا تھا اس لئے عموماً اس قیدی کو یہاں منہ پر ڈنڈے سے مار مار کر اس کی جان لی جاتی تھی۔

جب یہ سزا دی جاتی تھی تو پورا جیل چیخ سن کر کانپ جاتا تھا۔ انگریز صرف کہنے کے لئے قانون پرست تھے۔

لیکن اس غیر قانونی حرکت کے خلاف تو شکایت کی جا سکتی تھی۔

یہی تو بات ہے کہ' معاف کیجئے گا' ہم خوابوں کی دنیا میں رہنے سے باز نہیں آتے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جن سے شکایت کی جا سکتی تھی ان کو یہ سب معلوم نہیں تھا۔ یہ سب

منافقت کا کھیل ہوتا ہے۔ انگریزوں کی سرکار پوری طرح ڈھکوسلے پر قائم تھی۔ ان کے دکھانے کے دانت اور تھے اور کھانے کے اور تھے۔ میرے پردادا سے جو یہاں کے جلاد تھے صرف دست خط لے لیا جاتا تھا۔ جن کو وہ بچانا چاہتے تھے ان ک کو فرار کر دیا جاتا تھا۔ سرکار کا مطلب ہوتا ہے سرکار۔' اس نے ایک ہاتھ نچا کر مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

' اور جن کو مارنا چاہتے تھے ان کو کچل کچل کر مارتے تھے۔'

پھانسی والی کوٹھری سے منسلک ایک اندھیری سے کوٹھری تھی۔ وہ خالد کو لیکر اس میں سیڑھیوں سے اتر گیا۔ اس کے آگے سامنے کی دیوار میں بغیر زینوں کی ڈھلان تھی جس کے نچلے سرے سے آگے سمندر کا پانی چمک رہا تھا۔

' مرنے کے بعد انہیں اسی سرنگ میں بہا دیا جاتا تھا۔'

خالد کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے دل میں ایک شدید اندیشہ پیدا ہوا۔ اس نے جیسے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

' یہاں مسلمانوں کا کوئی قبرستان ہے۔'

' اب تو ہے لیکن اس وقت تو قبر یا قبرستان جو کچھ تھا یہی تھا۔ اس نے سرنگ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔' آگے انہیں مچھلیاں اور چیل کوے کھا جاتے تھے۔

خالد کے جسم کا سارا خون جیسے سرد ہو گیا۔ اس نے اس لمحے کی تاب نہ لا کر زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اپنے پر قابو پاتے ہوئے اس نے سرنگ کے سرے کی طرف دیکھا۔ خالد سہیل کو لگا جیسے یہ سرنگ اور اس کے آگے کا سمندر' یہ سب' ایک الگ ہی قسم کا قبرستان ہوں جو ان کے لئے بنائی گئی ہو جن کی پہچان ختم ہو چکی تھی۔

پھر پتہ نہیں کہاں سے اس کے اندر ہمت پیدا ہوئی اور اس نے لگاتار اس جگہ کے کئی فوٹو لئے۔ کبھی سرنگ کے، کبھی سمندر کے اس پانی کے جو نیچے چمک رہا تھا، کبھی چھت کے اور کبھی فرش کے۔ ادھر سے نکلتے ہوئے اس نے اس پھانسی والی کوٹھری کی بھی انگنت تصویریں لیں۔

جب وہ تصویریں لینے کے بعد تھما تو اس کو اس آدمی نے آگے بتایا جیسے یہ بات انکی رہ گئی تھی۔

ہاں' البتہ شیر علی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔

بزرگوں سے سنا ہے کہ انگریز ان کے ساتھ بڑے ادب سے پیش آئے تھے۔ یا تو اس کے پیچھے ان کی کوئی سیاست تھی کہ وہ قیدیوں سے ڈرے گئے تھے یا پھر ان کے اوپر یہ رعب چھا گیا تھا کہ یہ وہ آدمی تھا جس نے ان کے اتنے بڑے سربراہ کو مارا تھا۔ میرے پردادا نے انہیں وضو کے لئے پانی دیا تھا۔ انہوں نے پھانسی سے پہلے نماز پڑھی تھی۔

میں تھوڑی دیر یہاں بیٹھ لوں۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پردادا کو بہت یاد کیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے۔ اسے دیکھ کر وہ آدمی بھی سمجھ گیا کہ اس جگہ سے خالد کا کوئی خاص تعلق ہے۔ خالد کو بے حد غمزدہ دیکھ کر اسے بھی اس زمانے کی کہانیاں یاد آ گئیں اور وہ بھی مغموم ہو گیا اور چپ چاپ خالد کو بغیر چھیڑے ہوئے کھڑے کھڑے اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ باہر اچانک بادل آ گئے تھے اور بارش ہونے لگی تھی۔ بارش کے ماحول نے جیسے خالد کے غموں کو دھو کر سمندر کے انہیں پانیوں میں بہا دیا۔ بارش ختم ہوئی تو دونوں وہاں سے چل پڑے۔ خالد اب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔ سامنے ماونٹ ہیریٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چلتے چلتے یوں ہی خاموشی کو توڑنے کے لئے اس آدمی سے پوچھا۔

اور ماؤنٹ ہیریٹ پر کیا ہوا تھا؟

ماؤنٹ ہیریٹ وہ رہا۔

اس نے سامنے کے سب سے اونچے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا لیکن سمجھ نہیں پایا کہ خالد اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔

'وہیں تو لارڈ میو کو مارا تھا شیر علی نے۔ اسی پہاڑ کی جڑ میں۔ اچانک شیر کی طرح اندھیرے میں پہنچ گیا تھا۔'

کیوں مارا تھا؟

یہ تو آج تک کوئی نہیں سمجھ پایا کہ اچانک اسے کیا سوجھی۔ بہت شریف آدمی تھا۔ کابل کا پٹھان تھا لیکن دماغ میں گرمی بالکل نہیں تھی۔

'بہت سوچ بچار کے مارا تھا؟'

'سوچا تو ہوگا۔ سنا ہے سوچتا بہت تھا۔ سوچتے سوچتے دماغ پر کوئی بات چڑھ گئی ہوگی۔'

'ایسی کیا بات ہو سکتی تھی۔'

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

❖❖

10

سیلولر جیل میں جا کر اس نے پوری تسلی کر لی۔ وہاں بھی کوئی ریکارڈ نہیں ملا۔

وہ اپنے والد کو کیا بتائے گا؟ شروع میں تو اسے پریشانی ہوئی لیکن اب اس نے سوچ لیا کہ وہ اپنے والد کو میر علی کی پوری کہانی سنائے گا یعنی اس جگہ اور اس کی تاریخ اور میر علی کے زمانے کی قیدیوں کی زندگی اور حالات کی پوری تصویر وہ یہاں سے لے جائے گا اور میر علی کے مقدمے پر پوری زندگی کام کر کے اس مقدمے کو پوری دنیا میں پھیلائے گا تاکہ پورے کالا پانی کو ہی میر علی کی قبر کے طور پر یاد کیا جائے۔ کیونکہ ریکارڈ مٹے تھے اور میر علی کی لاش مٹ گئی تھی لیکن نہ تو یہ جگہ مٹی تھی نہ ہی وہ سمندر مٹا تھا۔

وہ ذہنی طور پر اس بات کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا تھا کہ وہ اس بات کو پوری طرح پھیلا کر دیکھے کہ میر علی کا پورا وجود یہیں کہیں گم تھا۔ خالد کا جی چاہا کہ وہ یہاں جتنے دنوں کے لئے بھی آیا ہے اتنے دنوں کے لئے وہ یہاں دل و جان سے آباد ہو جائے۔ بالکل ایسے جیسے وہ اس کے اجداد کی پرانی بستی ہو۔ اور سچ بھی یہی تھا کہ یہ جگہ بھی اس کے پردادا کی بستی رہ چکی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے دنوں میں کیا کیا دیکھا ہوگا، کیا کیا سوچا ہوگا، کیا کیا باتیں کی ہونگی وہ یہ سب کچھ یہاں رہ کر محسوس کرنا چاہتا تھا۔۔

اب خالد زبانی کہانیوں، کتابوں، رسالوں، ریکارڈس، تصاویر، مقامات، پرانی عمارتوں کے کھنڈروں اور پینٹنگز سے لے کر رسومات اور روایات، رشتوں کی نوعیت، اقدار، زبان، الفاظ اور روزمرہ سب میں ان کو ڈھونڈنے لگا۔

اس نے سیلولر جیل کے میوزیم میں وہ مشینیں دیکھیں جن کو قیدیوں کو سزا دینے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کا استعمال کتنے کے قتل میں سزا یافتہ اس کے پردادا پر بھی کیا گیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ اسے وہ مشینیں اپنے پردادا کی جگہ خود اپنے جسم پر چلتی ہوئی محسوس ہوئیں جس کے ناقابلِ برداشت درد کو محسوس کر کے ایک بار تو اس کی چیخ نکل گئی۔

اس دن کے بعد لگاتار بارش کی جھڑیوں میں گزرے کئی دن، صبح اور شام وہ چلتے چلتے آ کر کسی جزیرے کے اوپر ٹھٹھک جاتا اور اپنے پیروں کے نیچے کی کنکریلی زمین سے لے کر سامنے کے سمندروں اور آسمانوں میں جھانکتا رہتا۔

وہ اب بآسانی سن سکتا تھا اس شور شرابے کو جو مجرموں کو گھسیٹنے، زدوکوب کرنے، چلانے اور پھانسی پر لٹکائے جانے سے پیدا ہوتا تھا۔ یہ لوگ یہاں برسوں تک رکھے جاتے تھے۔ زیادہ تر پوری زندگی یہیں کٹ جاتی تھی۔ بیشتر اپنے وطن کے عزیزوں کو یاد کر کے اداس ہوتے یا رویا بھی کرتے تھے اور خود ہی اپنی سسکیوں کو سنتے تھے۔ خالد سہیل تاریخ کے اس دور کی بو باس میں اتنا ڈوب گیا۔ اب اکثر ان کے لیے اس کے اندر رونے کی خواہش پیدا ہوتی۔ وہ ان لوگوں کے ماضی کے درد میں شامل ہو کر اپنے اور ان کے دکھوں کی مشترکہ کہانی کو لکھ کر اسے امر کر سکے گا تاکہ ان کی اگلی نسلیں جدوجہد کریں اور ان قوتوں کو پہچان سکیں اور اپنے زمانے میں لٹکتے ہوئے چلمنوں کو سرکا کر اپنی حکومتوں کے چہروں کا کامیاب تجزیہ کر سکیں۔

ایک دن وہ پورٹ بلیئر کی لائبریری میں گیا۔ وہاں ان جزیروں سے متعلق ایک الگ گوشہ بنایا گیا تھا جس میں یہاں کی موجودہ زندگی سے ماضی بعید کے آثار کی نمائندگی کرنے والی کتابیں اور تصویریں لگی تھیں۔

وہ ایک کتاب لیکر پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس میں ان جزیروں پر انگریزوں کی اولین

آمد کا ذکر تھا۔

پہلی بار ملٹری ان جزیروں میں پہنچی تھی تو ان فوجیوں نے قبائلیوں پر بلا وجہ محض ان سے خوفزدہ ہو کر اور ان کو خوفزدہ کرنے کے لئے اپنے اسلحوں کا بے دریغ استعمال کیا۔ اپنے روایتی تیر کمانوں سے قبائلی ان کا بھلا کیا مقابلہ کرتے۔ اس سے قبل کہ انہیں رائفل کی گولیوں کی طاقت کا اندازہ ہوتا بے شمار قبائلی ڈھیر ہو گئے۔ قبائلیوں نے اپنے شہیدوں اور زخمیوں کو اپنے کندھوں پر ڈھویا اور اپنی پسپائی پر بے بسی کے آنسو بہاتے ہوئے انہیں جنگل کے دشوار گزار راستوں سے اندر محفوظ مقامات پر لے گئے۔ ان قبائلیوں کو پہنچانے والے درخت اپنی محبوب آبادی کی اس تباہی پر زار و قطار روتے رہے اور یہ پورا جزیرہ غم کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ ان آبادیوں کی باہر سے آئے ہوئے فوجیوں کو اس سے زیادہ کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مارے جائیں۔ اپنی جگہ خالی کر دیں اور سپاہیوں کی رائفلوں کے مشق کا نشانہ بنیں۔ نتیجے بے گناہوں پر مظالم کی یہ داستان مقامی آبادی کی تاریخ کا حصہ بن گئی۔ قبائلی بیوائیں اور قبائلی یتیم بچے اپنی چھاتیاں پیٹتے رہ گئے۔

کتابوں میں ان قبائلیوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا تھا گویا ان کے سینوں میں انسانی دل نہیں تھے۔

کیا اس کے پیچھے بھی کوئی اسکیم تھی؟

اس کے اندر اچانک ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا۔

کہیں وہ بھی جرواقبائلیوں کی طرح تو نہیں ہے؟؟

آزاد، معصوم، غیر مضر اور اس کے باوجود پیچھے ڈھکیلا جاتا ہوا۔

اس کی زمین بھی تو اسی طرح چھینی جا رہی ہے۔

اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کر ان تصویروں کو دیکھنے لگ جو دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ انہیں تصویروں میں اس کی نظر ایک پینٹنگ پر پڑی جس میں ایک قبائلی عورت تھی جس کی گود میں ایک بچہ تھا، ایک مرد کو جس کی نگاہیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں اس پر تھوک رہی تھی۔ اس پینٹنگ کا مطلب تھا کہ اس کے پیچھے کوئی کہانی تھی۔

غدار گوپی

اور

یک طرفہ مورخ

اس نے لائبریری کے اس گوشے کی نگرانی کرنے والے گائڈ سے اس کے پس منظر کے بارے میں دریافت کیا۔

اس نے بتایا کہ ایک بار مجرموں کے ایک بھاگے ہوئے گروہ پر جو یہاں کے جیل سے فرار ہو کر ان کے علاقے سے گزر رہا تھا' جرواقبائلیوں نے حملہ کیا اور سب کو گھائل کر کے مار دیا لیکن ان میں ایک زندہ بچا تھا۔ جب قبائلی قریب آئے تو اس نے جروا سردار سے ہاتھ جوڑ کر جان بخشی چاہی۔ سردار نے سب کی تلاشی لی کہ ان کے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں تھا۔ یہ اندازہ ہونے پر کہ ان کے پاس کوئی خطرناک ہتھیار نہیں تھا' سردار نے اس زندہ بچے ہوئے آدمی کی جان بخش دی۔ اسے ساتھ لے گیا حتی کہ کچھ دنوں کے بعد اس نے اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی لیکن اس کے بعد اس آدمی سے بھی ان کو شدید صدمہ پہنچا۔ جب جرواقبائلیوں نے انگریزوں پر حملہ کرنے اور ان کو مار بھگانے کی ایک بے حد کارگر حکمت عملی بنائی اور پورٹ بلیئر پر حملہ کرنے آئے اس سے پہلے وہ شخص دھوکے سے انگریزوں کی طرف

آ گیا اور ان کو اس حملے اور اس کی حکمت عملی سے آگاہ کر دیا۔ نتیجے میں جروا قبائلیوں کی بری طرح شکست ہوئی اور بے شمار جروا قبائلیوں کی جان تلف ہوئی۔

کافی عرصہ بعد ایک بار وہ عورت بیمار ہوئی اور پورٹ بلیئر کے اسپتال میں آئی تو وہی آدمی اس سے ملنے گیا۔ اس لڑکی نے اس آدمی کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

پورٹ بلیئر کی لائبریری کی کتاب میں تھوکنے والی تصویر اسی واقعہ سے متعلق تھی۔

خالد نے ان جزیروں سے متعلق ایک دوسری کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا کہ ایک جگہ اس واقعے کا اس میں ذکر تھا لیکن یہ ذکر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ چونکہ گوپی کی نظر میں چونکہ انگریز مہذب تھے اس لئے اس نے غیر مہذب اور وحشی قبائلیوں کے حملوں سے ان کو بچانے کے لئے ان کی مدد کی۔

مورخوں کا یہ انداز اسے بڑا عجیب لگا۔

ہندوستان کو غلام بنوانے والوں میں جن غداروں کا نام آیا ہے اس میں گوپی ناتھ کا نام کیوں نہیں آتا۔

ہندوستان کے لیے جن لوگوں نے جنگ آزادی لڑی اس میں اس جروا قبیلے کا نام کیوں نہیں آتا۔

اسے ایک مفکر کے وہ جملے یاد آ گئے جو اس نے چند برسوں پہلے پڑھے تھے اور جو کچھ اس طرح تھے۔

None should believe in political theories, history and scientic researches as told to the common people by those

whom we believe to be gospels. The people up there are worse than common man in matters relating to political interests. Certainly they consider political interest above truth. To them suppressing truth is legal and recognizing truth is matter of convenience.

پورٹ بلیئر میں کچھ دنوں کے بعد مقامی لوگوں سے اسے معلوم ہوا کہ یہاں کے قبائلیوں سے رابطہ بڑھانے کے لیے گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں کئی مخصوص ٹیموں نے سمندر کے ساحل پر تحائف رکھے لیکن جروا اس وقت اسے لینے آتے تھے جب جہاز دور چلا جاتا تھا۔ وہ تحائف اٹھا کر لے جاتے تھے، لیکن کبھی بھی انہوں نے اپنے رویہ میں نرمی نہیں برتی۔ نہ تو انگریزوں کے زمانے میں اور نہ ہی ان کے بعد جو لوگ یہاں رہ گئے تھے ان کے زمانے میں۔ پھر اسے اس دوسری انتہائی پراسرار کہانی کے بارے میں ایک تحریر ملی جس کے بارے میں اس نے ابھی صرف زبانی سنا تھا۔

وائسرائے لارڈ میو کا قتل

لائبریری کا وہ گوشہ جس میں ان جزائر سے متعلق کچھ پرانی کتابیں تھیں، کچھ اس حالت میں پڑی تھیں جیسے برسوں سے ان کو کسی نے چھوا نہیں ہو۔ وہ شیلف کے قریب گیا۔ ان پرانی زرد ہوتی کتابوں میں اسے ایک ایسی کتاب ہاتھ آ گئی جس میں کالا پانی کے اولین دنوں کے متعلق واقعات میں کچھ سرکاری دستاویزوں کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اس نے اس کتاب کی ورق گردانی کی۔ اس میں دو تین تصویریں اس منظر کی تھیں جس میں سیکڑوں لوگوں کو باری باری سے پھانسی پر لٹکایا جا رہا تھا۔ ایک تصویر لارڈ مایو کے قتل کے منظر کا تھا جب وہ

پہاڑی راستے سے ایک پیچیدہ جگہ سے گزر رہا ہے، اور اچانک ایک پٹھان نمودار ہو کر اس پر خنجر سے حملہ کرتا ہے۔ یہ کتاب وہ لائبریرین سے اجازت لیکر ہفتے بھر کے لئے ساتھ لیکر آ گیا اور رات کی تنہائی میں اسے متعدد بار غور سے دیکھا اور پڑھا۔

ان تصویروں میں اب اس کی نگاہ خاص طور سے اس آدمی پر ٹکنے لگی جس کا نام شیر علی تھا اور جس نے اپنے وقت کے ہندوستان کے والسرائے لارڈ میو کا قتل کیا تھا، یقیناً یہ واقعہ تصویر کا ایک ایسا رخ پیش کر رہا تھا جس نے ان جزائر کی کہانی میں خالد سہیل کے لیے بے انتہا گہرائی پیدا کر دی تھی۔

یہ بات اور چونکانے والی تھی کہ اتنے اہم واقعے کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں کبھی اس طرح نہیں آیا جیسے یہ کوئی اہم واقعہ ہو۔ خالد سہیل کو احساس ہوا کہ کہانی اتنی سپاٹ نہیں جتنی دکھتی تھی۔ برٹس ریکارڈ کے مطابق شیر علی ایک انتہائی نیک خصلت اور امن پسند مجرم تھا۔ اس کو اس کے کردار کو مد نظر رکھتے ہوئے ترقی دیتے ہوئے پہلے دوسرے مجرموں کا سربراہ بنایا گیا اور بعد میں اس کو جیل کی اوقات کی پابندی سے بھی ممزا کر دیا گیا تھا۔ انگریز افسر اکثر اس کے مشورے پر عمل کرتے تھے اور دوسرے مجرموں کو اس کی وجہ سے مراعات مل جاتی تھیں۔ یہ اور دوسری تفصیلات مکمل طور پر یہ گواہی دے رہی تھیں کہ شیر علی پوری طرح ایک ہوش و حواس میں رہنے والا ایسا شخص تھا جس کے ذہن اور دل مکمل طور پر اس کے قابو میں تھے اور جو تعجب خیز حد تک زندگی کے حقائق کو سمجھنے پرکھنے اور تولنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ بات انتہائی چونکانے والی تھی۔ اس شخص نے جس نے کبھی کسی ایسے سپاہی سے بھی جھڑک کر بات نہیں کی جس نے اس کے اوپر جیل کے سخت دنوں کے دوران ناقابل برداشت مظالم ڈھائے ہوں اس نے وائسرائے لارڈ میو کے قتل کا ارادہ کر لیا اور اس ارادہ کو پائے تکمیل تک پہنچا دیا۔ مزید تعجب کی بات یہ تھی کہ وائسرائے لارڈ میو وہاں ہیرٹ پہاڑ کے اوپر قیدیوں کے لئے ایک اسپتال بنانے کا حکم دیا تھا اور اسی اسپتال کی سنگ بنیاد ڈالنے گیا تھا۔

❖❖

11

ایک شام وہ ٹورسٹ ہوم کے باہر کھڑا چاروں طرف کے دور دور تک پھیلے سمندروں اور پہاڑوں کا منظر دیکھ رہا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ پچھم کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ آسمان میں دور دور تک بادلوں کے رنگ برنگے ٹکڑوں کی ایک چھت سی تن گئی تھی اور سمندر کی خاموش لہریں سورج کی پہلی روشنی میں حد نگاہ تک چمکتی ہوئی بے حد پراسرار لگ رہی تھیں۔

اس منظر کو دیکھتے دیکھتے اس کا تخیل ماضی کے اندر دو تین سو سال کی گہرائی میں جا پہنچا اور پھر اس کے تخیل میں جو کچھ ابھرا وہ رونگٹے کھڑا کرنے والا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہی آسمان اور یہی سمندر ہیں اور یہ پورا آسمان ٹوٹ ٹوٹ کر ہندوستان پر گر رہا تھا اور گدھ اس تباہ کن منظر میں گردش کرتے ہوئے زخمی لوگوں کے اوپر اور مرے ہوئے لوگوں کی لاشوں پر حملہ کر رہے تھے۔

اور یہ کون تھا' ساحل پر کھڑا دوربین سے جزیروں کو دیکھتا ہوا۔

اور وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟

یہ کیپٹن بائیک تھا۔

خالد کو لگا جیسے کیپٹن بائیک ابھی ابھی ہوائی جہاز کی سیڑھیوں سے یہاں وارد ہوا

ہے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو خود اس وقت انیسویں صدی میں تھا۔

'غالباً اس شخص سے بھی میرے پردادا کا واسطہ پڑا ہوگا۔' اس نے کیپٹن بائیک کو غور سے دیکھا۔ اس کی اسکیچ والی ایک تصویر وہ پورٹ بلیر کی لائبریری میں دیکھ چکا تھا۔ اس تصویر میں اسے ان جزیروں کو آباد کرنے والی شخصیت کے طور پر پیش کرتے ہوئے اسے اس جزیرے کی تاریخ کا ایک حصہ بنا دیا گیا تھا۔

اس کیپٹن بائیک کے بارے میں اس نے کتابوں میں پڑھ رکھا تھا۔ وہ ملٹری یونیفارم میں ملبوس تھا اور کیپ کے ایک کونے میں کھڑا مغربی جانب کی پہاڑیوں کو اور سامنے سمندر کی وسیع دوریوں میں واقع جزیروں کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان صاف تھا لیکن کہیں اس میں بادل پگھلے ہوئے لوہے کی طرح سفید سفید چمک رہے تھے کچھ پرندے آسمان میں اڑ رہے تھے جیسے ہواؤں میں ہچکولے کھانے کا لطف لے رہے ہوں۔ اس کا جہاز جزیرہ کے قریب کھڑا تھا۔ اور اس پر برطانوی پرچم سمندری ہواؤں کے تھپیڑوں سے لہرا رہا تھا۔ جہاز کے انجن کا دھواں آسمان کی جانب اٹھ کر مشرق کی طرف ہواؤں کے ساتھ بدلیوں میں جا رہا تھا۔

خالد سہیل کو کیپٹن بائیک برطانوی سلطنت سے چھوڑے گئے ان ہزاروں شہبازوں میں سے ایک لگا تھا جو کرہ ارض کے گوشے گوشے میں اپنی خوراک ڈھونڈنے کے ساتھ برطانوی حکومت کا پرچم بھی گاڑنے نکلے تھے۔

کیپٹن بائیک اکیڈمی کے ذہین ترین افسروں میں سے ایک تھا۔ وہ تین سال سے برطانوی فوج میں افریقہ میں کام کر رہا تھا کہ اچانک ایک دن اسے لندن کے ہیڈ کوارٹرز میں بلایا گیا تھا۔ کئی روز کے پانی کے جہاز کے سفر کے بعد جب وہ اپنے چست درست یونیفارم میں ملبوس ہو کر جب وہاں پہنچا تو اس کی تین بڑے افسروں کے سامنے پیشی ہوئی

جن کے سامنے اس کا ریکارڈ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ریکارڈ میں جھانکتے ہوئے ان میں سے ایک نے اس سے کہا۔

'We appreciate that you have been doing very well in what ever command you have been sent. Now we want to assign you more important things.'

اس کے بعد سب سے بڑے افسر نے کہا۔

'Now we want to give some independent charge. We are making you incharge of the islands of Andaman & Nicobar.

We are sending you to Port Blair.

These islands are an important piece of our territory and need to be exploited fully to make make the best possible gains from it. That will be exactly your task. You have to consolidate the British establishment there. We have been making efforts for the same but have not succeeded so far because all efforts have been casual. Now a serious effort has to be made.

These islands have scope for sea routs, it has forests and it has people. You have to see what best use of

these resources can be made. The place is very important as it is located at a linking and turning point in the sea routs covering the south/Asea and Africa. Secondly the forests there are full of wealth. See how far it can be exploited. It has been surveyed that high quality wood is there. Thirdly you have a human resource. You have to see how far this resource can be exploited. The population is of tribals.They have been extremely hostile so far. See if that population can be increased and used as good labor. See whether it can be tamed. If not it has to be either contained or eliminated as they are a problem. Survey and give your suggestions.'

کیپٹن بائنگ یہاں تاریخ کی سڑک کے ایک مخصوص سنگ میل پر کھڑا تھا۔ان جزیروں پر قدیم زمانے سے ہی جہاز اور کشتیاں آتے رہے تھے۔

چونکہ کرہ ارض کو قبضہ کرنے کی دوڑ میں یورپ کی کئی قومیں پوری طاقت سے سمندروں میں اتر گئی تھیں۔اس جگہ کو آباد کرنا اور یہاں عمارتیں بنانا ضروری ہو گیا۔کیپٹین بائنگ اسی کام کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا۔لیکن کیپٹن بائنگ ایک آزاد ملک کا انسان تھا جو برطانوی افسر ہونے کے ناطے برطانوی حکومت کے اقتدار کا خود ایک حصہ تھا،وہ مزدور نہیں تھا جو صرف اپنی زندگی کو کام کام اور کام کے نام پر نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔وہ تاجر بھی نہیں تھا جو ہمیشہ اپنی آمدنی بڑھانے کی تدبیریں سوچنے میں غرق رہتا۔وہ اپنے کام کو کام کے دائرے میں رکھتا تھا اور فرصت کے اوقات میں زندگی اور دنیا کا لطف لینے میں مشغول رہتا۔اس کے اپنے نقطۂ نظر سے ان جزیروں میں اس کے آنے کا مقصد صرف یہاں پر دئے گئے مہم کو پورا کرنا نہیں تھا بلکہ اس نئی جگہ کے حسن کا انکشاف بھی تھا۔جیسے ہی اس جگہ کے ہنگامی انتظامات

سے اسے تھوڑی فرصت ملی اس نے اپنے ذہن کو اس کے جھمیلوں سے آزاد کر لیا اور ایک صبح صرف اس غرض سے کہ وہ اس جگہ کو بھرپور نظر سے دیکھ کر اس کا لطف لے گا' وہ خیمہ سے باہر نکلا۔اپنی نیمت والی جگہ سے وہ کسی اونچے مقام پر پہنچنا چاہتا تھا۔وہ اپنے محافظوں کے ساتھ پورٹ بلیر کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچا اور وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔اس کے محافظوں نے وہاں ایک چھتری گاڑ دی، کرسیاں لگا دیں اور ایک خوبصورت منقش گلاس میں پینے کا پانی نکال کر دیا۔ایک دو سپاہی ناریل توڑ کر لانے چلے گئے۔کرسی پر آرام سے بیٹھ کر کیپٹن بائنگ نے اس جگہ کو دیکھا جو اب برطانوی حکومت کا ایک حصہ بن چکی تھی۔یہ جزائر اجتماعی طور پر ایک طویل سلسلہ تھے جس میں ایک ہزار سے زیادہ جزیرے تھے جن میں کچھ کے اوپر اونچے اونچے پہاڑ تھے اور کچھ سطح سمندر سے محض چند فٹ اوپر تھے۔چند ایک کو چھوڑ کر ان تمام جزیروں میں گھنے ہرے پودے اور بیش قیمت لکڑیوں والے جنگل تھے جن میں کچھ درختوں کا شمار دنیا کے بلند ترین درختوں میں کیا جا سکتا تھا۔ان میں کچھ جزیرے بہت بڑے علاقوں پر پھیلے ہوئے تھے تو کچھ جزیرے ایسے بھی تھے جو برطانوی افسروں کے بنگلوں سے بھی مختصر تھے۔ساحلوں پر کچھ مقامات پر کورل کے ٹکڑوں اور بالو سے ایسے خوبصورت پیٹرن بن گئے تھے جیسے کوئی ہندوستانی عورت بنارسی ساڑی پہنے ہوئی ہو اور اس کا کنارہ زمین کو چھو رہا ہو۔ہو۔ہندوستانی عورتوں کو اس نے انگلینڈ سے انڈمان آتے ہوئے کلکتے میں دیکھا تھا جہاں اسے ایک انگریز،ایک ہندوستانی شادی کے جشن کو دکھانے لے گیا تھا۔

وہاں سے ڈاب پینے اور پہاڑوں کی پینٹنگ بنانے کے بعد وہ نیچے اترا اور چھوٹے چھوٹے جزیروں کے اندر کشتی سے گیا۔یہاں اس نے ان جزیروں کے کناروں کو بہت قریب سے دیکھا۔

کئی جگہوں پر ہرے گھنے چھوٹے پیڑ تھے جن کو پانی نے نیچے سے ایسے تراش دیا تھا جیسے یہ کام کسی ماہر مالی نے کیا ہو۔کئی جزیروں کے بیچ سمندر دور تک ندی کی طرح گھسا ہوا تھا جن میں پانی کی اونچائی کم ہونے کی وجہ سے خوبصورت چھوٹے چھوٹے اکے دکے پیڑ اگے

ہوئے ٹیلے پیدا ہوگئے تھے۔

ادھر جابجا اس کی نظر پانی کی سطح پر چلی جاتی جہاں سمندری مچھلیاں اچھل اچھل کر ہوا میں آتیں اور پھر پانی میں چلی جاتیں۔ لیکن کہیں کہیں بڑے جزیروں کے کنارے تحت اور انتہائی نوکیلے پتھر تھے جن سے ٹکرا کر کوئی بھی جہاز یا کشتی پاش پاش ہوسکتی تھی۔

'میر علی سے اس شخص کی آنکھیں ضرور ٹکرائی ہونگی۔' خالد کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا۔

کیپٹن بائیک یہ سب دیکھ کر بے حد مسرور ہو رہا تھا۔ یہاں کا پھیلا ہوا حسن اسے اس قدر شادمانی دے رہا تھا کہ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ خوبصورت دنیا اسی کے لیے بنی ہو۔ اس کی اجنبیت دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے دیکھا، کیپٹن بائیک اتنی باریک بینی سے اس اجنبی دنیا کا معائنہ کر رہا تھا جیسے اسے یہاں اپنا گھر بنانا ہو۔ شاید کیپٹن نے سوچا یہ جگہ جو اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس برطانوی حکومت کا حصہ بن گئی ہے جو پورے روئے زمین پر پھیل چکی ہے تو یہ اب اجنبی کہاں رہی۔ اب اس جگہ میں اور برطانیہ میں کیا فرق ہے؟ اس جگہ کو سنوارنا، اس کی دولت کو اجاگر کرنا، اس کو آگے بڑھانا تو اب ہمارا کام ہے۔ اس جگہ کو انگریزوں کے ایک خوبصورت شہر میں بھی تو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

Let me think frankly

یہ جگہ تو انگلینڈ کی کسی بھی جگہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ابھی یہاں قبائلیوں کا قبضہ ہے اور ان کی آبادی ہے۔ ان کا یہاں زیادہ تعداد میں ہونا مناسب بھی نہیں۔ اگر یہاں ہمارے سوا صرف یہی ہوں تو یہ بھی

بھی متفق ہوکر ہمارے لیے خطرناک صورت حال پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کو یاد آیا کہ جب اس کے بزرگ امریکہ گئے تھے جہاں ریڈ انڈین قبائلیوں کی بڑی آبادی تھی تو کس طرح اور کیوں انہوں نے ریڈ انڈین قبائلیوں کو لال چیونٹیوں کی طرح مسل مسل کر ختم کیا تھا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اگر ہم نے یہاں کی آبادی سے دوستی کرکے، انہیں تحفظ کا احساس دلا کر ان سے مزدوروں کا کام لیا بھی تو ایک نہ ایک دن ہمارا یہ اقدام سر دردی بنے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ مین لینڈ سے یہاں قیدی لائے جائیں۔

اس جزیرہ میں صرف چند ہی مقامات ایسے تھے، جہاز محفوظ طریقے سے جہاز لنگر انداز کیے جاسکتے تھے اور ان میں یہ جگہ جہاں وہ اترے تھے مناسب ترین تھی۔ وہ یہ انداز بھی لگا سکتا تھا کہ سمندری دنیا کے اس علاقہ میں جہاں سورج سیدھے سر کے اوپر آجاتا تھا سردیوں کے موسم میں سمندر بہت نرم رو ہوتا تھا لیکن گرمیوں کے موسم میں اپنی اونچی اونچی درختوں جیسی اونچی لہروں اور تیز ہواؤں کی وجہ سے خطرناک تھا اور صرف کسی جزیرے کے پیٹ میں گھس کر ہی محفوظ رہا جاسکتا تھا۔

یہاں بندرگاہیں بنانا سب سے پہلی ضرورت ہے۔

'بندرگاہوں کی تعمیر میں میرے پردادا نے غالباً کام بھی کیا ہو۔' بار بار اسے اپنے پردادا کی یاد آجاتی تھی لیکن اب اس کو اپنے مقدمے کی یاد نہیں آتی تھی۔ جب یہ سب ہوتا تھا تو اس مقدمہ کی سچائی میں کیا رکھا تھا۔ یہاں تب اصل تماشہ ہی کچھ اور تھا۔

تفریح کے لیے نکلے کیپٹن بائیک کے ذہن میں اس کی سیاسی سوچ کو ابھرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

جہاز پہنچے ایک ہفتہ ہو چکا تھا لیکن فوری ضرورت کی مصروفیات نے کیپٹن بائیک کو اتنا منہمک رکھا کہ وہ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ ہی نہیں پایا لیکن ٹھہرنے کے انتظام کے

مکمل ہونے کے بعد اسے فرصت ملی تو اس جگہ کے وجود کو پہلی بار محسوس کیا۔

کیپٹن ہائیک انتہائی انہماک سے ان تمام نکات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، صرف اس لیے نہیں کہ یہ سب کچھ بہت خوبصورت تھا بلکہ اس لیے کہ ان نکات کی تجارتی اہمیت بہت بڑی تھی۔ کیپٹن ہائیک نے اس جزیرے کی تیز دھوپ میں عینک لگا کر آج ایک بار اس جگہ کو گویا ٹھیک سے دیکھا۔ اس سے پہلے یہ جگہ خوابناک سی ہی لگی تھی۔ وہ جہاں کھڑا تھا اس کے اتر کی جانب سمندر میں کھڑا اس کا جہاز ڈول رہا تھا۔ دن میں سمندر میں لہریں ایسے اٹھ رہی تھیں جیسے پانی نہیں ہو، پہاڑیاں ہوں، لیکن شام کے وقت سمندر اس قدر خاموش ہو جاتا کہ اس میں جہاز کا عکس تک دکھائی دینے لگتا جیسے ایک جہاز سمندر میں سیدھا کھڑا ہو اور ایک جہاز الٹا پانی کے اندر لٹکا ہوا ہو۔

شام کا دھندلکا شروع ہوتے ہی ساحل پر زور زور سے پانی کو پٹکتی ہوئی لہریں ایک پراسرار سا ہنگامہ پیدا کرتی تھیں۔ ابھی پچھلی شام کو ہی وہ وہاں اترتا چلا گیا تھا، جہاں سیپیوں کے ٹکڑے اپنی فطری شکل میں بکھرے ہوئے، اپنے انوکھے حسن کی وجہ سے جادو جگا رہے تھے۔ پانی دور تک اندر کی طرف سرک گیا تھا، جیسے سمندر سو گیا ہو لیکن پھر وہ چند ہی گھنٹوں کے بعد جاگ اٹھا تھا۔

سامنے پورب کی طرف کوئی آدھ میل کی دوری پر ایک جزیرہ تھا جس میں دوسرے جزیروں ہی کی طرح کافی ہری بھری جھاڑیاں اور درخت تھے لیکن اس کا ساحل یوں بے حد دلکش لگ رہا تھا کہ اس کا کوڑی بیچ ایک عجیب حسن پیدا کر رہا تھا جس کو دیکھ کر وہاں پہنچنے کی ایک خواہش بار بار دل میں لہرا جاتی۔

اس بیچ کے حصے میں پانیوں میں جا بجا کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے دکھائی دے رہے تھے جس پر لگے پیڑ ان جزیروں کی تنہائی کو اور اجاگر کر رہے تھے لیکن اسے محسوس ہوا کہ ان پیڑوں کو کسی قسم کی تنہائی کا احساس قطعی نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس جزیرے کی مٹی سے

ابھرے تھے۔ وہ پیڑ وہیں خوبصورت لگ رہے تھے۔ اور واقعی بے حد خوبصورت لگ رہے تھے۔

پورب کے اس جزیرے سے اس کی نگاہ شمال کی جانب دور کھڑی پہاڑیوں پر گئی۔ اس سے پہلے ایک ڈیڑھ میل تک پانی ہی پانی تھا۔ لیکن وہ پہاڑیاں مغرب کی جانب سے دوسرے پہاڑی سلسلوں اور اس جزیرے سے بھی منسلک تھیں جس پر وہ اس وقت کھڑا تھا۔

وہ بحرِ ہند کی اس جگہ پر آیا تھا جہاں سے آدھی دنیا کی نگرانی کی جا سکتی تھی۔

جہاز سے سائرن کی پرزور آواز آئی۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ کیپٹن ہائیک اترتا ہوا نیچے وہاں آیا جہاں سے کشتی سے وہ جہاز میں واپس جاتا تھا۔ وہاں اوبڑ کھابڑ پتھر تھے اور اس سے آگے بائیں جانب من گروبھ کے پیڑ سمندر کے کنارے پر اگے ہوئے سطح سمندر سے تقریباً چپکے ہوئے تھے۔

وہ چلتا ہوا ڈونگی میں بیٹھ گیا اور ڈونگی پانی میں چل پڑی۔ اس نے نیچے پانی میں ہاتھ ڈال کر اس کے لمس کے لطف کو محسوس کیا۔ پانی کا درجہ حرارت معتدل اور رنگ صاف تھا۔ اس کے منہ پر ایک کیڑا اڑ کر بڑا جسے اس نے ہاتھ سے اڑایا اور پھر منہ پونچھا۔ انگلیوں کے ہونٹ پر پڑنے سے اس کے کھارے پانی کے نمک کا ذائقہ منہ میں آ گیا۔ پورا سمندر کھارے پانی سے بھرا تھا۔

چند دن پہلے وہ جب جہاز سے یہاں اترا تھا تو اسے لگا تھا کہ اسے اس کے دوار سے کسی پیڑ کی طرح اکھاڑ لیا گیا ہے اور اسکی مٹی اس کے اپنے قدموں تلے کہیں پیچھے چھوٹ گئی ہے۔ لیکن آج اسے یہ جگہ مانوس سی لگی تھی۔

اس کی جڑیں پیاسی زباں کی طرح کسی نئی چیز کے لیے بیقرار ہو گئیں۔

ہمیں ان جنگلوں میں میٹھے پانی کی تلاش کرنی ہے۔

کوئی چشمہ، کوئی تالاب، کوئی نالا۔ لیکن تلاش کے لیے انھیں ان گھنے جنگلوں میں گھسنا پڑے گا اور وہ قبائلیوں کی زندگی اور ان کے حربوں سے ابھی اس قدر ناواقف تھے کہ ابھی ان کے اندر خود اعتمادی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پانی تلاش کرنا بے حد ضروری اور ہنگامی ضرورت تھی چاہے اس کے لیے قبائلیوں کے بیچ ایسے جانا پڑے جیسے جنگ میں سپاہی تیروں کی بوچھار کے سائے میں آگے بڑھتے ہیں۔

کیپٹن بائیک نے ایک نگاہ اس خیمہ پر ڈالی جو جزیرے پر لگائی گئی تھی اور جس کے چاروں طرف گارڈس لگے تھے، جس کے قریب ایک فوجی دستہ رہتا تھا، جن کے جسموں پر خود تھے۔ اور ہاتھوں میں نوکیلی رائفلیں تھیں۔ اور حملہ آوروں پر یا جنگل سے برآمد ہوئے قبائیلیوں کو بلا تکلف گولی مار دینے کی ہدایت تھی۔

کیپٹن بائیک انتظامات سے کافی مطمئن تھا۔

رات میں رقص ہوتا رہا۔ رم چلتا رہا۔

بے تکی باتیں ہوتی رہیں۔

'فوجی ڈرنک'

'جی ہاں' گھوڑے کو پلا دو تو کیچڑ سے لڑنے لگے؟ ہاہاہا!

لیکن گھوڑے کو رم پلائیں کیوں؟

کیچڑ نہیں ملا تو کیا ہوگا؟

تم کیوں پریشان ہو۔

وہ گھوڑے آئیں گے اور کیچڑ وں کو نہیں پا کر کہیں خود ہم سے نہ لڑنے لگیں اس لیے میں تنہائی میں زیادہ راحت محسوس کرتا ہوں۔

کیا؟ یہ تنہائی کیا چیز ہے؟ کائنات کی ہر چیز، ہر ذرہ تنہا ہے۔

اور کچھ کہنا؟

سوری سر، سلاد بنانے کے لیے کوئی سبزی باقی نہیں رہی۔ یا تو سبزیاں سڑ گئیں یا پک چکیں یا پھینک دی گئیں۔

یہاں صرف جنگل تھے کوئی بازار نہیں تھا.. کوئی سڑک نہیں تھی، ہریالیاں تھیں لیکن انسان کے کھانے لائق کوئی سبزی نہیں تھی۔ جیسے یہ قبائلی ویسے یہاں کہ پیڑ پودے اور جھاڑیاں۔ یہاں چاروں طرف پانی ہے اور پھر بھی پیاسے! پانی کے لیے پریشان۔ اور ہماری تکلیف کون سمجھ سکتا ہے کہ انسان پانی لینے کے لیے ہزاروں فٹ کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے۔ اور خصوصاً عورتیں، کہ ان میں صبر کا مادہ بہت ہوتا ہے۔

عورتیں؟ عورتیں؟ یہاں؟ خوشبو؟ خیال یا کوئی رومانی چھیڑ خانی، یہاں ہم کام کرنے آئے ہیں وار فوٹنگ پر۔

لیکن ان قیدیوں میں عورتیں بھی ہونی چاہئے۔
'تو لکھئے'
اور اس نے لکھا۔
اس نے اپنے پردادا کے بارے میں ایک خاص بات یہ سن رکھی تھی کہ وہ عورت

کے بغیر ایک ساعت بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر وہ یہاں کس طرح رہے ہوں گے۔ اس کو اپنے پردادا کی اس جنسی بے چینی کا احساس ہوا جس سے وہ گزرے ہوں گے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ اس کے پردادا تھے اور سچ بھی یہی تھا کہ اب تو وہ اس کے لئے ایک قیدی رہ گئے تھے اور انہیں تمام قیدیوں کی طرح ایک قیدی تھے جیسے دوسرے تھے۔ اور پھر وہ بھی تو اس وقت اسی طرح ایک نوجوان تھے جیسے اس وقت وہ خود تھا۔ اور دونوں کے دکھ بھی لگ بھگ ایک جیسے تھا۔

'یہاں کے قبائلی فطرتاً خونخوار ہیں۔ ان کو پالتو بنانا ممکن نہیں۔ اس لئے دوسرا راستہ صرف یہ ہے کہ ان کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ گھنے جنگلوں کے بہت اندر رہتے ہیں اور ان کو آسانی سے پوری طرح ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کو مارنا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ اب سامنے نہیں آتے۔ ان کو ختم کرنے میں بہت بڑی تعداد میں انگریز فوجوں کا جانی نقصان ہوگا۔ اسلئے اس صورت میں جو سب سے معقول تجویز ہے وہ یہ کہ ان کو جنگل کے اندر دھکیل دیا جائے یعنی ان کو ایک کونے میں مقید کر دیا جائے اور بیچ میں ایک لائن کھینچ دی جائے۔ اور دوسری طرف مزدوروں کی جو ضرورت ہے اس کے لئے کہیں اور سے کام کرنے والے لائے جائیں۔ لیکن زہریلے کیڑوں ملیریا اور قبائلیوں کے حملے کی کیوجہ سے مزدوروں کا یہاں ٹکنا مشکل ہے اس لئے سب سے مناسب تجویز یہ ہے کہ یہاں ایسے مزدور لائیں جائیں جو یہاں ٹکنے کے لئے قانونی طور پر پابند ہو یا پھر قیدی لائے جائیں۔

اگر قیدی لائے گئے تو ان سے ہم یہاں ایک مستقل آبادی بسا سکتے ہیں۔ یہاں تقریباً دس لاکھ قیدی بسائے جا سکتے ہیں لیکن ان سے کام لینے کے لئے ان کو صحت مند رکھنا ہوگا۔ جہاں تک قبائلیوں کا تعلق ہے ان کا دھیرے دھیرے مکمل خاتمہ ہی کرنا ہوگا۔ لمبے پروگرام میں ان کو ختم کرنے میں نسبتاً بہت کم خرچ آئے گا۔ لیکن فی الوقت تو ان کو علیحدہ کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے بہترین تجویز یہ ہے کہ اس جگہ کو مجرم بستی بنا دیا جائے۔

کیپٹن بائیک نے کلکتہ کے ہیڈ کوارٹر کو اگلے خط میں کچھ ملزم عورتیں بھیجنے کی گذارش کی۔ عورت ضروری ہے ورنہ یہ جگہ آباد کیسے ہوگی۔ ہمیں ایسے بچے چاہئے جو یہاں پیدا ہوئے ہوں...... ان جزیروں پر؟ اس کھارے پانی کے بیچ؟ ان مچھروں کے بیچ ان قیدیوں کی زنجیروں کی آوازوں کے بیچ ہماری رائفلوں اور ان سے بے دھڑک نکلتی ہوئی گولیوں کے سائے میں۔

'میں بھی اس مٹی میں کیا کیا بونے جا رہا ہوں؟ کیپٹن بائیک کا دل اداس ہو گیا۔ وہ ایک فوجی تھا اسمارٹ اور پر حوصلہ۔ کمزوری کی باتیں اسے پسند نہیں تھیں۔ ہم پتھر سے بچے پیدا کرنے جا رہے ہیں۔ مچھر، مکھیاں، اور کیڑے اور نہ جانے کیا کیا۔ کچھ گھناؤنے خیالات کائی کی طرح اس کے دل پر جم گئے۔'

❖❖

ساحل پر چلتی ہوئی تیز ہوائیں، کیپٹن ہائیک کے اندر اپنے ملک سے ہزاروں میل دور ہونے کے احساس کو گہرائی سے بیدار کر رہی تھیں۔ وہ خیمے کے باہر کھلی جگہ پر کھڑا تھا۔ سامنے سیاہ و تاریک پہاڑیاں تھیں جن پر ناریل کے پیڑوں کی جھنڈ یہاں کی ویرانی کو اور بھی بڑھاوا دے رہی تھیں۔ خیمہ کے اندر ایک جلتی ہوئی لالٹین لٹک رہی تھی۔ آگے تھوڑی دور پر پانی میں وہ جہاز کھڑا تھا۔

یہاں کا کام کم از کم سال دو سال کا تھا۔

وہ سوچتا ہوا خیمہ کے اندر چلا آیا۔ ٹیبل پر اس کے لیٹر پیڈ کا ایک ورق ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس نے اس صفحہ پر پیپر ویٹ رکھنے کے بجائے اسے یوں ہی چھوڑ دیا اور کرسی پر بیٹھ کر پھر انھیں پہاڑیوں اور ناریل کے پیڑ کے جھنڈوں کے تصور میں کھو گیا جن کے درمیان وہ تھوڑے سے فوجیوں کی ایک ٹکڑی لا کر اس جگہ کو انسانوں کی آبادی کے قابل بنانے کا آغاز کرنے کے لیے آیا تھا۔

اس کے خیالوں کا تسلسل اچانک تب ٹوٹا جب نیچے اسکی ٹانگ میں ایک مچھر نے زور کا سے کاٹ لیا۔ اس نے ہاتھ سے پاؤں پر بیٹھ کر خون چوستے ہوئے مچھر کو مارا تو اس کی ہتھیلی پر خون کا سرخ دھبہ لگ گیا۔ کہیں قریب میں پانی بھی نہیں تھا جس سے وہ اپنی گندی ہتھیلی کو دھو لیتا۔ پھر کچھ اور مچھر ہوا میں تیرتے ہوئے دکھائی دیے۔ باہر ہوا مدھم ہو گئی تھی۔ اور مچھر متحرک ہو گئے تھے۔

کیپٹن ہائیک نے اپنے کیریئر کے آغاز سے ہی مہم جو ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور

وہ مسلسل ایسی ذمہ داریاں لیتا جا رہا تھا جس میں اسے ایسی جگہوں پر جانا پڑے جہاں دوسرے جانے سے کتراتے ہوں۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک خط لکھا جو برطانیہ میں کسی اسکول میں پڑھاتی تھی:

''میری شیریں شریک حیات!

مجھے یہ جگہ بے حد پسند ہے لیکن یہ اسی قدر ہولناک بھی ہے۔ یہاں کے جنگلی انسانوں کا شکار کر لیتے ہیں۔ میں یہاں آنے کے بعد یہی سوچ رہا ہوں کہ اگر کل یہاں آبادی ہوئی تو اس میں کس سے قسم کے لوگ ہوں گے؟ اور کون سے لوگ ہوں گے؟ اور کون یہاں آنا پسند کرے گا۔ اور کیوں آئے گا۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری ساری محنت اکارت جائے گی۔ اور یہ سوچ کر مجھے مایوسی ہونے لگتی ہے۔ حکومت نے اس کام میں دلچسپی لی ہے لیکن وہ محض اس لیے کہ ان جزائر کی فوجی اہمیت بہت ہے۔ لیکن مجھے اس جگہ کو آباد کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور یہ توقع بھی مجھ ہی سے کی جاتی ہے کہ میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ یہاں کی آگے کی پلاننگ کیا ہوئی۔

لیکن میں یہی سوچ رہا ہوں کہ یہاں آئے گا کون؟

تمہارا ہائیک

کیپٹن ہائیک وہاں اپنے دستے کے ساتھ کھڑا تھا۔ پورا دستہ اس وقت وردی میں تھا۔ کیپٹن ہائیک ان کی گنتی لے رہا تھا۔ دور چاروں طرف جنگل کی جانب منہ کیے ہوئے دس رائفل بردار چوکنا کھڑے تھے تاکہ اس دستے کی ان جنگلی قبائلوں سے حفاظت کر سکیں جو اپنے تیر کمان کے ساتھ اچانک حملہ آور ہوتے تھے اور جن کا نشانہ اچوک تھا۔

"جوانوں کا حوصلہ بلند رکھنا ضروری ہے۔"

اسے محسوس ہوا کہ حوصلہ افزا تقریر کرنے کی جو تربیت اسے ملٹری اکیڈمی میں ملی تھی اس کے استعمال کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

اس نے شام کے وقت خیمے کے سامنے عارضی طور پر جنگل کی صفائی کر کے بنائے گئے پریڈ میں پوری فوجی ٹکڑی کو بلایا اور اچھی طرح سوچ کر اپنی تقریر تیار کی۔

پریڈ گراؤنڈ میں اس نے سیلوٹ لینے کے بعد جوانوں کو مخاطب کیا۔

'نوجوان افسر، بنجر زمینیں یوں آباد نہیں ہوتی۔ پہلے وہاں رہنے کی عادت کی بو فضا میں بسانی ہوتی ہے۔ گھر ہو یا جزیرے رہنے سے آباد ہوتے ہیں۔ یہ جگہ انتہائی خوبصورت ہے۔ اگر خدا نے انسان کو یہاں پہلی بار اتارا ہوتا تو شاید اسے جنت سے نکالے جانے کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا اور جگہوں پر اترنے سے ہوا، کیپٹن نے لوگوں کے مذہبی اور قومی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی تقریر میں پوری دنیا میں پھیلتے ہوئے برطانوی سامراج کی اہمیت اس سلسلے میں ہر انگریز کی ذمہ داری اور فرض، اور زمین پر ابھرتے ہوئے سب سے بڑے اس سامراج کی عظمت کا ذکر کیا اور ہر قیمت پر اس کام کو پورا کرنے کی ترغیب دی جس کے لیے برطانوی حکومت نے ان پر مکمل بھروسہ کر کے انہیں یہاں بھیجا تھا۔

تقریر کے بعد چائے پیتے وقت ایک جونیئر افسر نے کیپٹن ہائیگ سے کہا۔

"مجھے ایک شک ہے سر۔ اگر ہم محنت سے کچھ جگہ صاف کر کے ایک اچھا میدان تیار کرلیں تو بھی ہمیں اس سے کیا حاصل ہوگا، تھوڑے دنوں کے بعد وہاں پیڑ اور جنگلی جھاڑیاں اُگ آئیں گے۔"

کیپٹن ہائیگ اپنے خیمے میں بیٹھا تھا کہ اس کے ایک ماتحت نے اس کو خبر دی کہ تین جوانوں کو بخار آ رہا تھا اور وہ جہاز میں بستر علالت پر تھے اور اس لیے پریڈ میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔

'ملیریا؟'

'جی ہاں ساری علامتیں ملیریا کی ہیں۔'

اچانک ایک سپاہی پریڈ میں سے اچھلا۔ اس کے پاؤں پر ایک کیڑا چڑھ رہا تھا۔

'یہ کیا ہے؟'

'یہ کوئی بہت ہی عجیب سا کیڑا ہے۔'

مجھے امید ہے یہ زہریلا نہیں ہے۔

لیکن میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے مار گرایا تھا۔ یہ تو کوئی انتہائی زہریلا کیڑا لگ رہا ہے۔

خدا کرے۔ یہ بے ضرر ہو، یہ اس جگہ کی ایک اور اجنبی چیز ہے۔

یہ ایک کنکھجورا تھا۔

کیپٹن ہائیگ سمجھ گیا کہ اس جگہ رہنے اور کام کرنے میں جو دشواریاں ہیں وہ چند ہی دنوں میں اس کے جوانوں کا حوصلہ پست کر سکتی ہیں اس خطرے کو تاڑتے ہی اس کو اپنی ٹریننگ یاد آئی۔

کیپٹن بائیک کو یاد آیا کہ وہ اسی بات کی نزاکتوں پر تو پچھلے دن سوچ رہا تھا۔ لیکن ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کیونکہ اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر ہندوستانی مزدور لالچ یا ٹھیکہ دے کر لائے بھی گئے تو اتنے جوکھم بھرے کام کو وہ دل سے قبول نہیں کریں گے اور بالآخر واپس جانا چاہیں گے۔ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی یہاں ہندوستان کے جیلوں میں بڑے قیدیوں کو لایا جاسکتا ہے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یہ ہدایت جاری کر کے کہ زیادہ سے زیادہ ملزموں کو سزائے کالا پانی دیا جائے اس جگہ پر بھاری تعداد میں کام کرنے لائق لوگوں کو لایا جاسکتا ہے۔

اس نے سنجیدگی سے جوانوں کو دلاسا دیا۔

''ہم اس کا کچھ نہ کچھ مناسب انتظام کریں گے کیوں نہ ہم حکومت سے یہ کہیں کہ ان قیدیوں کو یہاں بھیج دے جو ہندوستان کے مختلف جیلوں میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ یا جن پر پھانسی کی سزا برحق ہو؟ اگر ضائع ہوتی ہوئی انسانوں جانوں کا اس قدر نتیجہ خیز استعمال ہوسکتا ہو۔ اس تجویز پر غور کرنا چاہیے۔

'یہ تو ایک قابل قدر خیال ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنی اس رائے کو فوراً آگے بھیجنا چاہیے۔'

کیپٹن بائیک نے سلوٹ لیا اور پریڈ گراؤنڈ سے جہاز میں آ گیا۔ جہاز سے ساحل کو ایک چھوٹی سی کشتی جوڑتی تھی۔ یہاں اور بندرگاہوں کی طرح کوئی جٹی نہیں تھی۔ دفتر کا بیشتر حصہ ابھی جہاز پر ہی تھا جیسے جہاز ان جزیروں میں آ کر بس ابھی لگا ہی ہو۔

کیپٹن بائیک ایک عام برطانوی طالب علم کی حیثیت سے جمہوری اقدار کے

بارے میں جو کچھ پڑھایا گیا تھا وہ سب کچھ بار بار ان غیر برطانوی علاقوں میں کام کرنے کی برطانوی پالیسیوں سے ٹکرا جاتی تھی۔ اسے بار بار ان فلسفوں سے اپنے ذہن کو صاف کرنا پڑتا تھا۔ اکثر وہ پوری ایمانداری سے کام کرنے کے لیے کسی ایسی منطقی نتیجے اور اصول پر پہنچنا چاہتا تھا جو ان برطانوی اقدار سے بھی میل کھاتا ہو لیکن انتہائی شبہے کی حالت میں بھی اسے ایک بات یاد رہتی کہ وہ برطانوی حکومت کا نمائندہ ہے اور اس کی پالیسیوں پر کام کرنا اس کی اہل ذمہ داری ہے صبح کی تیز روشنی میں ان جزیروں کے مناظر پورے آب و تاب کے ساتھ ابھر آئے تھے۔ اس لق و دق جزیرے میں ساحل کے قریب لگے خیموں کے سامنے اپنے خیمہ کے اندر چمکتی صاف ستھری میز پر ایک کاغذ نکال کر اور اپنے خیالات کو مجتمع کر کے کیپٹن بائک کلکتے میں مقیم اپنے حکام اعلیٰ کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ ایک خط لکھ رہا تھا جس میں اس کے ذہن کی ایک گھناؤنی سازش کاغذ پر اتر کر ہزاروں معصوموں کو پرندوں کی طرح پکڑنے والی تھی۔

اسنے لکھا تھا۔:

'' کلکتے سے مراسلہ و مواصلہ بہت ہی مشکل اور وقت طلب ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہوگا کہ یہاں کوئی عدالت قائم کی جائے۔ اس لیے ہر قسم کے اختیارات حتیٰ کہ عدلیہ کے اختیارات بھی یہاں کے جیلر کو ہی سونپ دیے جائیں۔ ہمیں یہ بات بھی نظر میں رکھنی پڑے گی کہ خاص ہندوستان میں تو بہت سارے جیل ہیں جن کے چاروں طرف دیواریں ہیں لیکن یہاں کوئی دیوار نہیں ہوگی، اس لیے قیدیوں کو فرار ہونے کی کوششوں سے باز رکھنے کے لیے کچھ سخت سزاؤں کے اختیارات دے کر جیلر کے ہاتھ کو مضبوط کرنا پڑے گا۔ مثلاً جیل سے فرار ہونے کی سزا 'موت' مقرر کر دی جائے اور اس میں ہمیں کوئی جھجک یوں نہیں ہونی چاہیے کہ انھیں یہ سزائے قید سزائے موت کے عوض میں ہی دی گئی ہے اور اگر وہ اپنے حدود سے آگے گزرتے ہیں تو ان کے لیے سزائے موت مناسب

ترین سزا ہوگی۔ اس کے علاوہ ان مجرموں کی فطرت ،خصلت کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ایک نہایت اہل جیلر کا انتخاب کرنا پڑے گا جو قید خانوں کے انتظام میں مہارت رکھتا ہو کیونکہ یہ کام انتہائی ندرت کا ہوگا۔ اس میں جیلر کے اوپر کوئی افسر نہیں ہوگا اور سارے فیصلے اسے خود ہی کرنے پڑیں گے ۔اس افسر کے اندر یہ خود اعتمادی بھی پیدا کرنی پڑے گی کہ یہاں کی چھوٹی موٹی پالیسی طے کرنے کی اسے مکمل آزادی حاصل ہوگی اور اس کے اختیارات حتمی ہوں گے تبھی وہ اپنے کو ہنگامی و انتظامی امور میں زیادہ وسعت نظری سے فیصلہ کرنے پر قادر محسوس کرے گا۔"

کلکتہ میں بائیک کی تجویز کے پہنچنے کے بعد اس تجویز نے انتظامی حلقوں میں تیزی سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ بائنک کو اس خیال کے لیے سراہا گیا اور ایک میٹنگ طلب ہوئی جس میں اس کے مختلف پہلوؤں پر غور وخوض ہوا اس تجویز کے مختلف قانونی، سیاسی اور عملی پہلوؤں پر رائیں ظاہر کی گئیں۔ ایک ممبر نے جس کا دماغ کافی قانونی تھا اور جس سے انتظامیہ کے لوگ اکثر نالاں رہتے تھے کہا۔

"حضرات! یہ تجویز یں اچھی ہے۔ لیکن مجھے یہ تشویش ہے کہ انتظامی ضرورتوں، انتظامی تدبر اور انتظامی اختیارات کے نام پر ہم اپنے ان بنیادی اصولوں سے دور جا رہے ہیں جن کے اوپر برطانوی انصاف کا پورا انتظام قائم ہے۔ ہمیں یہاں کے لوگوں کے بنیادی حقوق کا بھی دھیان رکھنا چاہئے۔ مجرموں کو جیل میں سزا کاٹنے کے لیے ڈالا جاتا ہے۔ ان میں کئی باعزت لوگ بھی ہوتے ہیں۔ کیا ہم ان کو بندھوا مزدور بنا سکتے ہیں؟ ان کی مرضی کے خلاف انھیں کام کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں؟ بغیر اجرت اور معاہدہ کے ہم ان سے کام لے سکتے ہیں؟"

ایک دوسرے افسر نے اس کو جواب دیا

'ہم ایک غیر ملک میں ہیں، ہمارا واسطہ برطانوی شہریوں سے نہیں ہے۔ یہ اور

لوگ ہیں اور اس ملک کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور فوجی صورتحال بالکل مختلف ہے۔ برطانوی شہری حق آزادی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے بھی بخوبی واقف ہیں اور انھیں از خود نبھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں ہماری جوابدہی اپنے ملک کے شہریوں کے تئیں ہے۔ جہاں تک یہاں کے لوگوں کا سوال ہے ان کی فکر آپ یا برطانوی شہری کیوں کریں؟ یہ جب اپنے حقوق کی بات کریں گے تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو اس ملک میں ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ برطانوی شہری کیا چاہتے ہیں؟ برطانیہ کے مقاصد کیا ہیں اور وہ کس طرح پورے ہونگے۔ ابھی ہمارے سامنے ضروری بات یہ ہے کہ انڈمان کو بسایا جائے۔'

چیرمین نے فیصلہ کن انداز میں میٹنگ کا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔

'برائے مہربانی آپ ایک فلسفی کی طرح بات نہ کریں۔ ہمارا فرض صرف اتنا ہے کہ ہم انتظامی امور میں کامیاب ہوں۔ ہمارے ملک کے قانون سازوں نے قانون کو عملی جامہ پہنانے کے طریقوں میں ہمارے لئے جو گنجائشیں رکھی ہیں اس کا اندازہ ہم بخوبی لگا سکتے ہیں۔ دراصل اس بات کی ہمیشہ ہی گنجائش رکھی جاتی ہے کہ چاہے قانون کسی بھی طرح کے بن جائیں حکومت ہمیشہ اس کی اہل رہے کہ اس کی بالادستی قائم رہے اور وہ جو چاہے وہ کرنے میں آخر کار کامیاب رہے چاہے بعد میں کچھ بھی ہوتا رہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو اس کی فکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ برطانیہ کے لوگ ان ہندوستانیوں کے لئے برطانوی حکومت سے ناراض ہونے نہیں جا رہے ہیں۔'

اور پھر چیرمین نے فیصلہ سنا دیا۔

الجھے ہوئے، ٹوٹے ہوئے، تباہ شدہ اخلاقیات کا مجسمہ بنے ہوئے لارڈ مار لے یہ فیصلہ سنانے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب وہ اپنے ڈرائنگ روم سے گزر رہے تھے اور اس کے بعد جب وہ اٹھانے کے میز پر بیٹھے تھے تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ تحت الشعور کی دنیا کہیں اندر اندر پگھل رہی تھی اور ایک نیا پیکر اختیار کر رہی تھی۔ میں تو کسی ایسی چیز کے دباؤ میں جھکتا جا رہا ہوں جسے میں خود بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

کالا پانی وجود میں آ گیا۔

❖❖

سوچتے سوچتے خالد سہیل کو تیز بھوک کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہ ڈیڑھ سو سال کی سیڑھیوں کی اونچائی سے نیچے اتر آیا۔

وہ ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھہرا تھا وہ تقریباً سو سال پرانا تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا جو اسے اپنی قدامت سے بخوبی اسے ماضی سے جوڑ رہا تھا۔ لکڑی کی دیواریں، شہ تیر، فرش، فرنیچر سب انڈمان کے جنگلوں کے بڑے بڑے درختوں کی لکڑیوں سے ہی بنے ہوئے تھے۔ یہ لکڑی کے مکان غالباً اس لیے بھی بنائے گئے تھے کہ یہ جزائر کسی ایسے آتشی لاوا کے اوپر کھڑے تھے جو گاہے بہ گاہے زلزلہ پیدا کرتا رہتا تھا۔ غالباً انہیں زلزلوں نے زمانۂ قدیم میں باہر کے حملہ آوروں کے اندر خوف پیدا کر کے ان جزیروں کو غلامی سے بچائے رکھا تھا اور غالباً بائیک ایسے ہی پراسرار نکات کو سمجھنے کی مسلسل کوششیں کر رہا تھا تا کہ وہ یہاں انگریزی حکومت کا خیمہ مضبوطی سے ڈال سکے۔

خالد کو یقین ہو گیا کہ کالا پانی مجرموں کو قید یا جلاوطنی میں رکھنے کی جگہ نہیں تھی بلکہ یہ ویران خطرناک اور لق و دق جنگلوں کو آباد کرنے کا ایک پروجیکٹ تھا۔

کالا پانی کے پہلے جیلر کو قیدیوں کی حیات اور موت پر جس قسم کے آمرانہ اختیارات دیے گئے تھے اس کے پیچھے پروجیکٹ کس طرح کارفرماں تھا یہ اب اسے صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جیلر کو جس چابک دستی سے ایک کاروباری کا پروجکٹ منیجر بنا دیا گیا تھا اس بات نے اس کو انگریزی ذہن کی سوچ سے روشناس کرا دیا تھا۔

یہ نیا رول خود کم نظر ڈاکٹر واکر کے لیے ایک چیلنج تھا۔ اس کو بند جیلوں میں

احساس جرم میں گرفتار مجرموں پر سختی کرنے کا تجربہ تو تھا لیکن ایسے ملزموں سے ان کو کھلے میدانوں میں چھوڑ کر کام لینا جن کو اپنی جان کی ہی پرواہ نہیں تھی اس کے تجربے سے باہر کی بات تھی لیکن انگریزی حکومت نے اسے ایک بھوتھری کلہاڑی کی طرح استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا انتخاب اپنے آپ میں ان افسروں کی ذہنیت کا غماز تھا جنہوں نے اس کو اس جگہ تعینات کیا تھا۔

کیپٹن بانیک کی تجاویز پر عمل درآمد کرنے کے لیے اس کی نزاکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے معقول جیلر کی تلاش شروع ہوئی جو جنگ آزادی کے طاقتور کرداروں کو بندھوا غلام بنانے میں کامیاب ہو پائے۔

اس زمانے کا ہر منظر خالد کے سامنے ایسے ابھرتا جا رہا تھا جیسے وہ انہیں مناظر کے آس پاس کہیں موجود ہو اور جیسے ان کو دیکھنا اس کے مقدر میں نوشتہ ہو۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا اس کا اگلا منظر کلکتے میں واقع تھا۔

چند روز بعد کلکتہ کے عالیشان دفتر کی بڑی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا افسر ڈاکٹر واکر سے کہہ رہا تھا۔

"پورے ہندوستان سے ہم نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ تمھیں انڈمان میں قیدی بستی آباد کرنا ہے، ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں، کہ تم کیسے یہ کام انجام دو گے۔ لیکن تمہاری اہلیت کا ثبوت اس بات میں مضمر ہوگا کہ تم جلد سے جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر کامیابی کا تمغہ حاصل کرو۔ ہم تمہارے اس طویل سفر اور مشکل کام میں کامیابی کی خواہش کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر واکر جو سرکاری زبان سے اچھی طرح واقف تھا اس نے اس آواز پر غور کیا۔

'ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ تم کیسے یہ کام انجام دو گے، ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔' یعنی مجھے اس بات کا پورا اختیار ملا ہے کہ میں ان قیدیوں کو جس طرح چاہوں استعمال کروں۔ اس نے اس نئے جیل کے قوانین کو جانچا اور پرکھا۔ 'جو بھاگنے کی کوشش کرے اسے قتل کی سزا جیلر خود دے سکتا ہے!' یعنی میں خود ان کی زندگی اور موت کا مالک ہوں۔ کوئی بھاگنے کی کوشش کرے نہ کرے... موت کی سزا تو میں دے ہی سکتا ہوں... اور پوچھنے والا کون ہوگا؟ کون گواہ ہوگا؟ اور جب ان کو اس سے کوئی مطلب نہیں تو وہ کیوں پوچھیں گے؟

'ہندوستان کے اس ظالم ترین جیلر کو گویا اپنے ظلم کے کرتب کو مکمل طور پر دکھانے کے لیے پہلی بار پورا موقع دیا گیا تھا۔' خالد نے سوچا۔ اتنے سارے انسانوں کی زندگی پر بے روک ٹوک اختیار... کوئی انگلی اٹھانے والا بھی نہیں یہ اختیار تو شاید دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل نہ ہو سکا تھا کہ انہیں بھی دیکھنے والوں کے ردعمل کا دھیان رہتا تھا۔

ڈاکٹر واکر کو محسوس ہوا کہ وہ دراصل پہلی بار اختیار کی بہترین اور اعلیٰ ترین لذت سے آشنا ہوا ہے۔ بڑی بڑی ہستیوں کو جو قیدی کے طور پر اسے دیے جا رہے تھے وہ اپنی مرضی سے کیڑوں مکوڑوں کی طرح مار سکتا تھا یا ان کی گردنیں پکڑ کر ان کا چہرہ پتھروں پر رگڑ سکتا تھا۔ دل ہی دل میں اس کے اندر جلد از جلد اس لذت سے ہمکنار ہونے کی خواہش پیدا ہوئی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے پردادا اسی زمانے میں کالا پانی لائے گئے تھے۔"

خالد کو خیال آیا۔

ڈاکٹر والکر کے ذہن میں کلکتے والے افسر کی گفتگو کی آواز سمندری لہروں کی طرح ابھرتی ڈوبتی رہی۔

'ہم نے تمھیں اس لیے طلب کیا ہے کہ تمھیں اب خصوصی مہم سونپی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی مختلف جگہوں پر کام کرتے ہوئے بہت سارے جیلروں میں سے تمہارا انتخاب تمہاری گذشتہ کارناموں کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اس لئے تم سے امید کی جاتی ہے کہ تم آئندہ بھی اپنے اس جذبے اور طریقہ کار کو مشکل سے مشکل صورتحال میں بھی قائم رکھو گے۔ ہم اپنے وفادار اور جفاکش ملازمین سے یہی امید رکھتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ تم ہمارے توقعات پر پورے اترو گے۔ تمہارے سامنے جو مہم ہے وہ چیلنج بھرا ہوا ہے۔ تمھیں جزائر انڈمان میں ایک قیدی بستی کا داغ بیل ڈالنا ہے۔ تمہیں وہاں جنگل صاف کروانا پڑے گا، کچھ عمارتیں بنانی ہونگی اور کچھ سڑکیں نکالنی پڑیں گی۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم کو کچھ قیدی دیے جائیں گے۔ تم ان کے لیے ایک سخت اور کڑا جیلر بنو گے گا۔ یہ قیدی اور قیدیوں سے مختلف ہیں۔ ان میں زیادہ تر انتہائی خطرناک باغی ہیں۔ ان میں زیادہ تر قیدیوں کو جزائر انڈمان میں جانے کے بعد پتہ لگے گا کہ وہ اپنے وطن میں لوٹ کر کبھی واپس نہیں آسکیں گے اور ان کی اپنے خاندان کے افراد سے زندگی بھر پھر کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ ان کے لئے یہ بات انتہائی تلخ ہوگی۔

ان کے ذہن میں بغاوت کی ہولنا کیاں اب تک تازہ ہیں۔ وہ آزادی چاہتے ہیں لیکن جانتے ہیں کہ یہ محض ایک خواب ہے۔ اور اس لیے وہ بے قرار ہونے یا غصہ ظاہر کرنے میں کسی بھی طریقہ کو استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جیل کے حکام کی کھلی نافرمانی کریں اور موقع ملنے پر ان پر حملہ کریں۔

یہ قیدی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ان میں کچھ ابھی چند ہی ماہ پہلے تک عوام

میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور لوگ ان کو رہنما سمجھ کر آنکھیں بند کرکے ان کے پیچھے چلنے کو تیار تھے۔

کچھ اور سمجھنا چاہو گے؟

ڈاکٹر والکر "ایک معمولی سی وضاحت۔"

"کیا؟"

"میں ایک وقت میں کتنے قیدیوں کو سزائے موت دے سکتا ہوں؟"

"As you think fit"

ڈاکٹر والکر اپنی قوم کی انگریزی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔

'میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔'

'فی الوقت تمھیں دو سو قیدی دیے جا رہے ہیں۔ وہاں جانے کے بعد تم صورتحال کا جائزہ لے کر اپنی ضرورت کے بارے میں لکھو گے۔ ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھو کہ برطانوی سرکار کے لیے یہ جزائر دفاعی نقطہ نظر سے انتہائی اہم ہیں، اگر تم یہ بات اپنے ذہن میں رکھو گے تو تم سے کوئی ناپسندیدہ غلطی سرزد نہیں ہوگی۔ ہم تمہاری ہر طرح سے ترقی چاہتے ہیں۔'

ڈاکٹر والکر کی مشکلوں کا اندازہ کوئی ادنیٰ ذہن بھی لگا سکتا تھا۔ کلکتہ میں مقیم ہائی کمان کے برٹش حکام اس سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کے مدنظر انہوں نے ڈاکٹر والکر کو خاموشی سے ایسے اختیارات سے مسلح کر رکھا تھا جن کا مجرموں کے خواب و خیال میں بھی آنا

ناممکن تھا۔

سکریٹریٹ سے باہر آنے کے بعد ڈاکٹر والکر کا ذہن دیر تک اس نئی ذمے داری کے مشکل دکھائی دینے والے پہلوؤں میں الجھا رہا۔ وہ اس نئے چیلنج کے بارے میں یہ سوچ کر نروس ہونے لگا کہ اگر وہ مجرموں کو قابو میں نہیں لا سکا تو اس کی یہ ناکامی اس کے کیریئر کو برباد کر سکتی ہے لیکن پھر اس کو اپنے وہ غیر معمولی اختیارات یاد آئے جو شاید دنیا میں پہلی بار کسی جیلر کو ملے تھے۔

I shall hang bloody all of them !

سب کو لٹکا دوں گا اور نئے لوگ منگاؤں گا اور اگر وہ بھی قابو میں آنے سے انکار کریں گے تو ان سب کو بھی لٹکا دوں گا اور دوسرے لوگوں کو منگاؤں گا۔

اس کی سوچ آواز بن کر اس کے بڑبڑاتے ہوئے ہونٹوں سے باہر آنے لگی تھی۔ اور وہ دیر تک اپنے اندر کے تناؤ کو خارج کرتا رہا۔

اور اب وہ اپنے تخیل میں اس جگہ آ گیا تھا جہاں سے ایک جہاز کالا پانی کے لئے روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ جگہ ہبلی ندی کا کنارہ تھی۔

قیدیوں کو کلکتہ کے جیل کے خیمے لگے احاطوں سے زنجیروں میں قطار میں باندھ کر لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

”برہمن اور شودر کو ایک ساتھ نہیں باندھنا ہے۔“

کوئی افسر ہدایت دے رہا تھا۔ قیدیوں میں ایک قیدی پوربی یو۔ پی۔ کا رہنے والا مشرا تھا۔ مشرا کو ایک ایسی قطار میں باندھا گیا تھا جس میں زیادہ تر شودر تھے، وہاں سے نکال کر دوسرے گروہ میں لے جایا جانے لگا۔ اسے اطمینان کا احساس ہوا کہ یہ انگریز کم از کم اتنے جنگلی نہیں ہیں۔ جہاز کے قریب لا کر انہیں جانوروں کی طرح جلدی چڑھنے کے لیے کہا گیا تو ڈاکٹر والکر کے اشارے پر مشرا کو بھی بیٹھک کے اوپر ایک کوڑا لگا۔ مشرا کو اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ جلدی کرو، جلدی کرو۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں سے خالد نے چند دنوں پہلے پورٹ بلیر کے لئے پرواز کیا تھا۔ خالد اب خیالی نہیں بلکہ اصلی منظر کو دیکھ رہا تھا۔

جہاز اب ہبلی ندی کا کنارہ چھوڑ رہا تھا۔

قیدی زنجیروں میں بندھے اس مادر وطن کو نم اور اداس آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو ان کی کوئی مدد نہیں کر پا رہی ہے۔

مشرا نے دور جاتے ساحل پر آخری نظر ڈالتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر وطن کو پرنام کیا۔ پھر اس نے گھوم کر دوسرے قیدیوں کو دیکھا جو اب اس کے ساتھی ہو چکے تھے۔ ان سے اس کی پچھلے دس پندرہ دنوں میں خاصی جان پہچان ہو چکی تھی۔ ان میں وہ بہار کا ایک پہلوان تھا جو قید میں بھی کسرت کرنے سے نہیں چوکتا تھا اور گھی دہی کثرت سے کھانے کے فائدے بتاتا رہتا تھا۔ وہ گروہ بنا کر کسی کی زمین دخل کرنے گیا تھا اور اس جھگڑے میں تین لوگوں کا قتل ہو گیا تھا۔

ہندوستان کے ساحلوں کو سبز رنگ میں ڈھکنے والے جنگل آنکھوں سے اوجھل ہو رہے تھے اور جہاز اپنے آگے بڑھنے کا راستہ تلاش کرتا ہوا آخر کار اپنی پوری طاقت سے سمندری لہروں پر چڑھتا اترتا تھپیڑوں سے ٹکراتا آگے بڑھنے لگا۔

مشرا کی نظر بائیں جانب اس مجنوں نما آدمی پر پڑی جو راجستھان کے ریگستانی علاقے کا رہنے والا تھا۔ مجنوں نے بھی اس کو دیکھا تو نہ جانے کیوں مسکرایا۔

مجنوں نما داڑھی والا ادھیڑ عمر، سوچتا بہت تھا۔ اس وقت بھی اس کا دماغ دور دور تک جا رہا تھا۔ جہاز ساحل سے دور سرکتا جا رہا تھا اور سبھی بے چینی سے ساحل کو دیکھ رہے تھے کیونکہ اس سے پیدا ہونے والی اداسی ان کی روح کو سکون دے رہی تھی لیکن اس کا دھیان کہیں اور چلا گیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ساحلوں سے دور جانا کسی پھانسی گھر میں لٹکنے جیسا ہے۔ اس نے قول پور کے قلعے کا پھانسی گھر دیکھ رکھا تھا۔ جیسے جیسے جہاز جتی اور سمندری کا کنارہ چھوڑ کر ساحل سے دور ہوتا گیا اس کے اندر وہی خوف جاگنے لگا جو اب سے بیس سال پہلے اس پھانسی گھر کو دیکھتے ہوئے پیدا ہوا تھا۔ پھانسی گھر دور سے دیکھنے میں ایک بلند کمرہ جیسا تھا جس میں ایک پتلی سی ایسی گلی جاتی تھی جس میں دونوں طرف اونچی دیواریں تھیں۔ غالباً اس لیے کہ پھانسی کے لیے لے جاتے وقت بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ قیدی کسی طرح چھوٹ جائے اور بھاگ جائے یا کھلے راستے پر آ کر بھاگنے کی کوشش میں اچھل کود کرنے کی خوامخواہ

کوشش کرے کیونکہ اس وقت اس کو کچھ بھی کرنے سے کسی دھمکی سے یا ڈسپلین کے نام پر روکا نہیں سکتا تھا۔

اس گلی سے پھانسی کے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ایک کشادہ جگہ تھی۔ اس کی بھی چہار دیواری کافی اونچی تھی اور اس کے چاروں طرف برچھیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ سب دکھاتے ہوئے گائڈ اسے پھانسی گھر کے اندر لے گیا تھا۔ جب اس نے پھانسی گھر کا دروازہ کھولا تو سامنے ایک موٹی سی رسی، جس میں قیدی کی گردن میں ڈالنے کے لیے بنا ہوا پھندا لٹک رہا تھا، جھولتا ہوا دکھائی دیا جس کی گانٹھ تیل پلائی رسی پر آسانی سے سرکنے والا تھا۔ پھندے کی اونچائی لگ بھگ آدمی کی گردن کے برابر تھی۔ پھندے کے نیچے فرش پر پتھر یا سیمنٹ کے بجائے لکڑی کا تختہ لگایا گیا تھا جس سے لوہے کی کچھ سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ یہ سلاخیں پانچ چھ فٹ آگے جا کر ایک تین فٹ اونچے لوہے کے دستانے سے ملی ہوئی تھیں۔ گائڈ نے بتایا کہ پہلے قیدی کو پھندے کے نیچے لکڑی کے تختے پر کھڑا کیا جاتا ہے اور اس کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے تھوڑا سا کس دیا جاتا ہے تاکہ قیدی سر کو ہلا کر پھندے سے نکل نہ سکے۔ لیکن پھندے کو گردن میں پوری طرح نہیں کسا جاتا تھا تاکہ اس کی سانس چلتی رہے۔ اس کے بعد اس کو مارنے کے لیے چار پانچ فٹ دور لگے ہوئے لوہے کے اس ہینڈل کو پیچھے کھینچا جاتا ہے۔ ہینڈل کو کھینچتے ہی لوہے کی وہ ٹکڑا جس پر لٹکنے والا لکڑی کا تختہ دوسری طرف سے ٹکا ہوتا ہے پیچھے ہٹ کر لکڑی کے تختے کو بے سہارا کر دیتا ہے اور تختہ نیچے گر کر ایک طرف جا لٹکتا ہے۔

گائڈ نے لکڑی کے تختے کو ہینڈل کھینچ کر دکھایا۔ تختے کے گرتے ہی اس کے ٹھیک نیچے ایک پتلا سا کنواں دکھائی دینے لگا۔ گائڈ نے بتایا کہ تختے کے گرتے ہی گویا قیدی کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک جاتی ہے اور وہ ہوا میں جھول جاتا ہے اور پھندا ایک جھٹکے کے ساتھ گردن میں کستا ہے اور اس کے دباؤ سے گردن کی نرم والی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے کیونکہ وہ آدمی کے بدن کا پورا بوجھ برداشت نہیں کر پاتی اور اس طرح قیدی کو کوئی اور نہیں مارتا بلکہ وہ

اپنی ہی بوجھ کو اپنی گردن پر برداشت نہیں کر پانے کی وجہ سے مر جاتا ہے۔ ہم صرف اپنا تختہ بنا لیتے ہیں۔" جلاد کے پوتے کی باتیں اس دن کے بعد خالد کے ذہن میں مسلسل گونجتی رہیں اور وہ غور کرتا رہا کہ ظلم کرنے والے اور مارنے والے اس بات کا کتنا اہتمام کرتے ہیں کہ کسی ظلم اور بے رحمی کا الزام ان کے اوپر نہیں آئے اور اس کے لئے وہ کس گہرائی سے مظلوموں کی نرم ہڈیوں کو ٹٹول کر اس میں پھندا ڈالتے ہیں اور اس طرح وہ اکثر انسانی اقدار کی عدالت میں مجرم ٹھہرائے جانے سے صاف بچ جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ ہندوستان کے جنگلوں، پہاڑوں اور بستیوں کی جگہ اب چاروں طرف صرف جہاز کے چپوؤں کی آوازوں اور سمندری لہروں اور لامتناہی دوری تک پھیلے آسمانوں نے لے لیا تھا۔ یہ آسمان وہ نہیں تھا جو قیدیوں نے اپنے گھروں کے آنگنوں سے رات میں چارپائی پر لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ آسمان کا وہ حصہ تھا جدھر صرف پانی ہی پانی تھا۔

سفر کے دوران جہاز کے ڈیک پر ایک قیدی جو پیاس کی شدت سے کراہ رہا تھا، ایک سفید چرم کو دیکھ کر گڑگڑایا۔

پانی!

ایک پورا جملہ جو اگر مختصر نہ ہو تو اس کی شدت کم ہو جائے۔

اس سفید چرم کے ساتھ دو تین اور سفید چرم تھے۔ سفید چرم کا چہرہ ہلکا سا گھوما گویا غلطی سے گھوم گیا ہو اور پھر وہ اپنی گفتگو میں مشغول ہو گیا۔ اس دوران ڈاکٹر والکر ادھر آیا۔

اس کے منہ میں دھوپ سے گرم سلاخیں رکھ دو!

اگر منہ نہ کھولے تو منہ کھول کے رکھ دو!"

سفید چرم سپاہی سکتے میں آ گیا تو ڈاکٹر والکر نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

'ان کو بتلا دیا گیا ہے کہ پانی ان کو چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار ملے گا... لیکن وہ اس کی خلاف ورزی کر رہا ہے، اس کو اچھا سبق دو۔ وہ کرو جو میں نے کہا۔ یہ جیل کی زندگی ہے...... تم لوگ اس سے واقف نہیں ہو۔ اس لیے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ غور سے سنو اور اس پر بغیر تعجب کیے عمل کرو۔ ابھی آگے انڈمان میں اس سے بھی آگے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔ ڈاکٹر والکر نے بالکل خشک، سخت اور حاکمانہ لہجہ میں سامنے ادب سے کھڑے سپاہیوں کو ہدایت دی۔ اور پھر گھوما اور چلا گیا اور اپنے پیچھے بھاری بوٹوں سے اٹھنے والی ٹھک ٹھک کی آواز...... اور پھر اس کے بعد کی بھیانک خاموشی چھوڑ گیا۔

پھر فوراً ہی ایک سپاہی باہر آیا اور آواز لگائی۔

'سب ڈاکٹر والکر کے سامنے جاؤ!'

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر والکر کا پورا عملہ اس کے سامنے تھا۔ "میں نے یہ ہدایت دینے کے لیے بلایا ہے کہ تم ان قیدیوں سے کسی قسم کی گفتگو نہیں کرو گے۔ ان کی کسی مانگ کو نہیں سنو گے۔ ان کی کسی تکلیف کو ہمدردی سے نہیں سنو گے ورنہ ان کی ہمت افزائی ہو گی اور یہ ہم سے باتیں کرنے اور اپنی تکلیفوں کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان کو کھانا، پانی اور دوائیں اور دوسری ضرورت کی چیزیں اسی طرح سے دینا ہے جیسا مقرر کیا گیا ہے۔ جب وہ کچھ کہنے کی کوشش کریں تو تم اپنے کام میں مشغول رہو اور اپنا کام ختم کرنے کے بعد واپس آ جاؤ۔ اگر وہ شور مچائیں اور کوئی ناگوار اور نامناسب بات خواہ مخواہ کریں تو جواب منہ سے

نہیں بوٹ اور گرم سلاخوں سے دو۔ بغیر کچھ بولے ہوئے۔''

اس نے نظریں اٹھا کر قیدیوں کو دیکھا۔

" I know those bastards."

یہ تو سب کو باسٹارڈ ہی سمجھتا تھا۔ ممکن ہے اس نے کبھی میر علی کو بھی باسٹارڈ کہا ہو۔'باسٹارڈ ڈاکٹر والکر، باسٹارڈ یہ قیدی نہیں، باسٹارڈ تم ہو۔ لیکن تم اس وقت ایک ایسے جہاز کے ڈیک پر ہو جس پر برطانوی سامراج کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اس لئے یہ سارے قیدی باسٹارڈ ہو چکے ہیں اور یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ باسٹارڈ تم اور باسٹارڈ وہ سارے مورخ ہیں جنہوں نے تمہاری ہی طرح زبردستی غلط تاریخ لکھی۔ لیکن تمہیں کیا معلوم تھا کہ میں تمہارے اس جہاز کا پیچھا کروں گا اور دریافت کروں گا کہ باسٹارڈ کون تھا۔ اور ثابت کروں گا کہ میر علی باسٹارڈ نہیں تھے بلکہ باسٹارڈ تم تھے۔

خالد نے سوچا۔' طاقتور کمزوروں اور شریفوں کو باسٹارڈ کہتے ضرور ہیں لیکن دراصل باسٹارڈ وہ خود ہوتے ہیں۔'

اور ڈاکٹر والکر خود ہی کتنا باسٹارڈ ہے۔ یہ کہتے ہوئے خالد کو بار بار یہ خیال آیا کہ حرامکاری سے پیدا کی گئی اولاد کو گالی کے طور پر باسٹارڈ کہنا بھی ایسے ہی درندہ خصلت انسانوں کا شیوہ ہے۔ وہ جو بار بار اپنے دل میں باسٹارڈ لفظ استعمال کر گیا تھا۔ اس کے لئے اس نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے کو چپت لگائی۔

اس کی نظر میں ڈاکٹر والکر اب ایک ایسا جانور دکھائی دینے لگا تھا جس کے سامنے درندہ بھی معصوم لگنے لگا تھا۔ کمینہ اور بے رحم۔ وہ سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔

'ان کی ہر ایک حرکت کے لیے ہم نے ایک مخصوص سزا مقرر کر دی ہے۔ اگر وہ

اپنی تکلیف کا اظہار منہ سے آہستہ آواز میں کریں تو بوٹ سے گال میں مارو۔ اگر اونچی آواز میں کریں تو منہ یا ہونٹ پر بوٹ سے اتنی زور سے مارو کہ کم از کم خون نکل آئے۔ اگر کوئی چیز مانگیں تو گرم سلاخیں منہ میں ڈال دو۔ اگر ضرورت سے زیادہ بولیں تو زبان نکال کر اس میں لوہے کی رنگ ڈال دو تاکہ زبان دوبارہ اندر نہ جا سکے اور جو بھاگنے کی کوشش کریں تو پہلے ان کو سانپ کی طرح کچل کچل کر ادھ مرا کرو۔ ان کو ان کی اوقات بتاؤ اور اس کے بعد ہینگ کردو۔

"I know those bastards very well."

اس بات کا خاص دھیان رکھو کہ سزا دینے کے بعد ان کو بتاؤ کہ ان کا کون سا عمل جرم ہے اور اس کی کیا سزا مقرر ہے۔

یہ سزا دینے کا 'ڈاکٹر والکر' کا اپنا اسٹائل ہے۔

'باسٹارڈ' خالد کے ذہن میں اس لفظ کے ساتھ ڈاکٹر والکر کا اپنا ہی چہرہ ابھرا۔

ہدایات دینے کے بعد ڈاکٹر والکر اپنے کیبن میں ٹوائلٹ چلا گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر آیا۔

وہ بہت اکتایا سا محسوس کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو جو ذمے داری دی گئی ہے اس میں کامیاب ہونا آسان بات نہیں۔ اس نے ڈیک پر نیم مردہ حالات میں پڑے قیدیوں کو دیکھا تو اسے خیال آیا کہ یہ سب وہ قیدی وہی ہیں جنہیں کبھی سے بھی موت کا خیال پریشان کرتا دکھائی نہیں دیتا اور ان کو قابو میں لانے کے لیے اس کے ہاتھ میں موت کی چھڑی دی گئی ہے۔ اسے خیال آیا کہ وہ مختلف اذیتوں سے قیدیوں سے ان کی ریڑھ کی ہڈیوں میں گڑے ہوئے راز تک کو اگلوا لیتا تھا اور بڑے بڑے بدتمیزوں کو سیدھے راستے پر کھڑا کر دیتا تھا لیکن یہ دونوں باتیں اور تھیں۔ اگر وہ ان قیدیوں کو اذیتیں دے کر انہیں نڈھال کرے گا تو ان سے کام کیسے لے گا۔ اس کے ذہن میں کوئی تدبیر آ نہیں

رہی تھی۔ اذیت تو قیدیوں کو موت پر آمادہ کر دیتی تھی لیکن موت کے خوف سے اذیت برداشت کرنے والے اس نے نہیں دیکھے تھے۔ اذیت دینا تو اس کے اختیار میں تھا اور اذیت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ وہ آدمی کے جسم اور دماغ کو اس کے اختیار سے باہر کھینچ لاتی ہے اور آدمی نہ چاہتے ہوئے بھی اس وقت سب کچھ کہہ دیتا ہے جب اذیت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے یعنی مسلسل اذیت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور موت کا کوئی راستہ یا طریقہ دکھائی نہیں دیتا تب لیکن قیدیوں کو اذیت دے کر کام کرنے پر آمادہ کرنا بالکل الگ بات تھی۔ اس لئے یہ ناقابل عمل خیال بڑے افسروں کے دماغ میں تو آ سکتی تھی لیکن اس جیسے تجربے کار جیلر کو معلوم تھا کہ اس خیال میں کتنی فاش غلطی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ڈیک سے گزرتا ہوا جہاز کے اگلے حصے میں واقع جہاز کے کیپٹن کے کیبن کی طرف چلا گیا۔

دونوں کئی گھنٹے ادھر ہی گپ شپ میں لگے رہے۔ پھر قیمتی شراب کی بوتلیں نکالی گئیں۔ اور نقوش سے مزین گلاس میں نیم سرخ جھلملاتی شراب ڈالی گئی۔ دونوں نے چیرز کیا اور پھر ایک گھونٹ لینے کے بعد ڈاکٹر والکر کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری۔

"دیکھو مجھے کتنا مشکل کام دیا گیا ہے۔ ان قیدیوں کی صورت دیکھ کر ہی لگتا ہے کہ یہ کسی کام کے نہیں ہیں۔ یہ سب بڑے مشکل قسم کے انسان لگ رہے ہیں۔ ایک تو یہ عام طرح کے مجرم نہیں ہیں۔ اچھے خاندانوں میں ناز اور پیار سے پالے ہوئے عیش وعشرت کی زندگی بسر کیے ہوئے لوگ ہیں جنھوں نے پھاوڑا اٹھانا تو کیا اب تک بہتوں نے شاید پھاوڑا دیکھا بھی نہ ہوگا۔ اس کام کے لیے تو مکمل طور پر غیر تربیت یافتہ ہیں۔ مہینوں تو ان کو تربیت دینے، ان کے دماغوں کو توڑنے اور درست کرنے اور اس کام کے لیے مناسب بنانے میں لگ جائیں گے۔ مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ یہ جلد بیمار پڑیں گے، اس لیے کہ خط استوا کے قریب کی آب وہوا کو شاید برداشت نہ کر سکیں۔ بیمار ہونے پر تو ان سے کام لینا ناممکن ہوگا۔ اور ہمارے جو کام کریں گے وہ بھی بہت کم اور اطمینان بخش نہیں ہوگا .... لیکن مجھے امید ہے کہ چند مہینوں میں یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر والکر نے بشاش چہرے کے ساتھ

فخریہ کہا۔

"وہ تو ابھی بالکل پیلے پڑ گئے ہیں، مجھے تو اندیشہ ہے کہ وہ پورٹ بلیر تک بھی زندہ نہیں پہنچ سکیں گے۔" کیپٹن نے رائے دی۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو بیکار اور کمزور ہیں اگر وہ ختم ہو جائیں تو اچھا ہی ہے۔ میرا سر درد تو کم ہو جائے گا۔ میں پھر کچھ ان کی جگہ پر دوسرے مضبوط اور توانا مجرموں کو تو مانگ سکتا ہوں۔

"ایسے لوگوں کو ختم کر دو...... اور ایک حکومت برطانیہ کے لیے رپورٹ بھیج دو کہ ملیریا سے مر گئے تا کہ وہاں کوئی بات نہ اٹھا سکے۔"

"ہاں یہ تو ہم بھی کر سکتے ہیں، سب سے آسان راستہ تو یہ ہے کہ ان کو بھاگنے کے الزام میں ختم کر دیا جائے۔ اور ریکارڈ کی مناسب خانہ پر کر دی جائے ...... یہ تو خیر کوئی مسئلہ نہیں۔"

اور پھر گفتگو نے دوسرا موڑ لے لیا...... برطانیہ...... اور برطانیہ میں ہو رہے پارلیمانی سوالات اور فیصلے اور سیاسیات...... اور سمندری زندگی...... اور پھر کھانے کے وقت ہنسی مذاق اور لطیفے کا سلسلہ چلتا رہا......

'شب بخیر' گرمجوشی سے کیپٹن سے ہاتھ ملایا...... اور اپنے کیبن کی طرف چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد...... بستر پر دراز ہو کر محوِ خواب ہو گیا!

ادھر ڈاکٹر والکر ان قیدیوں کے کردار کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہا تھا

کہ ان کو قابو میں لانا کتنا مشکل ہوگا۔ ادھر ان قیدیوں کی حالت ٹھیک اس کے برعکس تھی۔

وہ باہر مردہ سے، تھکے، ہارے پڑے تھے۔

ڈاکٹر والکر نے اپنے دل میں سوچا اس وقت یہ خطرناک قیدی اپنے دل میں شاید زہر پیدا کر رہے ہوں گے۔ بے گناہ قیدیوں کے بارے میں اس کے یہ اندیشے اور خیالات انتہائی ظالمانہ رویے کی مثال تھی کہ اس وقت ان کے عزائم، جنگِ آزادی کے سارے خیالات، اور اپنے دلکش ماضی کے واقعات، یادیں، رشتہ دار سب بہت اہم ہونے کے باوجود ذہن میں ایسے سو گئے تھے جیسے کوئی بند کتاب جو اتنے دنوں سے بند ہو کہ اس سے کاغذ کی مخصوص بو آنے لگی ہو۔

'ان کے اندر اتنی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں ٹھیک سے سوچ سکیں۔' خالد اپنے ذہن میں ابھرتے چہروں کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

حالات کی تبدیلی اور تہہ و بالا ہو جانے کے بعد انسان کہاں سے کہاں نہیں پہنچ جاتا...... اور کیا سے کیا نہیں ہو جاتا ہے۔ پھول جیسے بچے جھریوں پڑے بوڑھے بن جاتے ہیں۔ محل کھنڈر بن کر بھوت نما ہو جاتے ہیں، مالک غلام بن جاتے ہیں اور بادشاہ تخت سے اتر کر جھاڑو دینے لگتے ہیں۔

'کتنی تازہ تھی یہ ان کی کہانی۔'

اس کے ذہن میں شاعرانہ تخیل کی ایک لکیر کی طرح مسلسل ان مناظر پر تبصروں کی ایک آواز آ رہی تھی۔ 'ہندوستان کی زمین کے سرخ رو چہرے جن کے جاہ و جلال کو دنیا سلام کرتی تھی، جن کے یہاں سفید و سرخ بالوں والے سوداگر بن کر گھومتے تھے، آج اس جہاز پر ایک معمولی جیلر کے کمان میں سفر کر رہے ہیں۔'

ان کی شخصیتیں آج کتنی مردہ، گمنام دھندلی ہو گئی ہیں۔ زندگی کی دوڑ دھوپ اور بے حد مشغولیات میں آج کے انسان پھنس کر کتنے گم ہو گئے ہیں کہ ان کے ماضی کے آباؤ اجداد کی یہ کہانیاں بھی اب ایسی قبریں بن گئی ہیں جن پر گھاس اُگ آئی ہے اور بستیوں سے دور کہیں انجان جگہوں پر بغیر چراغ، بغیر فاتحہ، گم ہیں۔ ہر شے یوں ہی بدلتی ہے۔ سو وہ بھی جو جہاز پہ تھے وہ صرف چند دنوں میں جنگِ آزادی کے بڑے کارنامے انجام دینے والے جانباز سپاہی اور شعلہ فشاں مقرر سے کمزور و نحیف، خاموش، بیگار قیدیوں میں تبدیل ہو کر کھنڈر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر والکر نے اپنے اختیارات کے خیالات سے ذہن و دماغ کو نشہ آور کر کے ان قیدیوں کی طرف دیکھا جن کی زندگی اور موت پر اس کو اس قدر اختیار حاصل تھا جیسے کسی شخص کو اپنے مرغوں اور مرغیوں پر... جیسے کسی شیر کو اپنے پنجے میں دبے ہوئے چھوٹے جانور پر... اس کو یونہی محسوس ہوا جیسے اس کے تمام جسم میں بازوں، پاؤں کے جوتوں، سینے حتیٰ کے گردن اور مغز کے اندر اختیارات کے چشمے پھوٹ پڑے تھے جو آہستہ آہستہ نالا، اور پھر دریا، اور پھر سمندر بن گئے جہاں دور دور تک حد نظر سے آگے تک اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر طرف صرف وہ تھا۔

جب بھی قیدی تنہا ہوتے تو انگریز جیلر کے اس عجیب سلوک سے شدید نفرت کا اظہار کرتے جیسے اس کے سلوک میں کوئی ایسی بات ہو جس کی وہ بالکل توقع نہیں کرتے تھے۔ اور یہ بات تھی انگریز افسر اور سپاہیوں کی انہیں نسلی بنیاد پر اور قومی بنیاد پر ذلیل کرنے کی عادت۔ انہوں نے اپنی ہار تسلیم کر لی تھی لیکن ان سے یہ ذلت برداشت نہیں ہوتی تھی۔ جب بھی جیلر ان کو اس بنیاد پر نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ وہ ہندوستانی ہیں تو ان کا سرد پڑا ہوا خون کھول جاتا تھا اور تب انہیں خیال آتا کہ انگریزوں سے جنگ میں ہار ہونے میں ہوا کیا تھا۔ وہ سوچتے کہ اگر ہندوستانیوں کو معلوم ہوتا کہ انگریز انہیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں تو شاید کبھی بھی ہندوستان ان کے ہاتھ نہیں لگتا لیکن سادہ لوح ہندوستانیوں نے تو جنگ اور حکومت

کو صرف لڑنے بھڑنے' بانٹنے کھانے اور مونچھیں اینٹھنے کا کھیل سمجھا لیا تھا۔

جہاز پر سفر کے دوران مجنوں نما داڑھی والا ادھیڑ عمر قیدی اچانک ایک سپاہی پر چیخ پڑا۔

'تم ہمیں سزا دو نا قانون کے مطابق۔
جرم کی سزا دے تو رہے ہو۔
پھر تم ہمیں ذلیل کیوں کر رہے ہو؟'

آواز سن کر ڈاکٹر والکر وہاں آ گیا۔

'تم نے ہمیں سزا سنا دی تو کیا ہم انسان نہیں رہے؟
پھانسی دو پھانسی اگر دے سکو' خصی مت بناؤ۔

سپاہی خاموشی سے چیختے ہوئے قیدی کو سنتا رہا۔

قیدی اسے گھورتے ہوئے دیکھ کر اور بھی بلند آواز میں بولنے لگا۔

'کیا کرے گا تو؟ پھانسی دے دیگا۔؟'

ڈاکٹر والکر نے دو سپاہیوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

'"Throw him in the sea."

سپاہیوں نے اسے پکڑ کر نیچے سمندر میں پھینک دیا۔

نیچے گرتے ہی قیدی کی چیخ ایک لمحے میں ختم ہوگئی۔

دوسرے قیدی ایک دوسرے کی طرف صرف دیکھ کر رہ گئے۔

ڈاکٹر والکر ڈیک سے ہو کر اپنی کیبن کی طرف جا رہا تھا۔

اسے خیال آیا۔

'میں جلاد نہیں... میں دنیا کا... دنیا کی تاریخ کا سب سے طاقتور... اور زیادہ اختیار والا جیلر ہوں... جیلر... ج ے ل ر... جلاد تو جج کے حکم کا غلام اور سرکار کا مزدور ہے۔ جج تو خود بھی اپنی مرضی سے کسی کو پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا۔ مجرم ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک جا سکتا ہے۔ لیکن میں وہ جج ہوں جس کو یہاں کسی کو سزائے موت دینے کے لئے کسی اوپری جج، کسی گواہ، کسی وکیل، کسی دلیل، کسی سوائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اتنے سارے لوگوں کی زندگی کا تنہا مالک ہوں۔ میں ان سے جو چاہوں کرا سکتا ہوں...... جو چاہوں منوا سکتا ہوں۔ اور جب تک چاہوں انھیں زندہ رکھوں اور جب چاہوں انھیں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں!'

اس نے ایک بار پھر ان قیدیوں کو دیکھا۔ جہاز کو دیکھا۔ سامنے جو کچھ دکھ رہا تھا اس کو غور سے دیکھا... کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں ہے...... کیا حقیقت میں ایسا ممکن ہے۔ اس نے کئی بار۔ دوسری بار، تیسری بار، چوتھی بار اس افسر کے جملوں پر غور کیا۔ کہیں میں نے غلط تو نہیں سمجھ لیا تھا۔ نہیں وہ تو بالکل وہی کہہ رہا تھا۔ 'ڈاکٹر والکر، ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ تم یہ کام کیسے کروگے۔ پورے ہندوستان سے ہم نے تمہارا انتخاب کیا ہے کیوں کہ قیدیوں کو قابو میں کرنے کے فن میں تم ماہر سمجھے جاتے ہو اور یہ تمہاری وہ شہرت ہے جو تمہارے کیریر کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ ہمیں اس سے بالکل کوئی مطلب نہیں کہ تم یہ کام کیسے کروگے۔ تمہاری اہلیت کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم جلد سے جلد اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرو۔' نہیں یہ خواب نہیں، یہ حقیقت ہے۔ بالکل حقیقت ہے۔

میرا کام اہم ہے۔انتہائی اہم ہے۔

سمندری سفر کے دوران تمام وقت وہ قیدیوں پر اپنے کارروائی کے ابتدائی مشق و آزمائش کرتا رہا تھا۔اس نے حکم دیا تھا کہ قیدیوں کو دن بھر کھلی دھوپ میں رکھا جائے اور پینے کے لیے پانی صرف ایک وقت دیا جائے اور کھانے کے لیے سڑے ہوئے چاول بغیر دال اور سبزی کے دیے جائیں تا کہ دوران سفر قیدیوں کو بار بار ضروری حاجات کے لیے نہ جانا پڑے اور اپنی جگہ پر پڑے پڑے وہ پیشاب پاخانے سے جہاز کو گندہ نہ کریں۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے یہ قیدی سفر طے کرتے رہے۔کبھی کبھی ان کو خون کی قے آجاتی اور جہاز کا فرش سرخ ہو جاتا۔قیدیوں کو کھانا اور پانی ایک ہی برتن میں ڈال دیا جاتا تھا اور وہ زنجیروں میں بندھے ہاتھوں سے نکال نکال کر کھانا کھاتے اور پانی پیتے اور کرتے جاتے اور زنجیروں کی آواز کھنکھناتی رہتی۔

نتیجتاً قیدی جو بنگال کی کھاڑیوں میں آتے ہی اپنی بھوک کے باوجود سمندر کے بدلتے ہوئی رنگ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ایک ڈیڑھ دن کے بعد نیند اور تھکن سے بوجھل ہو کر جھولنے لگے اور سمندر کے سارے نظارے، اور وطن کی ساری یادیں ایک دھند میں ڈوبتے ڈوبتے بالکل غروب ہو گئیں اور تھکے تھکے ذہنوں پر ایک کیچڑ نما سائے کے علاوہ اور کچھ نہ رہ گیا۔حتی کہ جہاز کے عملہ بھی ایک دھند سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے ہی ان کی توجہ کو مبذول کراتے اور پھر جیسے دھند میں ہی کھو جاتے...اور اس طرح قیدی دھند، تھکن، اور مایوسی کی بے پناہ تاریکی میں لپٹے سمندر میں کئی روز تک سفر کرتے رہے۔اکثر ان کو خود محسوس ہونے لگتا کہ وہ زندہ نہیں، مردہ ہیں۔

مہینوں تک قید خانوں میں رہتے رہتے ان کے جسم کا گوشت پوست تو یونہی کم ہو گیا تھا۔چہرے پھیکے ہو گئے تھے۔اور جسم کو ناامیدی کے گھن لگ گئے تھے۔اور اب ایک

نامعلوم جگہ جاتے ہوئے انھیں واقعی یونہی لگ رہا تھا کہ زندگی اور دنیا سے دور...عذاب دینے والے فرشتوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر وہ کہیں جا رہے ہیں۔''

جزیرے دکھائی دیے تو ایک ہنگامہ سا پیدا ہوا۔اس حال میں بھی قیدی اس جگہ کی پہلی جھلک دیکھنے کے مشتاق تھے جہاں ان کو لے جایا جا رہا تھا۔ان میں کئی ایسے تھے جن کا ذہن مسلسل اسی بات پر کام کر رہا تھا کہ کیا فرار کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔انسان کی ضد کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور یہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

اس لمحے، آج لگ بھگ ڈیڑھ سو سال بعد، ان جزیروں کو خالد انہماک کی انھی گہرائیوں سے دیکھ رہا تھا جس گہرائی سے کیپٹن بائیک نے دوربین لگا کر دیکھا تھا۔شاید خالد سہیل کے لئے بھی ان کو گہرائی سے دیکھنا اتنا ہی ضروری ہو گیا تھا جتنا کیپٹن بائیک کے لئے تھا۔

داہنی طرف جزیروں کا ایک سلسلہ تھا۔ڈاکٹر واکر بھی یہ دیکھنے کے لیے باہر ڈیک پر نکل آیا تھا۔ایک قیدی کو محسوس ہوا کہ اس کی سرخ داڑھی کے نیچے سے دکھائی دینے والے جزیرے اس کی شخصیت کا حصہ بن گئے تھے۔پھر وہ قیدی دوسری طرف دیکھنے لگا۔ادھر بھی اٹے دیے جزیرے نظر آ رہے تھے۔دیکھتے ہی جزیرے قریب آکر بڑے بڑے دکھائی دینے لگے۔

پورٹ بلیر کے پاس آکر جہاز کی رفتار کم ہو گئی اور وہ جزیرے کے قریب پہنچ گیا۔پھر اسے لنگر انداز کرنے کے لیے جہاز کے عملوں میں ہنگامی حرکتیں شروع ہو گئیں۔قیدی بھی چاروں طرف پھیلے تماشے کو دیکھنے لگے۔وہ تنہائیوں کی ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہے تھے۔تنہائی صرف دنیا کے دوسرے لوگوں سے الگ ہونے کی تنہائی نہیں تھی بلکہ زندگی تمام ضروریات کی چیزوں سے الگ ہونے کی بھی تنہائی تھی۔

ڈاکٹر والکر نے بھی اس تنہائی کو پہلی بار محسوس کیا۔ جب یہاں رہنا تھا تو یہاں کی زمین سے یہاں کی چیزوں کو حاصل کرکے یہاں ایک خود کفیل دنیا بنانا ضروری تھا۔ اس نے سوچا۔

جزیرہ چاتھم پر جہاز سے اور قیدیوں کو نیچے اتارا جارہا تھا۔

ایک قیدی جس کی عمر اس وقت بہت کم تھی اور جو آنے والے دنوں کے تمام طوفانوں سے بچ گیا تھا اس نے 45 سال بعد اپنی یادداشت میں اس وقت کے منظر کو بیان کیا تھا جسے خالد نے ایک پرانے رسالے میں پڑھا تھا۔ اس کے الفاظ خالد کے تخیل میں کسی فلم کے پردے پر الفاظ کو ٹائپ کیئے جانے کی ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ کسی کہانی کے حصے کی طرح ابھرنے لگے تھے۔

رسالے کے الفاظ یوں تھے۔

''قیدی بندھے ہوئے جانوروں کی طرح زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لگی ہوئی ہتھ کڑیوں کی رسیاں دوسری طرف سپاہیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔'' اس نے اپنی یادداشت میں اسی سفر کے ایک ابتدائی واقعے کے بارے میں بھی لکھا تھا جو اس کے ذہن پر بری طرح نقش ہوگیا تھا (حالانکہ اس کے بعد اس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہولناک واقعات اسے دیکھنے پڑے)۔ اس نے جو واقعہ بیان کیا تھا اس کا کچھ حصہ میگزین سے پھٹ جانے کی وجہ سے پڑھا نہیں جاسکا لیکن جو پڑھا جاسکتا تھا اس سے پورے واقعے کی تصویر یوں بنتی تھی۔

''کمزوری کے باعث ایک قیدی کہنی کے سہارے گرا تو درد محسوس ہوا۔ ایک سپاہی نے ایک جھٹکے سے اسے اٹھا کر دیکھا تو اس کا چہرہ بچ گیا تھا لیکن اس کی کہنی سے خون بہنے لگا۔ وہ ذرا بھی احتجاج نہ کرسکا۔ فائدہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سپاہی جو چاہتا ہے وہ اسے

کرنا پڑے گا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نہ تو جسمانی طور پر احتجاج کرسکتا ہے اور نہ ہی سپاہی سے کچھ باتیں کرکے اس کو کچھ سمجھا کر، اس کے دل میں ہمدردی جگا کر ہی اس سے بچ سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سپاہی کوئی انسان نہیں تھا۔ یہ تو کسی بڑے مشین کا ایک چلتا پھرتا حصہ تھا جو اپنا کام کرنے پر مجبور تھا۔''

یادداشت کا شعری لہجہ بتا رہا تھا کہ قیدیوں میں احتجاج اور نفرت کا جذبہ بدرجہ اتم تھا۔ ''وہ جیسے ہی زمین پر گرا تھا اس کی کمر کی ایک نازک جگہ پر سپاہی کی بھاری بوٹ کی ایک ٹھوکر لگی تھی اور درد سے اس کی زبان خود بخود کراہ اٹھی۔ لیکن اس کی آنکھیں صرف فرش کی ٹوٹی ہوئی اینٹوں پر ٹھہر گئیں۔ سپاہی کا دوسرا ٹھوکا لگا تو وہ گھوم گیا۔ سپاہی کے بھاری بوٹ بھی دکھائی دیے اور اس کے اوپر کئی تہہ لگی ہوئی اون کی پٹیاں بھی جو سختی اور کرختگی کو اور بھی زیادہ نمایاں کررہی تھیں۔ پھر اس کی نظریں گھوم کر اس سپاہی پر ٹھہر گئیں۔ پیچھے سے دو اور سپاہی رہے تھے۔'' آگے لکھا تھا ''اس نے چاہا کہ ان ہندوستانی نسل کے سپاہیوں سے کچھ بات کرے۔ ان سے کہے کہ وہ اس پر اتنا ظلم نہ کریں بلکہ ہمدردی کریں کہ وہ تو جنگ آزادی میں شریک ہونے کی وجہ سے یہاں لائے گئے تھے لیکن ان سپاہیوں کی منحوس صورت دیکھ کر ہی اس کی ہمت جاتی رہی۔''

پورا منظر کسی طاقتور فلم کی طرح اپنے زمانے کی آوازوں اور کہانی کی بچینی اور درد کو ابھارنے والی میوزک کے ساتھ اس کے ذہن میں گزرتا رہا اور آنکھوں کے سامنے وہ سب کچھ تھا جو ہو رہا تھا۔

ایک دن ایک ہندوستانی نژاد سپاہی نے کسی بات پر غصے میں آکر قیدیوں سے کہا۔

'اب تمہارے دن قریب آرہے ہیں۔'

ان قیدیوں میں سے ایک نے اپنا بھاری سر ہلاتے ہوئے کہا۔

'تو وہ دن جلد آنے دو نا۔'

سپاہی نے نرم ہو کر قدرے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

'یہ کالا پانی ہے۔ یہاں موت آئے گی لیکن سب سے آخر میں آئے گی۔ جلدی تھی تو کہیں اور جاتے۔ یہاں تم کو بڑے بڑے جہازوں پر چڑھا کر پھانسی کے پھندے پر لٹکانے کے لیے نہیں لایا گیا ہے۔ ملک میں بہت سارے پھانسی کے پھندے ہیں۔

تم لوگ اپنے پرانے دن بھولتے کیوں نہیں۔ تمھیں اپنی نوابی یاد آتی ہے۔ وہ نوابی تو اب خواب و خیال ہو گئی۔ اب تو فرنگی سرکار ہے۔ تم نے غداری کی اور اب تم کو اس کی سزا مل رہی ہے۔ کالا پانی کاٹنے آئے ہو۔ عیش کرنے تو آئے نہیں۔ اپنے حرم کی کنیزوں کو بھول جاؤ۔ شراب و کباب کی باتوں کو بھول جاؤ۔ یہ دوسری دنیا ہے۔ یہاں تم کو نئی زندگی ملی ہے۔ اس کو جیو ورنہ ختم کر دیے جاؤ گے۔'

یکا یک ایک گورا ادھر آ گیا۔

'اڈیٹ کیا مانگتا ہے۔ کیا بات کرتا ہے؟ ڈال دو استون کے نیچے۔ یہ لوگ ٹورچر (اذیت) ڈیزرو کرتا ہے۔'

اس یادداشت میں ان دنوں کی کچھ اور باتوں کا ذکر بھی تھا۔

'ان کو جوٹ کا بنا ہوا ایک لمبا لبادہ قسم کا لباس پہننے کو دیا گیا۔ اور پھر چند پہرے داران کے ہاتھ میں بیڑیاں ڈالے ہوئے ان کو لے کر آگے چلے اور آگے ایک مقام پر زنجیروں کا آخری سرا ایک درخت سے باندھ دیا۔ یہاں پہلے سے نہ تو قیدیوں کے لیے کوئی

بیرک یا جیل تھا اور نہ کوئی سایہ، کھلے میدان میں ان کو مقید کر کے رکھا گیا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی اور سامنے ماؤنٹ ہیریٹ اور وائپر آئیلینڈ کی طرف سورج بادلوں کے پیچھے چھپا جا رہا تھا۔ گھنے درختوں اور جھاڑیوں سے ہلکی ہلکی دھوپ کی روشنی قیدیوں کے اوپر اور دور پڑ رہی تھی۔ شام کا وقت ہونے کی وجہ سے انڈمان کی دھوپ میں وہ جلانے والی شدت نہیں تھی جس سے جسم کی چربی پگھل جاتی ہے۔ جزائر انڈمان کے اوپر آسمان میں گرد و غبار نہیں ہونے کی وجہ سے جب سورج کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں تو دھوپ انتہائی تیز ہوتی ہے۔

قیدی پھر بھی جوٹ کے لباس میں پسینہ سے شرابور ہو رہے تھے۔ اسی حالت میں وہ ادھر ادھر مٹی اور گھاس پر دراز ہو گئے۔ صحت مند اور زندہ رہتے ہوئے بھی یہ تمام لوگ مردہ یا بیمار دکھائی دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں پہاڑیوں کے اوٹ سے آسمان پر مغرب سے بادلوں کا غبار ابھرنے لگا اور پھر بادل بڑے بڑے چیلوں کی طرح آسمان پر نمودار ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ ادھر ماؤنٹ ہیریٹ کے دامن میں پچھلے پہاڑیوں سے بھاپ پیدا ہو کر روئی کے ٹکڑوں کی شکل میں آسمان پر جا رہی تھی۔ یہ دلچسپ سماں قیدی کتنی دلچسپی سے دیکھتے لیکن انہوں نے نہیں دیکھا۔ ان میں یہ سب دیکھنے کی سکت نہیں تھی۔ قدرت کا یہ حسن ان کے لئے بیکار تھا۔ ان کے پاؤں اور ہاتھ زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے لیکن اس سے زیادہ ان کی آنکھیں تھکن، بھوک کی شدت اور جسمانی اذیت سے بندھی ہوئی تھیں۔

خالد یہ پڑھتے ہوئے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ تنگ دستیوں، مجبوریوں، خوف اور دہشت سے بھرے معاشرے میں آج بھی بظاہر آزاد لوگ دیہاتوں، ریگستانوں اور پہاڑیوں کے حسن کو کتنا محسوس کر پاتے ہوں گے۔ اگر زندگی اذیتوں سے بھر جائے تو یہ صورتحال کس طرح آنکھوں سے احساسِ حسن کو چھین لیتی ہے۔

اس نوجوان نے آگے لکھا تھا "یہ قیدی جو ہندوستان کے گوشے گوشے سے لائے گئے انہوں نے اپنی پچھلی زندگیاں مختلف حالات میں گزاری تھیں۔کوئی پہاڑوں کے دامن سے لایا گیا تھا۔کوئی دریاؤں کی ترائی سے۔کوئی سمندری ساحلوں سے۔اب یہ سب اس طرح ایک حالت میں رکھ دئے گئے تھے جیسے مرے ہوئے لوگ ایک قبرستان میں جمع کردئے جائیں۔یہ پھر بھی ابھی میدان جنگ میں جنگ کے بعد گرے ہوئے ان شدید زخمی سپاہیوں کی طرح پڑے ہوئے تھے جن کی سانسوں سے ان کا جسم ہلتا تھا۔

انہوں نے قیدیوں سے کوئی بات بھی نہ کی تھی۔کوئی جملہ بھی نہیں کہا تھا۔کس قدر لاتعلق اور کتنی ظالمانہ خاموشی کام تھی۔جیسے انسانوں اور پتھروں کی دوری۔یا انسانوں اور درندوں کے درمیان کی خاموشی! دھمکی کے جملے بھی کچھ انسانی رشتے قائم کرجاتے ہیں۔ قیدی صرف ان کے بھاری بھاری بوٹوں کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

اور بارش ہونے لگی۔

آہستہ آہستہ بارش تیز ہوگئی۔پہلے تو ان کے جوٹ کے بنے ہوئے موٹے موٹے کرتے بھیگنے لگے۔پھر وہ مکمل طور پر بھیگ گئے اور بھیگے ہوئے کرتے اپنے پورے بھدا پن کے ساتھ رات بھر نہ سوکھنے کے لیے ان کے جسموں سے چپک کر رہ گئے کہ اوپر سے ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی۔دور کافی دور شام اور بارش سے پھیلنے والے اندھیرے میں صرف ایک روشنی تب تھوڑی دکھائی دینے لگی جب بارش تھوڑی ہلکی ہوئی۔یہ روشنی جہاز کے اوپر جل رہی تھی جہاں چند سنتری اور دوسرے لوگ ادھر ادھر سایوں کی طرح آجا رہے تھے۔کوئی آدھی رات کے بعد بارش پھر آہستہ آہستہ تیز ہوگئی اور پھر رات بھر موسلا دھار بارش ہوتی رہی!! بہت سے قیدیوں نے رات کے اندھیرے میں اپنے جسموں سے اپنے لبادے کھسکا کر ہٹا دئے تھے۔

کبھی کبھی ان کے اوپر بجلی چمکتی تو یہ بھیگے ہوئے لوگ کسمسا کر رہ جاتے کہ

انہوں نے اپنے جسموں کو اپنے بازوؤں اور اپنی جانگھوں سے چھپا رکھا تھا۔'

آگے کے کچھ صفحات پھٹ گئے تھے۔اس کے بعد جیل بننے کے بعد کی کچھ کہانیاں رقم تھیں۔

جن قیدیوں کو جب پتھر توڑنے اور عمارتیں بنانے کی جگہ تک ڈھو ڈھو کر لے جانے کے کام پر لگایا گیا تو ان میں سب سے زیادہ ٹال مٹول کرنے والا سلیم نکلا۔ایک سپاہی جو اسے بہت دیر سے دیکھ رہا تھا اس کے پاس پہنچا اور کھینچتے ہوئے اسے اور سپاہیوں کے بیچ لایا۔وہاں اس نے اسے اس کے پنجے کو دباتے ہوئے سیدھے پیچھے گرا دیا۔پھر اسے اوندھے منہ لٹانے لگا۔سلیم بغیر کسی احتجاج کے خوشی سے گھوم گیا۔سپاہیوں نے پھر اس کی پچھلی ٹانگوں پر ایک بھاری پتھر رکھا۔پھر ہتھیلیاں کھول کر انہیں بھاری پتھروں سے دبا دیا۔

"مجھے پانی پلا دو۔" وہ چلایا۔

"نہیں" ایک حوالدار کڑکا۔

"تمہیں پانی کل شام سے ملے گا اگر تم محنت سے تمام دن کام کروگے۔آج رات بھر تم یونہی پڑے رہوگے۔پاخانہ پیشاب یونہی کرتے رہوگے۔صبح تمہاری پیٹھ پر دس بیس کوڑے لگیں گے۔دو چار سوئیاں چبھوئی جائیں گی۔یہ سلسلہ تب تک چلتا رہے گا جب تم کام نہ کروگے، اور زندہ رہوگے اور اگر بدزبانی کی تو زبان سامنے نکال کر اس میں تار ڈال کر اسے اس دیوار سے رات بھر کے لیے باندھ دیا جائے گا۔یہ یہاں کے احکامات ہیں۔آگے اپنا اچھا بھلا تم خود سوچ لو۔

پھر اسے ایک بھاری کولہو چلانے کے لئے دیا گیا تھا۔

جب رات ہوئی تو اسے ایک الگ بند کمرے میں ڈال دیا گیا۔

وہ کوٹھری بڑی بھیانک تھی۔ جیل بننے کے بعد جس دن قیدی اس میں لائے گئے ان میں میں بھی تھا۔ ہم جیل کے درو دیوار اور انتظامات کو کافی دیر تک دیکھتے رہے تھے جیسے خود ہمیں قید کرنے کے لئے ہمارے ہی ہاتھوں سے بنوایا گیا تھا۔

اس واقعہ کو پڑھتے ہوئے خالد کو اچانک پٹنہ کے ایک جیل کی یاد آ گئی جس کی جدید کاری کر کے اس کا افتتاح پٹنہ کے کلکٹر نے کیا تھا اور دو تین برسوں بعد ایک مقدمہ میں گرفتار ہو کر اسی جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔

نوجوان نے سلیم کا آگے کا حال لکھا تھا۔

کولہو کی مشقت کے بعد سلیم کو اندر ڈال کر سپاہی باہر آئے اور باہر سے تالا پڑنے کی آواز ہوئی تو سلیم کو کچھ راحت ملی۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد اس کے چاروں طرف صرف ایک ہولناک سناٹا رہ گیا۔ چاروں طرف اندھیرا۔ صرف ایک جانب سلاخوں کا بنا ہوا دروازہ۔ اس کے آگے باہر سناٹا جہاں اذیت رسانوں کے علاوہ اور کسی کی صورت کے دکھائی دینے کا امکان نہیں تھا۔ ایک دن، دو دن نہیں، ایک ماہ، دو ماہ نہیں، بلکہ پوری زندگی کے لیے وہ اس ماحول میں لایا گیا تھا۔ باہر خوفناک سناٹا اور تیز ہوائیں جنگل سے گزر رہی تھیں ان میں ایسی عجیب وغریب آوازیں ملی جلی ہوتی تھیں کہ اکثر ایسا لگتا کہ سامنے کے پھانسی گھر سے روحیں روتی رہتی ہیں۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کو بھی جلد ہی وہاں جانا ہے، کتنی دور ہے وہ... اپنے ملک سے ... درمیان میں کتنا وسیع سمندر... سمندر کے اوپر پر مسرت ہوائیں، سناٹا، اونچی اونچی لہریں جن کو جہاز نے پانچ دنوں میں پار کیا تھا۔ پانچ دن اور پانچ رات مسلسل چلنے کے بعد... وہاں وہ کبھی نہیں جا سکے گا۔ کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ جو کچھ دیکھ رہا ہے۔ جو کچھ محسوس کر رہا ہے، حکومت برطانیہ کے ان مظالم کو کوئی نہیں دیکھ پائے گا۔ یہ کوئی نہیں جان پائے گا کہ اس پر یہ ظلم اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے کہ اس نے قتل کیا تھا یا اس نے جنگ لڑی تھی بلکہ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ انگریز جو اسے بغاوت وغداری کے الزام میں شکار کی

طرح پکڑ لائے ہیں ان سے غلاموں اور جانوروں کی طرح زبردستی اذیت دے کر کام لینا چاہتے ہیں۔

یہ کسی جرم کی سزا نہیں بلکہ بیگار لینے کا بہانہ ہے۔ یکا یک اس کی زبان... اور پھر گویا وہ وہیں آ گیا جہاں وہ تھا۔ وہیں بند کوٹھری وہ فرش، وہی بندھے ہوئے ہاتھ وہی پیاس، وہی بھوک، وہی تنہائی، وہی تھپیڑ... وہی ہولناک منظر... وہی پھانسی گھر کی طرف سے آتی ہوئی ہوائیں...!

'میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں وہ کروں جو مجھے پسند نہیں...... اور پھر اس کے بعد رات بھر اس کے ذہن پر یادوں کے ریلے آتے جاتے رہا... سارا ہندوستان... آگرہ کا تاج، موسم، عہد وسطی کا ہندوستان، اس کی تاریخی عظمت، اس کا جلال، اس کے بہادر سورماؤں کی کہانیاں، اس کی جنگیں، اس کے مجبور وغریب لوگ، وہ لوگ بھوک سے نڈھال ہو کر انگریزوں کا ظلم... یہ ساری یادیں اس کے ذہن پر دوڑتی رہیں۔

اسے صبح کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس سے باتیں کر رہا ہے لیکن وہ نہ جانے کیا جواب دیتا رہا۔ ذرا ہوش میں آیا تو دیکھا کہ یہ جیل کا وارڈر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

'تم ایسا کیوں نہیں کرتے، برما کا ایک جہاز یہاں پچھم کی طرف آ کر لگا ہے۔ اس میں بیٹھ کر تم برما نکل جاؤ، میں یہاں سے تیرے نکلنے کا انتظام کر دیتا ہوں، میں ایک لوہا کاٹنے والی آری دیتا ہوں، رات کو تین بجے آری سے یہ تالا کاٹ دینا، سنتری کو میں تھوڑا افیم کھلا دوں گا، تم اس کی فکر مت کرو، تمہاری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ میں نے یہاں صاحب کو بہت سمجھایا ہے اور گڑگڑا کر کہا کہ بال بچے دار آدمی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اس کا بڑا بھلا ہوگا لیکن اس نے ایک نہیں سنی، تو نکل جا، جیسے میں کہہ رہا ہوں۔"

'لیکن اگر پکڑا گیا تو؟'

'نہیں پکڑا جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔ اگر پکڑا بھی جائے گا تو کیا صاحب میری اتنی بھی بات نہیں مانے گا۔'

رات کے تین بجے وہ جیسے ہی پھاٹک سے نکل کر جارہا تھا اندھیرے سے ایک گولی آئی اور اس کی پیٹھ میں اتر گئی۔ وہ وہیں گر کر مر گیا۔ سارا خون منہ اور زخم سے بہہ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

'جناب یہ رپورٹ ہے، وارڈ بوائے نے پیش کیا...... 'خطرناک مجرم سلیم جیل کا تالا کاٹ کر بھاگ رہا تھا کہ سنتری جو چوکنا تھا اس نے اس کو للکارا اور واپس لوٹ آنے کی ہدایت کی لیکن جب وہ نہیں مانا تو سنتری کو گولی چلانی پڑی جو اندھیرے میں اسکے پاؤں پر لگنے کے بجائے سینے میں لگ گئی جس سے مجرم سلیم کی موت ہو گئی۔'

'اب یہ بھی انکوائری کرو کہ یہ لوہے کو کاٹنے کی آری کس نے مجرم کو دی تھی۔ اور جتنے مجرم ترقی کے بعد مجرموں کی دیکھ ریکھ کرنے کے کام پر معمور کیے گئے ہیں ان کو جمع کر کے کہا جائے کہ ان کے بارے میں انکوائری ہو رہی ہے۔ اور یہ کہ وہ اپنے کام میں ہوشیار رہیں۔'

وارڈر سلام کر کے چلا گیا۔

'ان تمام باتوں کے باوجود کام میں پروگریس تسلی بخش نہیں تھا اور ڈاکٹر والکر ایک اچھی رپورٹ بھیجنا چاہتا تھا۔

'ان مجرموں کو جو کام چور ہیں۔ الگ کرو اور انھیں پچھمی بلاک میں رکھو، کام کرنے والوں کو پوربی بلاک میں اور اپنے اسٹاف کو ہدایت کرو کہ ان کام چوروں کی سزا میں اضافہ کرے اور خوراک کم کرے۔'

'لیکن اس سے تو یہ اور بھی کمزور ہو جائیں گے۔'

'ہونے دو، ہمارے پاس اتنا رسد نہیں ہے کہ ہم انڈیا سے اناج یہاں تک جہاز میں ڈھو کر لائیں اور ان ناکارہ کتوں کو پال کر رکھیں۔ سمجھے۔ جیسا میں نے کہتا ہوں ویسا ہی کرو۔'

اور غالباً ایسا ہی کچھ کیا گیا جس کے نتیجے میں پچھلے بلاک کے ایک کمرے سے زور زور سے ایک مجرم کے چیخنے کی آواز آنے لگی تھی۔ اس نے اپنی چیخ سے سب کو جگا دیا تھا۔ ابھی وہ چیخ ہی رہا تھا کہ دوسرے مجرم نے چیخنا شروع کیا۔ ابھی لوگ ادھر گئے ہی تھے کہ تیسرے کی چیخ ابھری۔

'یہ آج ہوا کیا ہے۔ اتنے سارے کھنجورے آج اس ہال میں کہاں سے پہنچ گئے کہ سب کو کھنجورے کاٹ رہے ہیں۔'

'ممکن ہے کہ برسات ہونے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہو۔'

'ہوسکتا ہے کہ یہاں کسی کسی موسم میں کان کھجورے زیادہ نکلتے ہوں۔'

جن کو کن کھجوروں نے کاٹا تھا وہ بے تحاشہ چیخ رہے تھے۔ تڑپ رہے تھے ان میں ایک کا پاؤں دوسرے دن صبح تک پھول کر غبارہ ہو گیا۔ اسے دن کو دوپہر میں ڈاکٹر کے پاس پیش کیا گیا۔ اس نے دوا لگائی لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

دو چار دنوں بعد جو چاول بنا اس میں کنکریوں کی اتنی تعداد تھی کہ رات تک کوئی کچھ کھا نہ سکا۔

'جناب چاول خراب ہیں۔'

'تو کیا ان کے لیے بانس متی آئے گا۔ اور جو اسٹاک آچکا اس کی جگہ اب دوسرا اسٹاک نہیں آئے گا۔'

ڈاکٹر والکر نے پنجڑے کی چٹخنی خود ہی نکال رکھی تھی اس مکاری کو قید کی گھٹن اور اذیتوں سے تنگ پرندے بھلا کیا سمجھتے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ انکا وُنٹر جمہوری نظام کے اپنے لازمی تقاضوں کے تحت ایک حربے کے طور پر ابھی ابھی ایجاد ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اشاروں کنایوں سے خواہش پرواز کو بھی ہوا دلوائی اور طرح طرح سے تکمیل کے امکانات میں بھی پر جڑوا دئے۔ اسے قیدیوں سے دشمنی تو تھی نہیں کہ وہ ان کے زندہ بچ جانے کے امکانات کو مکمل طور پر ناممکن بناتا۔ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جب ان پرندوں کو برنا ہی ہے تو ان سے کباب کی لذت بھی حاصل کی جائے۔ یہ پرندے اڑان بھر کر اس کی ذاتی سلطنت کی وسعتوں کو دیکھیں اور اس کی وسعتوں کے سامنے اپنے کھلے ہوئے پروں کی حدود کو محسوس کریں۔

ایک آدھ گمراہ کن اشاروں پر ہی جیل کے اندر کانا پھوسی شروع ہوگئی۔ جیل میں سنتریوں اور دوسرے اسٹاف کی حرکتوں، ان کے اوقات، ان کے طور طریقوں کا گہرا معائنہ ہونے لگا۔ جیل کی دیوار کا بھی معائنہ شروع ہوا۔'

اگر ہم نکل بھاگے تو جائیں گے کیسے؟'

'ہمیں بیڑا بنانا پڑے گا۔'

'اس کے لیے رسی چاہئے، اور کاٹنے کے لیے کلہاڑیاں۔'

'اور جنگل میں کھائیں گے کیا؟'

'ہرن وغیرہ مارنا پڑے گا۔ کچھوے نکالیں گے۔ جنگلوں میں بکرے ملیں گے۔'

'لیکن ہم جنگل سے نکل کر کہاں جاسکیں گے؟'

'ان دنوں پچھم کی ہوا چل رہی ہے۔ مجھے جغرافیہ کی کتاب سے ان جزائر کے بارے میں کچھ جانکاری ہے۔ اگر ہم بیڑا بنا کر ہوا کی سمت میں چلے اور قطب شمال کی جانب جنگل میں آگے بڑھے تو آگے کے گھنے جنگلوں میں جا پہنچیں گے اور اگر ہم وہاں سے بیڑا بنا کر ہوا کی سمت میں چلے تو ہم برما جا پہنچیں گے۔'

دیوار کیا ٹوٹی کہ سبھی یکے بعد دیگرے نکلنے لگے۔ سامنے کے سنتری کی نظر پڑی لیکن اس سے قبل کہ وہ گولی چلاتا، ایک قیدی نے اس کی پیٹھ میں چھرا بھونک دیا۔ بارش کی تیز آواز اور تاریکی نے ماحول پر پردہ ڈال دیا تھا۔ قیدیوں کی ایک بڑی تعداد جو تقریباً ڈھائی سو کی تھی، جیل کی باؤنڈری سے نکل کر ان گھنے باغات سے ہوتے ہوئے پہاڑیوں کی طرف بھیگتے ہوئے آگے بڑھی۔

سامنے کی پہاڑیوں کو دیکھنا۔

بھاگ نکلنے کی راحت اور آزادی کو محسوس کرنا۔

تیز بھاگنا اور جگہ جگہ زخمی ہونے کے بعد اب ایک محفوظ حد تک دور آجانے کے بعد ستانا۔

صبح کی روشنی بھوک پیاس کے باوجود نئی زندگی لیکر آئی اور لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلے۔

یہ جگہ جنگلوں کے بیچ کافی دور دور تک کھلی تھی۔

مچھلیاں اور کیکڑے کھائے گئے۔

جنگل میں زیادہ دور اندر جانا خطرناک تھا کہ وہاں کے قبائلی پوشیدہ طور سے رہتے ہیں۔ وہ فوج کو دیکھتے ہی دھواں دھار تیر برساتے تھے۔ تقریباً پچاس سال قبل ہی تو فوج نے سینکڑوں کی تعداد میں ان قبائلیوں کا قتل کر کے پورٹ بلیئر کے جنوبی حصہ پر قبضہ کیا تھا۔

'سر...... جیل ٹوٹ گیا۔ پچھم بلاک والے قیدی سب کے سب بھاگ گئے۔'

'لیکن یہ کب ہوا؟'

'لگتا ہے کافی دیر پہلے ہوا۔'

'لیکن سنتری کہاں تھے؟'

'ایک سنتری کا قتل ہو گیا۔ دوسرا افیم کھا کر سو رہا تھا۔'

'تم لوگ سخت لاپرواہ ہو۔'

'لیکن سر میں پہلے بھی رپورٹ دیتا رہا ہوں کہ جیل کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔'

'ٹھیک ہے، میں یہ تو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ جیل توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے لیکن تم نے یہ خبر دینے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ حکم دو کہ فوج کی ٹکڑی ان قیدیوں کا پیچھا کرے اور ان کو تلاش کرے۔

فوج کی ٹکڑی بوٹ پر سوار صبح کے اجالے میں ساحل ساحل جا کر دور بینوں سے ڈھونڈتی رہی اور آگے بڑھتی رہی۔ جنگلوں میں بھی تلاش کے بہانے قبائلیوں سے بچتے ہوئے رائفل بردار ٹکڑی جنگلوں میں گشت کرتی رہی۔ ساحل کے کنارے گھومتی رہی۔ شام تک کچھ سراغ نہیں لگا۔ کھیتوں میں جہاں سے ہو کر وہ گزرے تھے ان کے نشانات کچھ کچھ مل رہے تھے۔ جو کچھ وہ ساتھ لے جا رہے تھے ان میں سے کچھ گرا ہوا ملا لیکن اس سے آگے کوئی نشانی نہیں مل سکی۔ شام تک کچھ بھی دکھائی نہ دینے کے بعد فوجی ٹکڑی واپس آ گئی۔ قیدیوں کے نہیں ملنے کی رپورٹ جیل سپرنٹنڈنٹ کو دی گئی جو..............

❖❖

ادھر بیڑے کے لئے لکڑیاں توڑی گئیں اور ان کو لکڑیوں سے ہی باندھا گیا۔ ہوا کی سمت کا اندازہ کیا گیا اور سمندری تھپیڑوں میں موت کے پورے امکانات اور کھانے کے لئے کچھ نہ ملنے کے امکانات اور پانی بچانے کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باوجود اس سمندری مہم پر چل پڑنے کا فیصلہ لیا گیا۔ لیکن جب لوگ بیڑے پر چڑھے تو وہ زیادہ نیچے دبنے لگا۔ بیڑے تمام قیدیوں کے سوار ہونے کیلئے کافی نہیں تھے۔ کچھ قیدی ان میں سوار ہو گئے اس طرح صرف ۵۵ لوگ بیڑوں پر آپائے۔ بقیہ نے ان کو الوداع کہا اور دور تک انہیں پانیوں میں شاید ہمیشہ کے لئے جاتے دیکھتے رہے۔ جب وہ بیڑا کامیابی سے ان کو لیجاتے ہوئے دور موجوں میں کھو گیا تو انہوں نے اب اپنے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

وہ کچھ جنگل سے ہو کر آگے نکل گئے۔ وہ سمندر کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ ساحل کی ریت پر چلنے میں انہیں آسانی ہو رہی تھی۔ انہوں نے کچھ دور چلنے کے بعد پھر کھانے کی کوئی چیز تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اچانک ان پر قبائیلیوں نے اچانک حملہ کر دیا تھا۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ان میں سے ایک بھی نہیں نکل پایا۔ انگریزوں کے حملوں نے قبائیلیوں کو بہت حد تک دلیر اور خونخوار بنا دیا تھا۔ اب جنگل میں یہاں وہاں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ جنگلی قبائل دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے تمام گرے ہوئے زخمیوں کا معائنہ کر رہے تھے۔

گوپی کی چلتی سانس کو دیکھ کر ایک قبائلی جھکا اور اسے غور سے دیکھا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ گوپی کے پیٹ میں تیر لگا تھا لیکن وہ چوٹ سے کم اور خوف سے زیادہ کمزور ہو کر

گرا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں قاتلانہ تیر کمان لیے ہوئے قبائلی اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے قیدیوں کا گروہ کٹی ہوئی فصل کی طرح گر گیا تھا۔ اس کی نظر ٹھیک ایک قبائلی کی آنکھوں میں جا پڑی اور اس نے جان بخشی کے لیے اس قبائلی کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ آنکھیں صاف صاف رحم کی بھیگ مانگ رہی تھیں۔

ایک نوجوان جروا نے اپنے پہلو سے لٹکا ہوا چاقو نکالا اور جھک کر گوپی کے سینے میں بھونکنا چاہا کہ اس جروا نے جس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گوپی کو آنسو آ گئے تھے، اسے روک دیا۔

'تم مجھے مت مارو، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔'

'تم مجھے مت مارو' میں تو قیدی ہوں اور قید سے چھوٹ کر بھاگا ہوں۔'

'تم مجھے کیوں مارتے ہو، میں تمہاری سیوا کروں گا۔'

'بھگوان تم لوگوں کا بھلا کرے۔'

'مجھے بہت پیاس لگی ہے۔'

'یہ کیا کہہ رہا ہے'

سردار کو یکایک وہ دن، وہ لمحے یاد آ گئے جب وہ خود ایک بار ایک کشتی پر تھا اور کشتی ڈوبنے لگی تھی اور بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس وقت زندہ رہنے کی خواہش ہوئی۔

سردار نے اس کو قتل کرنے سے منع کیا اور اس کو اٹھا کر لانے اور اسکا علاج کرنے کا حکم دے دیا۔ سارے قبائل گوپی کو تعجب سے دیکھتے رہے۔

سردار کے اشارے پر چند نوجوانوں نے گوپی کو اٹھالیا اور مسکراتے ہوئے اسے اپنی بستی کی طرف لے گئے۔ ان کو اس بات پر حیرت تھی کہ سردار نے اس کی جان بخش کردی، کیونکہ سردار کا یہ روّیہ بالکل انوکھا اور روایت سے ہٹ کر تھا۔ لیکن جب سردار نے ان کی شرارت بھری نظروں کو دیکھ کر انہیں جھڑکی دی تو انہیں اندازہ ہوا کہ سردار تو سنجیدہ تھا اور وہ اس زخمی آدمی کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ مسکراتے ہوئے انہیں بھی پتہ نہیں کیسے اس آدمی پر ترس آنے لگا۔ ان کے لیے انسانی ہمدردی کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اپنے دشمنوں کو زندہ چھوڑنا ان کے دستور میں نہیں تھا اور جو بھی اجنبی ان جزیروں پر آتے تھے وہ عموماً پوری تیاری اور بہتر ہتھیاروں کے ساتھ ہی آتے تھے اور ان قبائلیوں پر پہلے سیدھے حملہ کرتے گویا یہ قبائلی خونخوار جانور تھے۔

گوپی کو سردار کی جھونپڑی میں لایا گیا۔ نوجوان فوراً پانی لائے۔ اپنے طور کی وہاں کھڑی عورتیں دلچسپی سے گوپی کو دیکھ رہی تھیں۔ کسی اجنبی پر اگر پیار آجائے تو پھر پیار ہوجاتا ہے۔ ایک عورت کو کسی نے زخم پر لگانے والی دوا تیار کرنے کی ہدایت کی۔ وہ دوا بنا کر ایک بڑے سے جنگلی پتے پر رکھ کر لائی۔ ایک قبائلی نے جس کی نظر میں ڈاکٹر کی طرح سنجیدگی سے گوپی کے زخموں کو دیکھ رہی تھیں۔ اس دوا کا لیپ اس کے زخموں پر لگایا۔ شام کے وقت گوپی کو بھی وہاں لایا گیا جہاں آج کی جنگ کی فتح کا جشن منایا جا رہا تھا۔

گوپی کو یہ منظر دیکھ کر بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کے زخم پر کوئی آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہا ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے اوپر ایک جواں سال لڑکی کو جھکے ہوئے دیکھا جس کا بدن سیاہ لیکن چمکدار تھا۔ بدن اتنا خوبصورت ڈھلا ہوا جیسے ہندوستان کے مجسمہ ساز اپنے بہترین مورت بناتے تھے۔ سینے جو کھلے ہوئے تھے۔ نوکیلے اور چکیلے تھے اور انتہائی تندرست۔ اس آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ ابھری، کمر، کولھے، ٹانگیں سب کھلی ہوئی تھیں۔

صرف کمر کے گرد ایک رسی سی تھی جس سے کچھ پتیاں جھول کر پردہ کر رہی تھیں۔

اس کو آنکھ کھولتے دیکھ کر وہ اور مسکرائی۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی تو گوپی اس کے پورے سراپا کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ لہراتی ہوئی گئی اور درخت کی پتی میں پانی لے کر آئی اور اسے پلایا۔

یہ ایک نئی دنیا تھی۔ یہ ایک حقیقی دنیا تھی۔ لیکن جیل کی دنیا سے بھی اجنبی۔ ایک مکمل عدم ترسیل کی دنیا جہاں سرے سے کوئی ایسی منظم دنیا تھی ہی نہیں جس میں رہنے کا وہ عادی تھا۔ یہ دنیا نہ تو اس کے اپنے ان لوگوں کے بیچ کی دنیا جیسی تھی جہاں کا وہ رہنے والا اور نہ انگریزوں کے اختیار کی اس دنیا جیسی تھی جس میں وہ ایک قیدی کی حیثیت سے آیا تھا۔ وہ زندہ بچ تو گیا تھا لیکن اسے اس بات کا بھی قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اسے زندہ رکھیں گے یا ان کے ارادے کچھ اور ہیں۔ اس نے ان خوفناک قبائلیوں کے بارے میں سن رکھا تھا جو جنگلوں میں رہتے تھے اور وہاں کسی کی آمد کو برداشت نہیں کرتے تھے اور کسی بھی اجنبی کو جانوروں کی طرح اپنے قابو میں لے لیتے تھے، انہیں جان سے مار دیتے تھے اور کھا جاتے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے گوپی کو معلوم ہوا کہ اسے تو ان لوگوں نے اپنا مہمان بنالیا ہے۔ پھر دو تین دنوں بعد دو تین جروا آئے اور انہوں نے اسے پکڑ کر کھڑا کیا۔ پھر اس کے کپڑے اتار کر اسے مکمل ننگا کردیا۔ اس کے جسم پر دو تین لڑکے اور لڑکیوں نے مٹی کی مالش کی اور کمر میں ایک رسی سی چیز باندھ دی۔

سردار نے اسی لڑکی کی طرف دیکھ کر جسے وہ رتھی رتھی کہہ کر پکار رہے تھے اشارہ کرکے گوپی کی دیکھ ریکھ کرنے کو کہا۔

صبح و شام رتھی اس کی دیکھ ریکھ کرنے لگی۔ وہ رفتہ رفتہ گوپی کو اپنی زبان کے الفاظ اور اشارے سمجھانے لگی۔

'یہ رتھی کو دیکھتا رہتا ہے۔' سردار نے اپنی بیوی سے کہا۔

'ہاں دیکھتا تو رہتا ہے۔'

'اس کو عورت کی ضرورت ہے۔'

'ہاں۔'

'رتھی کی اس سے شادی کردو۔ ہر آدمی کی ضرورت کا پورا ہونا ضروری ہے۔'

'رتھی...... کیا تم اسے پسند کرتی ہو؟'

'بہت دلچسپ ہے۔'

❖❖

ادھر فوجی بوٹ کئی دنوں تک تلاش میں سرگرداں رہی۔ کہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ایک جگہ جب وہ ساحل کے قریب سے گزر رہے تھے، انہیں بیڑے پر نہیں جانے والے قیدیوں نے دیکھ لیا اور جنگل میں روپوش ہوگئے۔ فوجیوں کی ان پر نظر نہیں پڑی تھی۔

ادھر بیڑا ہواؤں کے رحم و کرم پر آگے بڑھتا رہا۔ سمت کا اندازہ لگا کر وہ بیڑے کے رخ کو تھوڑا موڑتے بھی جاتے تھے۔ تین دن ہوگئے تھے۔ کہیں کوئی ساحل نظر نہیں آیا۔ ہوا تیز ہوتی تو ان کی امید بڑھ جاتی۔ ہوا مدھم ہوتی تو ان کی امیدوں پر پانی پھرنے لگتا۔ اب بھوک اور پیاس کی شدت جان لیوا ہوگئی۔ اگلے دن ان میں سے دو تین لوگ مرے ہوئے ملے۔ ان کو دیکھتے ہوئے باقیوں کو کچھ خیال آیا۔ سب اندر ہی اندر اس خیال سے متفق ہوگئے تھے۔ انہوں نے ان ساتھیوں کی لاشوں کو سمندر میں پھینکنے کے بجائے ان کو کھا کر اپنی بھوک مٹائی۔ انہیں نہ گھن آئی نہ شرم۔ انہیں صرف زندگی اور جنگ کی عظمت سمجھ میں آئی جسے بچانا تھا۔ اور جو نپٹنے پر آمادہ تھی۔

'زندگی ایسی ہی ہے۔' ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ 'یہ جس شکل میں آئے اسے قبول کرنا چاہئے۔' دوسرے خاموشی اسے سنتے رہے جیسے سر ہلا رہے ہوں۔

سب ذرا تازہ دم ہونے کے بعد زور زور سے بیڑے کی رفتار بڑھانے کیلئے چپو چلانے لگے۔ ان کا بیڑا یونہی سمندر میں مدھم مدھم چلتا رہا کہ اچانک موسم بدلنے لگا اور پھر ہوا کا رخ مڑ گیا۔ سبھی نڈھال ہو چکے تھے۔ بیڑے کو ہوا کے زور کے سامنے روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بیڑا اب الٹی سمت میں بڑھا جا رہا تھا۔ انہوں نے ہوا سے لڑنے کی ہر ممکن کوشش کی

لیکن ہوا بہت تیز ہوگئی۔ سبھی مردوں کا گوشت کھانے کے نشے اور تکان سے نڈھال ہونے کے سبب نہ چاہتے ہوئے بھی سونے سے لگے تھے۔ رات کے اندھیرے میں تاروں کے سائے میں اس اجنبی سمندر میں جہاں انسان کا کوئی کام نہیں تھا' بیڑہ تیز لہروں کے ہچکولوں پر اپنی من مانی سمت میں چلتا رہا۔ پھر آسمان پر تارے چھپنے لگے اور سیاہ بادل چاروں طرف چھا گئے۔ سمتوں کا اندازہ ختم ہوگیا۔ ہوا اور تیز ہونے لگی۔ کبھی کبھی بیڑا ایک طرف سے اتنا اٹھ جاتا کہ وہ لڑھکنے سے لگتے اور ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگتے لیکن اب ان میں مزاحمت کی خواہش تک باقی نہیں رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اچانک آسمان پر بجلی چمکنے لگی لیکن ان کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب سو گئے تھے۔ پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی لیکن سبھی سوتے رہے۔ جب بجلی چمکتی تو اس کی روشنی میں ان کے جسم لاشوں کی طرح چمک جاتے لیکن اس منظر کو قدرت کے سوا اور کوئی دیکھنے والا نہ رہا۔ سب کے جسموں نے اپنے کو مکمل طور پر نیند کی گود میں ڈال دیا تھا۔ اپنے کو تقدیر کے سپرد کر دیا تھا۔ صرف ایک دو آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ بھی ایسا محسوس کر رہی تھیں جیسے عالم خواب میں ہوں۔ انہیں بھی محسوس ہو چکا تھا کہ اب یہ بیڑا موت کی وادی میں داخل ہونے جا رہا تھا اور یہ لمحے ان کی زندگی کے آخری لمحے تھے۔

کاش ان کا بیڑا اب بھی کہیں کسی ساحل پر آ جاتا چاہے وہ کیسا بھی ملک کا ہو۔ وہاں چاہے کوئی قبائلی ہی کیوں نہ ہوں۔ کون ان کی اس حالت پر ترس نہیں کھائے گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے ان کو سب کچھ سمجھا لیں گے۔

پھر انہیں بھی نیند آگئی۔ تمام رات یوں ہی گزرتی رہی۔

بارش رک چکی تھی۔

صبح ہوئی۔

بیڑا سمندر میں اپنی مرضی سے بھٹک رہا تھا۔

فوجی بوٹ واپس آنے کیلئے تیار تھی کہ ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ وہ دور سمندر سے ہو کر چلیں۔ پھر کسی کو خیال آیا کہ کسی جزیرے کی بلندی پر چڑھ کر دیکھیں۔ جب انہوں نے جزیرے پر چڑھ کر دیکھا تو دور افق کے قریب ایک بیڑا سا بہت مدھم دکھائی دے گیا۔ وہ چونک گئے۔

انہوں نے بیڑے کا پیچھا کیا۔

جو پہلا منظر انہوں نے دیکھا وہ بہت ہولناک تھا۔ فوجی بوٹ نے ان کو دیکھ لیا تھا۔

بوٹ کو دیکھ کر یہ تقدیر کے بحر عظیم میں اترے ہوئے قیدی بھی گھبرا گئے۔

بوٹ کے قریب آتے ہی کچھ قیدیوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ نے اپنے کو ان کے رحم و کرم کے حوالے کر دیا۔ چھلانگ لگائے قیدیوں میں سے کچھ پکڑے گئے۔ کچھ ڈوب گئے۔

کل ۳۳ قیدی پکڑ کر واپس لائے گئے۔

جو قیدی بیڑوں پر سوار ہوئے تھے انہیں فوجی جہاز اور کشتیوں پر آئے ہوئے مسلح سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ دوسرے دن دوپہر تک ڈاکٹر واکر کے حکم سے ان تمام پکڑے گئے 33 قیدیوں کو پھانسی دے دی گئی۔

سمندر کی یہ کہانی ایک قیدی نے پھانسی سے پہلے والی رات میں ایک ہندوستانی چوکیدار کو سنائی تھی۔ یہ والی کہانی قیدی ایک دوسرے کو اکثر سناتے رہتے تھے۔ اور اب وہاں لوگ اسے کالا پانی کی پرانی کہانیوں کے طور پر سنایا کرتے تھے۔

خالد نے یہ کہانی سنی تو دیر تک اداس رہا۔ اس رات اسے بھوک نہیں لگی۔

❖❖

اپنے دادا کی کہانی کو وہ کبھی کا بھول چکا تھا۔ اسے بار بار کلکتے کی لائبریری میں ملے شخص کا چہرہ یاد آتا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے اسے ہفتوں ہو گئے تھے لیکن وہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ دلی میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ سب اس کے لئے محض ایک عظیم کہانی کا عنوان بن کر رہ گیا تھا۔ اسے اپنے اس زمانے کے اپنے آپ کے ساتھ دوسروں کے چہرے بھی معصوم دکھنے لگے تھے۔ ظلم کیا ہوتا ہے یہ انہوں نے دیکھا کہاں تھا۔ امتحان والے واقعے کو بھی اس نے تب اتنی گہرائی سے کہاں سمجھا تھا۔ لیکن اس کے بعد اسے کہیں بھی کامیابی کیوں نہیں ملی یہ بات اس کو اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ عام انسان اگر تاریخ کو اپنے طور پر پڑھے تو تاریخ اور دنیا کے چہرے بدلے ہوئے دکھ سکتے ہیں اس کا احساس اسے مسلسل جھٹکوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ واپس چلا جائے۔ وہ اس وقت تاریخ کے ایک ایسے منظر میں آ کھڑا ہوا تھا جو حکومت، معاشرہ اور انسانوں کی ان الجھنوں کو سمجھنے میں معاون ہو سکتا تھا جس کے بغیر وہ سب بھی بیکار تھا جو اس نے ابتک سمجھ رکھا تھا۔ یہ بات صرف اس کے اپنے متعلق ہی صحیح نہیں تھی بلکہ معاشرہ کی ایک بڑی اکثریت اسی کی طرح شدید دھوکے کا شکار تھی۔

وہ بار بار اپنے والد کو خط لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا تھا لیکن پھر رکھ دیتا تھا کیونکہ یہ عجب گاہ اتنی گنجلک تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں سے شروع کرے اور کہاں ختم کرے گا تو اس کی بات واضح طور پر مکمل ہو سکے گی۔ نتیجے کے طور پر وہ یہاں آنے کے بعد ایک بھی خط نہیں لکھ پایا تھا۔ آتے وقت تو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ وہ اپنے والد کو فون پر بتاتا جائے گا کہ اس نے کیا دیکھا اور کیا کیا پایا اور اس کے پردادا سے متعلق کیا معلومات حاصل ہوئیں۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اپنی بستی کے کسی پڑھے لکھے نوجوان کے ذریعے وہ انٹرنیٹ

کے کسی سوشل نیٹ ورک پر یہاں کی تصویریں ڈالکر اپنے گھر والوں تک پہنچوا دیگا لیکن یہ سب باتیں اب بے معنی ہو گئی تھیں۔ خط لکھنے کا اس کا ارادہ اسی دن کہیں اٹک گیا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی ایسا قبرستان نہیں جس کے بارے میں وہ سوچ سکے کہ اس کے پردادا کو اس میں دفن کیا گیا ہوگا اور وہ جانتا تھا کہ اس کے والد اس کے خط میں سب سے پہلے اسی بارے میں کچھ ڈھونڈیں گے اور اگر اصلیت کی طرف اشارہ بھی کیا تو شاید یہ بات اس کے لئے کافی ہوگی کہ وہ اس کے لوٹنے سے پہلے ہی اس دنیا سے چلے جائیں۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ خط تبھی لکھے گا جب وہ یہاں کے مظالم کی پوری تصویر کھینچ کر دنیا کو دکھانے اور ایک تاریخی مقدمہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس کہانی نے ہی دنیا کے بارے میں اس کا نظریہ بدل دیا تھا۔

'اور اسی دن سے یہ ابدی مقدمہ اس کی روح کی بیماری بن گیا تھا۔ وہ دراصل بے حد حساس تھا۔ اسے اس بات کی تکلیف تھی کہ اتنی جانسوز مصیبت سے گزرے لوگوں کی جان بچی بھی تو پھر انہیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور ان کے ساتھ ذرا سا بھی رحم کا سلوک نہیں کیا گیا۔ اسے اتنا اندازہ سا ہو رہا تھا کہ اس کے پردادا اسی دور میں آئے تھے اور ممکن تھا کہ کتے کے مقدمے کے اس ملزم کو یہ سب کچھ سہنا پڑا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہو تو کیا یہ واقعہ پوری انسانیت کے ضمیر کو ہلا دینے اور حکومتوں کے کردار پر از سر نو گور کرنے کے لئے کافی نہیں تھا۔' مجاور نے کہا۔ اور خاموش ہو گیا جیسے وہ خالد کو کہانی سناتے سناتے تھک سا گیا ہو۔

سامعین طالب علم بھی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

مجاور نے کہانی جاری رکھی۔

اس واقعہ کہ بعد قیدیوں کے اندر ایک شدید بے چینی سلگتی آگ کی طرح گردش

کرتی رہی۔ شیر علی کے ہاتھوں لارڈ میو کا قتل کوئی لمحاتی یا جذباتی واقعہ نہیں تھا۔ اس کی جڑیں دراصل بہت گہری تھیں۔ اور اس کا یہ عمل ایک اعتبار سے تمام قیدیوں کی طرف سے اجتماعی عمل تھا ہر چند کہ یہ اس کے بہت دنوں کے ذاتی مشاہدے کا نتیجہ تھا اور جس بات نے اس کو اس عمل پر آمادہ کر دیا وہ کوئی اور بات تھی جس کا ذکر میں آگے کروں گا۔ ابھی تک تو شیر علی ان جزیروں میں پہنچا بھی نہیں تھا۔

❖❖

بھاگے ہوئے قیدیوں کی اس طرح گرفتاری اور ان کی اجتماعی پھانسی نے سب کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ ڈاکٹر والکر کی طرف سے اتنی بے رحمی کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ پہلے تو انہوں نے ڈاکٹر والکر کی دہشت آفریں حرکت کو قیدیوں کو نفسیاتی طور پر قابو میں لانے کا ایک حربہ سمجھا تھا اور اس کی طرح سے قیدیوں کو دی جانے والی اذیتوں کو بھی اس کے اسی عمل کا حصہ سمجھا تھا لیکن اس اجتماعی پھانسی کو وہ اس کی بے رحمی نہیں بلکہ قیدیوں کے لئے اس کے دل میں موجود گہری حقارت کا نتیجہ ماننے لگے تھے۔ ان کو تعجب خود اس بات پر بھی تھی کہ انگریزی سرکار کا ایک ملازم ایسی بڑی سزا کا فیصلہ اتنی آسانی سے کیسے لے رہا تھا۔ انہیں یہاں نافذ قانون بڑا اجنبی لگنے لگا۔

وہ بڑے جری لوگ تھے۔ ان کے دماغ سے لیکر لبوں تک پر سوالات ابھرنے لگے۔

'ہندوستان کے جیل خانوں کے لیے تو ایسا قانون نہیں ہے کہ وہاں سے جیل سے بھاگنے والے قیدی کو سزائے موت دی جائے گی۔

'کیا یہ دیکھنا نہیں چاہئے کہ اگر مجرم قید سے بھاگتے ہیں تو کیوں بھاگتے ہیں؟

کیا اس لیے بھاگتے ہیں کہ وہ قید کی مدت کی پوری سزا بھگتنا نہیں چاہتے۔

یا یہ کہ وہ قید کی صعوبتوں سے تنگ ہو کر بھاگتے ہیں۔

یا ان کے اوپر قید کے دوران اتنے مظالم ڈھائے جاتے ہیں، اس کو اتنا زدوکوب

کیا جاتا ہے اور وہ بھی موت کے خوف کے تلے کہ جب وہ برداشت نہیں کر پاتے تو باہر نکل جاتے ہیں؟

کیا یہ دیکھنا ضروری نہیں ہے کہ قیدیوں کے بھاگنے کے پیچھے وجہ وہ اذیت تو نہیں ہے جو انہیں دی جاتی ہے؟

کچھ سوال واقعی بہت گمبھیر تھے۔

'مجرموں کو بھاگنے سے روکنے میں جیل کے انتظامیہ کی کتنی کمزوری ہے؟

'جب ایک حد سے زیادہ اذیت بڑھائی جائے گی تو مجرم قید سے بھاگے گا اور گولی سے مرجانا یا جنگل میں جا کر مرجانے یا سمندر میں ڈوب کر مرجانے کو ترجیح دے گا۔

'یہاں یہ سب دیکھنے والا کوئی نہیں۔ ان کی حکومت ہے۔' ان میں سے ایک نے دوسروں سے کہا۔ وہ یہاں ایسے زنداں میں گرفتار تھے جہاں سوچ کر خاموش رہ جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

❖❖

دوسرے دن مجاور نے گوپی کی آگے کی کہانی سنائی۔ 'رفتہ رفتہ جب رتھی نے گوپی کو اپنی زبان سمجھادی تو گوپی نے اسے اور قبیلے کے دوسرے لوگوں کو اپنے بارے میں، اپنے قیدی ہونے کے بارے میں بتایا۔ جب سردار کو یہ معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو اس نے مارا تھا وہ لوگ قیدی تھی تو اس نے بہت افسوس کیا۔

'ہم انگریزوں کا بدلہ خود لیں گے۔ یہ ظالم لوگ ہمارے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں ہم ایک ایک قیدی کے خون کا بدلہ ان انگریزوں سے لیں گے۔

اسی بات سے تو گوپی گھبراتا تھا۔

یہ انگریزوں سے مصالحت کیوں نہیں کر لیتے ؟

اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ قبائلی حد درجہ بیوقوف ہیں۔

یہ انگریزوں سے لڑیں گیں؟

گوپی ان لوگوں کی زبان یا حرکات کا معنی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اس لیے زیادہ وقت وہ چپ رہتا۔ ایک قبائلی نے اس کے اس مسئلہ کو تاڑ لیا اور گاہے گاہے کبھی خاموشی سے اور کبھی مسکرا کر گوپی کو اکثر الفاظ یا حرکتوں کے معنی سمجھاتا رہتا تھا۔ شام میں اسے وہی کھانا دیا گیا جو قبائلی کھاتے تھے۔ پھر اس کے کپڑے مکمل طور پر اتار کر اسے جنگلیوں کی طرح بنا دیا گیا۔

ابتدا میں گوپی کو عورتوں اور نوخیز لڑکیوں کے بدن پر اور پستان پر نظریں اٹھانے میں جھجک محسوس ہوتی اور اندازہ نہیں لگا پاتا کہ اسے کہاں دیکھنا چاہیے اور کہاں نہیں دیکھنا چاہیے لیکن دھیرے دھیرے وہ ان قبائلیوں کے آداب زندگی کو کافی حد تک سیکھ گیا۔ وہ مسلسل اس بات سے خوفزدہ رہتا کہ کیا پتہ کس بات پر قبائلیوں کو غصہ آ جائے۔ ان کا تیور بدل جائے اور وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیں لیکن دھیرے دھیرے وہ ان قبائلیوں کے انداز زندگی کو کافی حد تک سیکھ گیا۔ بہت جلد وہ ان میں سے ایک بن گیا۔ رفتہ رفتہ اسے معلوم ہوا کہ جو لوگ بھی آپس میں معاشقہ کرتے ہیں اور شادی میں بندھن میں داخل ہوتے ہیں اور میاں بیوی کے تئیں وفاداری نبھاتے ہیں اور اپنے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں یعنی ان کے ننگے بدن کا معنی یہ قطعی نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے راہ روی کے ساتھ جنس کی تسکین کرتے البتہ بوڑھے، بڑے اور نوجوان سے نوخیز بھی جب ایک ساتھ ہوتے تو اس کے ذہن کے پرخچے ضرور اڑتے کیونکہ وہ اپنے معاشرے میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ان کی عورتیں آپس میں بچوں کو لے کر جھگڑے کرتیں۔ مرد آپس میں جنگ کرتے لیکن سردار کے سامنے سب خاموش ہو جاتے۔

ان دنوں میں جب گوپی ابھی زخمی تھا اسے کھانا پانی دینے کی ذمہ داری سردار نے اپنی پندرہ سالہ بیٹی کو دی تھی۔ وہ بہت سنجیدگی سے گوپی کی دیکھ بھال کرنے لگی تھی اور اس وقت وہ اداس ہو جاتی جب وہ گوپی کی کچھ یاد کر کے تنہائی میں ڈوبتے دیکھتی جب گوپی کی تنہائی کا دکھ اس سے نہیں دیکھا جاتا تو وہ اس کے قریب آتی اور کسی نہ کسی بہانے سے اس کے سامنے آ کر مسکراتے ہوئے اس کو اس تنہائی سے باہر لاتی۔ لڑکی کی گہری اور تازہ آنکھیں اور مالش کیا ہوا جسم ایک جادو کا سماں پیدا کر دیتے اور گوپی سب کچھ بھول کر اس کے حسین بدن اور اس کے جسم کے نوخیز خدوخال میں کھو جاتا لیکن کبھی اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں پڑی لیکن دن بدن لڑکی خود بخود اس کی جانب کھنچی آ رہی تھی۔ ایک دن جب قبائلی

اکھٹے ڈانس کرر ہے تھے۔ رتی نے گوپی کا بازو پکڑ کر اسے بھی کھینچ کر رقص کرنے کے لیے لے گئی۔ سردار نے ایک بار تو اسے گمبھیر نظروں سے دیکھا لیکن اس کے بعد نظریں نیچی کر کے کچھ سوچنے لگا۔لڑکی نے ضد کی۔ دوسروں کو کچھ حیرت نہیں ہوئی۔ حسن کی اس قربان گاہ پر اپنی جان کی بازی لگانے کی ہمت کرتے ہوئے وہ رقص میں شامل ہو گیا۔سب ڈانس کرتے رہے اور سردار اسے ہی دیکھتا رہا۔ڈانس ختم ہو گیا۔اس نے بھی اوروں کے ساتھ شراب پی۔

رات میں جب وہ سو رہا تھا اس نے دیکھا کہ سردار اپنی اس بیٹی سے بات کر رہا تھا۔ لڑکی سنجیدہ دکھ رہی تھی۔صبح کے وقت اس نے سردار کے دروازے پر قبائیکوں کو جمع ہوتے دیکھا۔

غالباً میرے سر کو میرے دھڑ سے کاٹ کر الگ کرنے کی تیاری ہو رہی ہے،

گوپی نے سوچا اور خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بے چینی سے سوچنے لگا کہ کیسے وہ یہاں سے فرار ہو۔وہ ضرورت سے فرار ہونے کے بہانے سامنے کے جنگل کی طرف گیا اور وہاں سے آگے نکلنے لگا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگنا لگ بھگ ناممکن تھا۔ سیکڑوں میل دور تک پھیلا ہوا جنگل انہی قبائیکوں کا علاقہ تھا کہ سردار کا ایک اشارہ ملتے ہی پورا قبیلہ تیر کمان لیے تلاش میں نکل پڑے گا۔اسے ڈھونڈے گا اور پورے قبیلہ کے سامنے آگ کی بھٹی میں ڈال کر کباب بنا دیا جائے گا۔ وہ تیز تیز بھاگتا جا رہا تھا، جب وہ تھک گیا تو وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ کر آرام کرنے لگا۔

انسان کسی ایک لمحہ میں غلطی کرتا ہے اور پھر ایک طویل خوفناک انجام کو بھگتتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا، اس نے کب غلطی کی۔ اس لمحے جب وہ اس نوخیز اجنبی حسینہ کے خوبصورت جادوئی نرم گرم جسم کی کرنوں سے پگھلنے لگا تھا، وہ اسے دیکھتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔اس نے پہلے اس کے کندھوں پر پھر اس کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا تھا،اور پھر اس کی نظروں میں ڈوبتے ہی نہ جانے کب اس کے ہاتھ میں اس کا خوبصورت سینہ آ گیا تھا۔کیسی لذت محسوس کی تھی اس نے۔اس کی انگلیوں کو اب تک اس نوخیز کے سینے کے ابھار کی اندرونی

نرمی کی لذت یاد تھی۔

پھر وہ لڑکی اچانک ہی دور ہو گئی تھی اور غصہ بھری آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بھاگ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ خوف سے کانپنے لگا تھا، رات میں اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ جاگ ہی رہا تھا کہ اندھیرے میں اس کی نظر دور بیٹھے سردار پر پڑی۔ اس کی بیٹی اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ جب وہ لڑکی اس کے بالکل قریب آ گئی تھی اس لمحے اسے اس خطرناک لمحہ کے انجام کا خیال آیا تھا۔اسے موت کی تلوار لٹکتی دکھ رہی تھی پھر بھی اس نے چانس لیا تھا لیکن اب تو وہی ہو بھی گیا تھا جس کا خطرہ تھا۔

اسے اپنی زندگی کے ابتدائی دن اور اس کے بعد کے برس یاد آئے۔ وہ بچپن سے ہی اپنی جڑوں سے اکھڑتا آیا تھا۔ وہ چوروں کے ایک خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔وہ ایک گھر میں سیندھ لگانے گئے تھے۔ وہ ابھی گھر میں راستہ بنا ہی رہے تھے کہ کوئی جاگ گیا۔تب بھی اس نے غیر ضروری ہمت سے کام لیا تھا،اس نے سوچا کہ جاگا ہوا آدمی جب سامنے آئے گا تو وہ اسکوڈرا دے گا۔ جب وہ نہیں ڈرا تو اس نے اپنے داب سے اس کی گردن پر حملہ کر کے اس کو مہلک طور پر زخمی کر دیا۔ لیکن اس کے بھاگنے سے پہلے آواز سن کر کچھ دوسرے لوگ گھروں سے نکل پڑے تھے۔اس کا پیچھا کیا اور پھر اس پر مقدمہ چلا اور اسے کالا پانی بھیج دیا گیا۔

اس کو اپنی جان بے حد عزیز تھی اور وہ بہت جلد کسی کی ہمدردی حاصل کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتا تھا اور اس کی بنیاد تھی اس کے اندر ہمت کی یکسر کمی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ فطرتاً شاعر بھی تھا۔لہٰذا وہ وہاں سے نکل کر بھاگ گیا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ اس کا شاید کچھ فائدہ نہ ہو۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں اسی کی

تلاش سے متعلق تھیں۔ اس نے درختوں کے بیچ سے سر اٹھا کر دیکھا۔ کچھ نوجوان تھے جو ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے تھے۔ کبھی زمین پر قدموں کے نشان ڈھونڈتے، کبھی مڑی شاخوں اور پتیوں سے اس کے گزرنے کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ خاموش رہا۔ وہ اس کا نام لے کر اسے پکارتے رہے۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ اس کو سوچنے کا موقع ملا۔ کسی تھکے ہوئے شکار کی طرح جو شکاری جانور کے ڈر سے بھاگتے بھاگتے بھاگنے کے ارادہ ترک کر چکا ہو اور خود ہی اپنے آپ کو شکاری کے پنجے میں ڈال دینا چاہتا ہو۔ اس نے اپنے کو سپرد کر کے ایک بار پھر ہمدردی کے آزماتے ہوئے نسخے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ نکل کر سامنے آ گیا اور جیسے موت کی طرف خود ہی چلنے لگا۔ گھنے درختوں والے اس جنگل میں چلنے والی ہوا کچھ ایسا محسوس کروا رہی تھی جیسے یہ اس کی زندگی کے آخری لمحات تھے۔ اسی بیچ اس کو ایک اور گروہ پیچھے سے آتا دکھائی دیا۔ وہ غالباً گھبرا کر گر جاتا لیکن یہ دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں تیر کمان نہیں تھے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ قریب آئے۔ وہ ایک بار پھر ان سے طرح طرح سے ہمدردی اور رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ اس وقت وہ خالصتاً اپنی مادری زبان بول رہا تھا۔ صرف اس کی آواز اور چہرے کے تاثرات اس کے معنی کھول رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر کسی قسم کا غصہ نہیں تھا۔

اس نے ان کو بتایا کہ وہ بھاگا نہیں تھا بلکہ راستہ بھول گیا تھا۔ وہ گوپی کو ساتھ لے کر آ گئے۔

سردار بیٹھا انتظار کر رہا تھا اور لڑکی رتھی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اسے بتایا گیا کہ سردار اس سے اپنی لڑکی کو بیاہ رہا تھا۔ شادی کی رسم ادا ہوئی۔

وہ رات گوپی کی زندگی کی سب سے زیادہ بھرپور رات تھی۔

رتھی:

گوپی نے جھک کر پیار سے رتھی کا بوسہ لیا تو وہ لوہے کی بنی لڑکی اتنی نرم بن گئی جیسے ریشم کی ہو۔ جذبہ پیار سے سرشار رتھی نے اپنے پورے وجود کو اسے پروتے ہوئے، اپنی گرم سانسوں کی خوشبوؤں سے اسے دنیا و مافیہا سے کاٹ کر جنت میں پہنچا دیا تھا۔ وہ انتھک انداز میں بار بار کسی پاگل کی طرح انتہائی معصومیت اور بے ساختگی سے اپنے پورے وجود کے ساتھ اس سے لپٹی رہی۔ اس کے اندر سے اس جنگل میں اجنبی اور تنہا ہونے کا احساس مکمل طور پر جاتا رہا۔

دوسری صبح اس کی زندگی کے ایک انتہائی حسین باب کا آغاز معلوم ہو رہا تھا، کیونکہ اب رتھی اس کے ساتھ گھر بسا چکی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب رتھی حاملہ ہو گئی تو سردار نے امور خانہ داری کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے گوپی سے ایک دوسری عورت کی بھی شادی کر دی۔ ان دو بیویوں اور رتھی کے پیٹ میں پلنے والے بچے کے ساتھ اب وہ مکمل طور پر قبائلی بن چکا تھا۔ ان کا رہن سہن، ان کا علم، ان کے جذبات، ان کی زندگی گزارنے کے ذرائع، ان کے جنگی حربے، ان کے چھپنے کی جگہیں، ان کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے طریقوں اور ان کے گانے بجانے سب دھیرے دھیرے اس کے ذہن و دل کا حصہ بن گئے۔ لیکن وہ پوری طرح ان قبائلیوں میں کبھی بھی فنا نہیں ہو پایا۔

مجاور کی گول گول چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اس کے اندر کا پروفیسر جاگ اٹھا تھا۔

اس کی وجہ تھی وہ عظیم تنہائی جس کا احساس ان جزائر کی دنیا قدرتی طور پر پیدا کرتی تھی۔ یہ تنہائی صرف اپنے جیسے لوگوں سے الگ ہونے کی تنہائی نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایسی تنہائی تھی جس نے مکمل طور پر اس جگہ کو ساری دنیا سے الگ کر رکھا تھا۔ اس زندگی کی تمام رنگینیوں کے باوجود وہ کبھی کبھی بے حد دکھی ہو جاتا۔ رتھی اس کے جسم کے قریب تو آ جاتی۔ اس کے دل کو بھی چھوتی لیکن شاید وہ بھی اسی طرح اس سے دور تھی جس طرح انگریز ہندوستان

سے دور تھے۔وہ لاکھ جتن کے باوجود نہ خود اس کی روح میں گھل پایا نہ وہ پوری طرح اسے سمجھ پائی لیکن وہ اس سے محبت کرتی تھی اس کا اسے گہرا احساس تھا۔پھر بھی جب کبھی رات کی گہری تنہائی میں اس کی آنکھ کھلتی تو ایک بھیانک سناٹا اس کو گھیر لیتا اور کبھی کبھی دہشت زدہ بھی کر دیتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔ پورٹ بلیر دوسرے قیدیوں کے بیچ پہنچ جائے یا کسی طریقے سے اپنے وطن ہی چلا جائے۔وہ رتھی کو لیکر بھی جانے کی کوشش کرسکتا تھا لیکن شاید یہ قبائلی نہ تو اسے اس طرح جانے دیں گے نہ خود رتھی جانا چاہے گی۔ یہ سوچتے سوچتے اسے رتھی کی محبت پر شک ہونے لگتا۔کبھی کبھی سوچتا کہ اگر وہ انہی لوگوں کے بیچ رہ گیا تو یہیں بوڑھا ہو جائے گا اور انہیں کے بیچ مر جائے گا۔اپنی زندگی کا اس طرح کا خاتمہ پتہ نہیں کیوں اسے بالکل پسند نہیں تھا۔

کبھی کبھی اسے یہ لوگ انگریزوں سے بھی زیادہ اجنبی محسوس ہوتے کیونکہ یہ کسی بھی اعتبار سے اس کے وطن کے لوگوں سے جڑے ہوئے نہیں تھے۔ان کی دنیا محدود تھی اور یہ اسی دنیا میں محدود رہنا چاہتے تھے۔اس علاقہ کے آفاق سے آگے سیکڑوں میل تک کوئی دوسرا ملک نہیں تھا، اور اس درمیان اگر کچھ تھا تو صرف گہرا سمندر، جس میں اٹھتی ہوئی لہریں چلتی پھرتی پہاڑیوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں جن سے ہو کر بغیر کسی جہاز کے جانا ممکن نہ تھا۔وہ اکثر ساحل پر کھڑے ہو کر اپنے وطن کے بارے میں سوچتا اور بہت مایوس ہو جاتا تھا۔ یہاں کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے اپنی کوئی بات یا خبر اپنے ملک تک پہنچائی جا سکتی۔خود ان لوگوں کے بیچ رہ کر اسے جو تجربہ ہو رہا تھا اسے وہ کسی 'اپنے' سے بانٹنا چاہتا تھا۔دھیرے دھیرے اس کے اندر ایک ناقابلِ برداشت گھٹن پیدا ہونے لگی۔اس نے کئی بار اس گھٹن کو ہٹانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔یہاں کی آب وہوا اس کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ یہاں ملنے والی کھانے پینے کی چیزیں کھاتے کھاتے وہ اوب سا گیا تھا۔ ہر چند کہ یہ چیزیں اسے رتھی اپنے ہاتھوں سے بنا کر بے حد پیار سے کھلاتی تھی اور اس کے اوپر جان چھڑکتی تھی۔ لیکن رتھی کے علاوہ اسے یہاں کی کسی اور چیز میں گہری دلچسپی پیدا نہیں ہو سکی۔

یہ جزائر بے حد ہرے بھرے سبز و شاداب تھے لیکن ان زمینوں پر کھانے والی کوئی بھی سبزی نہیں اگتی تھی۔ خوراک میں وہ وٹامن یہاں مل ہی نہیں سکتے تھے جو جسم کو تندرست اور بیماریوں سے محفوظ رکھتے۔ نہانے کے لیے میٹھا پانی نہیں تھا۔دن بھر کڑی دھوپ کی گرمی میں کام کرنے کے بعد چپچپے بدن کو صاف کرنے کے لیے سمندر کے اس کھارے پانی کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا جو خون بدن کی کھال کو چپکے چپکے خراب کرتا رہتا تھا اور نئی بیماریوں کو جنم دیتا رہتا تھا۔ مین لینڈ سے آیا ہوا آدمی ان جزیروں میں آکر ایک رفتہ رفتہ ایسا بوسیدہ مکان بن جاتا تھا جس کو وقت سے بہت پہلے ٹوٹ کر گر ہی جانا تھا۔ یہاں آکر احساس ہوتا تھا کہ انسان کی زندگی غیر محسوس طریقے سے کتنی ایسی ان دیکھی چیزوں کی بنیاد پر قائم تھی جن کی غیر موجودگی انسان کو اس مچھلی کی طرح بنا سکتی تھی جسے پانی سے نکال کر خشکی میں تڑپنے، پریشان ہونے اور موت کے منہ میں جانے کے لیے ڈال دیا گیا ہو۔وہ یہاں ایک ساری دنیا سے کٹا ہوا انسان بن کر رہ گیا تھا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ اجنبی دنیا بھی محفوظ نہیں تھی۔ یہ انگریزوں کے نشانے پر تھی۔ایک نہ ایک دن اسے تباہ ہونا تھا۔وہ انگریزوں کی اسکیم سے واقف تھا کہ کسی بھی دن انگریزی فوج یہاں بھیجی جا سکتی تھی۔جن انگریزوں نے پوری دنیا کو فتح کیا تھا ان کے لئے یہ جنگل کیا چیز تھے۔انگریزوں کو نئی مجرم آبادی کو بسانے اور سرکاری دفتروں، فوجی ٹکڑیوں کے کھیل کود، ٹریننگ وغیرہ کے لیے جگہ اور عمارتوں کی ضرورت تھی۔ عمارتیں لکڑیوں سے بنتی تھی۔اس کے لئے لکڑی چیرنے کی مشینوں اور فیکٹریوں کی ضرورت تھی اور ان تمام چیزوں کے لئے ایسے علاقوں کو قبضے میں لینے کی ضرورت تھی جہاں سے لکڑیاں لائی جا سکیں۔ لیکن لکڑی کاٹنے کی کوشش میں اکثر ان قبائلیوں سے لڑائی ہو جاتی تھی۔وہ کبھی کبھی تنہا بیٹھا ہوا انہی 'مسائل' پر غور کرتا رہتا۔لیکن اپنے ان اندیشوں میں وہ کسی کو شامل نہیں کر پاتا۔ یہ قبائلی بے حد ضدی تھے اور ان مسائل پر غور کرنے کیلئے وہ بالکل تیار نہیں تھے۔

جیالانی کو یہ کہانی سنتے ہوئے سمجھ میں آنے لگا کہ جنگلی معاشرے کے کمزور یا

موقع پرست طبیعت کے عوام کسی فاتح یا حاوی طبقے کے سامنے اپنے لوگوں کو کمزور پاتے ہیں تو کیسے وہ خود اپنے ہی مجاہدوں کی حوصلہ شکنی کرنے لگتی ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بارے میں اس کے چاروں طرف معاشرے کے لوگوں کی رائے اسی طرح تو بنتی جا رہی تھی۔

گوپی جانتا تھا کہ انگریز یہ طے کر چکے ہیں کہ ان جزیروں میں ایک مکمل دنیا آباد کرنے کے لئے اس جروا قبیلے کے لوگوں کو ایک مخصوص علاقے میں ہانک کر کم از کم ان جزیروں کے ایک بڑے علاقے کو جروا قبائلیوں سے خالی کروا لیا جائے جہاں فوجی یا قیدی مزدوروں کو ان کے تیروں کا سامنا نہیں کرنا پڑے۔

اس کے مدنظر حاکموں نے ان جزائر کے نقشے پر نظر ڈالتے ہوئے ایک بڑے علاقہ کو غیر جروا علاقہ قرار دے کر فوج کو حکم دیا تھا کہ وہ اس پورے علاقے سے جروا قبائلیوں کو نکال کر اسے خالی کرے اور اس کی سرحدوں پر پہرہ لگا دے۔

فوج نے جب یہ کارروائی کی تو جروا قبائلیوں کے اوپر یہ گویا ان کے ملک کے بڑے حصے سے ان کو نکالے جانے جیسا تھا۔ جا بجا جنگلوں میں لڑائیاں ہوئیں۔ جروا انگریزوں کی رائفلوں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ دوربین لگی رائفلوں سے جس دوری سے انگریزی فوج انہیں دیکھ کر ان پر نشانہ کر سکتی تھی وہاں سے تیروں سے جوابی حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ جروا قبیلے میں غصہ بڑھتا گیا۔ دنیا کی کسی بھی قوم کی طرح انہیں اپنے ملک پر یہ حملہ پسند نہیں تھا اور وہ اپنی زمین چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے ایک زبردست کارروائی کا حربہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ سردار سے قربت کی وجہ سے گوپی اس پوری سوچ میں شامل رہا۔ سردار نے اس کو زندگی بخشی تھی۔ اپنی بیٹی سے شادی کر کے اپنے پیار کا احساس دلایا تھا اور قبائلیوں میں اسے ایک ممتاز مقام دیا تھا۔ اسے گوپی پر مکمل بھروسہ تھا۔ لہٰذا وہ جروا قبیلے کی وار کونسل کی ہر میٹنگ میں شامل رہتا۔

❖❖

ادھر جروا انگریزوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے ادھر بڑے پیمانے پر ان کے جنگلوں پر قبضہ کر کے وہاں کی زمینوں، درختوں اور ساحلوں کو استعمال کرنے کے لیے مین لینڈ سے زیادہ سے زیادہ آدمی لانے کی مہم شروع ہو گئی۔

ملک کے جیلوں کے دروازے اس اجنبی کام کے لیے کھول دیے گئے۔ اپنے علاقے کے جیلوں سے چلنے کے بعد اس سفر میں سڑکوں، درختوں، بستیوں، ندیوں کو دیکھتے ہوئے یہ قیدی سوچ رہے تھے کہ ان چیزوں پر ان کی نظریں شاید آخری بار پڑ رہی ہیں۔ انہیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب ان تمام چیزوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ اس جذبہ کے تحت ان کا حب الوطنی کا جذبہ ایک بار پھر بجھتے چراغ کی لو کی طرح بھڑک اٹھا تھا۔ جہاں جہاں انہیں موقع ملا ٹرین کی کھڑکیوں سے انہوں نے مویشی چراتے چرواہوں اور صبح کو کام پر جانے یا شام کو گھر لوٹتے مسافروں کو ہاتھ ہلا کر آوازیں دیں اور نعرے لگائے جو کبھی بمشکل ہی ان کو سنائی دیے سوائے اسی کے ان کی پکار بلند ہوئی جو صدا بہ صحرا ہو گئی۔ سننے والوں کے پاس جواب میں ان کے اس صبر و تحمل کے علاوہ اور کچھ نہ تھا جو ان کی آنکھوں میں رات کے طویل صحرا میں جھلملاتے شمعوں کی طرح روشنی تھا۔ ان کی آنکھوں میں ان وطن کے جیالوں کے اور پر فخر کے وہ موتی ضرور چمک اٹھے جنہوں نے وطن کی آزادی کے لیے اپنی مکمل زندگی کی قربانی دی تھی اور اب ایک نئے تماشہ کا جانور بنے ہوئے تھے۔ ان کو ٹرین میں چاہے دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ملک کی روح کو ٹرین کا انجن پنجروں میں بند کر کے کھینچے جا رہا ہو۔

کھیپ کے کھیپ ملزم مجرموں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے کیونکہ کالا پانی میں مزدوروں کی ضرورت تھی۔ تمام عدالتوں میں ایسے ہنر اور فنون کی فہرست بھیج دی گئی تھی جن کے جاننے والوں کی کالا پانی میں ضرورت تھی۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ کالا پانی کی

سزا دیتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھا جائے کہ قیدی مضبوط اور صحت مند ہوں۔ عدالتیں اپنے حیرت انگیز فیصلوں سے وکیلوں کو ششدر کر رہی تھیں۔ کسی مقدمے میں ملزم کے طور پر نام آنا اور جسمانی طور پر مضبوط ہونا سزا پانے کے لیے کافی تھا۔ عدالتیں مزدور منڈی بنی جا رہی تھیں۔

ہندوستان کے ہر کونے کے لوگ تھے، پنجابی، بہاری، یو پی والے، بنگالی، آسامی اور ہر طرح کے جرم میں سزائیں پائے ہوئے۔ حکومت برطانیہ کے خلاف سر اٹھانے والے، نعرہ لگانے والے، قتل کرنے والے، ڈاکہ زنی کرنے والے یا کئی کئی بار مسلسل جرم کرنے والے۔

قیدیوں کے چہرے جھلسے ہوئے، داڑھی بڑھی ہوئی، ناخون میلے، پاؤں خالی اور نگاہوں میں ایک لامتناہی اداسی گہرائی۔

عدالت نے انھیں کالا پانی کی سزا دی تھی۔ وہ سزا کاٹنے جا رہے تھے لیکن وہ خود بھی سوچے جا رہے تھے۔

ان کا جرم کیا تھا۔

وہ جرم تھا تو وہ جرم کیوں تھا؟

کیا وہ واقعی جرم تھا؟

یہ دنیا طاقت کے کپاس سے چل رہی تھی۔

انھیں اپنی اپنی مختلف طرح کی کہانیاں یاد آتی رہیں...

وہ فلسفیانہ انداز میں اپنے جرائم کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

اپنی دفاع میں۔

قانون کون بناتا ہے۔

کیوں بناتا ہے۔

اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں۔

کیا قانون کبھی کبھی کچھ مخصوص گروہ کے لوگوں کو دبانے یا پھنسانے کی لئے بھی بنتا ہے۔

کچھ مخصوص لوگوں کے مفاد کو محفوظ رکھنے کے لئے بنتا ہے۔

اگر ایسا ہے تو وہ قانون محترم کیسے ہو سکتے ہیں۔

شکاری کی طاقت ان کی زبان کو روک سکتی تھی، ذہن کو نہیں۔

وہ سوچا کرتے تھے کہ انھوں نے عدالتوں میں کتنی بنتیاں کی تھیں۔ کتنی دلیلیں دی تھیں، سچائی کو بے نقاب کرنے والے اشارے کئے تھے لیکن کوتاہ نظر اور متعصب حاکموں اور ججوں کی سوچ پر ان کی اپنی ذاتی رائے اور اپنے مقاصد حاوی تھے۔

یہ معصوم پر مبنی الزام کے پنجروں میں ڈال کر ان کے سامنے فیصلے کے لئے رکھ دئے گئے تھے۔

ملزم کو جرم ثابت ہونے تک معصوم سمجھنے کا اصول ایک خواب پریشاں بن کر رہ گیا تھا۔ ایک بار سرکار مقدمہ قائم کر دیتی تھی تو معصوم نہ صرف مجرم سمجھ لیا جاتا تھا بلکہ اس کے ساتھ مجرم جیسا سلوک بھی ہوتا تھا اور اسے مجرم ثابت کر کے اسے سزا دلانے اور دینے کی کوشش ہوتی تھی۔ کیونکہ مدعی خود سرکار تھی اور وہی سرکار ججوں کی بحالی کرتی تھی ان کو ترقی دیتی تھی۔ معصوم ملزم کی حالت ایسی خوبصورت عورت کی ہو جاتی تھی جسے ہتھیاروں سے لیس خطرناک غنڈے سڑک پر گھیرے ہوئے ہوں اور خوفزدہ عوام بے بسی سے دیکھ رہے ہوں۔

جج صرف عدالت کے کمروں میں بیٹھے ہوئے شطرنج کے کھلاڑیوں کی طرح قانون کی کھال میں سے بال نکالنے کو ہی جج سمجھتے تھے۔ اس صورتحال کا سامنا ان قیدیوں کے وکیلوں نے کیا تھا۔ اور ججوں کے سامنے سے ہٹتے ہی باہر آ کر ماتم کیے تھے۔ کئی بار یہ شک ہوا کہ یہ وکیل ہی کمزور تھے۔ لیکن اپیلوں کے بعد معلوم ہوا کہ نیچے سے اوپر تک ان قتل گاہوں کی سیڑیاں ایک خاص انداز میں بنائی گئی تھیں۔

عدالتوں میں انسانی حقوق اور انسانی آزادی کی پامالی اور شہریوں کی بے حرمتی چاہے وہ غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے ہو یا جذبہ آقائیت کے تحت ہو جمہوریت کے گلے پر خنجر چلانے جیسا ہے۔ جنگ' ملک پر بیرونی لٹیروں کی گرفت' حیرت انگیز حد تک بے رحمی، دھوکے بازی، سفید پوشی، کمینی مسکراہٹیں، یہ عدالتیں بھی اسی کریہہ درندہ کا ایک بازو تھیں۔ ایک روشن تہذیب کے ارتقا کو ناکام کرنے میں یہ بھی برابر کی حصہ دار تھیں۔ یہ ان سفید ریش بزرگوں کی طرح تھیں جو درحقیقت پاکھنڈی ہوتے ہیں۔ وہ لوگ یہی تو تھے جنہوں نے خالد کے پردادا کو کالا پانی بھیجا تھا۔

عدالتیں تکلیف زدہ انسانوں کے جدوجہد کا آخری پرامن راستہ ہوتی ہیں۔ اس کے بعد خلفشار کا راستہ کھلتا ہے۔

اس راز کا کسی بھی مورخ نے کھل کر اظہار نہیں کیا کہ دراصل خونی انقلابات کے

پلیتے عدالتوں کے بند دماغوں سے ہی پھٹتے ہیں اور جمہوریت کے مجبور آنسوؤں کا پہلا قطرہ عدالتوں کے دروازو انخلا کے چوکھٹے پر گرتا ہے۔

قیدیوں میں بہت سے قیدی عالم اور مفکر تھے اور ان مسائل پر تفصیل سے سوچ سکتے تھے۔ تمام باتیں ان کے اوپر روشن تھیں لیکن وہ عدالتوں کے اس ننگے ناچ کو دیکھنے پر مجبور تھے کیونکہ وہ میدانِ جنگ میں ہار گئے تھے۔

ایک بہاری کو مقدمہ میں قتل کی سزا ملی، اور وہ قاتل بن کر کالا پانی جا رہا تھا۔ کیونکہ اس نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ قتل کی سزا قتل۔ قاتل کی اڑا دو گردن۔ لیکن وہ اب محسوس کر رہا تھا کہ وہ تو کہیں اور جا رہا تھا۔ تاریخ میں ایسا بھی ہوتا آیا تھا۔

وہ اپنی بہن کی عصمت دری کی گالی سن کر غصہ میں آ گیا تھا۔

اس گالی سے ابھرنے والی وہ گھناونی تصویر جو اس کے ذہن میں ابھری تھی وہ اسے ابتک یاد تھی۔!

وہ بھالا جو اپنی حفاظت کے لیے لے گیا تھا۔

وہ لمحہ۔

ایک لمحہ۔

ایک لمحہ میں غصہ میں آ جانا۔

ایک پل کا غصہ۔

اور وہ عورت تھی جس نے اپنے نوزائیدہ بچے کو قتل کر دیا تھا اور دریا میں پھینک آئی تھی۔ کیونکہ وہ بچہ جائز نہیں تھا بلکہ وہ اس پڑوسی کا بچہ تھا جس سے اس کی دوستی ہو گئی تھی اور وہ جذبات میں بہہ گئی تھی اور پھر کھیتوں کے درمیان۔ چاندنی۔ چاندنی۔ ایسی ہی کھلی چاندنی میں اس پڑوسی سے باتیں کرتے کرتے مدہوش ہو گئی تھی۔ اور پھر یہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ جس کو وہ رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ اس کے بچے کو باسٹارڈ کہہ کر پکاریں! اسے وہ چاندنی رات یاد آ رہی تھی۔ اور وہ پڑوسی۔ اور اس کے حمل سے پیدا ہونے والا وہ بچہ۔ اور اس بچے کی پہلی آواز۔

ایک انسان کی پیدائش پر غلط صحیح کا فیصلہ صادر کر کے اس کی پیشانی پر ٹھپہ لگانا۔
اگر پیدائش غلط تھی تو اسے کائنات نے پیدا ہی کیوں کیا۔

اور کائنات نے پیدا کیا تو یہ ٹھپہ کائنات کی پیشانی پر کیوں نہیں۔

اب یہ نئے بھیڑ بھی ان جزیروں کو دیکھ رہی تھی۔

خودرو جھاڑیاں، بید کے پودے،

پتھریلے چٹان،

اونچی نیچی پہاڑیاں،

لکڑی سے بنی ہوئی سیڑھیاں

ٹیڑھی میڑھی چڑھائیوں پر چڑھنے کے لیے دشوار گزار راستے

سمندری لہروں کی آواز،

سمندر کے پانیوں کے مختلف رنگ،

گھاس سے بھری پہاڑیاں،

ٹیلے،

گھنے درختوں کی ہری ٹھنڈک ،

پہاڑی نالا،

چشموں کے پانی کی آوازیں،

پتھروں پہ کھلے ہوئے پودے،

پودوں کے قریب آ کر کائنات کے فلسفے سے انتہائی قربت،

لیکن فرصت کہاں؟

کھلا سمندر، افق تک پھیلا ہوا،

سامنے نیل آئی لینڈ'

آسمان پر دیو پیکر بادل'

سورج، چاند، ٹھنڈی ہواؤں کا رات بھر چلنا اور سمندر کی آواز کی گہری پراسراریت۔

سامنے جیلر کے مکان کے سامنے ایک گول نما پہرہ گھر میں کھڑا رائفل لیے سنتری جس کی مونچھیں تیل پلائی ہوئی، چہرہ لوہے سے بنا ہوا، اور کپڑے بھی پولس کی ٹرینگ پائے ہوئے تھے۔ اس مکان سے آگے وہ تالاب تھا جسے قیدیوں کی محنت ومشقت سے انگریزوں کی عیش وعشرت کے لیے بنایا گیا تھا، اس میں سیڑھیاں تھیں جو پانی کے اندر جاتی تھیں۔

دوسری طرف سپاہیوں کے رہنے کے لیے بیرک تھا، جہاں وہ اپنی آدھی پینٹ پہنے ادھر ادھر لاپرواہی سے آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔

تیسری طرف کافی دور ایک ٹیلے نما بلندی پر گنبد نما پھانسی گھر تھا، جہاں ان لوگوں کو لے جایا جاتا تھا جو یا تو کسی ظلم سے مرجاتے تھے یا جن کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دینا ہوتا تھا۔

دھول مٹی چیخ پکار اور ہنگاموں کی اس دنیا کے پیچھے اور نیچے ایک سسکتی ہوئی دنیا بھی تھی جو ان لوگوں کو جینے کی طاقت دیتی تھی۔

ایک دن۔

دو دن۔

کئی دن۔

رفتہ رفتہ مہینوں بیت گئے۔

سمندر کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھا ہوا،

اپنی جانگھ پر کاغذ رکھ کر ایک قیدی ایک خط لکھ رہا تھا،

وہ یہ خط اگلے جہاز سے بھیجنا چاہتا تھا۔

'میرے دوست!

ہمیں کالا پانی آئے ہوئے ایک مدت گزر گئی۔

لکھتے لکھتے اس نے سامنے کھلے گنبدی نیلے آسمان میں دیکھا۔

وہ جانتا تھا یہ خط کبھی نہیں پہنچے گا کیونکہ اسے خط بھیجنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اسے سمندر کے کنارے پتھروں پر رکھی ہوئی ایک بڑی سی سادہ کاپی مل گئی تھی جس کے اوراق سمندری ہوا کے جھونکوں سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

پاس ہی ایک دوات میں گردن تک روشنائی بھی بھری تھی، اس نے ادھر ادھر دیکھا تو وہاں قلم دان میں ایک قلم بھی تھا۔ شاید ڈاکٹر والکر یہاں آیا تھا، اور کھلی جگہ میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا اور اس کے جانے کے بعد اس کا ماتحت ابھی یہ سب سامان سمیٹ کر نہیں لے گیا تھا۔

وہ ایک صفحے پر خط لکھ کر اسے کاپی سے پھاڑ کر رکھ لے گا اور اسے کسی طرح بعد میں بھیجنے کی کوشش کرے گا، وہ اس خط میں یہاں کی دردناک حالت کی منظر کشی اس شدت سے کرے گا کہ وطن کا جو کوئی بھی اسے پڑھے گا، اس کے گھر پہنچوا دے گا۔ وہ اس خط کو سمندر کی لہروں پر ایسے موسم میں ڈالے گا جب ہوا ملک کے ساحلوں کی طرف جاتی ہو۔

میں جانتا ہوں یہ خط شاید تمہیں کبھی نہ ملے لیکن میں اس وقت وہ سب کچھ لکھنا چاہتا ہوں جو تم وہاں سے نہیں دیکھ سکتے اور اب تک نہیں جانتے۔ میں یہاں ایک عجیب و غریب دنیا دیکھ رہا ہوں۔ تم کو پچھلی بار میں نے اس وقت خط لکھا تھا جب جیل سے ہم کو دوسرے جگہ لے جانے کا پروگرام ہمیں معلوم ہوا تھا۔ اس وقت یہ بتایا گیا تھا کہ قاتل ہونے کی وجہ سے مجھے سخت سزا ملنی تھی لیکن عدالت نے نرمی سے کام لیتے ہوئے جلاوطنی کی سزا دی ہے۔ لیکن یہ صرف جلاوطنی نہیں ہے۔ یہاں یوں تو جلاوطنی بھی ہے کہ یہاں سے نہ تو اب تک میں تم کو خط بھیج سکا، نہ اب تک، کوئی تمہارا کوئی خط آیا۔ یہ جلاوطنی یوں بھی ہے کہ یہاں نہ وطن کا موسم ہے نہ وطن کے چڑیوں کی آوازیں ہیں، نہ وطن کے چہرے ہیں، نہ وطن کے جیلر ہیں نہ وطن کے سپاہی جو ہم کو گالیاں بکا کرتے تھے، اور ہم پر رعب جماتے تھے، یہاں تو سب کچھ اجنبی ہے لیکن اس جلاوطنی میں بھی ہم آزاد نہیں۔ وطن سے خارج کرنا ہی صرف ہماری سزا نہیں ہے...... ہم بیڑیوں اور زنجیروں میں گرفتار رہتے ہیں۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے ہر وقت یہ بیڑیاں اور زنجیریں ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ ہم کو جانوروں کی طرح اس غیر آباد جنگل میں درختوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ دیکھا تم نے ہم قیدی کے قیدی ہیں اور جلاوطن کے جلاوطن۔ لیکن اس سے آگے ابھی بہت کچھ ہے۔ اس سے آگے وہ مسلسل اذیتیں ہیں جو ایک مقررہ وقت اور مقررہ انداز میں ہم کو دی جاتی ہیں، لیکن ان اذیتوں تک ہی محدود نہیں۔ ہم محنت کے ساتھ دن بھر اس جگہ کی کھلی تیز ترین بال جھلسا دینے والے اور پیٹھ کے چمڑے کو کالا کر دینے اور اس کی چربی کو پگھلا دینے والی دھوپ میں کام کرتے ہیں اور ہمارے پیچھے سفید پوش اپنے کوڑے لے کر کھڑے رہتے ہیں

گویا ہمارا ہاتھ رکا اور اوپر سے کوڑا لگا...... یہاں ہر منٹ ہی نہیں ہر سکنڈ قید ہے، گھنٹہ دن، ہفتہ، مہینہ، سب کچھ یوں گزرتا ہے ہم موت کی تمنا کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہاں موت سب سے بعد میں آتی ہے، پہلے ان تمام مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ موت اور زندگی دونوں ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جس دن تم بیکار ہو جاؤ گے اور ہم کو تمھیں موت دینی ہوگی، اس دن ہم تمہاری بیڑیاں کھلوا دیں گے اور کوڑا زیادہ اور بے وجہ لگوائیں گے تاکہ تم بھاگنے کی کوشش کرو اور قبائلیوں کے تیروں کا نشانہ بن جاؤ یا بھاگنے کے جرم میں گرفتار کر کے خود تمہارے ہاتھوں اور تمہاری محنت سے بنے ہوئے پھانسی گھر کے موت کے پھندے میں تم کو لٹکا دیا جائے۔ اور اس سے بھی آگے۔ یہاں نہ تو کسی سے اپنی تکلیف بتائی جا سکتی ہے اور نہ کسی کے پاس شکایت کی جا سکتی ہے۔ نہ اپیل اور اس سے بھی آگے۔ سب سے بڑی اذیت۔

یکایک اسے کسی نے ٹھوکر ماری تو آنکھ کھل گئی۔

وہ تو کام کرتے کرتے درخت کے سائے کے نیچے اونگھ گیا تھا۔

اور اب ایک گورا اسے ٹھوکر لگا رہا تھا۔

اس کے دل کو ایک شدید دھچکا سا لگا۔

'کاش ہمارے ہمدردوں، ہمارے ہم وطنوں ہمارے اپنوں کو صرف میرا خط پہنچ جاتا۔ وہ خط جو میں خواب میں لکھ رہا تھا۔ کاش ہم وطنوں تک صرف یہ بات پہنچ جاتی اور ملک کے گوشے گوشے میں لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ لوگ جن کے لیے سماج پھانسی کی سزا دلوانا چاہتا ہے اسے حکومت برطانیہ کیسے استعمال کر رہی ہے۔ اسکا دل گویا اندر سے ٹکڑا ٹکڑا' بے جان اور کمزور ہو گیا، پھر اسے خط کا خیال آیا۔

'اس کے ہاتھ پاؤں میں تو بیڑیاں ہیں، اور وہ تو قید میں ہے، اس نے آسمان کی بے پناہ وسعتوں کی طرف دیکھا اور فضاؤں اور ہواؤں کی صرصر اور درختوں کی پتیوں

میں کھو گیا۔

کاش یہ الفاظ ان لوگوں تک۔

لیکن جاگنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سارا تصور فضول اور بے معنی ہے!!

کبھی نہ پورا ہونے والا خواب!

ہفتوں' مہینوں تک ایک کے بعد دوسرا جہاز نئے قیدیوں سے بھر بھر کر آتا رہا۔ اور جنگل بھرے جزائر میں جنگلوں کو کاٹنے اور عمارتیں بنانے کا کام چاروں طرف دور دور تک تیزی کے ساتھ پھیلتا رہا۔

انسانوں کی جان اور خون کی بھوکی اور پیاسی ایک اجنبی نئی دنیا یہاں آباد ہوتی رہی۔

❖❖

شیر علی کابل کا پٹھان ایک قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر کالا پانی کی سزا پا کر انہیں دوسری کھیپوں میں آیا تھا اور میر علی کو بھی سزا اسی دوران ہوئی تھی۔ خالد کو خیال آیا کہ اگر یہ کالا پانی نہ ہوتا تو اپیل اور اعتراض کے بعد اس کے پر دادا یقیناً چھوٹ گئے ہوتے۔

تھوڑی دیر بعد خالد کو پھر خیال آیا کہ میر علی کی شیر علی سے ضرور ملاقات ہوئی ہوگی اور دونوں میں پٹتی بھی ہوگی۔ خالد کو میر علی کی تلواریں اور زرہ بکتر یاد آنے لگے تھے۔ ہر چند کہ شیر علی کی کہانی لکھنے والا کوئی نہیں تھا اور انگریزوں کے ریکارڈ میں محض اس کے مقدمے کا ذکر تھا لیکن اس کے بارے میں، اس کی زندگی اور کالا پانی کے اس کے ایک ایک لمحہ کے بارے میں تفصیلات اس طرح موجود تھیں کہ جب ان کا بیان ہوتا تو اس کی سانسوں کی آواز، الگ الگ موقعوں پر اس کے ابرو کے تیور، اس کے غصے، اس کی باتوں، مختلف چیزوں پر اس کی رائے، یہ سب اتنا جانا مانا سا تھا جتنا خود اپنے وقت کے زندہ لوگوں کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم تھا۔ ایک ایک تفصیل سینہ بہ سینہ آئی تھی اور اس کی سچائی لوگوں کو اتنی عزیز تھی کہ کسی کی کیا مجال کہ اس تفصیل میں رد و بدل کر دے۔ خالد سہیل جب ان سے یہ تفصیلات سنتا تو یہ قصہ اس کی نظروں کے سامنے فلم کی طرح گزرنے لگتا اور اس میں شیر علی ہیرو کی طرح دور اور قریب' سب کے بیچ اور مکمل تنہائی میں، ہر جگہ دکھائی دینے لگتا۔ چند ہی روز میں خالد تقریباً اس عہد میں آباد سا ہو گیا۔ اور اس عہد کی مکمل چلتی پھرتی تصویر اس کے سامنے آنے لگیں۔ اس سے اس کو دستاویزات کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ اسے کالا پانی کے اس واقعہ پر پوری دنیا سے ایک تاریخی مقدمہ لڑنا تھا اور وہ اس سانحاتی دور کے ایک ایک لمحے کی انتہائی سچی تصویر اپنے دل و دماغ کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا اور اس میں کسی طرح کی افسانوی ملاوٹ کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔

یہ قصہ اب خالد کے دل و دماغ کو متاثر بھی کرنے لگا۔ اور اس کے خیالات کی دنیا میں ایک کہرام سا مچنے لگا تھا۔ اس کے ذہن میں نہ صرف سوالات اٹھنے لگے تھے بلکہ یہ سوالات ایک وسیع تر دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے عام آدمیوں سے لے کر حکمرانوں تک کے کردار اور ان کی تقدیر کے بارے میں نئے نئے تصورات پیدا کرنے لگے تھے۔ اس کائنات کے درمیان انسان موقع پانے پر کیا کیا تماشے کھڑے کر سکتا ہے اس بات پر وہ متحیر تھا۔

یہ قیدی یہاں قید میں ہونے کے باوجود اپنے اندر اور اپنے درمیان ایک بڑی دنیا رکھتے تھے۔ ان میں کافی لوگ کردار اور ذہن کے اعتبار سے وہ لوگ تھے جو اپنے ملک کی حکومت سے لیکر دوسرے ملکوں سے معاشرتی اور سیاسی تعلقات' نیز معاشرہ' زندگی' فلسفہ ہر میدان کے وہ منتخب روزگار تھے جنہوں نے ہندوستان کو بچانے کے لئے انگریزوں سے جنگ لڑنے کی جرات کی تھی اور جو اس کی بصیرت رکھتے تھے۔ یہ اس معاشرے کے خالق تھے جس نے غالب اور مومن جیسے شعرا کی ذہنی پرورش کی تھی' تربیت کی تھی اور ہمت افزائی کی تھی۔ کالا پانی میں پتھر توڑنے والے یہ لوگ ایک زمانہ پیدا کر دینے کی ذہنی صلاحیت رکھتے تھے۔ شیر علی جیسے نوجوانوں کی تربیت ان کا صبح شام کا کھیل ہوتا تھا۔ کالا پانی میں آیا ہوا قیدیوں کا پہلا کھیپ شہر تاریخ میں عجائب گھر کی طرح تھا۔ دلی کے ذہن کو چیتوں کی طرح پیڑ سے تراش کر یہاں ڈال دیا گیا تھا اور اس کے افراد کے نام سرکاری رازداری کے تحت مٹا دئے گئے تھے۔ یہ وہ اہم لوگ تھے جن کو مین لینڈ میں عوام کے علم میں ہوتے ہوئے قتل کر کے ختم کرنا انگریزوں کے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مغل شہنشاہوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اور سلطنت مغلیہ کے سارے ستون جو ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مارے نہیں جا سکے تھے وہ سب مصلحتاً یہاں لائے گئے تھے۔

ان قیدیوں کے نام سے ان کے بھاری بھرکم الفاظ تو جا چکے تھے لہٰذا انہوں نے خود ہی اپنے کو اپنے چھوٹے ناموں سے مشہور کر لیا تھا۔

یہ لوگ جو کچھ تھے وہ تو یہ اب تھے نہیں' بس صرف زندہ لاش تھے اور اس کا انہیں مکمل احساس تھا۔ ان کا مزدوروں کی طرح حکم ماننا اور کام کرنا تاریخ کا غیر معمولی واقعہ تھا۔

بڑے بڑے ذہنوں اور کرداروں کو طاقت کس طرح ذلیل کرتی ہے اس کا یہ نمونہ تھے۔

ان کو جب بھی موقع ملتا وہ سوچتے تھے۔

یہ برف سے آگ پیدا کرنے والے انسانوں کی صف سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ تو صرف تاریخ اور تقدیر کے ہاتھوں پٹ گئے تھے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ زمین پر ان کا کوئی ثانی نہیں تھا لیکن اب ان کے بارے میں اس بات کا اعتراف کرنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی۔

❖ ❖

شیر علی کالا پانی پہنچا تو یہاں کے قیدیوں کے سماج کا ایک مقبول ممبر بن گیا۔ ایک قیدی سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ دن میں کام کرتے کرتے وہ آپس میں خوب باتیں کرتے اور حکومت برطانیہ اور کمپنی کے اوپر تبصرہ خیال کرتے رہتے تھے۔

قیدیوں کا عام خیال تھا کہ اصل دکھ کی وجہ تو حکومت کی پالیسی تھی اور یہ بیچارے جیلر تو مجبور کیے گئے ہیں جن کی یہاں پوسٹنگ ہو جاتی ہے۔ ان سے تو جیسا کہا گیا ہوتا ہے وہ ویسا کرتے ہیں اور ان کو جیسے اختیارات دئے جاتے ہیں ان کا استعمال ان مقاصد کے لیے کرتے ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے ان کو بھیجا گیا ہے اور وہ یہ سب کچھ کرنے سے انکار بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے بال بچوں کی روزی روٹی اسی میں ہے اور وہ کیا کر سکتے ہیں؟ وہ تو اسی نظر سے اس جلاد کو بھی دیکھتے تھے جس نے تمام اگلے لوگوں کو موت کے پھندے پر چڑھایا تھا۔

'جلاد کا پیشہ برا نہیں۔ جلاد تو ہمیشہ سے رکھے گئے ہیں اور رکھے جائیں گے۔'

پھر قیدیوں میں جلادوں کی قسم اور واقعات پر گفتگو ہونے لگی۔

'میں متفق نہیں کہ جلاد کا کام برا نہیں ہوتا۔ لوگ تو صرف یہ سمجھتے ہیں کہ جلاد کا کام پھانسی دینا ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ جلاد تو انسان کو اذیت دینے کا فن سیکھتے ہیں۔ ان کے کچھ فن خاندانی ہوتے ہیں۔ اور پشت در پشت چلے آتے ہیں اور اس فن میں وہ ماہر ہوتے ہیں۔ ان کی اسی اہلیت کی بنا پر ان کی تنخواہ مقرر ہوتی ہے اور ترقی ملتی ہے۔'

یہ گفتگو ان کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ تھی۔ وہ اسی خوراک پر تو اس تنہائی میں جی رہے تھے۔

مجاور آگے کہہ رہا تھا۔

خالد کی موت کے بعد میں نے خود بھی انڈمان کے ماضی اور خصوصی طور پر کالا پانی کے بارے میں جو کچھ ملا اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے یہاں اپنے گھر میں اسکی ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی ہے۔ میں اس انسانی فریب، مکاری اور ظلم کے اس جال کو سمجھ سکتا ہوں جس میں خالد کا ذہن جا کر پھنس گیا تھا۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ خالد اس کچی عمر میں انسانی بے رحمی کے اس گہرے احساس کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں ہوتا ہے۔ تبھی تو غالب نے کہا تھا کہ

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور پھر وہ دیارِ غیر کی تنہائی جہاں کسی کو شاید یاد بھی نہیں کہ اس زمین پر بھی کیا ہوا تھا۔

جس کمرے میں مجاور یہ کہانی سنا رہا تھا اس کے سامنے سے نیل گایوں کا ایک پورا غول گزرنے لگا۔ جیلانی کے کچھ دوستوں نے کبھی کسی بستی میں نیل گایوں کو یوں آزادی سے گھومتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سب ادھر دیکھنے لگے۔ نیل گائیں آگے جاتی ہوئی خالد کی قبر کے بغل سے جنگل میں دریا کی طرف چلی گئیں۔ شاید انہیں پیاس لگی تھی۔ مجاور نے بھی گھڑے سے پانی نکال کر پیا اور پھر دوبارہ دیوار سے ٹیک لگا کر خالد کی داستان سنانا شروع کر دیا۔

جلاد والی بحث پر خالد کے ذہن میں آج کے ملٹی نیشنل بنکوں کے قرض اصولی دستوں کا خیال آیا جس میں خاص طور سے غنڈے ریٹائرڈ پولس افسر اور محلے علاقے کے با اثر

چودھری رکھے جاتے تھے اور وصولی کا کام ٹھیکے پر دے دیا جاتا تھا۔

شیر علی کو کسی نے وہ قتل عام کا منظر سنایا تھا جس میں بے شمار قیدیوں کو ڈاکٹر واکر نے موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا اور اس نے بقیہ قیدیوں سے کہا تھا۔

'تم لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا ؟ میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو یقین آ ہی نہیں سکتا تھا۔ کیا سمجھتے تھے کہ پھانسی کی سزا صرف ایک دو یا چار آدمی کو ہی دی جا سکتی ہے۔ اگر آئندہ کسی نے گستاخی کی اور اس زندگی سے گھبرا کر بھاگنے کی یا احتجاج کی کوشش کی تو سب کو موت کے گھاٹ اتار کر ہندوستان سے ہزاروں قیدی اور منگا لیے جائیں گے۔ ہم تمہاری جان کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھو۔'

جیلانی بول پڑا 'وہ تو آج بھی حکومتیں نہیں صرف امیدوار الیکشن جیتنے کے لئے عوام کے محتاج ہوتے ہیں۔'

شیر علی جب آیا تھا تو اس نے سنجیدہ ہو کر کہا تھا 'شیر علی دشمن کو پہچانتا ہے۔'

شیر علی کے اس مشہور جملے نے جو اس نے لارڈ میو کو قتل کرنے سے بہت پہلے کہی تھی خالد کے دل میں شیر علی کے لئے ایک خاص طرح کی عزت اور محبت پیدا کر دی تھی۔ جیسے جیسے وہ شیر علی کے بارے میں جانتا گیا ویسے ویسے اس کے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگا جیسے گویا شیر علی بھی اس کے دادا تھے بلکہ اب تو یہ ہو گیا تھا کہ اپنے پردادا کی کوئی نشانی نہ ملنے کی وجہ سے اب شیر علی ہی ان کی بھی نشانی بن گیا تھا۔ اور شیر علی کی ہر ایک حرکت میں وہ اپنی پردادا کو دیکھنے لگا۔ شیر علی کی تاریخ زندہ تھی اور وہ اکیلے اس دور کے تمام قیدیوں کا نمائندہ بن گیا

تھا۔ رفتہ رفتہ شیر علی کے چہرے میں اسے اپنا پردادا دکھنے لگا۔ پچیس سال کا ایک نوجوان جو شیر علی ہی کی طرح رہا ہوگا اور ممکن ہے کئی معنوں میں ان سے آگے بھی رہا ہو۔ اور ضرور شیر علی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے چہیتے یار رہے ہونگے اور دونوں کے جذبات اور خیالات ایک رہے ہونگے۔

اگر لارڈ میو کو شیر علی نہیں مارتے تو میر علی مارتے۔ دھیرے دھیرے شیر علی اس کے لئے اپنے ماضی کی ایک اہم دریافت بن گیا۔

❖❖

قیدی اب دھیرے دھیرے اونچی آواز میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ منشی ان باتوں پر اب دھیان نہیں دیتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان قیدیوں کا اظہار خیال ان کے دلوں کی بھڑاس نکالنے بھر ہے اور عظیم برطانوی حکومت کے لیے ان کی آوازیں مچھروں کے بھنبھنانے کی آواز سے بھی سیکڑوں گنا کم اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ جس حال میں کام کر رہے تھے یہ حالات خود ان کے تبصروں پر ایک مذاق تھے۔

یہ سننے کے بعد کہ 182 فرار شدہ قیدی پکڑے گئے ہیں اور پورٹ بلیر لائے گئے ہیں، یہ سوچ کر کہ نہ جانے اس بار ڈاکٹر والکر کیا فیصلہ کرے گا، وہ پورا منظر ایک بگولے کی طرح شیر علی کے ذہن میں گھومنے لگا جس کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ 33 قیدیوں کو ایک ساتھ سولیوں پر لٹکا دیا گیا تھا۔

جیل سے فرار شدہ 182 مجرم دوبارہ گرفتار کر کے لائے جانے کے بعد دوبارہ سلاخوں کے پیچھے بند کر دیے گئے تھے۔

قیدیوں کی ان فرار شدہ مجرموں کے بارے میں عام توقع یہ تھی کہ اس سے پہلے ڈاکٹر والکر نے جو بہت بڑی تعداد میں بھاگے ہوئے قیدیوں کو پھانسی کی سزا دی تھی اس سے اس کے اندر کا زہر شانت ہو گیا ہوگا اور اس بار قیدیوں کو کڑی سزا سنا کر دوبارہ کام پر لگا دیا جائے گا۔ لیکن ایک قیدی جس کی آنکھیں بڑی عجیب سی تھیں، اس بات سے بالکل ہی متفق نہیں تھا۔

’وہ پھانسی ہی دے گا۔‘

’پھانسی تو نہیں ہوگی۔ لیکن سختی بڑھے گی۔‘ ایک دوسرے قیدی نے کہا۔

’جو ہوگا وہ خود ہی دیکھ لوگے۔‘ عجیب آنکھوں والے نے کہا۔ ’تم لوگوں نے ابھی اسے سمجھا نہیں ہے۔ میں نے اس کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر والکر انسان نہیں درندہ ہے۔ اس دن وہ اس مہاراشٹرین کے بارے میں جانتے ہو کیا حکم دے رہا تھا؟ کہہ رہا تھا کہ اتنے کوڑے مارو کہ کھال ادھڑ جائے۔ جب کھال ادھڑی تو اسے انگلیوں سے پکڑ کر قیدی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نوچنے لگا۔‘

اس سزا کا تصور کر کے ہی سب چپ ہو گئے۔

فرار شدہ قیدیوں کے فرار اور دوبارہ گرفتاری کی ایک تحریری رپورٹ جیل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر والکر کے حکم کے لئے تیار کی گئی۔

ڈاکٹر والکر شراب کا گلاس ہاتھ میں لیے ہوئے ہی جھومتا ہوا اپنے آفس میں آ گیا، منشی سلام کر کے حاضر ہوا اور فائل سامنے رکھ دی۔ منشی جو سرکاری احکامات کے دستور سے واقف تھا۔ ڈاکٹر والکر سے باحترام بولا ’حضور اگر اجازت ہو تو یہ گلاس بعد میں پیش کردوں۔‘

’منشی رام رائن‘ تم کو نہیں معلوم کہ میرے اختیارات اور اس قلم میں جو میرے سامنے تم نے قلمدان میں لگا رکھے ہیں‘ اس گلاس سے ہزاروں گنا زیادہ نشہ ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو غور کرو کہ ان 182 لوگوں کی زندگی اس قلم کی نب میں لٹکی ہوئی ہے۔

اس نے قلم اٹھا کر اس کے نب کو دیکھا۔

منشی رام نرائن دل ہی دل میں سہم گیا۔

'اور میں انھیں کیا دوں گا؟

موت۔

کیوں؟

اس لیے نہیں کہ ڈاکٹر والکر کے سینے میں دل نہیں ہے۔

اس نے منشی رام نرائن کی آنکھوں میں جھانکا جہاں ایک انجانہ خوف جھانک رہا تھا۔

'ڈاکٹر والکر رحم دل ہے۔ لیکن ان قیدیوں کو قانون نے موت کی وادی میں بھیجنے کی جگہ کالا پانی کی سزا دے کر جو زندگی عطا کی ہے یہ اس زندگی کو چھوڑ کر بھاگے تھے۔ ان کو ان کی اس غداری کی سزا دینا ضروری ہے۔'

ڈاکٹر والکر نے بائیں ہاتھ سے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ اور قلم کاغذ کی طرف بڑھایا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ جیل سے تنگ ہو کر بھاگے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ میں چاہوں تو ان 182 آدمیوں کو پھر سے زندہ رہنے کا موقع دے دوں لیکن نہیں۔ میرا نام ڈاکٹر والکر ہے۔ میری اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ اور اسی پہچان کی بنا پر برطانوی سرکار نے میرے اوپر بھروسہ کیا ہے۔۔ اس جیل کے قیدیوں کو معلوم ہونا چاہیے اور ان کے دلوں میں یہ بات گہرائی میں ثبت ہونی چاہیے کہ ڈاکٹر والکر کون ہے۔

اور قلم کاغذ پر جھک کر لکھنے لگا۔

'کل صبح بارہ بجے سے پہلے پہلے ان تمام 182 قیدیوں کو جیل خانے کے میدان میں پھانسی کے پھندے میں لٹکا کر موت کی سزا دے دی جائے گی۔'

وہ گلاس لے کر اپنے ریسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن جیل کی چار دیواری کے پاس فوج کی پوری ٹکڑی آ گئی۔

سبھی سمجھ گئے۔

چند قیدیوں کو بلا کر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ پھانسی دینے کے لیے تین کھمبے تیار کریں۔ جیل کے احاطے میں تین نئے پھانسی کے کھمبے لگائے گئے۔ ان میں پھانسی کی رسیاں لٹکائی گئیں۔ سامنے ڈاکٹر والکر کی کرسی لگی۔ پھر ڈاکٹر والکر بھی وہاں آ گیا۔ سارے قیدیوں کو زنجیروں میں باندھ کر اس کارروائی کو دیکھنے کے لیے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں دور کھڑا کیا گیا۔ سامنے سنگین لگی رائفلوں میں فوج کے جوانوں نے گولیاں بھریں اور چوکنا ہو کر دیکھنے والے قیدیوں کی طرف رخ کر لیا۔ پھر ہاتھوں اور پاؤں میں بیڑیاں لگے فرار شدہ قیدیوں کو رائفل بردار فوجیوں کے گھیرے میں سنگینوں کی نوک پر گھیرے ہوئے جیل کے وسیع احاطے میں لایا گیا۔ ان قیدیوں کے چہرے اڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے پتھر کی طرح ساکت چہروں والے جیل کے قیدیوں پر نظر ڈالی اور ان میں کئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کئی نڈھال ہو کر گرنے لگے تو ان کے پیٹ یا کمر میں سنگینیں لگا کر ان کو اٹھایا گیا۔ انہوں نے چلا چلا کر سامنے بیٹھے والکر سے استدعا کی۔ اپنی جان کی بھیک مانگی۔ دوبارہ کبھی ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ قسمیں کھائیں۔ لیکن ان کی اس استدعا سے ڈاکٹر والکر کا جوش اور بڑھتا

جا رہا تھا۔ ان کی چیخوں سے بے پرواہ فوج کی ٹکڑی اپنا کام کرتی رہی۔ اونچی آواز میں یکے بعد دیگرے حسب دستور احکامات دیے جاتے رہے۔ قیدیوں کو پھانسی کے پھندوں سے کچھ دور لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ان میں کئی بے ہوش ہو کر گر گئے۔ انہیں گرا رہنے دیا گیا۔ ڈاکٹر واکر نے اٹھ کر اپنی عقابی نگاہوں سے دور سے اس منظر کو دیکھتے ہوئے قیدیوں کو دیکھا۔ وہاں ہر طرف زبردست سناٹا تھا۔ پھر اس نے کارروائی شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ تین قیدیوں کو کھینچ کر پھندوں کے پاس لے جایا گیا۔ پتہ نہیں کہاں سے ان کے اندر ہمت آ گئی کہ وہ اچانک سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ ٹھیک پھانسی کے پھندوں کو دیکھتے ہوئے سپاہیوں سے بھی آگے چلتے ہوئے انہیں لگ بھگ کھینچتے ہوئے پھندوں تک پہنچے۔ خود سے ان تختوں پر چڑھے جن کے اوپر پھندے لٹک رہے تھے۔ یہ سب کچھ ایسے ہو رہا تھا جیسے وہ پھانسی کے پھندوں پر نہیں جا رہے ہوں کوئی کام کر رہے ہوں۔ وہاں کھڑے جلادوں سے ان میں سے ایک نے خود ہدایت دی کہ وہ ان کے گلے میں پھندا ڈالے۔ جلاد نے جلدی جلدی ان کو کالی ٹوپی پہنائی۔ وہ یہ سب کچھ ایسے کر رہے تھے جیسے وہ ڈاکٹر واکر کی نگاہوں کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ یہ سب دیکھ کر اچانک دوسرے قیدیوں میں بھی موت سے بے خوفی کا جوش چڑھ آیا "اب ہمیں لے چلو، مجھے لے چلو، ارے پہلے مجھے جانے دو۔" کی آوازوں کے ساتھ انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ان کی تازہ دمدار آوازوں میں موت کی وہ آواز جو تھوڑی دیر پہلے جیل کے پورے علاقے میں ڈنکے کی آواز جیسی چیخ رہی تھی، کہیں گم ہو گئی جیسے یہاں پھانسی نہیں دی جا رہی تھی بلکہ جنگ ہو رہی تھی۔ جنگ تلواروں اور بندوقوں سے اوپر اٹھ کر خوف اور بے خوفی کی جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی اور بے خوفی کی فتح ہو رہی تھی۔ چیختے ہوئے قیدیوں کو ہنگامہ کرنے سے روکنے کے لیے اور اپنی بے عزتی کے غصے میں سپاہیوں نے قیدیوں کو رائفل کے کندوں اور سنگینوں سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ کئی قیدی خون سے لہولہان ہو گئے۔ کئی کے جسموں سے خون کے فوارے نکل پڑے۔ ڈاکٹر واکر خاموش کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ قیدی موت پر فاتح ہو چکے تھے۔ اور اب کچھ تھم کر اپنے مفتوح کی بزدلانہ کارروائیوں کو دیکھ رہے تھے جو تین تین قیدیوں کو باری باری لے جا کر پھانسی دیتے رہے اور لاشوں کو اٹھا کر ایک

طرف ذبح کیے ہوئے جانوروں کی طرح پھینکتے رہے۔ لگ بھگ تین گھنٹے کے اندر پورے 182 قیدی جو وہاں اپنے پیروں پر چلتے ہوئے لائے گئے تھے ڈاکٹر واکر کے نوک قلم کے تین لفظوں "Hang them all" سے لاشوں کا ڈھیر بن گئے۔ انگریزی زبان میں بہت طاقت تھی۔ تیز تیز ہوائیں جزیروں سے ٹکراتی ہوئی سائیں سائیں کی آوازیں پیدا کرتی چلتی رہیں۔

182 لاشیں نیچے جمع ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر واکر کو رپورٹ پیش کی گئی۔

اس نے رپورٹ پر اپنا دستخط کر کے فائل کو کلوز کر دیا۔

لاشیں دوسرے قیدیوں سے اٹھوا اٹھوا کر سمندر میں پھنکوا دی گئیں۔

پھانسی کے اس منظر کو دیکھنے کے بعد قیدیوں پر ایک سناٹا چھا گیا تھا۔ دن بھر حسب معمول کام ہوتا رہا۔

اس دن شیر علی نے دیکھ لیا کہ وہ جس نظام میں تھا وہاں لوگ گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ محض بھجتے تھے۔ شیر علی نے اس پر غور کرتے کرتے محسوس کیا کہ وہ ایک مزدور سے ترقی پا کر ایک ٹنڈیل بن گیا ہے۔

❖❖

سامنے جیلر کے مکان کے روبرو ایک گول نما پہرہ گھر میں رائفل لیے ایک سنتری کھڑا ہوتا تھا۔ سنتری جس کی مونچھیں تیل پلائی ہوئی، چہرہ لوہے سے بنا ہوا اور کپڑے بھی پولس کی ٹریننگ پائے ہوئے تھے۔ اس مکان سے آگے وہ تالاب تھا جسے قیدیوں کی محنت ومشقت سے انگریز افسروں کی عیش وعشرت کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں سیڑھیاں تھیں۔ جو پانی کے اندر جاتی تھیں۔ چاروں طرف ہری بھری جھاڑیاں اور پھر جنگل تھے۔

دوسری طرف سپاہیوں کے رہنے کے لیے بیرک تھا۔ جہاں وہ اپنی آدھی پینٹ پہنے ادھر ادھر لاپرواہی سے آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ تیسری طرف کافی دور ایک ٹیلے نما بلندی پر گنبد نما پھانسی گھر تھا۔ جہاں ان لوگوں کو لے جایا جاتا تھا جو یا تو کسی ظلم سے مر جاتے تھے۔ یا جن کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دینا ہوتا تھا۔

خالد بنیادی طور پر اس جگہ کو آج کے زمانے کے اپنے معاشرے کے آئینہ کے طور پر دیکھنے لگا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنی کتاب میں ایسا کچھ لکھا نہیں ہے لیکن اس کے ذہن کا اتنی گہرائی میں اتر کر اس ماحول کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس زندگی کو اپنے اردگرد کے اس ماحول کے استعارے کے طور پر دیکھ رہا تھا جس کا وہ خود ایک حصہ تھا اور جو کچھ اس پر گزر رہا تھا اور جس کو وہ اپنے سادہ لوحی کے باعث ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا۔

ایسا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جب کوئی واقعہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو جاتا ہے تو ہمارے اوپر اسرار کھل جاتے ہیں۔ خصوصاً تب جب ہم اس کے دباؤ یا تلخ تجربے سے گزرے ہوتے ہیں یا گزر رہے ہوتے ہیں یا ہم اپنی صورتحال کے بارے میں واقعی اندھیرے

میں ہوتے ہیں۔

ایک بار جہانگیر کی بھی بحیثیت ایک شہنشاہ اپنی صورتحال کے بارے میں آنکھ کھلی تھی۔ وہ کشمیر جا رہا تھا۔ ہاتھیوں کا قافلہ تھا۔ اچانک ایک پتلے راستے سے گزرتے ہوئے ایک ہاتھی کھائیوں میں گرا اور مسلسل لڑھکتے ہوئے بہت نیچے مٹی کے ایک ڈھیلے کی طرح جا گرا۔ جہانگیر نے اسے گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے قافلہ وہیں روک لیا اور حکم دیا کہ دوسرے ہاتھی کو اسی جگہ لے جایا جائے۔ دوسرا ہاتھی بھی وہاں جا کر گرا تو سنبھل نہیں پایا اور اسی طرح بے سہارا چیختا ہوا نیچے گرتا چلا گیا۔ جہانگیر نے وہیں بیٹھے بیٹھے یکے بعد دیگرے اس وقت تک کئی ہاتھی گروا دیے جب تک اس کا معنی اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست نہیں ہو گیا۔ بس یہی صورتحال خالد کی ہو گئی تھی۔ یہ ہر سوچنے والے اور خصوصاً تخلیقی ذہن رکھنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اسی سے وہ کائنات اور زندگی کے اسرار کھول کر ہمارے سامنے لاتے ہیں جس کے مطابق ہم اپنی سوچ، زندگی اور معاشرے کو از سر نو ترتیب دیتے ہیں۔

وہ اپنے تخیل کے سہارے اور ان قیدیوں کی زندگی کے حقائق کی روشنی میں دنیائے زندگی کے انہیں سات سمندروں کی سیاحی میں اتر پڑا تھا اور اس سیاحی کے ہولناک ہونے کے باوجود کبھی باہر نہیں نکلا کیونکہ تخلیقی مفکر ایک ایسا سپاہی ہوتا ہے جو تجربات کی دنیا کو اپنی نسل کے لئے باغ عدم سمجھتا ہے اور ایک باپ یا ماں کی طرح اسے انسانیت کو کچھ دینے میں اسی طرح کی ایسی خوشی اور مسرت ملتی ہے کہ وہ باغ عدم کے ان پھلوں کو ان کے لئے زیادہ سے زیادہ بٹور کر لانا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس کے سامنے چاہے کتنا بڑا ہی خطرہ کیوں نہ سامنے آ جائے وہ خطرہ مول لے لیتا ہے۔ یہ تو ہم جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی طرح کی سوچ رکھنے کی وجہ سے ان تخلیق کاروں کی اس محبت کو سمجھ نہیں پاتے جو ان کے دلوں میں ہمارے لئے ہوتی ہے لیکن ماں باپ کی طرح انہیں بھی اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ہم ان کو سمجھتے ہیں یا نہیں سمجھتے ہیں۔

قیدیوں کی زندگی میں جو قہر برپا ہوا تھا، ان سارے واقعات نے جو ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ گزرے تھے، وہ ساری باتیں جن کا وہ امید یا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی انسان ان کے یا کسی دوسرے انسان کے ساتھ کر سکتا تھا لیکن جو ہوئے تھے، ان تمام باتوں نے ان پر یہ عیاں کر دیا تھا کہ وہ جس طرح سے دنیا، اور زندگی کو دیکھتے ہیں اس سے الگ بھی زندگی کی حقیقتیں موجود ہیں اور وہ ان حقیقتوں کے درمیان آ گئے ہیں۔ اس ادراک نے ان کی سوچ کی کھڑکیوں کو رفتہ رفتہ کھولتے کھولتے اب پوری طرح روشن کر دیا تھا۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ بہت سی باتیں جس پر ان کو یقین اور کسی حد تک بھروسہ تھا ان کے کچھ حدود ہیں اور اگر وہ جسمانی اور ذہنی سکون چاہتے ہیں تو انہیں یہاں جینے کی نئی راہیں دریافت کرنی پڑیں گی۔ وطن، رشتے داروں، دوستوں اور اپنے کاروبار سے مکمل طور سے کٹ جانے کے بعد ان کے ذہنوں کو اچھی خاصی فرصت میسر آ گئی تھی، اور ان کا ذہن سوچنے کے عمل کے لیے اچھا خاصا آزاد ہو گیا تھا اور یہاں کی زندگی کی اذیتوں نے انہیں نہ صرف سوچنے پر مجبور کر دیا تھا بلکہ ان اذیتوں نے خود ان کے سوچنے کے لیے جیتے جاگتے اور مضبوط سوال کھڑے کر دیے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ ذہنی طور پر مین لینڈ کے جیلوں میں پڑے قیدیوں سے بہت مختلف قسم کے انسان بن گئے تھے۔ یہاں جینے کی راہ ڈھونڈتے۔ ہر شخص مفکر بن گیا تھا۔ ان کے ذہنوں پر چھائی ہوئی پرانی باتیں ایک ایک کر کے تفکر کے زور سے کسی پرانے درخت کی خال کی طرح الگ ہوتے جا رہے تھے جنہیں یہ مفکر اچانک محسوس کر لیتے اور انہیں نوچ کر دوسروں کو بھی یہ دکھانے لگتے۔ وہ اب حکام کی چالوں کو بھی باریک بینی سے سمجھنے لگے تھے۔

انڈمان میں انہوں نے بھی ایسی ایسی باتیں دریافت کی تھی جس کے نتیجے میں ایک جرم سے پاک معاشرہ آگے چل کر پیدا ہوا جس کا پہلے ذکر آیا ہے اور ایک ایسا معاشرہ بھی سامنے آیا جس میں لوگ بلا تفریق مذہب آپس میں شادیاں کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک انسانی محبت ہی رشتوں کی بنیاد ہے مذہبی عقیدہ نہیں۔ یعنی محبت جو انسانی سرشت کی زیادہ بنیادی چیز ہے جس کے بارے میں ہم خود جانتے ہیں وہ عقیدوں سے زیادہ بنیادی چیز

ہے اور زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور وہی ہماری فکر کی بنیاد بنی چاہئے اور جو لوگ عقیدوں پر محبت کو قربان کرتے ہیں وہ دراصل خطرہ مول لیتے ہیں۔

ایک دن اسی ماحول میں گفتگو کرتے ہوئے ایک قیدی نے یہاں لانے کی وجہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "بات صرف یہ نہیں ہے کہ یہ ہمیں یہاں کام کرنے کے لیے لائے ہیں، اور یہ دوری اس کا ایک حصہ ہے۔ صرف یہ بات ہوتی تو ہمیں اپنے گھر خط لکھنے کی، اپنے دکھ سکھ کا خطوں کے ذریعے اپنے عزیزوں سے اظہار کرنے کی اجازت ہوتی۔ اپنے گھروں سے خط پڑھ کر ان کے بارے میں جاننے کی اجازت ہوتی۔ لیکن خط بھیجنے کی اجازت اس لیے نہیں کہ یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے ہم وطنوں کو معلوم ہو یا یہ خود ان کے ہم وطنوں کو معلوم ہو کہ یہ ہمارا کس بے رحمی کے ساتھ استحصال کر رہے ہیں۔ ایسا کرنا انسان کی فطرت بھی ہے۔

جب بھی ہمیں اپنی من مانی کرنی ہوتی ہے۔ تو ہم پردہ کر لیتے ہیں۔ جب بھی ہم اپنی کسی بات کو چھپانا چاہتے ہیں تو پردہ کر لیتے ہیں۔ جب بھی ہم غلط کام کرنا چاہتے ہیں تو پردہ کا سہارا لیتے ہیں۔ پردہ کا استعمال بہت وسیع ہے۔ تمام انسانی سماج کا انحصار پردوں اور لہروں پر ہے۔ چاہے یہ چہرے کا نقاب ہو یا دروازوں کا پردہ، یا بند کواٹر، یا خاردار دیوار کا اور اس کا پھاٹک، اس پر پڑا ہوا تالا اور ایک ہولناک کتا، جیل کی دیواریں ہوں یا کسی دفتر کا چپراسی ہو یا سنتری رائفل لیے کھڑا ہو یا کسی فائل پر کنفیڈنسیل لکھا ہوا۔ یا کوڈ میں ہو رہی گفتگو ہو، یا اسمگلروں کے تعارفی نشانات ہوں یا کسی محل یا قلعہ کی دیوار ہو، یا ہندوستان اور جزائر انڈمان اور نکوبار جسے 'کالا پانی' کہا جاتا تھا اس کے درمیان کے وسیع سمندروں کی دوری ہو یا فلسفہ کے دبیز زرہ بکتر ہوں، یا قانون کی پیچیدگیاں ہوں یا کسی مخصوص آئین کے دو معنی الفاظ اور جملے ہوں یا کسی ڈکٹیٹر کے گھر کے چاروں طرف لگی ہوئی سیکورٹی کی فورس ہو، یہ سب پردے اور یہ سب پہرے چلمن ہیں۔ یہ سب ایک یا کچھ انسانوں کی سے نظروں سے پڑتے، تنہائی کا فائدہ اٹھا کر، رائے عامہ کی پسند سے الگ اور قانون عامہ کی پابندیوں سے نکل کر اپنی

من مانی کرنے کے ذرائع ہیں۔ ہندوستان کے جیلوں میں، کال کوٹھیوں میں، مجرموں کے ساتھ جو نازیبا اور انتہائی وحشت ناک سلوک کیا جاتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن اس سے بڑے پردے' سمندروں کے دبیز پردے، اور پہرے کی کیا ضرورت! کیسے پردہ ایک باسیرت پتلی لڑکی کو ننگی موم کی پتلی کی طرح ظاہر کر دیتا ہے یہ کس سے پوشیدہ ہے؟ تنہائی جیل کی تنہائی، وحشت کی تنہائی، جزیرہ کی تنہائی میں صاحب اختیار جن کو ان پردوں پر پورا اختیار ہوتا ہے وہ کیسے مادر زاد ننگے ہو جاتے ہیں۔ یہ عجیب وغریب منظر ہے۔

یہاں ان کا وہ چہرہ ہمارے سامنے کھل کر آ رہا ہے جس سے ابھی ہمارے ملک کے لوگ واقف نہیں ہیں۔ وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ایک ملک جب دوسرے ملک پر حملہ کرتا ہے تو لڑائی میں کھل کر خوں ریزی ہوتی ہے، جب تک جنگ کا خون لوگوں کے ذہنوں پر سوار رہتا ہے تب تک اکثر رونگٹے کھڑے کرنے والے مظالم بھی ہوتے ہیں اور بے رحمی اور بے حسی کے ان دنوں میں لوٹ مار، عصمت دری اور بدسلوکیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سماں تو ہمارے ملک کے لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ قابض ہو جانے کے بعد ملک اور حکومت کے قوانین کو فوجی ضرورتوں کے نام پر تجارتی مقاصد کے لیے اس بے رحمی سے کیا جائے گویا مفتوح ملک کے باشندوں نے کوئی جرم کیا ہو۔ ایسے لوگ تو پہلی بار فاتح کے طور پر ہمارے ملک میں آئے ہیں۔ اور یہ کام کافی حد تک دانستہ طور پر ڈھکے چھپے طور پر کر رہے ہیں یعنی یہ عوام سے اپنا اصلی چہرہ چھپانا چاہتے ہیں۔ کوئی حکومت تو عموماً ایسا نہیں کرتی حکومتوں کو اپنے ارادوں کو چھپانے کی کیا پرواہ۔

دوسرے نے جواب دیا "ان کی مجبوری شاید تم نہیں جانتے۔ انہوں نے اپنے ملک میں جمہوریت چلا رکھی ہے۔ وہاں اب بادشاہت نہیں ہے کہ کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ کوئی بھی منہ پھٹ وہاں کے پارلیمنٹ میں یہ پوچھ سکتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا قانونی جواز کیا ہے اور سرکار یہ کہہ نہیں سکتی کہ بغیر کسی جواز کے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور یہ سب چلتا رہے گا۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے انہوں نے منافقت کی راہ ڈھونڈ رکھی ہے۔ یہ لوگ عملاً

یہاں کی خبر وہاں جانے ہی نہیں دیں گے اور ویسے بھی یہ ضروری نہیں کہ کلکتہ کے افسروں کی یہ منشا ہو کہ ہمارے ساتھ اتنی سختی اور زیادتی کی جائے لیکن یہاں کی تنہائی، یہاں کے جیلروں اور افسروں کو خود بخود ایسا کرنے کے مواقع دیتی ہے۔ دراصل اس طرح کی صورت حال پیدا ہی نہیں ہونی چاہیے۔

انڈمان کی دوری ایک طویل اور دبیز لٹکے پردے کی طرح سے تھی جس کو نہ نظر پار کر سکتی تھی نہ آواز اور اس طرح یہ اس پردے کی طرح تھی جو زندگی اور موت کے بیچ ہوتی ہے۔ آپ تصور کیجیے کہ اگر آپ نہ دیکھ پائیں' نہ سن پائیں، نہ بول پائیں تو آپ کی کیا حالت ہوگی۔ بالکل اس مرتے ہوئے انسان کی طرح جس کی زبان بند ہو جاتی ہے لیکن روح نکلنے سے پہلے وہ نہ جانے کیا کیا دیکھنے لگتا ہے' اشارے بھی کرتا ہے لیکن بتا نہیں پاتا۔ اسی صورتحال میں ان قیدیوں کو ڈال کر پھر ان کے ساتھ یہاں پوری آزادی سے من مانی سلوک ہو رہا تھا۔ اور کیا یہی صورتحال آج کے معمولی انسانوں کی آج کے عظیم معاشی نظام میں نہیں ہو گیا ہے جس میں سب کچھ بالے بالے اور من مانی ہوتی رہتی ہے اور ہم آزاد ہوتے ہوئے بھی قید ہیں اور ان کے اعمال اور فیصلوں کو جھیلنے پر مجبور ہیں۔

پردوں کا زیادہ ہونا، اور موٹا ہونا، اور بے ضرورت ہونا، اور اس پر پہرہ ہونا کبھی مناسب نہیں، پردہ اور پہرہ' یہ دونوں قانون کے متضاد ہیں، اس لیے کہ قانون سماج سے وابستہ ہے، اور کھلے میدان کی چیز ہے' پردہ کے اندر قانون اپنی اصل کھو کر اس پردہ کے اندر موجود روشنی یا تاریکی کے رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ اور پھر قانون نہیں رہ جاتا۔ قانون پردوں کے پیچھے جا کر فوراً اپنا چولا بدل لیتا ہے، کیونکہ قانون پانی کی طرح ہے جو سمندر میں رہ کر ہی سطح سمندر کے برابر رہ سکتا ہے۔ یہ جس دریا، جس نالہ، جس کوزہ، جس برتن میں جائے گا، اس برتن کے مطابق ڈھل جائے گا۔

پردہ انسان کو غلط کاری کا موقع فراہم کرتا ہے اور پہرہ انسان کو ظلم کرنے کے

لیے اطمینان بخش ماحول عطا کرتا ہے۔ عقل پہ پردے ڈالنا، غلط باتیں بتا کر اور سمجھا کر اور زبان وفکر پہ پہرے بٹھانا پابندی گفتگو لگا کر' وہ دونوں صورتیں بھی آنکھوں کے سامنے اور کانوں کے قریب ظلم کے جال بچھانے کا ذریعہ ہیں' جب بھی ہم سے کوئی پردہ کرتا ہے یا ہماری کوئی چیز پردے اور پہرے کے پیچھے جاتی ہے تو اس کے ساتھ کیا گزرتا ہے یہ ہم کو معلوم ہونا چاہئے۔ اور جب بھی کوئی کسی کو پردے اور پہرے کے پیچھے لے جاتا ہے تو ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو قانون کے سائے سے دور لے جایا گیا اور لاقانونیت کی حدود میں داخل کر کے۔ اس کے اوپر جنگل کے قانون کا اطلاق کیا جائے گا۔'

خالد سہیل نے محسوس کیا کہ دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک وہ جسے سب جانتے ہیں اور ایک وہ جسے عام آدمی نہیں دیکھ سکتا اور جابر حکمرانوں کو یہ دنیا بہت مرغوب ہے۔

❖❖

انہیں پردوں کے پیچھے موت کے اس جنگل میں زندگی اپنے راستے ڈھونڈتی رہی۔

موت کے سائے میں کالا پانی کی زندگی دبے قدموں آگے بڑھتی رہی۔ رفتہ رفتہ قیدی اس نئی زندگی کی انگریزی گرامر کو سمجھ چکے تھے۔ پھانسی کے منظر کے چند روز کے اندر ہی قیدیوں کے ذہنوں میں گہری تبدیلی نمودار ہونے لگی۔ پہلے وہ تمام دکھوں اور ذلتوں کے باوجود کبھی کبھی آپس میں ہنسی مزاق اڑا کر اپنے غموں کو ہلکا کر لیتے تھے لیکن اب وہ سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ ایسا لگنے لگا جیسے سبھی اپنے طور پر کچھ سوچ رہے ہیں۔ دھیرے۔ ان کی سوچ بھی باہر آنے لگی۔

مشرا جو ایک بڑے برہمن خاندان سے تھا اور جسے یہاں لکڑیاں ڈھونے اور کھینچنے کے کام پر کئی مہینوں سے لگا دیا گیا تھا اور سست کام کرنے کے پاداش میں جس کو تین چار بار کوڑے لگ چکے تھے کئی بار گھوم کر اپنے ملک کی طرف دیکھنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن نہ تو ملک دکھائی دیا نہ ملک کا کوئی آدمی اور نہ مستقبل میں کبھی کسی کے دکھائی دینے کی کوئی امید باقی رہ گئی تھی۔ اب تو وہی لوگ دکھائی دے رہے تھے جو اسی کی طرح یہاں کے کاموں میں جوت کر بیل اور گدھے بنا دیے گئے تھے۔ یہاں کی برہمن کی اونچی ذات اور ان کا پیشہ اور کہاں کی وہ سماجی حکمرانی۔ منو کا فلسفہ کہیں مین لینڈ میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ جس حکومت نے انہیں غلام بنا کر ذلت کے گڈھے میں ڈال رکھا تھا وہ حکومت جیل کو اس زندگی میں قیدیوں کے ذات پات کے تئیں از حد احترام کا اظہار کرتی تھی۔ جیل کے حکام کی یہ حرکت ہی اسے بڑی کمینی لگنے لگی اس نے تو بچپن سے کبھی ذات پات کے اس پہلو کو دیکھا ہی نہیں جس پہلو کو اتنی آسانی سے انگریزوں نے دیکھ لیا تھا اور وہ اپنے راج پاٹ کو چلانے کے لیے بڑی باریک بینی سے استعمال کر رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ انگریزوں کی اس چال کی کاٹ کرنی

چاہیے اور یہ کاٹ اسے ہی کرنی چاہیے کیونکہ وہ برہمن ہے اور کسی فلسفے میں نیا پہلو تلاش کرنا ان کی بنیادی ذمے داری ہے۔ اتنا خیال آنا تھا کہ وہ لگ بھگ کنار لے کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

جن دنوں وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا ان دنوں اسے کام پورا نہ کرنے کے عوض میں اس بار کوڑے نہیں لگائے گئے تھے بلکہ اس کا پانی بند کر دیا گیا تھا۔ جب پانچ دنوں تک پیاسا رہنے کے باوجود اس نے آئندہ ٹھیک سے کام کرنے کی خود اپنی طرف سے یقین دہانی نہیں کرائی تو جیلر کو شک ہو گیا کہ وہ دراصل پیاسا نہیں ہے اور اس کو کسی نے پانی پلایا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ڈاکٹر والکر نے سب کو بلا لیا۔

'اسے پانی کس نے پلایا ؟'

'پتہ نہیں'

جب ہم نے حکم دے دیا ہے کہ اس کو پانچ دن تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں دیا جائے گا تو کون احکامات کو توڑتا ہے۔

'سر' ایسا بالکل نہیں ہو سکتا، وہاں تو کوئی جاتا ہی نہیں ہے۔ وہ آدمی ہے ہی اتنا ضدی کہ اس کے اوپر پانی نہیں ملنے کا اثر نہیں پڑتا ہے۔

وہاں چوکیداری پر کون لگا ہے۔

'رام پت یادو لگا ہے جناب'

'ہٹاؤ اس کو اور تمام چوکیداروں کی سروس بک لاؤ۔

جیلر نے ایک ایک سروس بک کا معائنہ کیا اور ایک جگہ ٹھہر گیا۔

'گلارام' ذات بھنگی، ضلع، دہرادون۔

اس نے گھنٹی بجائی اور اردلی آ کر کھڑا ہوا۔

'ہیڈ کلرک' اس نے اونچی آواز میں کہا جو بلانے کا اشارہ تھا۔

تھوڑی دیر میں ہیڈ کلرک آ گیا۔

ونگ نمبر پانچ میں گلارام کی ڈیوٹی ہو گی چابی صرف اس کے پاس رہے گی اور کسی دوسرے کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔

'یس سر' میں حکم جاری کر دیتا ہوں۔

مشرا بھی اب یہاں کے حقائق سے نبٹنے کے لئے ذہنی اور خاص طور سے جذباتی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ 'جہاں میرا دھرم روشنی نہیں دے سکا وہاں مجھے خود فیصلہ کرنا چاہئے اور اس کٹر برہمن نے درخت کی اس پرانی چھال کو ایک رات اپنے دل و دماغ سے نوچ پھینکا۔

دوسری صبح وہ ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ ایک ایسا انسان جسے انگریز نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس نے کالا پانی کے ان لوگوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا جو اپنی زندگی کی لڑائی خود اپنے طور پر لڑ رہے تھے۔ وہ نئے چوکیدار گلارام کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

گلارام آیا تو اس نے گلارام کو قریب بلایا اور اس سے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"گلارام اگر میں تمہارے ہاتھ کا پانی لینا چاہوں تو کیا تم دے دو گے؟"

مشرا نے جب یہ کہا تو گلارام کو لگا جیسے صدیوں کی بوسیدہ فصیل اچانک کسی طوفان کی زور سے ٹوٹ گئی رہی ہو۔ پہلے تو وہ اس جملے کے اثر کو اپنے آپ میں محسوس کرتا

رہا۔ پھر اسے لگا کہ اسے مشرا کی بات کا مناسب جواب دینا چاہیے اور ادب اور احترام سے دینا چاہیے۔ اچانک اس کے لہجے میں درد ابھر آیا۔

'آپ کے لیے میری جان حاضر ہے، میں پانی کیا اپنا خون......' کہتے کہتے گلارام کی زبان بند ہوگئی۔

لیکن سرکار میں کچھ کرتا ہوں۔

حضور۔ میں گلارام یہاں چوکیداری کر رہا ہوں لیکن میں ذات کا بھنگی ہوں جناب۔ میرے ہاتھ کا چھوا پانی آپ کیسے پئیں گے؟ میں کچھ کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کوئی آدمی جو تیار ہو۔ یہاں بڑا خطرہ ہے۔ کسی سے بات کرنا اپنے کو بھٹی میں جھونکنا ہے۔'

'لیکن میں' مشرا نے نگاہیں اٹھا کر گلارام کو دیکھا' گلارام۔ مجھے لگنے لگا ہے کہ یہاں کی دنیا میں اگر ہم لوگوں کو جینا ہے تو ہمیں اپنے دماغ کو بہت کھول کر اس دنیا کو دیکھنا چاہئے۔ ہم نے دھرم کے بہانے بہت سی چیزیں اپنے مطلب کی بنا رکھی ہیں۔ جب ہم اپنے مطلب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو ہمیں وہ سب کچھ دکھتا ہے جو میں اب تک دیکھتا تھا۔ لیکن وہ سب یہاں ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ ہمیں اس دھرتی اور آکاش کو ایسی ہی نظر سے دیکھنا چاہئے جیسے یہ کہ ہم دونوں ایک ہی دھرتی کی مٹی سے بنے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ مٹی پاک ہے یا ناپاک۔'

یہ تو میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔

'اسی طرح یہ پانی ہے۔ جات پات ہماری آنکھوں میں ہے' ہماری نظروں میں ہے' ہمارے دلوں میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ جب مکان ٹوٹ کر گرنے لگے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ مٹی بھربھری ہو چکی ہے۔ اپنے کو مورکھ بنائے رکھنے کا کوئی فائدہ ہے کیا۔ میں

تمہارے ہاتھ سے ہی پانی پیوں گا۔ کسی اور کے ہاتھ کا پانی نہیں پیوں گا۔'

'سرکار، آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ میں شودر ہوں، آپ براہمن ہیں، انگریز آئیں جائیں۔ یہ تو آتے جاتے رہیں گے پرنتو آپ براہمن ہی رہیں گے اور میں شودر ہی رہوں گا۔ ہم اپنے سنسکار، اپنے دھرم پر قائم رہیں گے۔'

'گلارام' یہ جیل کی دیواریں اتنی لمبی چوڑی بحثیں کرنے کے لیے نہیں ہوتیں، اور اونچی آوازیں یہاں دور تک سنائی دیتی ہیں۔ ذرا دھیرے بولو۔ سنو گلارام، مجھے لگتا ہے۔ دھرم مجھ سے اور تم سے اور سچ سے بڑا ہو گیا۔ جو دھرم سچ سے بڑا روپ لے لیتا ہے وہ مٹنے لگتا ہے اس کی حقیقت ختم ہونے لگتی ہے۔ وقت سب سے زیادہ اہم ذریعہ اور چشمہ ہے علم و دانش کا وقت۔ کیا کہہ رہا ہے؟ وقت کی آواز کو دھرم کی آواز سمجھو۔ گلارام، ابھی جو سانس کی ہوا تمہارے نتھنوں سے نکل رہی ہے وہ میرے نتھنوں میں جا رہی ہے یا نہیں؟ کل تم مرو گے اور تمہاری راکھ فضا میں پھیلے گی۔ اور اسے درخت اور پودے چوس کر اپنے پھلوں میں ڈالیں گے تو اسے کوئی برہمن کسی دیوی کے چرنوں میں رکھ کر اپنی پوجا کرے گا یا نہیں؟ سے کا الٹ پلٹ چیزوں کو دھو دیتا ہے جیسے بہتے دریا کا پانی صاف ستھرا رہتا ہے زندہ سنسکار اور دھرم جنتوؤں کی طرح اپنے شریر کی مٹی گراتے رہتے ہیں۔ دھرم تو آتما سمان ہے۔ جسے دیکھا نہیں جا سکتا محض محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور اسے ہم اپنے اندر جھانک کر محسوس کر سکتے ہیں۔ گلارام تمہارا دھرم تو یہ ہے کہ تم جس کا نمک کھا رہے ہو اس کی نمک حلالی کرو۔ انگریز تمہارا آقا ہے۔ اس کے وفادار ہو رہے ہو نا؟ لیکن تم یہ بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہو؟'

گلارام کے چہرے پر ایک ہنسی ابھر آئی۔

'تم مسکرا رہے ہو گلارام، کیوں؟ اس لیے کہ تم جو کچھ دیکھ رہے ہو اس سے تم کو خوشی ہو رہی ہے۔'

تم جو کچھ دیکھ رہے ہو، وہی دھرم ہے

'اسی کو پھیلا ؤ نا'

ہم سب اپنی جھوٹی وفاداریوں سے باہر نکلیں اور کھلے میں آ کر دھرم کو پہچانیں اور یہ دیکھیں کہ سچائی کا مارگ کون سا ہے۔

تم شودر ہو، میں برہمن ہوں، لیکن ہماری مٹی؟ یہ مٹی تو اس دھرتی کی مٹی ہے جس میں سے سب نکلتے ہیں اور سب ڈوب جاتے ہیں اور ہماری آتمائیں سب کی سب پرماتما کا حصہ ہیں۔

جسے ہم چھوا چھوت کہتے ہیں گلا رام، وہ ہمارے کرداروں اور صورتحال کی سرحدیں ہیں، تم شودر ہو اس لیے کہ تم گندگیاں صاف کرتے ہو، اور میں برہمن ہوں کیونکہ میں علم کا دھنی ہوں، لیکن وہ پانی جو تم مجھے دو گے، اس پانی کو کیا لگ جائے گا۔ کیا دھرتی سے نکلا ہوا اور آسمان سے برسا ہوا پانی تمہارے چھو دینے سے ناپاک ہو جائے گا؟

پورا آسمان جس کے نیچے تم ہو، اور پوری دھرتی جس پر تم رہتے سوتے ہو، وہ ناپاک کیوں نہیں ہو جاتی؟

گلا رام یہ دھرتی جس سے ہم بنے ہوئے ہیں وہ پاک ہے یا ناپاک،

اس دھرتی کی ہریالی ختم ہونے جارہی ہے۔ ہم اس پر لگے ہوئے پودے ہیں اور ہم؛

گلا رام صرف اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر چپ چاپ سوچتا ہوا مشرا کی باتوں کو دھیان سے سنتا رہا۔

'ہم سوکھ رہے ہیں، ہم سوکھیں گے تو یہ دھرتی ویران ہوگی۔ تمھیں مجھے نہیں اس دھرتی کو پانی پلانا ہے۔ جب کروڑوں اچھوتوں کی آبادی سے کوئی زمین ناپاک نہیں ہو سکتی' جب وہ ندیاں ناپاک نہیں ہو جاتیں جو بہت کچھ دھو کر اپنے اندر لے جاتی ہیں، تو تمہارا چھوا ہوا جل کیسے ناپاک ہو سکتا ہے۔ یہ ناپاکی کیا چیز ہے؟ یہ صرف میرے ہی دماغ کے پیچھے گرا ہوا کالا پردہ ہے۔ یہ ہماری آنکھوں کا پردہ ہے۔ یہ ہمارے سے کیے رہنے کا دوش ہے۔ اور یہی دوش تمہارے دل میں دھرم کے پرویش کو روکتا ہے۔ تمہارے اس ٹکڑے کے جالے سے گھرے ہوئے دل میں اس شنکر مشرا کے لیے جس کے ذات والے تمھیں اپنے کنویں سے پانی نہیں لینے دیتے۔ جو اپنے سامنے تم کو بیٹھنے نہیں دیتے۔ جو اپنے گھروں میں تمھیں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ جو ہاتھ اٹھا کر تمہارے پرنام کا جواب نہیں دیتے ان کے لیے ہمدردی ضرور ہے لیکن تم احساس کمتری کے پنجرے میں گرفتار ہو۔ اور پھر ٹھہرا رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہمارا اور تمہارا درد الگ الگ نہیں ہے۔ اگر تمہارے بچے کو بیل سینگھ مار دے تو میں اس کے لیے جڑی بوٹی ضرور بناؤں گا۔ تمہاری بیٹا کی شادی میں مہمان کو کھانا نہ ملے تو ہمیں شرمندگی ضرور ہوگی۔ ہم تو دراصل الگ الگ بھی ہیں، اور ساتھ ساتھ بھی ہیں۔ کوئی کوے کی چال چلتا ہے اور کوئی ہنس کی، کوئی تیندوے کی۔ یہ کون سا ہوا رہ ہے کہ ہم اس ظلم سے ٹکرانے کے لیے کھل کر ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں بنا سکتے؟ اور اس بڑی لڑائی میں ہم ایک دوسرے سے اتنے الگ رہیں کہ ہمارا پورا فلسفہ کھوکھلا دکھائی دینے لگے اور ہماری ورشٹی ولپت ہو جائے۔'

گلا رام شنکر مشرا کو محض دیکھتا رہا۔ اسکے ذہن میں گفتگو کے دوران کبھی کبھار جگنوؤں کی طرح کوئی چنگاری روشن ہو جاتی اور پھر اندھیروں میں معدوم ہو جاتی لیکن اسے یہ صاف صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں کچھ جگمگاہٹ سی تھی۔

'آپ ٹھیک کہتے ہیں سرکار'

'گلا رام جانتے ہو کہ پہلے والے چوکیدار کو ہٹا کر تم کو یہاں کیوں لگایا گیا ہے؟

اسی لیے کہ یہ جیلر یہ جانتا ہے کہ رام بت یادو اس فرنگی کا اتنا وفادار نہیں جتنا اپنے دیس اور دھرم کا اور یہ گلا رام بھی فرنگی کا اتنا وفادار نہیں ہے جتنا اپنے دیس اور دھرم کا وہ جانتا ہے کہ یادو اس فرنگی سے اپنی جان، زندگی اور نوکری کا خطرہ مول لے کر مجھے پانی پلا سکتا ہے کہ اس کو اپنے دیس اور دیس واسیوں سے پیار ہے اور فرنگی یہ بھی سوچتا ہے کہ اگر تم چوکیدار ہو گے تو میں پیاس سے مرجاؤں گا لیکن تمہارے ہاتھ کا پانی نہیں پیوں گا کہ تم بھنگی ہو۔ اس لیے اس نے تمہارے اوپر بھروسہ کیا۔ اور تمھیں یہاں لگایا۔

'ہاں جناب' جیلر صاحب نے مجھے بھی سمجھایا کہ ہم نے تم کو وہاں پر اس لیے لگایا ہے کہ یادو اور پنڈت ایک ہے۔ وہ ایک دوسرے کا ہے۔ اور اس سے ہم کو خطرہ ہے لیکن تم کو تو انگریز سرکار کا وفادار ہونا چاہئے کیونکہ یہ برہمن اور اونچی ذات والا تم پر ظلم ڈھاتا ہے۔ یہ اس کے خلاف ہے اور ہم اس ذات پات کے خلاف ہے، تم کو غداری نہیں کرتا ہے۔ ہم تمہارا مالک ہے۔ ہم تمہاری بھلائی کرتا ہے۔ ہم تم سے نفرت نہیں کرتا ہے۔ ہم تمہارے ہاتھ کا دیا ہوا پانی پی سکتا ہے اس لیے کہ ہم تم کو انسان سمجھتا ہے لیکن تمہارا برہمن تم کو جانور سمجھتا رہے۔ جانور سے بھی بدتر سور سمجھتا ہے۔'

پھر تم نے کیا کہا۔

'میں کیا کہتا جناب' جیلر صاحب کے سامنے میری کہاں زبان کھلتی، میرے دل میں آیا تھا کہ میں جیلر سے کہتا

کہ اگر تم ذات پات کے خلاف ہو تو تم اس کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔ اس کے خلاف قانون کیوں نہیں بناتے۔ اور تم اپنی سرکاری کتابوں میں ہر آدمی کے نام کے آگے اس کی ذات کا نام لکھ کر اس کو اور پکا کیوں کرتے ہو، تم کیوں الگ الگ ذات کے لیے الگ الگ نوکری کو مخصوص کرتے ہو لیکن میری زبان مالکوں کے سامنے کیسے کھل سکتی ہے۔ ہم نے تو بچپن سے ہی سیکھا ہے کہ بڑا چاہے ظلم کرے یا رحم، اپنی زبان کبھی نہ کھولو ورنہ اور ظلم

بڑھتا ہے۔ قہر آتا ہے۔ خاندان تباہ ہوتا ہے۔ ہماری زبان تو بند رہنے کے لیے ہوتی ہے۔'

سلاخوں کے پیچھے سے شنکر مشرا' گلا رام کی آنکھوں کے ان دائروں میں غور سے دیکھتا رہ گیا جہاں غلامی کے گہرے سائے پلکوں کی طرح جھول رہے تھے۔

'شنکر' تم نے ان زبانوں کو کچلا ہے اور آج بھگت رہے ہو، تم کو اپنی تعداد بہت بڑی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن وہ اتنی بڑی نہیں ہے شنکر' تم نے خود ہندوستان کی مٹی کو ذلیل کیا ہے۔ یہاں کے انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو کمزور اور بے زبان رکھا ہے۔ شنکر، اگر اس گلا رام کی زبان بند نہ کی گئی ہوتی' اگر اس کو بڑوں کے سامنے کھلنے سے نہیں روکا گیا ہوتا تو یہ گلا رام جو تم کو جو ایک سلاخوں کے پیچھے ڈالے گئے مجرم ہو، اور جس پر نگرانی رکھنے کے لیے اس گلا رام کو یہاں تمہارے اوپر حاکم بنایا گیا ہے اور جو تم کو سرکار، حضور اور جناب کہہ کر بات کر رہا ہے۔ تم کو پانی دینے سے نہیں گھبراتا۔

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔' تم نے اپنے وہ ہاتھ کاٹ دئے ہیں جو تمہاری آزادی کی جنگ میں زخمی سپاہیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ تم نے اپنے کمزور لوگوں کو اور اپنی عورتوں کو اپنے معاشی رقیبوں کو کمزور کر کے دراصل اپنی قوم کو کمزور کیا ہے اور آج اسی کا نتیجہ بھگت رہے ہو۔ تم نہ صرف اپنی سزاؤں کے ذمے دار ہو بلکہ ان کی تکلیفوں کے بھی ذمہ دار ہوں جن کو تم نے دانستہ طور پر کمزور بنا کر رکھا۔' شنکر نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔

پھر وہ گلا رام سے مخاطب ہوا۔

'گلا رام' تم تو جانتے ہو کہ ایک برہمن بھوکے پیاسے مرجائے گا لیکن ایک اچھوت کے ہاتھ کا پانی نہیں پئے گا۔'

'جی جناب'

'تو میں بھی پیاس سے مر جاؤں گا لیکن تمہارے ہاتھ کا پانی نہیں پیوں گا۔'

'جناب آپ تو ان برہمنوں میں سے ہیں جو چھتری سے برتر مقام بھی رکھتے ہیں، آپ تو جنگ آزادی لڑتے ہوئے یہاں بند ہوئے ہیں۔ آپ تو اپنی جان کی پرواہ بالکل نہیں کرتے۔'

'اگر میں تمہارے ہاتھ کا پانی پیوں تو تم کیا کہو گے۔'

'مجھے حیرت ہوگی'

'گلارام' ہم کیوں نہ ایسا کریں کہ سب جاتی ملکر ایک ایسی فوج بنائیں جس میں ہر زخمی کو ہر دوسرا پانی پلا سکے' ہر باغی کو ہر دوسرا کھانا کھلا سکے۔ ہر ایک کو ہر ایک اپنا خون پسینہ دے سکے۔ ہر ایک کو ہر ایک پکڑ کر سنبھال سکے۔ ہر بیمار کی ہر ایک تیمارداری کر سکے۔ گلارام تم ایک لوٹا پانی لاؤ۔'

گلارام لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک لوٹے میں پانی لیکر آیا۔

'گلارام' تم اس میں سے پیو۔'

'نہیں جناب میں ایسا نہیں کر سکتا۔'

'گلارام' اگر تم نے اس پانی کو پینے سے انکار کیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ دیس کو کمزور کرنے میں جتنا حصہ اونچے ذات والوں کا ہے اتنا ہی نیچی ذات والوں کا ہے۔ گلارام ہر وہ آدمی دوشی ہے جو اس بھید بھاؤ کو مانتا ہے چاہے وہ میں ہوں یا تم ہو۔ پیو تم یہ پانی، اس میں منہ لگا کر۔'

گلارام تھر تھراتے ہاتھوں سے لوٹا منہ تک لے گیا اور ایک گھونٹ پانی پیا۔

'اب یہ پانی مجھے دو! پیاسا میں نہیں ہوں۔ پیاسی ہے ہماری تہذیب، ہماری مٹی۔ یہ پانی اس مٹی کی پیاس کو بجھائے گا' اسے مضبوط بنائے گا۔'

اور شنکر مشرا نے منہ لگا کر ایک گھونٹ پانی پی لیا۔ وہ چار دن سے پیاسے تھے لیکن انہوں نے صرف ایک گھونٹ پانی پیا۔

'اور پئیں جناب۔'

'نہیں' مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ انگریزوں کی دی ہوئی اس پیاس میں کتنی طاقت ہے۔'

بیشتر قیدیوں کو مین لینڈ سے آئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ ان میں بہت سارے بیمار ہونے کی وجہ سے سختی کے باوجود ٹھیک سے کام نہیں کر پا رہے تھے اور اذیتوں کے بعد وہ اور بھی لاغر ہو جاتے تھے۔

بہت سے دوسرے کام کرنا ہی نہیں چاہتے تھے اور ان کو اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھی۔ بہت سے قیدیوں کی سزا لگاتار ڈسپلن توڑنے کیوجہ سے یا پھر دوسروں کو بھڑکاتے ہوئے پائے جانے کے سبب سزا کو بڑھا کر سزائے موت میں تبدیل کر کے پھانسی دی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر والکر محسوس کر رہا تھا کہ اب نئے قیدیوں کی کھیپ آنی چاہئے۔ پرانے ہندوستانی کارندے بھی قیدیوں سے گھلنے ملنے کیوجہ سے نرمی برتنے لگے تھے اور قیدیوں کی سستی کی طرف سے نظریں چرانے لگے تھے یا پھر کام کے حساب میں خرد برد کر کے ان کو سزا سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کو بھی بدلنے کی ضرورت تھی۔ اس نے حال ہی میں کچھ نئے کارندے مین لینڈ سے بلائے تھے اور زیادہ تر ذمہ داریاں ان کو سونپ دی تھیں۔ کچھ وفادار قیدیوں کو پرموشن دیا گیا تھا۔ وہ زیادہ مستعدی سے اپنا کام کرتے تھے۔

اسسٹنٹ جیلر کو ڈاکٹر والکر کے تیور پر تعجب ہوا۔ اتنے حساس بات پر اس کا ردعمل بالکل غیر متوقع سا تھا۔ اس نے ڈاکٹر والکر سے خاص طور سے تنہائی میں مل کر ابھی، ابھی کہا تھا۔

'سر، جیل کی دیواریں کافی کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کی مرمت کی ضرورت ہے۔ برسات میں جگہ جگہ سے اس میں دراریں پڑ گئی ہیں۔'

'جو ہیں کافی ہیں۔ ان کو اگر جیل کی دیواریں نہیں روکیں گی تو قانون روکے گا۔ جانتے ہو کیا ہے قانون؟

'لیکن جناب اگر سب کے سب نکل گئے تو کیا سیکڑوں آدمیوں کو پھانسی کی سزا دے سکتے ہیں؟

تم نئے آئے ہو، تم کو یہاں کی تاریخ کے بارے میں کسی نے نہیں بتایا کہ یہاں پندرہ سال قبل ایک سو اسی فرار مجرموں کو راتوں رات پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ اور پھر یہ لوگ نکل کر جائیں گے کہاں؟ کیسے جائیں گے؟ ان کے پاس کیا ہے؟

'لیکن جناب' پچھم کی دیوار بالکل ہی ناقابل اعتبار ہے اور وہاں کا چوکیدار بھی کافی لاپرواہ ہے، پرسوں رات چیکنگ میں سویا ہوا پایا گیا تھا۔ اسے کوئی سزا نہیں ہوئی۔

'ٹھیک ہے' اس کے بارے میں مجھے رپورٹ پیش کی جائے۔

'لیکن جناب جب تک ان اسٹاف والوں پر سختی نہیں ہوگی۔ یہ خطرہ بنا رہے گا۔

'تمھیں معلوم ہے۔' اسے ان مجرموں کے بھاگنے کی بروقت خبر نہ دینے کے

انعام میں کیا دیا گیا تھا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے معنی خیز نظروں سے جیلر کو دیکھا۔

جیلر خاموش رہا۔ پھر واپس آ گیا۔

بیڑے میں تقریباً ۵۵ آدمی سوار تھے۔ سمندر میں ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ آسمان سے کالے بادل اٹھنے لگے اور پھر تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ سمندر میں بھی تیز ہوائیں چلنے لگیں اور لہریں تھپیڑے مارنے لگیں۔ چاند چھپ گیا۔ ستارے کھو گئے۔ تاریکی بڑھتی چلی گئی۔ صرف سمندر کے اندر جگنوؤں کی طرح چمکنے والی چمکیلی مچھلیاں دکھائی دیتی رہیں۔

تھوڑی دیر تک ہچکولے کھانے کے بعد بیڑا الٹنے لگا اور اس کی جوڑیں کھلنے لگیں اور بالآخر بیڑا ٹوٹ کر بکھر گیا۔ پانی میں گرنے کے بعد وہ تیرنے لگے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ کون کہاں جا رہا ہے۔

تین چار گھنٹے تک لگاتار تیرنے کی وجہ سے اب وہ کافی تھک چکے تھے۔ ہمت ختم ہونے لگی تھی اور وہ اپنے کو موت کے حوالے کرنے کو تیار ہو چکے تھے کہ یکایک ان کے پاؤں نیچے ریت سے ٹکرائے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کنارے تک آکر پانی سے باہر نکلے اور کنارے پر آکر ریت پر آ کر گر پڑے۔

وہ رات بھر وہیں پڑے رہے۔ صبح دھوپ سے ان کی آنکھ کھلی۔ سامنے سمندر کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ پیچھے گھنا جنگل پھیلا ہوا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دور دور تک ساحل پر انسانی لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ کے آدمی زندہ دکھائی دے رہے تھے جو ادھر ادھر رینگ رہے تھے۔

شام تک بھوک تیز ہوگئی۔ پانی اترا تو سمندر کے کنارے سے وہ سمندری کیڑے مکوڑے چن چن کر کھانے لگے، پھر جنگل میں تلاش کرتے کرتے نالے کا پانی ملا جس سے پیاس بجھائی۔ جب آس پاس کے کیڑے مکوڑے بھی ختم ہونے لگے تو وہ پیڑوں کی پتیاں بھی کھانے لگے۔ اب بھوک برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ آدمیوں کا گوشت کھا کر دیکھا جائے۔ اب کیا تھا جو آدمی مرنے والا ہوتا ہے اس کو کھانے لگے۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ مرنے والے کی جات پات کیا تھی۔ لیکن جو لوگ آدمی کا گوشت کھانے لگے، ان لوگوں کی آنکھیں پیلی ہو جاتیں اور پاؤں کے جوڑوں میں درد ہو جاتا اور یہ گوشت کھانے والے بھی اس طرح رفتہ رفتہ مرنے لگے۔ اس سے گھبرا کر کچھ لوگوں نے آدمی کا گوشت کھانا چھوڑ دیا۔

آدمی کا گوشت کھانے کی طبیعت نہیں چاہتی تھی۔ یہ گوشت کافی نمکین ہوتا تھا۔ لیکن موت کو سامنے دیکھ کر وہ سب کچھ کر رہے تھے۔ اب وہ سب کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ جو جہاں پڑ جاتا وہیں پڑا رہ جاتا۔ یکے بعد دیگرے لوگ مرتے رہے اور آخر میں صرف تین بچ گئے۔ انھیں لگا کہ وہ بھی اب صرف چند دنوں کے مہمان ہیں۔ پھر ان میں سے بھی ایک کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ مرنے کے قریب تھا کہ ایک اور انسانی لاش مل گئی جیسے نوچ نوچ کر اس نے خود بھی کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا۔

اب وہ زندگی کی آخری سانس لے رہے تھے کہ ایک دن برما کے مچھیروں کی ایک کشتی وہاں طوفان میں بھٹک کر آ گئی۔ ان سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ان کو سنبھالا اور اپنی کشتی سے انھیں کھانا اور پانی دیا۔ اور پھر ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ دنوں بعد وہ وہاں سے اپنے وطن لوٹے لیکن پولیس کے ڈر سے اپنے گھروں میں جانے کے بجائے اپنے رشتہ داروں کے یہاں زندگی بھر چھپے رہے۔

❖❖

رتھی کا بھائی جو پچھوے نکالنے گیا تھا لڑکھڑاتا ہوا جھوپڑے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کے سیاہ جانگھ سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ جھوپڑے کے قریب آتے ہی گر پڑا۔ آس پاس کے سبھی اس کے پاس پہنچ گئے۔

گولی کی آواز سب نے سنی تھی، ایک دھماکہ ہوا تھا۔ جنگلوں میں چڑیا اڑنے لگی تھی۔ ہرنیں بھاگ گئی تھیں۔ اور رتھی کا بھائی زخمی ہو کر آیا تھا۔ دو ماہ کے اندر یہ پانچواں واقعہ تھا جس میں پورٹ بلیر میں آئے ہوئے لوگوں نے جروا قبیلہ کے افراد کو گولی ماری تھی چار ہلاک ہو چکے تھے، یہ آج بچ کر آ گیا تھا۔

جروا قبیلہ کا پورٹ بلیر میں آئی ہوئی باہری آبادی سے جنگ کی ایک پوری تاریخ تھی۔ قبائیلوں کو وہ دن یاد تھے۔ جب پہلی بار اس جزیرہ پر یہ نئی آبادی آئی تھی۔ اس وقت وہ لوگ انھیں حیرت سے دیکھتے تھے آنے والوں نے ان کے اوپر گولی چلائی تھی۔ اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے تھے اس لیے کہ انہوں نے سوچا تھا کہ یہ اجنبی لوگ انھیں اپنا دشمنی سمجھ کر ان پر گولی چلا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان اجنبی لوگوں نے پورٹ بلیر میں قبضہ جمایا۔ قبائلی وہاں سے کچھ دور ہٹ گئے۔ جب بھی کہیں قبائل سامنے آتے تو وہ اجنبی ان کے اوپر گولی چلاتے تھے۔

پھر ایک دو بار دونوں طرف سے گولیاں اور تیر چلے۔ دو بار گھائل ہوئے لیکن رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ملاقات بھی ہوئی۔ اور وہ کچھ کچھ ایک دوسرے کی باتیں اشاروں سے سمجھنے بھی لگے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی جارحانہ رویوں سے قبائلی گھبراتے رہے۔ اور ان کے دل میں یہ اندیشہ اختار رہا کہ وہ لوگ ان کو نقصان پہنچائیں گے۔ اور رفتہ رفتہ ان کی زمینوں کو پکڑ لیں گے۔ درمیان ایک فوجی

افسر ایسا بھی آیا جس کو قبائلیوں کے جوابی حملے پر طیش آ گیا۔ اور اس نے اپنی پوری فوج کے ساتھ حملہ کر کے کئی قبائلیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر تقریباً دو میل تک کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لیا۔ تب سے قبائلی ہر اس آدمی کو جو پورٹ بلیر سے آیا اس پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ان کی کوشش یوں ناکام رہی کیوں کہ شہر میں فوج کی طرف سے حفاظت کا انتظام کافی اچھا تھا۔

ادھر کئی برسوں سے امن تھا۔ لیکن جب سے انگریزوں نے ہندوستان سے مجرموں کو منگوا کر ان سے جنگل صاف کرائے۔ لکڑی کاٹنے اور چیرنے اور اس سے جہاز میں باہر ملکوں میں بھیجنے کا کاروبار شروع کیا تھا تب سے وہ جنگلوں کے ان علاقوں پر بھی دھڑا دھڑ قبضہ کرنے لگے تھے جو اب تک جروا قبیلے کے پاس تھے۔ انگریزوں کی اس جارحانہ اور غاصبانہ پالیسی کے ردِ عمل کے طور پر جب بھی قبائلی کہیں رکاوٹ ڈالتے تو انھیں گولیوں کا شکار ہونا پڑتا تھا۔

انگریزوں کی اس پالیسی نے قبائلیوں کے تمام خاندانوں میں اور علاقوں میں ایک سنسنی اور دہشت پھیلا دی تھی اور ایک زبردست جذبۂ بغاوت ابھر رہا تھا۔ دو ماہ سے جب سے نئے قیدیوں کی ٹیمیں جنگل میں بھیجی گئی تھیں، جروا قبیلے کے اوپر حملے اور بڑھ گئے تھے اور اس حملہ میں چار جروا گولی کے شکار ہو کر مر گئے تھے اور آج پانچواں جروا زخمی ہو کر آ گرا تھا۔

رفتہ رفتہ تمام قبائلیوں میں یہ خبر پھیل گئی اور وہ جمع ہونے لگے۔ جگہ جگہ انہوں نے تیر بنانے کے کام پر زیادہ دھیان دینا شروع کر دیا۔ اور مرد و عورت و بچے بھی اپنے ہتھیار چمکانے لگے۔ پھر ایک دن ہزاروں کی تعداد میں جمع جرواؤں کی میٹنگ ہوئی جس میں انہوں نے پورٹ بلیر کو چاروں طرف سے گھیر کر، رات کے اندھیرے میں ہر قسم کی جان کی قربانی دیکر پورٹ بلیر پر مکمل قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یلغار کی تیاری ہوئی۔

تین دنوں کے اندر اندر جنگل کی ہر سمت سے قبائلی جوق در جوق اپنے تیر کمان اور چاقوؤں کے ساتھ پورٹ بلیر کی سمت میں بڑھنے لگے۔ بڑے ہی خفیہ طریقے سے وہ جنگل، نالے پہاڑیاں پار کرتے کرتے پورٹ بلیر سے کچھ دور جنگل میں یکجا ہوئے۔ اگلی رات انھیں پورٹ بلیر پر یلغار کرنا تھا۔ قبیلے کے سرداروں اور ماہرین جنگ نے ایک ساتھ بیٹھ کر آخری پلان تیار کیا۔ تمام رات آگ جلا کر اس میں شکار بھون بھون کر کھاتے رہے۔ ان کی جوان خوبصورت لڑکیاں رقص کرتی رہیں۔ جوانوں کی نظریں رات کے اس جادوئی منظر میں قیامت برپا کرنے والی کی جنگ پر گڑی ہوئی تھیں۔

دوسرے دن دھیرے دھیرے سارے قبائلی شام کے تقریباً اندھیرے ہونے کے بعد پورٹ بلیر کے چاروں طرف پھیلنے لگے۔ پورٹ بلیر میں بارش ہو رہی تھی۔ تمام تر آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے مکمل اندھیرا تھا۔ جیل اور سرکاری عمارتوں اور مکانوں پر کھڑے سنتری بھی آرام کرنے لگے تھے۔ وہ بارش سے بچنے کے لیے اندر چھپ گئے تھے۔ مکانوں کے باہر سڑکوں اور درختوں اور گلیوں پر مکمل اندھیرا طاری تھا۔ چاروں طرف سے قبائلی پورٹ بلیر کے حدود کے پاس پہنچ کر رکے ہوئے تھے اس آخری لمحہ کے منتظر تھے۔ جب وہ جانوروں کی ایک مصنوعی آواز لگاتے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔

گوپی کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اگر یہ جروا کامیاب ہو گئے تو پورٹ بلیر کے ہزاروں کو آدمیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انگریز اور اس کے ہم وطن سب مارے جائیں گے۔ اور یہ اجنبی جنگلی کامیاب ہو جائیں گے۔

"میں میدان جا رہا ہوں" آخر کار اس نے اٹھ کر پاخانہ جانے کا بہانہ بیوی سے کر کے گیا۔ کافی دیر تک وہ نہیں لوٹا۔ اس کی بیوی رتھی اٹھ اٹھ کر اس کو تلاش کرتی رہی۔ نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ سامنے کے کھائیوں میں پھسل کر گر گیا یا کیا ہوا۔ وہ آگے بڑھی اور جنگل میں ادھر ادھر گرتی پڑتی جا کر آواز دی۔ لیکن گوپی کی آواز کہیں سے نہیں آئی وہ واپس پیڑ کے

نیچے آئی۔ پھر اٹھی۔ پھر تلاش کی! راستہ بھٹک گیا ہوگا، اس نے سوچا۔

بارش اور تیز ہواؤں کا زور تھوڑا کم ہوا۔ ہر ماؤں کی آواز میں جروا کے سردار نے آواز لگائی اور پھر آواز چاروں طرف سے دہرائی گئی۔ نقشہ کے مطابق ایک پہاڑی کے نیچے سے سمندر کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے آگے بڑھنا تھا اور دوسری طرف دو پہاڑیوں کے بیچ سے ہوکر ٹھیک ایک ساتھ دونوں طرف سے حملہ کرنا تھا۔

تیر کمان لیے ہوئے سیکڑوں کی تعداد میں جروا آگے بڑھے کہ اس دوران فائر کی آواز آئی۔ پہاڑی کے اوپر سے گولی آئی۔ اور پھر گولیوں کی بوچھار ہوگئی۔ جروا ادھر ادھر بھاگے لیکن جنگل میں جانے والے۔ پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش کرنے والے اور سمندر میں کودنے کی کوشش کرنے والے سب آدھے سے زیادہ گولی کھا کر گر گئے۔

گولیوں کی بارش مسلسل ہوتی رہیں۔

سردار نے آخرکار حالات کو سمجھتے ہوئے واپس جانے کا سگنل دیا۔ ادھر ادھر بھاگتے ہوئے جروا قبائلی جنگلوں میں پہنچ گئے۔ حملہ کی کوشش ناکام ہوگئی تھی۔ سیکڑوں جروا مارے گئے تھے۔

'گوپی کہاں ہے؟' رتھ کے باپ نے رتھی سے پوچھا۔

'پتہ نہیں، وہ میدان گیا تھا، پھر واپس نہیں آیا، میں اسے تلاش کرتی رہی۔'

'وہ فرار ہے؟'

'ایسا ہی لگتا ہے؟'

'غدار۔ ہم نے غلط آدمی پر بھروسہ کیا۔ زندگی میں آگے کبھی اس قبیلے کا کوئی کسی اجنبی کو پناہ نہ دے۔'

وہ کرب کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

'گوپی، تم نے جروا قبیلے کے اس یقین کو توڑا ہے جس سے لگا ہوا زخم ہزاروں سال تک مندمل نہ ہو پائے گا۔ یہ بات کہ تم جھوٹی محبت کا اظہار اتنی شدت سے کرسکتے ہو، تم ہمارے احسانات اور رشتے کو اتنی بے دردی ٹھکرا سکتے ہو۔ تم ان تمام انسانی خوبیوں کو پامال کرسکتے ہو جس پر ایک اچھے انسانی سماج کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ تجربہ میں اور میرا قبیلہ کبھی نہیں بھول پائے گا۔

تمہاری دنیا کے انسان کیسے ہیں اس کا جو تجربہ ہمیں تم سے ہوا ہے اس کو ہم کبھی نہیں بھلا پائیں گے۔ ہماری بوڑھی عورتیں، اور جوان مائیں اور بوڑھے سردار رہتی انسانیت تک تمہارا اور تمہاری قوم کا ذکر کریں گے۔

اور تمہارے سائے سے بھی نفرت کریں گے کہ ان کے اندر وہ بیماریاں نہ پیدا ہو جائیں جن اخلاقی بیماریوں کا شکار تم اور تمہارا سماج ہے۔ تم نے تو اپنے سماج کے بارے میں اتنے بڑے بڑے دعوے کیے تھے کہ لگتا تھا کہ تمہارے دیوتا اور پیغمبر اور رشی اور منی دودھ سے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر ان سب نے مل کر تمہارے سماج کو ویسا بنایا ہے جیسا تم ہو تو لعنت ہے۔ تمہارے اور اس پورے معاشرے پر۔ ہم تم سے بہت بہتر ہیں، ہمارے جنگل کے پیڑوں کی ایک ایک پتی تمہاری کتابوں کے ایک ایک ورق سے ہزار گنا زیادہ پاک اور برتر ہے۔'

گوپی ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنے جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔

گوپی جیل میں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ یہ ان لوگوں میں ایک تھا جنھوں نے

جیل کی دیواریں توڑ کر فرار کیا۔ اس جرم کی سزا موت ہے۔ اور فرار ہونے والوں کے سر پہ موت کی سزا واجب ہے۔

لیکن گوپی نے حکومت برطانیہ کے ایک وفادار رعایا کی طرح اپنی وفاداری کا ثبوت دیا ہے اور اگر گوپی اس دن شام جیل کو خبر نہ کرتا اور ہماری فوجیں مناسب جگہوں پر عین وقت پر نہ پہنچ گئی ہوتیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک بڑی خونریز جنگ ہوتی جس میں نہ صرف لوگ مارے جاتے اور مکان جلائے جاتے بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ ہماری مکمل پسپائی ہوتی، ہمارے جہازوں میں آگ لگادی جاتی اور ہمارے راشن کے گودام جل کر راکھ ہو جاتے اور ہم بمشکل بچ پاتے یا ہمارا مکمل خاتمہ ہو جاتا۔ چونکہ گوپی نے ایک اہم فریضہ ادا کرتے ہوئے ایک ذمہ دار اور انتہائی غیر معمولی وفاداری کا ثبوت دیا ہے اس لیے ہم اس کے سنگین جرم کے باوجود اسے معافی دیتے ہیں۔ تاکہ ہمارے دوسرے قیدی اور رعایا بھی اس بات کو سمجھیں کہ ہم خدمات کا صلہ کیسے دیتے ہیں۔ گوپی کی سزائے موت معاف کی جاتی ہے اور اس کو دوبارہ اسی قیدی کی طرح رکھا جائے گا جو سزائے قید کاٹ رہا تھا۔

گوپی نے مشکور نظروں سے دیکھا۔

'جیلر صاحب نے تمہارے ساتھ بڑی مہربانی کی ہے۔ تمھیں نئی زندگی عطا کی ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور آ کر ان کو خبر کردی۔ اس ایک سمجھداری کے کام نے تمہاری زندگی بحال کردی ورنہ تم ان جنگیوں میں گم ہو کر فنا ہو جاتے۔ تم تو موت کے غار سے نکلے ہو۔ جیل وارڈر انے سے مسکراتے ہوئے مبارکباد دیا تھا۔

شیر علی نے جب گوپی کے بارے میں ہوئے اس فیصلے کی خبر سنی تو اس کے ابرو تن گئے؟

اور اسکی آنکھیں سوچتی رہیں۔

اس کے ذہن میں سوالوں اور جوابوں کی ایک جنگ شروع ہوگئی۔

شیر علی یاد ہے تم ایک دن انگریزوں سے پوچھنا چاہتے تھے کہ ہے کوئی طریقہ کوئی کام جو کر کے اپنی اس حالت سے باہر نکل سکو!!

یہ ہے وہ کام جو کر کے تم اس قید سے آزاد ہو سکتے ہو۔

یعنی تم اپنی جان کے اتنے بڑے لالچی ہو جاؤ۔

اور اپنی نظروں اور وفاداریوں کو اتنا محدود کرلو۔

کہ جن کے سامنے تم نے وفاداری کی قسمیں کھائی ہیں۔

اور جن کی لڑکیوں سے تم لوگوں نے شادیاں کیں۔

اور جن کے ساتھ شب و روز گزارے۔

اور جو تم پر بھروسہ کرتے ہیں۔

ان کے ساتھ تم لوگ غداری کرو۔

تم لوگ اپنے الفاظ اور وعدوں کو

بے وزن

بے ہودہ بنالو

تو تمہیں اس قید سے نجات مل سکتی ہے؟

کیوں شیر علی؟

چاہو گے ایسی آزادی؟

یا یہ قید بھلی ہے؟

یہ قید جسے تم موت سے بدتر سمجھتے ہو؟

نہیں

کبھی نہیں

گوپی کی آزادی سے میری یہ قید!

ہزار گنا زیادہ آرام دہ ہے۔

اس نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

اور کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔

جیسے اس موضوع پر وہ اور کچھ نہیں سوچنا۔

چاہتا تھا!

لیکن اس کے ساتھ ہی شیر علی کے ساتھ وہ ہوا جو اندر سے مضبوط انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

شیر علی نے یکا یک محسوس کیا جیسے شدید احساسِ مجبوری نے اس کی روح کو بے پناہ قوتوں سے بھر دیا ہو۔

وہ مطمئن نہیں تھا۔ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں انگریزی حکومت کی جانب سے بھی کچھ باتیں اٹھ رہی تھیں اس نے ہمیشہ ہی صورت حال کو سمجھنے اور دوسروں کی باتوں کو بھی اہمیت دینے کی کوشش کی تھی اور کوئی مناسب نتیجہ برآمد کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے قبیلے کے قانون کے مطابق بے قصور ہونے کے باوجود انگریزی قانون کے مطابق ملی سزا کو قبول کر چکا تھا اور ایک غیور پٹھان ہونے کے باوجود اس نے جیل کی انتظامیہ کی ہر زیبا ناز یبا بات کو برداشت کرتے ہوئے خود کو ایک اچھا قیدی بنا کر رکھا جس کے نتیجے میں اسے عزت، چھوٹ اور ترقیاں ملیں۔ یہ تو آج گوپی کے حوالے سے ایک ایسی بات آ گئی جس نے کافی عرصہ بعد اس کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ شیر علی کے اندر اس واقعے کے بعد اچانک اپنے اعمال کے بارے میں ایک گہرا شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اس کی جیل کے حکام کے ساتھ اٹوٹ وفاداری اور تعاون گوپی والے زمرے کی ہی چیز تو نہیں ہے اور اسے جو رعایت اور ترقی دی گئی ہے اس کے پیچھے بھی جیل کے حکام کی وہی پالیسی تو کارفرما تو نہیں ہے جو پالیسی گوپی کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ ایک سپاہی جس سے تنخواہ لیتا ہے اس کے لیے لڑتا ہے ایک مزدور جس سے مزدوری لیتا ہے اس کے لیے کام کرتا ہے اس میں برا کیا ہے؟ ایسے سپاہی اور مزدور کو وفادار تو ہونا چاہیے اور سچے دل سے وفادار ہونا چاہیے لیکن فوراً ہی ایک ایسا خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح چمک کر اچانک سامنے آیا جس نے اس کی پوری سوچ کو جڑ سے ہلا دیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ نہ تو انگریزوں کا مزدور ہے نہ ان کی جان کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ بہت سے قیدیوں کی سزا لگاتار ڈسپلن توڑنے کی وجہ سے یا پھر دوسرے کو بجز کاٹتے ہوئے پائے جانے کے سبب بڑھا کر سزائے موت میں تبدیل کر کے ان کو پھانسی دی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر والکر محسوس کر رہا تھا کہ اب نئے قیدیوں کی کھیپ آنی چاہیے۔ پرانے ہندوستانی کارندے بھی قیدیوں سے گھلنے ملنے کی وجہ سے نرمی برتنے لگے تھے اور قیدیوں کی سستی کی طرف سے نظریں چرانے لگے تھے۔ یا پھر کام کے حساب میں خرد برد کر کے ان کو سزا سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کو بھی بدلنے کی ضرورت تھی۔ اس نے حال ہی میں کچھ نئے کارندے مین لینڈ سے بلائے تھے اور زیادہ تر ذمے داریاں ان کو سونپ دی تھیں۔ کچھ وفادار قیدیوں کو پرموشن دیا گیا تھا۔ وہ زیادہ مستعدی سے اپنا کام کرتے تھے۔ پورے معاملے کو سنبھالنے کے لیے ڈاکٹر والکر اکثر نئی نئی ترکیبیں سوچنے میں الجھا رہتا۔ ہیڈ کوارٹر سے لگاتار کام کے بارے میں رپورٹ مانگی جاتی تھی اور ان دنوں کام حسب توقع آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو قیدیوں کی تساہلی تھی کچھ موسم کی خرابی جس سے ڈاکٹر والکر عاجز آنے لگا تھا۔ مین لینڈ کے حکام یہاں کے مسائل کو سمجھ ہی نہیں پاتے تھے۔ ڈاکٹر والکر اکثر بڑبڑاتے ہوئے اپنے اسٹاف کے سامنے ہی اپنے اعلیٰ حکام کو جن کے خط میں اس کی نکتہ چینی ہوتی تھی گالیاں تک بکنے لگا تھا۔ اس کے اسٹاف کے لوگ اس کی مشکلات اور تجربے میں شریک تھے اس لیے وہ اس کی مجبوری اور شدید اکتاہٹ کو سمجھتے تھے اور اس سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔

ایک دن ڈاکٹر والکر چیخ پڑا تھا۔ ''پھانسی کا اختیار دے کر سمجھ لیا ہے کہ سارے

مسئلے حل ہو گئے۔ اگر یہی حال ہے تو یہی کیے جائیں۔ ہمارا کیا ہم تو حکم کے غلام ہیں اختیار ہر بار یہی پوچھتے ہیں کہ اور کیا اختیار چاہیے۔ I am fed up with bloody this place. I feel like going on medical leave."

چند لمحے وہ بہت تناؤ کے عالم میں سوچتا رہا۔

" Now I will show them my metal."

اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بوکھلاہٹ میں کوئی نازیبا بات سوچ رہا تھا، کوئی ایسی بات جس سے وہ خود بھی متفق نہیں تھا لیکن اب کرتا سپاہی کو ہے جوان کی تنخواہ لے رہا ہے۔ وہ تو ایک آزاد انسان ہے جسے جرم کی سزا کاٹنے کے نام پر قیدی بنایا گیا ہے اور وفاداری اس پر لازم نہیں اور نہ ہی اس سے وفاداری کی امید کی جاتی ہوگی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ایک سپاہی جس سے تنخواہ لیتا ہے وہ اس سے وفاداری کی امید رکھتا ہے۔ جیل کے حکام بھی اپنے دل میں یہی سوچتے ہوں گے کہ وہ جیل کی اذیتوں کے خوف سے اور پرموشن کے لالچ میں وفاداری دکھا رہا ہے۔ اس انکشاف کے ساتھ ہی اس کی سوچ بدل گئی۔

یہ سچ ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس میں میری مرضی کہیں شامل نہیں ہے یعنی میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ میں نہیں کر رہا ہوں بلکہ مجھ سے کروایا جا رہا ہے اس خیال نے اس کے ذہن میں سوچ کے چشمے پھوڑ دیے۔

سوالوں اور جوابوں کا ٹکراؤ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ شروع ہو گیا۔

ظلم صرف مظلوموں میں نہیں ظالموں کے اندر بھی طرح طرح کے تناؤ پیدا کرتا

ہے اور اسے اور مضبوطی سے ظالم ہونے پر مجبور کرتا ہے۔'

مجاور نے ڈاکٹر والکر کا قصہ سناتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ ایک اخبار لگا جس میں کلکتہ کے ایک افسر نے ایک برطانوی نامہ نگار کو اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بڑے غصے سے کہا تھا۔

'ہم اس ملک کی معاشی ترقی کے لیے ایسا کر رہے ہیں اس سے حکومت برطانیہ کے فوجی نظام اور استحکام میں مدد ملے گی۔ ہم کوئی غلطی نہیں کر رہے ہیں۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ممکن ہے کہ کوئی کام صرف عوام کے لیے ہو اور پھر برطانوی حکومت ہندوستان کے تحفظ کا ذمہ بھی اپنے اوپر لیتی ہے۔ ایسی صورت میں جب اس جزیرے پر بخوشی کوئی آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اگر حکومت مجرموں کو یہاں لا کر رکھتی ہے اور ان سے مزدوروں کی جگہ یہاں کام لیتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟

اور یہ لوگ سیاسی قیدی نہیں ہیں- باغی میں اور سیاسی قیدی میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ تاریخ عالم میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ باغیوں کا مستقبل یا تو بہت درخشاں ہوتا ہے یا انتہائی تاریک- دنیا کی کوئی حکومت باغی کو معاف نہیں کر سکتی۔ اور اگر انگریزوں نے ان کے ساتھ سختی سے سلوک نہیں کیا تو کل دوسرے لوگوں کے اندر بھی بغاوت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ جس کے جی میں آئے گا حکومت برطانیہ کے خلاف بندوق اور تلوار اٹھالے گا اور انگریزوں کو، ان کے بال بچوں کو اس طرح کاٹ رکھ دے گا۔ جیسے ان لوگوں نے دلی میں کیا تھا۔ اور کیا اگر انگریز حکومت چھوڑ کر چلے جائیں تو یہ لوگ خود اپنے کاروبار کو سنبھال سکتے ہیں؟ حکومت کرنے کا فن صرف اس کو آتا ہے اور حکومت کرنے کی صلاحیت صرف اس میں ہوتی ہے جو بزور طاقت حکومت حاصل کر لے یا اپنے آباواجداد سے ملی ہوئی حکومت کی حفاظت کر سکے؟

ہم ایسے لوگوں کی عزت کرنے کو تیار ہیں اور ایسے لوگوں کو احترام کی نظر سے

دیکھنے کو تیار ہیں جن کے اندر حکومت کرنے کی صلاحیت ہو لیکن یہ باغی ان سے مختلف تھے، یہ باغی وہ ناکارہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ اپنی مقامی حکومت کو مضبوط کیا نہ برطانوی حکومت کو مضبوط رہنے دینا چاہتے تھے۔ کہاں تھی ان کی صلاحیت کہاں تھی ان کی بہادری جب مغل حکومت ٹوٹ کر قدیم بوسیدہ مکانوں کی طرح گر رہی تھی؟ کہاں تھے یہ مُلا جو آج حکومت برطانیہ کو کافروں کی حکومت کہتے ہیں؟ کہاں تھے یہ اس وقت جب مغلیہ حکومت کمزور ہو رہی تھی؟ تب انہوں نے کیوں فتوے نہیں دیئے تھے؟ یہ ناکارہ لوگ ہیں جو فتوئی دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے جو فوجوں کو اور عوام کو غداری اور بغاوت کے لیے بھڑکا سکتے ہیں۔ جن کے فتوے میں یہ اثر ضرور ہے۔ کہ وہ کسی فوجی کو غدار بنادے۔ لیکن یہ اثر نہیں کہ کسی فوجی کو باصلاحیت اور وفادار بنادے۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے ہندوستان پر قبضہ کیا ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان پر دھوکے سے قبضہ کیا ہے کہ ہم نے اپنے وعدے پورے نہیں کیے اور دھوکے دیئے کہ ہم نے دھوکے بازی سے اس ملک کو حاصل کیا ہے۔ کوئی اس بات کو کیوں یاد نہیں کرتا کہ ہم اپنے وطن کو چھوڑ کر اتنی دور اس اجنبی ملک میں، اجنبی لوگوں میں کتنے برسوں رہے ہیں؟ کوئی ان آنسوؤں کو کیوں نہیں دیکھتا۔ الوداع کہتے ہوئے ان بازوؤں کو کیوں نہیں دیکھتا جوان لوگوں کے لیے لرزتے ہوئے ملتے ہیں جو برطانیہ سے مہینوں اور سالوں کے لیے باہر جاتے ہیں۔ کوئی ان شب و روز کو کیوں نہیں یاد کرتا جو ہم جہازوں میں سمندروں میں ہچکولے کھاتے رہتے ہیں۔ کتنے بیمار پڑتے ہیں۔ کتنے مرتے ہیں۔ یہ اپنے وطن میں مرنے والے اور اپنی وفاداری کا ثبوت دینے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ برطانیہ سے ہندوستان تک سمندر کی گہرائیوں میں کتنے انگریز دفن ہوئے ہیں تب ہم یہاں تک پہنچتے ہیں۔ ہندوستان پہ اگر ہم نے قبضہ کیا تو یہ ہمارا جرم نہیں ہے، ہندوستان کو ہم نے اگر لوٹا بھی ہے تو یہ ہمارا جرم نہیں ہے۔ کیوں ہندوستان نے اپنے کو لٹنے دیا کیوں ہندوستان کی زمین نے ایسے فرزند پیدا نہیں کیے جو ہمارا مقابلہ کرتے اور اپنی مٹی کی حفاظت کرتے اگر ہندوستان کی مٹی ایسے فرزند نہ پیدا کر سکی۔ اگر ہندوستان دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا تو وہ اپنی کمزوری کے لیے خود ذمہ دار ہے، حکومتوں، ملکوں اور قوموں کے لیے کمزور ہونا گناہ ہے، جرم ہے، ہندوستان اس

بات کا مجرم ہے۔اوراس جرم کی سزا ہے غلامی۔ ہر مجرم کو سزا ملتی ہے، ہندوستانیوں کو یہ سزا مل رہی ہے۔اگر یہ سزا انگریز نہیں دیتے تو فرنچ دیتے، ڈچ دیتے یا کوئی اور دیتا۔اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں۔ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں ان لوگوں پر سختی کرنی پڑ رہی ہے۔جنھوں نے اپنی آزادی کی جنگ لڑی۔لیکن ہمیں اس کا بھی افسوس ہے کہ ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اپنی آزادی کی جنگ جیت سکیں۔انہوں نے ایک جذباتی لڑائی لڑی ہے اور آزادی کے لیے جذباتی لڑائی لڑنا ایک جرم ہے اور اسی جذباتی لڑائی کو غداری اور بغاوت کہتے ہیں۔آزادی کی جنگ کرنے والا کوئی آئے ہم اس کی عزت کریں گے۔لیکن یہ لوگ جو ناکارہ ہیں، جو آزادی کو بچوں کا تماشہ سمجھتے ہیں۔انہوں نے اپنی کمزوری سے اپنے وطن کی حکومتوں کو بھی کمزور و برباد کیا اور اب برطانوی حکومت کو بھی برباد کرنا چاہتے تھے۔اس میں بھی کمزوری کا بیج بونا چاہتے تھے۔ہم اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ہمیں دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ہمارے پاس اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ ہم کچی تھیوریوں میں اپنے وقت خراب کریں۔ہمیں ان الجھی ہوئی باتوں سے دور رہنا چاہئے۔فضول اور بکواس میں اپنا وقت نہیں برباد کرنا چاہیے ہمیں سیدھی اور تعمیری باتیں سوچنی چاہئے۔اور سیدھی بات یہ ہے کہ ہمیں ان جزائر کو آباد کرنا ہے تاکہ اس ملک کی معاشی ترقی میں اس کا رول ہو اور ہماری دفاعی انتظامات میں اس سے مدد مل سکے اور جہاں تک ان باغیوں کا تعلق ہے تو ہمیں ان کو یہاں یہ سبق دینا چاہئے کہ ڈسپلن کیا ہے اور اس دنیا میں ترقی کرنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔کتنی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ان لوگوں کے فرسودہ اور ہوائی اور خام خیالات کا کوئی استعمال نہیں ہے۔ان سے کہو کہ وہ اس کو بھول جائیں......اور ان سے کہو کہ محنت کر کے کچھ تعمیری کام کریں کہ یہی زیادہ عملی بات ہے۔

شیر علی انڈمان میں چھوٹے موٹے انگریز عملہ کی طرف سے کبھی کبھار اسی طرح کی کہی جانے والی باتیں سنجیدگی سے سنتا رہا اور خاموش رہا کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کے خلاف سوچنا یا بولنا بہت آسان ہے لیکن سچائی کی آواز کو سننا اور برداشت کرنا بہت جرأت کی بات ہے۔سچ تو یہ تھا کہ ان باتوں کا جواب اس کے ذہن میں نہیں ابھر پایا لیکن وہ ان باتوں

سے کبھی دل ہی دل میں مطمئن بھی نہیں تھا۔

ایک بار یہی بات جو اس انگریز افسر نے اخبار کے نامہ نگار سے کہی تھی، ایک انگریز سپاہی نے وہاں کالا پانی میں قیدیوں سے کہی۔انگریز سپاہیوں کے جانے کے بعد ایک قیدی نے جو دلی کی جنگ آزادی سے گرفتار ہو کر آیا تھا' دوسرے قیدیوں سے کہنے لگا۔

'یہ بیچارے کیا جانیں کہ ہم کون ہیں۔'

اس قیدی کا تیور دیکھ کر سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔وہ بہت کم بولا کرتا تھا اور جب بولتا تھا تو کام کی بات کرتا تھا۔

'ایسے ہی ایک بار دلی میں نادر شاہ نے ہانکی تھی۔اس نے دعوی کیا تھا کہ اس کی فوج بہتر تھی اور ہندوستانی فوج کی تربیت اچھی نہیں تھی۔اس پر ایک بوڑھے نے جو ہندوستانی فوج کا سپہ سالار اعظم رہ چکا تھا کہا کہ آپ نے ہندوستانی فوج کو دیکھا ہی نہیں ہے۔نادر شاہ نے کہا کہ یہ بہادر پانی پت کی لڑائی میں کیا کر رہے تھے۔

بوڑھے نے کہا کہ سپہ سالار وہاں گئے ہی کہاں تھے' وہاں تو نچنئے اور بھچنے گئے تھے۔اگر سپہ سالار کو دیکھنا ہے تو اپنے سپہ سالار سے کہئے کہ وہ ہمارے سامنے مقابلے پر آئے۔

مقابلہ طے ہو گیا۔لال قلعے کے نیچے جمنا کے کنارے ایرانیوں کا نوجوان سپہ جرح بکتر میں لدا تلوار ڈھال میں آیا دوسری طرف سے بڈھا خود نیزہ لیکر آیا۔

مقابلہ میں ایرانی تلوار اور ڈھال کے ساتھ بڈھے پر جھپٹا۔بڈھے نے نیزہ مارا۔ایرانی نے روکا لیکن نیزہ ڈھال کو پار کرتا ہوا ایرانی کے سینے میں جا گھسا۔کام مکمل کرنے کے لئے بڈھے نے نیزے پر ایرانی کو ہوا میں اٹھا لیا اور دوسری جانب پھینک دیا۔لیکن بڈھے

کے منہ میں سینے کے پھٹنے سے خون آ گیا۔ اس کو اس کے فرزند کندھوں پر اٹھا کر لے گئے۔

جب حکومت نچنیوں، ہیجنیوں اور مجرم پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور ملک کی رہنمائی ذہین اور محنت کش لوگوں کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے تو دنیا کو یوں ہی ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے۔

شیر علی بھی وہاں بیٹھا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور بھاری قدموں سے آہستہ چلتا ہوا جیل کی طرف جا رہا تھا کہ پھر اس کے ذہن میں کچھ خیالات تیزی سے ابھر کر گردش کرنے لگے اور وہ پھر سامنے کی پہاڑی کے ایک تنہا مقام پر پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ایسا سناٹا تھا کہ ہونٹ تک نہیں مل پا رہے تھے۔

سوال تو دیر سے اٹکا ہوا تھا اچانک جواب سامنے آیا۔

''کیا انگریز جو کر رہے ہیں یہ حکومت ہے؟''

ہمارے ملک میں حکومت کی ایک روایت ہے۔

اگر یہ سزا ہے تو سزاؤں کا یہ پورا نظام انسانی تہذیب کے جسم پر کوڑھ ہے۔
ہمیں انعام کا پورا تصور بھی غلامانہ ذہنیت کی پرورش کرنے کا ذریعہ ہے۔

سزا کا اصل طریقہ تو ہماری تہذیب نے ہمیں کسی اور ہی طرح سمجھا رکھا ہے جو انگریزوں کے اس طریقے سے مختلف ہے۔ سزاؤں اور انعام کا نظام تو دراصل ہمیں بہتر انسان بنانے کے لیے بنایا گیا ہے، انتقام یا استحصال کے لیے نہیں۔

سزا کو تجارتی استعمال پوری انسانی تہذیب کی روایت کی خلاف ورزی ہے اور یہ جرم کی کھیتی کرنے کے مترادف ہے اور یہ بات حکومت کے اقدار کا گھناؤنی خلاف ورزی ہے۔ کسی بھی ملک کے عوم کے لیے کسی ایسی حکومت کی حمایت کرنا ان کے لیے شرم کی بات اور ان کے عوامی کردار پر ایسا داغ ہے جو اسے انسانیت کی نگاہ میں گراتی ہے۔ حکومتوں کو ایسا قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ ان کے ملک کی تاریخ کے امیج پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ خالد نے سوچا جمہوریت میں اس کی فکر کون کرتا ہے۔ حاکم تو آتے جاتے رہتے ہیں فرق تو عوام کی اس وراثت پر پڑتا ہے جسے تاریخ کہتے ہیں۔

مشرقی تہذیب ہو یا مغربی دونوں جگہ گناہ و ثواب، ترازو کے دو پلڑے ہوتے ہیں جو اس کی بری عادتوں کو کمزور اور اچھی عادتوں کو مضبوط کرتی ہیں۔ ایک بار انسان گناہ سے توبہ کر لیتا ہے یعنی اپنی عادت کو بدلنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں یعنی اس کی عادت بدل جاتی ہے۔ انسان بنیادی طور پر کسی گناہ کی سزا دیے جانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کے اعمال و گناہ سزا کی ذلت سے بلند ہیں۔ سزا انسان کی ذات اور رتبہ کے خلاف ہے۔ سزا صرف ہماری مجبوری ہے۔ سزا دوسروں کی تسلی کے لیے ہے۔

ان کی تسلی کے لیے جو انسان کی عظمت کو ابھی پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہیں۔

انسان کو اس کے اعمال سے روک دو،

کہ اس کی بری عادتیں ہی اس کی سزا ہیں۔

جب ہم جزا یا سزا کی وجہ سے کچھ کرتے ہیں تو ہمارا کردار بری طرح مجروح ہوتا ہے۔

جزا اور سزا دونوں ہی انسان کی تخلیقی آزادی و عمل میں باہری مداخلت سے انسان کو غلام بناتے ہیں۔

اور جب کوئی ہم سے جزا یا سزا کی امید کرتا ہے تب بھی ہمارے اندر آقائیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہم اوروں سے دور ہو جاتے ہیں کہ حکم کا استعمال تب ہوتا ہے۔ جب ذمہ داری کام نہیں کرتی۔ اور حکم کے استعمال اور ذمہ داری کے فقدان سے انسان کے اندر کی تخلیقی صلاحیت نظر انداز ہو کر پڑی رہتی ہیں اور ہمیں تکلیف پہنچاتی ہے۔ اور ہمارا ارتقاء جاتا ہے۔

حکومت کے اشارے پر ہمارا جس قدر ارتقاء ہوگا وہ ہماری غلامی اور آقائیت کو اور مضبوط کرے گا۔

شیر علی جب وہاں سے اٹھا تو وہ بدل چکا تھا۔ برسوں بعد اسے آج پہلی بار محسوس ہونے لگا کہ وہ یہاں آنے کے بعد غلط راستے پر چل رہا تھا۔ کم از کم اس حد تک وہ ضرور غلط راستے پر چل رہا تھا کہ اس نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ گوپی کے لیے اس کے دل میں جو نفرت پیدا ہوئی تھی وہ اپنی جگہ۔ لیکن وہ خود اپنی جگہ۔ جو کچھ کرتا آیا تھا وہ گوپی کے عمل سے کتنا مختلف تھا اور مختلف تھا بھی کہ نہیں یہ اس کا اپنے آپ سے کہنا مشکل ہو رہا تھا۔

خالد کے ذہن میں ان باتوں سے متعلق ایک سوال ان دنوں بار بار اٹھتا تھا

''میر علی اس سوال پر کیا رائے رکھتے تھے۔''

وہ سوچنے والا لڑکا تھا اور بہت کچھ سوچنے لگا تھا۔

خالد نے سن رکھا تھا کہ میر علی ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ادب سے ان کو خاص دلچسپی تھی صوفیوں سنتوں کی صحبت بھی انہیں پسند تھی۔ رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں سننے کے لیے وہ پنڈتوں کو دعوت دیتے اور سماجی معاملات میں بولتے ہوئے اکثر ان کتابوں اور ان کے واقعات کا حوالہ دیتے۔

کیا کالا پانی جیسا کوئی واقعہ جس میں جرم کی سزا کے طور پر تاجروں کے اشارے پر مجرم کا استعمال کیا جائے۔ اپنے ہی قانون کو توڑ کر اس طرح کی کوئی چیز وجود میں لائی گئی ہو اس کی کوئی مثال اسے نہیں یاد آئی۔ میر علی نے پھر یہاں کی صورت حال کو کیا سمجھ کر برداشت کیا ہوگا، اور دیگر قیدیوں نے بھی۔ کیا ان کے دلوں میں حکومت کے لیے کوئی احترام باقی رہ گیا ہوگا۔ یقیناً انہوں نے یہاں وہ سب کچھ دیکھا اور پھر محسوس کیا ہوگا جس کو وہ کسی حکومت سے توقع نہیں رکھتے ہوں گے۔ پتہ نہیں وہ اس حکومت کو حکومت سمجھتے ہوں گے یا سمندری قزاق جن کے لیے کالا پانی کسی طوائف کا ایسا بدن تھا جس میں شرفاء اپنا وہی سب کچھ ڈال کر اسے گھناؤنی چیز کی طرح چھوڑ آتے ہیں جس سے وہ اپنے گھروں میں وارث پیدا کرتے ہیں۔ میر علی یہ سوچتے تو ضرور ہوں گے کہ حکومتیں ملکوں پر قابض ہونے سے نہیں قائم ہوتیں بلکہ حکومتوں کے فن جاننے اور حکومتوں کی ذمے داریاں اور کردار پیدا کرنے سے قائم ہوتی ہیں ورنہ حکومت قزاقی اور بزنس میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا اور جب حکومت حکومت نہیں رہتی تو وہ عوام کی وفاداریوں کا حق کھو دیتی ہے۔

❖❖

شیر علی کو ان جزیروں میں آئے ہوئے تین چار سال ہو گئے تھے۔ وہ جن دنوں آیا تھا اس سے پہلے بھی ایک بار بھاری تعداد میں بھاگے ہوئے قیدیوں کو ڈاکٹر واکر نے سزائے موت سنا کر پھانسی دی تھی۔ اس کے بعد اس نے دو سو بارہ لوگوں کے پھانسی کا منظر خود بھی کانٹے دار لوہے کے تاروں کے گھیرے سے باہر سے دوسرے قیدیوں کی طرح دیکھا تھا۔ تب اس کو معاملہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب یہاں کا قانون یہی ہے تو اس کی بہر حال خلاف ورزی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ یہاں کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوری مستعدی سے ان ذمے داریوں کو نبھاتا رہا جو اسے دی جاتی تھیں ڈسپلن میں وہ سب سے آگے دکھائی دیتا تھا۔ شخصیت بھی بھاری بھرکم تھی۔

جن قیدیوں کے آنکھوں کے سامنے مجرموں کو پھانسی پر چڑھایا گیا تھا ان کے دل و دماغ پر ایک گھبراسناٹا بہت یہاں آنے کے بعد شیر علی شروع سے ہدایات پر عمل کرنے میں اتنا سنجیدہ تھا کہ یہاں کے افسر اور کارندے اس کو کسی بھی طرح کی ذمہ داری پورے اعتماد سے دینے لگے تھے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا، گورا چٹا، بلند نظروں والا سنجیدہ دکھائی دینے والا، بائیس چوبیس سال کا نوجوان تھا۔ اس کی وجاہت ہی اس بات کا تقاضا کر رہی تھی کہ اس کا احترام کیا جائے۔ وہ کہیں سے مجرم نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے کام اتنی چابکدستی اور پھرتی سے انجام دیتا تھا کہ اسے کبھی ڈانٹنے، پھٹکارنے کی بات تو دور ٹوکنے تک کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ کبھی کوئی بات کہتا تو کچھ اس طرح کہتا کہ اگر وہ ماننے والی بات نہ ہو تو بھی اس کی بات پوری طرح سنی جاتی تھی۔ اور جب اس کی کوئی بات رد کی جاتی تو اسے وہ بغیر کسی حیلہ اور حجت کے مان لیا کرتا۔ جلد ہی وہ اتنا مقبول ہو گیا کہ اس کے افسر اسے اپنی ذمہ داریاں بھی دینے لگے۔ وہ اس کے اوپر اس سلسلے میں بھروسہ کر سکتے تھے۔ اس کی بات پر یقین کرتے تھے اور عزت

سے خان کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ اپنی مثال اور کردار سے دوسرے قیدیوں کو بھی لگن اور محنت سے کام کرنے کی ہمت افزائی کر دیتا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی نیت یہ تھی کہ غیر ضروری طور پر انہیں ڈانٹ کھانے یا اذیت اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔ جس کا سامنا ان قیدیوں کو عام طور پر کرنا پڑتا تھا جو اپنے کام کرنے میں کوتاہی برتتے تھے۔ جب بھی کسی قیدی کو سزا دی جاتی کوڑے مارے جاتے تو اس کے چہرے پر اس کے اندر پیدا کرب صاف دکھائی دیتا لیکن وہ بھی اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا۔ غالباً اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سو ان تمام باتوں کی وجہ سے ڈاکٹر واکر اسے لگاتار ترقی دیتا گیا۔

اس کا نام شیر علی تھا ہی اس کی آنکھوں اور بھنووں میں ایسا کچھ ضرور تھا۔ وہ کابل کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کو اپنے بھائی کے قاتل کے قتل کے جرم میں یہ سزا ملی تھی۔ اس نے یہ قتل اس لیے کیا تھا کہ بھائی کے قتل کا انتقام لینا اس کے اخلاقی فرائض میں شامل تھا۔ لیکن اب افغانستان میں انگریزی قانون نافذ ہو چکا تھا اور نئے قانون کے مطابق اس کے خلاف ایک مقدمہ قائم ہو چکا تھا۔ عدالت میں اس پر مقدمہ چلا۔ اپنے دفاع میں اس نے قبائلی قانون کا حوالہ دیا لیکن اس کے باوجود اس کو سزا ہوئی اور اسے کالا پانی بھیجنے کی سزا دی گئی۔ لیکن اسے کبھی اپنے عمل میں کوئی جرم نہیں دکھائی دیا اور اس نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہی بے قصور مانا۔ لیکن جب اس کی گرفتاری اور بعد ازاں سزا ہوئی تو اس نے اس کو ایک حقیقت تسلیم کر لیا۔ چونکہ اس کے اندر عزت نفس کا مادہ بہت زیادہ تھا اس لیے اس نے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کبھی چھوٹی موٹی باتوں میں نہیں الجھا۔ اس کو دوسری کی نامناسب باتیں بھی پسند نہیں تھیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بے جا باتوں سے بچے اور انتہائی صبر سے کام لے۔ اس نے کہیں اپنے دل کی گہرائی میں اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ جب ایک بار قسمت نے اس کو مجرم قرار دے دیا تھا تو اس طرح کی زندگی گزارنا بھی اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس لیے اس نے بہت خوبصورتی کے ساتھ اس زندگی کو اپنا لیا تھا اور نتیجے کے طور پر قیدی کی حقیقت سے جتنی مراعات اور ترقیاتی سے مل سکتی تھیں وہ سب اسے ملتی چلی گئیں۔ اور اب حالت یہ تھی کہ قیدیوں کی اس خانے میں تھا جس میں اس کی بیڑیوں، سلاخوں اور وقت کی

پابندیوں سے پوری طرح آزاد کر دیا گیا تھا اور اب وہ کسی خاتون قیدی سے شادی بھی کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے مقدمہ اور سزا کی نوعیت کے بارے میں بھی سب کو معلوم ہو گیا تھا اور اس کی بہادری کی وجہ سے لوگ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور سبھی یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ محض اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ یہاں یہ سزا کاٹ رہا تھا۔

لیکن انڈمان نکوبار کی آب و ہوا کو برداشت کرنے میں اسے بہت دشواری پیش آ رہی تھی اور اس کا اس کے مزاج پر کبھی کبھی بڑا پریشان کن اثر پڑتا تھا اور ایسے لمحوں میں وہ اکثر اپنا اطمینان کھو بیٹھتا تھا، وہ لوگ جو اسے جانتے تھے، ایسے لمحوں میں اس سے بچ کر دور ہی رہتے تھے۔ ایسے لمحوں میں وہ یہاں وہاں بے چینی سے گھومنے لگتا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا اور ہونٹ اس طرح بھنچ جاتے جیسے وہ کوئی دل برداشتہ شیر ہو۔ ایسے لمحوں میں وہ خود بھی کم گو ہو جاتا اور عموماً تنہائی پسند ہو جاتا۔

اس کی پہلی ترقی تب ہوئی جب اپنے اوپر کے منشی کی سفارش پر اسے جیل کی تعمیر کی نگرانی کا کام دیا گیا۔

سرکار نے ان جزیروں پر ایک اچھی خاصی آبادی بسانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ پرانے باغی جو یہاں لائے گئے تھے۔ بیشتر اب مر چکے تھے۔ جو نئے قیدی لائے جا رہے تھے ان کے دلوں میں آزادی کی آگ والی بات نہیں تھی اور ان کو قابو میں رکھنا نسبتاً آسان تھا۔ ڈاکٹر واکر پر سرکار کی طرف سے یہ نکتہ چینی ہوئی تھی کہ اس نے کافی قیدیوں کو پھانسی پر لٹکا کر ایک طرح سے محنت کرنے والے مزدوروں کو ضائع ہی کیا تھا۔ یہ رائے قائم کی گئی تھی کہ وہ قیدیوں سے کام لینے میں مہارت نہیں رکھتا تھا۔ اس صورت میں ڈاکٹر واکر نے اسے ترقی دے کر نگراں مقرر کر دیا۔ اس کو بیماروں کے وارڈ کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ مریضوں کا خیال رکھے اور یہ دھیان رکھے کہ ان کو مناسب دوائیں مل رہی ہیں۔ ایک دن اچانک وہ نماز پڑھ کر مریضوں کی صحت کی دعائیں مانگنے لگا۔ ایک کونے میں جب وہ مریضوں

کے لیے دعا مانگ رہا تھا تو اس کی سسکیوں کی آواز دور تک سنائی دے رہی تھی۔ ایک مریض اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے بہہ بہہ کر اس کے رخسار پر گر رہے تھے۔ اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ دوسرے دن سے وہ پابندی سے نماز پڑھنے لگا تھا۔

اس کے جذبات بالکل فطرتی تھے۔ وہاں مشکل سے ہی کوئی دوا موجود تھی۔ جب کوئی قیدی تپ دق کا مریض ہو جاتا تو شیر علی کا صرف یہی کام رہ جاتا کہ وہ اس مریض کی دلجوئی کرے۔ اس کو دلاسہ دے اور اسے اپنی تکلیف کو برداشت کرنے میں اس کی ہمت افزائی کرے کیونکہ اب سوائے موت کا انتظار کرنے کے لیے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جب زندگی کے آخری دنوں میں ان کی حالت بالکل خراب ہو جاتی تو انہیں ایک الگ کمرے میں ڈال دیا جاتا تھا جہاں پہلے سے اس حالت کو پہنچے ہوئے دوسرے مریض ہوتے۔ یہ مریض اپنے رشتہ داروں اور پرانے دوست احباب کو یاد کرتے رہتے۔ انہیں اپنے بچپن کی، اپنے ماں باپ کی محبتوں، اپنے بھائی بہنوں کی محبتوں کی بے تحاشا یاد آتی۔ اس کمرے میں دن اور رات ایک ہی طرح کے گزرتے۔ کسی کو بھی بمشکل ہی نیند آتی۔ ان کے پاس سونے کے لئے وقت ہی کہاں تھا۔ ان تمام باتوں کا انحصار اس پر تھا کہ وہ زندگی میں کتنا تھکے تھے۔ اسپتال میں بیمار ہو کر داخل ہونا کوئی آسان بات نہ تھی۔ مریضوں کو تب تک کام کرنا پڑتا تھا جب تک ڈاکٹر یہ تصدیق نہ کر دے کہ مریض کام کرنے کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔ زیادہ تر یوں ہوتا کہ اس بنا پر مریضوں کے کام کا بوجھ کم کر دیا جاتا۔ کئی مریضوں کی موت کام کرتے کرتے خون کی قے کرتے ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس ڈاکٹر کے مشورے سے طے ہوتا جس کے نزدیک سرکاری کام کی اہمیت قیدیوں کی جان یا راحت سے زیادہ تھی۔

شیر علی ہمیشہ اس کوشش میں رہتا کہ وہ مریضوں کی تکلیف کے بارے میں ڈاکٹر کو یقین دلائے لیکن کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر اس کی باتوں کو نظر انداز کرنے لگا تھا کیونکہ وہ تقریباً ہر اس شخص کے بارے میں سفارش کرنے لگا تھا جو واقعی بیمار تھا اور ڈاکٹر کے دل میں یہ بات آ گئی تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو سرکاری کام کا نقصان ہونے لگے گا۔ بلکہ آخر میں ایک دن

ڈاکٹر نے شیر علی سے منہ کھول کر صاف کہہ دیا کہ وہ مریضوں کے معاملے میں مداخلت کرنا بند کرے۔ شیر علی کو مداخلت کے لفظ سے کافی گہری تکلیف ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے کبھی کسی کی سفارش نہیں کی۔ اسی کے چند دنوں کے بعد وہ عاؤں میں پھوٹ پھوٹ کر رو یا تھا۔

مریض قیدیوں کی زندگی بچانے پر بھی دھیان دیا جانے لگا لیکن عموماً ان لوگوں کا خاتمہ ایک منظم انداز میں کیا گیا جن سے جیل کے حکام کو کسی بھی اعتبار سے پریشانی ہوتی تھی۔ نگراں مقرر ہونے کے بعد شیر علی کو اس بات کی بھنک مل گئی تھی۔ ایسے لوگوں کو یہ بہانہ بنا کر پھانسی دے دی جاتی تھی کہ وہ جیل کی ہدایت پر عمل نہیں کرتے اور اس لیے وہ عمر قید کی رعایت کے حق دار نہیں رہ جاتے۔ ایسے بہت سارے قیدی تھے جن کو پھانسی کی جگہ رعایت کے طور پر عمر قید دی گئی تھی۔ پھانسی کی سزا کو عبرت اور ہیبت کا نمونہ بنانے کی غرض سے وائپر جزیرہ پر ایک شاندار پھانسی گھر تعمیر کیا گیا تھا۔ جیلر کی رہائش بھی اسی کے پاس تھی جس میں ایک طویل و عریض احاطہ تھا۔

قیدی مرغی خانے کی مرغیاں بن گئے تھے۔ ان کو کیا ملے۔ کیا نہ ملے، وہ کیسے رہیں یہ ساری باتیں سرکار کے فائدے کی روشنی میں طے ہوتی تھیں۔ اسی نقطہ نظر سے اس پر بھی غور کیا گیا کہ اگر یہاں کچھ عورتیں بھی لائی جائیں تو اس کے فائدے اور نقصانات کیا ہوں گے۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ کچھ نوجوان عورتیں بھی یہاں لائی جائیں تاکہ بے چین طبیعت اور دماغوں والے مردوں کو رام کیا جاسکے۔ عورتوں کو انعام کے طور پر استعمال کیا جاسکے، ان سے تفریح کی ضرورت پوری کی جاسکے اور افسروں کے گھروں میں گھریلو خدمات کے لیے ان کا استعمال کیا جاسکے کیونکہ ان کو نسبتاً کم خطرناک مانا گیا۔

عورتوں کی آمد نے واقعی یہاں کی فضا بدل دی۔ جن قیدیوں کو عورتیں بہنیں ملیں ان کے اندر بھی صرف اپنے اردگرد عورتوں کو دیکھ کر تبدیلی نمایاں ہونے لگی۔ اب وہ یہاں انسانوں کی طرح رہنے کے امکانات دیکھ سکتے تھے۔ ان کے لیے یہاں لائی جانے والی

عورتیں مجرم نہیں تھیں بلکہ صنف نازک تھیں جن میں وہ ساری باتیں تھیں جن کی یہاں کمی تھی۔ محبت، میٹھی آوازیں جو انہوں نے برسوں سے نہیں سنی تھیں۔ گھریلو فضا، اور ہنسی مذاق۔ ان عورتوں میں دو رقاصائیں تھیں اور ایک دوگانے والیاں تھیں۔ رقاصاؤں نے کلکتہ میں کسی جھگڑے میں کوٹھے کے اوپر ایک سیٹھ کا قتل کر دیا تھا۔ ان کی چال اوروں سے مختلف تھی۔ ان کو بیڑیوں سے آزاد رکھا گیا تھا تاکہ وہ اپنے رقص کا ریاض جاری رکھ سکیں۔ مشکل کام، اذیتیں اور بے عزتی کی سارے احساسات ان رقاصاؤں کے رقص اور گانوں کی مدھم آواز میں ڈوب گئے۔ یہ عورتیں ایک مخصوص فرش پر رقص کرتی جہاں ایک طرف جیلر اپنے محافظین کے ساتھ بیٹھتا اور دوسری طرف قیدی زنجیروں میں بندھے زمین پر بیٹھتے، چونکہ ان قیدیوں میں مراتب بنادیے گئے تھے اس لیے ان کی نشست بھی ان کے مراتب کے مطابق ہوگی۔ قیدیوں کو رقاصاؤں کی ادا پر داد دینے کی یا بول مارنے کی اجازت تھی لہٰذا وہ ایسے موقعوں پر آپس میں مسکرا کر آنکھیں مار کر یا جھوم جھام کر کام چلا لیتے یا پھر کبھی کبھی اونچی آواز میں اپنے خالص علاقائی لہجے میں تبصرہ کرتے جس سے جیلر بھی محظوظ ہوتا۔ یا وہ رات گئے یہ رقاصائیں جیلر کے بنگلے کے اندر رقص کرتیں جہاں جیلر کے علاوہ انگریز افسر بھی ہوتے جن کی وہاں تعیناتی ہوئی تھی۔ دوسری صورتوں کو بنگلوں کے اندر گھریلو امور کے لیے بنایا جاتا۔ شیر علی ان محفلوں میں یا تو آتا نہیں یا آگر آتا تو مکمل طور پر خاموش رہتا۔

ایک دن شیر علی کو ان قیدیوں کا نگراں بنایا گیا جو قیدی افسروں کے بنگلوں میں کام کرتے تھے۔ ان میں عورت قیدی اور رقاصائیں سب شامل تھے۔ شیر علی نے بہت ہی ہوشیاری سے اپنی جگہ کسی اور کے لیے سفارش کر کے اس طرح کی ذمہ داری سے کترا گیا تھا۔

لیکن ان میں بڑی والی رقاصہ محفل رقص میں سامنے کی صف میں بالکل خاموش بیٹھے ہوئے اس پٹھان پر دل دے بیٹھی تھی۔ رقص کے دوران اپنی ہر تہلکہ خیز ادا کے ساتھ وہ اس کو ضرور دیکھتی لیکن وہاں وہ ذرا سی بھی حرکت نہیں دیکھتی۔ یہ بات رقاصہ کے دل میں گانٹھ کی طرح بن گئی تھی اور کہیں نہ کہیں اس کے لیے چنوتی بنتی جا رہی تھی۔ اس کو اس بات کی بھی

خبر ہوگئی تھی کہ شیر علی ترقیوں کے بعد اس مرتبہ پر پہنچ چکا ہے جہاں اس کو کسی قیدی سے شادی کی اجازت مل سکتی ہے۔

شیر علی کی زندگی میں محبت کا ایک یادگار واقعہ ہوا تھا جو انڈمان کی لوک کتھاؤں کا حصہ بن گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک دن شیر علی بغل کے راستے پر مزدوروں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے اپنی لمبی پلکوں کے نیچے سامنے کی پہاڑی وادی پر نظر ڈالی اور اسے اپنے وطن کی ایک بار پھر یاد آئی اور وہ ان یادوں میں کھو گیا۔ اسی دوران رقاصہ سنہری جو اسی راستے سے گزر رہی تھی، جان بوجھ کر اس کے بالکل قریب سے گزرنے لگی۔ جب وہ اس کے بالکل قریب قدم دو قدم کی دوری پر پہنچی تو اس نے اپنی میٹھی چہکتی آواز میں اسے سلام کیا۔

'آداب خاں صاحب'

ان جزیروں پر وہ پہلی شخص تھی جس نے اس کو خاں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کی نسوانی آواز میں جو اس کے بالکل قریب سے آ رہی تھی ہیں دھماکہ خیز قوت تھی جس نے شیر علی کے گاؤں کے تصورات کی دنیا کی پرخچیاں اڑا دیں جیسے اس کے حواس میں اندر دور تک اس آواز کے تیر نما لہریں اس کی رگوں میں دوڑ گئی ہوں۔ یہ بوچھار اس قوت کے ساتھ ہوئی تھی کہ شیر علی اس کی لذت کی مسرت سے کو بخود سرشار ہو گیا۔ اسی دوران سنہری ٹھیک اس کے سامنے آ چکی تھی اور اپنی نظریں اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ شیر علی اپنی کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں میں جھانکنے سے اپنے کو روک نہیں سکا۔ ان آنکھوں میں جھانکنا کیا تھا کہ ان آنکھوں میں جھیل برابر پھیلا پانی۔ برف سے ڈھکا ہوا، خنک، روح افزا، لاکھوں گلاب کے پھولوں کی خوشبو کا جھونکا، اور راحت کی گہرائی نے شیر علی کے لمبے چوڑے وجود اور ان جزیروں کی سخت کوشش سب کو پگھلا کر اس کی روح کو ایسے آزاد کیا کہ وہ ایک بالکل ہلکا پھلکا آدمی بن گیا۔

اس نے نظریں اٹھا کر دائیں بائیں کے ماحول کو دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس پورے کرخت ماحول میں وہ بالکل خوشی خوشی رہ سکتا ہے۔ اگر صرف یہ آنکھیں اس کے قریب رہیں اور آس پاس رہیں، صرف اگر وہ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی روزانہ اور کم از کم ہفتے میں ایک بار دیکھ سکے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اپنے جسم، اپنی شخصیت میں، جس کو وہ بہت اہمیت دیتا تھا کچھ بھی نہیں رکھا ہے اور حسن میں اس کے مقابلے بہت بڑے معجزہ کی قوت موجود ہے۔

اسے اس وقت سے یہ جگہ وہی سخت کوش جگہ، اب افغانستان کی وادیوں اور پہاڑیوں سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسے لگا جسے اگر اسے یہاں رہنے کا موقع ملے تو وہ کبھی واپس افغانستان جانے کی خواہش نہیں کرے گا۔

جب وہ قدرے ہوش میں آیا تو اسے محسوس ہوا کہ ایک شگفتہ گلاب کی طرح سنہری اس کے قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

کیسی ہو، شیر علی نے اپنی بھاری آواز میں پوچھا۔

جہاں آپ جیسا شیر محافظ ہو وہاں میری طرح کی ایک عورت کو کس بات کی فکر ہوگی۔ سنہری نے جواب دیا اور پھر پوچھا آپ مجرے میں چپ چپ کیوں رہتے ہیں۔ وہ مسکرائی، کیا آپ کے دل پر کچھ نہیں ہوتا۔ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں۔

شیر علی نے آہستہ اور نرمی سے کہا، تمہارے اوپر تعریف کے پھول برسانے والے اتنے سارے لوگ ہوتے ہیں۔ میرا کیا۔

سنہری سیدھی، بخت لائق کی طرح کھڑی ہو گئی۔

لیکن خان صاحب، آپ کی صرف ایک مسکراہٹ میرے دل کی کلی کو لمحے میں پھول بنا سکتی ہے۔ مجھے بتایئے۔ آپ کو میں اچھی نہیں لگتی۔

شیر علی کے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا اپنے حواس پر قابو ہی نہیں رہ گیا۔ برسوں کی پیاس مٹی پر گرا بارش کا قطرہ اسے بارود بنا دیا گیا ہے۔ شیر علی نہ جانے کتنی گہرائی سے جاگ اٹھا تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ کیا کہے۔ کیسے کہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ مشکل حالات میں وہ بآسانی کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا تھا کہ وہ کیا کہے۔ کیسے کہے۔ کوڑے لیے کھڑے انگریز افسروں سے وہ بغیر کسی وقت کے مناسب ترین گفتگو کرلیا کرتا تھا۔ خطروں سے بھرے لمحے اسے معمولی لگتے تھے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی قوت شیر علی کے حواس کی جڑ تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ لیکن یہ ذحیث عورت پچھاوڑ رہی تھی۔

جب شیر علی کو کچھ نہیں سوجھا تو اس نے سیدھے طور پر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

تم خوبصورت ہو۔

واہ، سنہری ایک ٹانگ پر رقص کرگئی، اور پھر سامنے آگئی۔ اس کا چہرہ سورج کی طرح کھل اٹھا۔ میں خوبصورت ہوں، اس نے تصدیق کے نام پر دوبارہ تعریف کی فرمائش کی نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ شیر علی کے اس جملہ پر وہ بجھ گئی۔

آپ کو کیا نہیں معلوم۔

تم اچھی ہو۔ بہت خوبصورت ہو۔ لیکن مجھے تمہاری تعریف کرنی چاہیے یا نہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ میری شخصیت تم سے عاشقی کی باتیں کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

عاشقی آپ نہیں کر رہے ہیں خان صاحب۔ میں کر رہی ہوں۔ لیکن میں آپ کو حقیقت بتاتی ہوں۔ میں اپنے دل سے آپ کی عزت کرتی ہوں۔ یہاں ان جزیروں میں صرف ایک مرد ہے اور وہ آپ ہیں۔ ان سارے اجلوں اور کالوں میں۔ اس نے اپنی انگلی سے چاروں طرف سے ایک دائرہ بناتے ہوئے کہا۔

کچھ دور چند قیدی بغل کی سڑک سے نمودار ہو کر محافظ دستے کی نگرانی میں آ رہے تھے۔

آداب، سنہری نے شیر علی کو مخاطب کیا ایسے آہستہ سے آگے بڑھ گئی جیسے خان کے پاس رکنا محض ایک اتفاقیہ لمحہ تھا۔ جب سنہری جا رہی تھی تو خان اسے مسلسل پیچھے سے دیکھتا رہا۔ اور پھر اس کے آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد خواتین کے بیرک کی طرف مڑ گیا جہاں کام ہو رہا تھا۔ اس رات وہ سو نہیں سکا۔ اس کے لیے جزائر انڈمان کی پوری تصویر بدل چکی تھی۔ یہ جزیرے میٹھے پانی کی کمی اور جاں کش فضا کے باوجود اب بے حد خوبصورت لگنے لگے تھے۔

رفتہ رفتہ شیر علی نے ان جذباتی جھٹکوں پر قابو پالیا جو سنہری سے گفتگو کے بعد اس کے اندر پیدا ہونے لگے تھے لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود سنہری کے اثر کو اپنے اندر سے نہیں نکال پایا وہ بار بار سوچتا رہا کہ یہ محض ایک عورت کے اس کے اندر دلچسپی لینے کا اثر تھا۔ وہ خود اس کے اندر کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اپنے کو بار بار ایک بات سمجھائی لیکن یہ بات اس کے اندرون میں داخل نہیں ہو پا رہی تھی اور سنہری کا اثر اس کے اندر اٹک سا گیا تھا۔ وہ اسے بار بار یاد آتی رہی۔ کچھ ایسا ہو گیا تھا جیسے سنہری نے اس کی یادوں میں ایک طاق سا بنا لیا ہو۔ بالآخر اس نے اسے اسی طرح وہیں چھوڑ دیا۔ لیکن یہ طاق خالی نہیں تھا اس میں کچھ روشنی تھی اور وہ روشنی بار بار بجھ کتے ہوئے بڑھتی جا رہی تھی۔

چند روز بعد وہ اچانک اپنے ایک دوست سے پوچھ بیٹھا۔

"یہ بتاؤ کہ عشق کیا ہوتا ہے؟"

"آں؟"

دوست کو اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ وہ ایسا جملہ خان سے سن رہا تھا۔ وہ

پوری طرح متوجہ ہو کر گہری دلچسپی کے ساتھ اور تجسس کے عالم میں اٹھ بیٹھا اور خان کو دیکھنے لگا پھر کافی دیر تک دونوں اس موضوع پر بات کرتے رہے اور عشق کے معنی کی گہرائیوں میں جا کر اسے ٹھیک سے سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے۔ بالآخر انہوں نے یہی نتیجہ نکال لیا کہ کوئی عشق کی تعریف بیان نہیں کر سکتا کہ اس کی کئی سطحیں ہیں کئی سائے اور کئی رنگ ہوتے ہیں اور یہ مکمل ہوش و حواس میں آنے سے لے کر مکمل طور پر دیوانہ ہو جانے تک ہر طرح پھیل سکتا ہے۔

''تو یہ بہت خطرناک ہے۔'' شیر علی نے سوچا۔ وجہ بہت سادہ سی تھی کہ اسے کچھ ہو رہا تھا یہ بھی عشق ہی کی کوئی شکل ہو سکتی تھی کہ انہوں نے جو چند تعریفیں نکالی تھیں وہ اچھی خاصی پریشان کن تھیں۔

''یہ ایک ایسی واردات ہے کہ جب یہ شروع ہو جاتی ہے تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔''

''اس کا کوئی علاج نہیں۔''

''یہ کسی کو بھی ہو سکتا ہے چاہے وہ شخص اسے پسند کرے یا نہ کرے۔''

''یہ ایک ایسی بیماری ہے جو آدمی کو اندر سے اس طرح پگھلا دیتی ہے جیسے موم باہر کی آگ سے پگھل جاتا ہے۔''

''تم اس سے جتنا ہی زیادہ لڑو گے، کتنی ہی زیادہ کوشش کرو گے اور جتنا اچھل کود کرو گے یہ سب اس کے ارتقاء میں ورزش کا کام کریں گے۔''

شیر علی پریشان ہونے لگا۔ سنہری ایک رقاصہ تھی۔ ایک ایسی عورت جو بہت سے مردوں کی خدمت کرتی رہی تھی۔ ان کے ذریعے استعمال ہوئی تھی۔ ہر ادا ہر صورت اور ہر انداز میں اور اپنی مرضی اور شرکت سے ہوئی تھی۔ حالانکہ، اس نے سوچا اس کی مرضی کوئی

متبادل نہیں ہونے کی بنیاد پر بھی ممکن ہے ہوئی ہو اور ممکن ہے زبردستی شرکت پر مجبور کیا گیا ہو۔ پھر بھی کیا اس کے پاس اب کچھ بچا تھا کچھ ایسا جو پراگندہ نہیں ہو چکا ہو۔ اس کا پورا بدن اس کے اندرونی اعضاء اس کے سر سے اور دھڑ سے پاؤں تک، اس کے پورے ذہن پر ان غلیظ الفاظ سے بمباری ہوئی ہوگی جو برساتا گوروں نے تلذذ آمیز محسوس کیا ہوگا اور اس نے وہ سب کچھ اپنے کانوں سے سنا ہوگا اور اس کی آنکھوں نے نہ جانے کتنے بھانت بھانت کے مردوں کا سب کچھ دیکھا ہوگا۔ کچھ نہیں کچھ نہیں۔ اس کے یہاں کچھ بھی باقی نہیں۔ اس کی سوچ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی کہ اچانک اس کے اندر ایک دھماکہ سا ہوا۔

سنہری کا دل

تھوڑی دیر بعد شیر علی کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ ایسے ذہنی عالم میں ہے جو اس آدمی کی ہو سکتی جس کے بہت قریب کسی بم کا زوردار دھماکہ ہوا ہو اور اس کا سب کچھ ٹوٹ کر چیتھڑوں میں بٹ گیا ہو لیکن وہ پھر بھی زندہ ہو۔ اب اسے علم ہوا کہ یہ جو اس کا چیتھڑا ہوا تھا یہ ناقابل مرمت تھا۔

اس موضوع پر شیر علی کو اپنے دوست کے ساتھ تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ شیر علی ایک سوچنے والی مخلوق تھا۔

اس نے دوبارہ ان ساری باتوں کو بھول جانے کی کوشش کی لیکن پھر ایک دن اس نے محسوس کیا کہ اسے سنہری سے ملنا چاہیے۔ اس کا چہرہ دیکھنا چاہیے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ آخر ان جزیروں میں کون اس سے ملنے آتا تھا۔

لیکن جب اس بارے میں اس کے گھر والوں کو اور رشتے داروں کو معلوم ہوگا تو کیا ہوگا۔ وہ سوچنے لگا اگر وہ اپنے اچھے ریکارڈ کی بنیاد پر بھی بالآخر چھوٹ بھی گیا اور اپنے

وطن واپس گیا تو وہ وہاں جا کر یہ اعلان کرنے کی جرأت رکھتا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے؟ کیونکہ یہ اس کا عمل تھا۔ وہ اعلان کر دے گا کہ اس نے اس عورت سے شادی کی ہے۔ اس سنہری سے نہیں، سنہری کے اس بدن سے نہیں بلکہ اس عورت سے جس کا نام سنہری ہے۔ وہ پورے قبیلے کے سامنے یہ اعلان کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ یا پھر وہ سنہری کے ساتھ جنگلوں میں چلا جائے گا اور وہاں اس کے ساتھ تنہائی میں رہے گا لیکن وہ اس بات کو چھپائے گا نہیں۔ شیر علی کے چاروں طرف ایک طوفان سا سنسنانے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دنیا میں جو چاہے کر سکتا ہے لیکن اگر نہیں کر سکتا تو صرف یہ کہ وہ سنہری کو بھول نہیں سکتا۔

اس نے اپنے تصور میں سنہری کے جسم کو زمین کے پاک ترین پانی سے مکمل طور پر دھو کر صاف کر لیا ہے اور پھر اسے قبول کر لیا۔

اس لمحے کے بعد اس کے اندر تنہائی کا احساس بہت گہرائی سے ستانے لگا۔ اپنے دوستوں سے اس کے بارے میں بتانا بہت مشکل کام تھا۔ اس نے کم از کم وقتی طور پر اس بات کو صیغۂ راز میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ اسے محسوس ہوا کہ چوری چھپے کرنے کا فن وہ پہلی بار سیکھ رہا ہے لیکن اسے ان گہری باتوں سے مالا مال ہونے کا احساس بھی ہوا۔ وہ بہت گہرا انسان بنتا جا رہا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ تبدیل ہو رہا تھا۔ وہ جو ایک انتہائی صاف گو آدمی تھا اب پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

کیا وہ سنہری کو بتا دے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

نہیں اگر وہ سنہری کو بتائے گا تو سنہری یہ سوچے گی کہ وہ ایک ایسا معمولی انسان ہے جو ایک عورت کے چند لٹکو جھٹکوں کے اثر میں آسانی سے گرفتار ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی معمولی خمیر کا مرد نہیں تھا وہ انتظار کرے گا۔

اب جب سنہری اس کے تصور میں آئی تو اس کا پورا وجود پاک صاف، خوبصورت

اور خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی مہک کو اس لمحے میں اپنی ناک سے اندر آتی سانسوں میں اور اپنے اندر پھیلتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے تصور کیا کہ اگر وہ سنہری کو اپنے آغوش میں لے لے اور اس کے گھنے لمبے بال اس کے چہرے کے نیچے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوں اور وہ تازہ دکھ رہی ہو، کبھی کبھی اس کی محبت آمیز نظروں کو دیکھ کر مسکرائی ہوتی تو اسے کیسا لگے گا۔

اس کی سانس بھاری ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے سنہری کے بارے میں سوچنا بند کر دیا دن میں وہ اس جانب نکل گیا جہاں سنہری آیا کرتی تھی اور اس سے بات کرنے کے لیے وہ لگاتار گھنٹوں تک انتظار کرتا رہا۔ آخر سنہری جیل کے پیچھے کسی کام سے آتی ہوئی دکھائی پڑی۔

کیا وہ اس کے پاس جائے اور اس سے ملے؟

وہ جانا چاہتا تھا۔

یا نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پایا۔ وہ تذبذب میں پھنسا رہا۔ سنہری اب واپس جانے لگی تھی۔

آخرکار وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

"سلام خان صاحب۔"

سنہری نے اسے دیکھ کر کیا لیکن رکی نہیں۔ صرف اس کی رفتار کم ہونے لگی جیسے وہ چاہتی ہو کہ خان اسے خود رکنے کے لیے کہے۔ اچانک اس نے فیصلہ کر لیا اور ایک شیر کی طرح اس کے سامنے آ گیا اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک شیر کی طرح اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔

چادر پر لیٹے لیٹے اسے خیال آیا کہ وہ سنہری سے شادی کر لے۔ لیکن وہ ایک رقاصہ تھی۔ وہ اسے اپنی بیوی بنانے کے بعد محفل میں اس رح کا رقص کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا تھا۔ اور وہ جیلر کے بنگلے کے اس بدنام رقص میں کیسے جا سکتی تھی جس کے بارے میں سب جانتے تھے کہ رقاصائیں رقص کی محفلیں ختم ہونے کے بعد فوراً نہیں لوٹیں بلکہ صبح تک وہیں رکھی جاتیں۔

سنہری کی طبیعت آج بہت بری بری سی تھی۔ اس نے آج اس مرد سے بات کی تھی جس کو دیکھ کر اس کا دل جاگتا تھا۔ وہ ان تمام افسروں سے زیادہ مردانہ قید رکھتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے سوچا، یہ سفید چمڑی والے افسر جو رعایا پر اتنی رعب دکھاتے تھے اور شاہانہ چال چلتے تھے وہ کیسے رات میں کتوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے تھے۔

جب سے سنہری نے خان سے گفتگو کی تھی، سنہری کو کچھ ہو گیا تھا۔ اس کے ہنستے بولتے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے فحش گانے گانا بند کر دیا تھا اور زیادہ خوش مزاج گانے گانے لگی تھی اور کبھی کبھی اس میں بھجن بھی گانے لگی تھی۔ رات کے پروگراموں میں وہ انگریز افسروں کے ہر اشارے پر عمل کیا کرتی تھی۔ وہ شراب کی بوتلیں ہاتھ میں لئے اسے کبھی گود میں کھینچ لیتے، کبھی اس سے شراب کے گلاس بنا کر خود پیش کرنے کا حکم دیتے، کبھی گلاس منہ میں لگانے سے پہلے اس کے ہیپتانوی کا بوسہ لیتے، اور وہ یہ سب کچھ پیشہ ورانہ ڈھنگ سے کرتی چلی آئی تھی۔ ایک خاص بے باک انداز میں اس کی مسکراہٹ میں کبھی تصنع کی جھلک تک نہیں آتی تھی لیکن اس مہارت کے بعد اچانک اس کے اندر ایسی تبدیلی آئی جیسے وہ خود بھی چاہتے ہوئے نہیں روک سکی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اس قابل رہی ہی نہیں کہ اس کے سامعین جو چاہتے تھے وہ انہیں دے سکے۔ انگریز افسروں نے یہ سمجھا کہ شاید وہ ذہنی طور پر بیمار ہو گئی ہے۔ کچھ شامیں اس طرح گزر گئیں۔

پھر اس کی طرف سے اس طرح کی بے پروائی دیکھ کر انہوں نے اپنی مدد آپ کرنے کی سوچی۔ وہ اسے پکڑ لیتے۔ اس سے بوس و کنار کرنے لگتے اور وہ ایک گوشہ پوست

کے خوبصورت نیلے کی طرح گر جاتی، اور تیز شمعوں کی روشنی میں اس کا جسم جگمگاتا۔ اس کی چھوٹی دوست مایا بھی اس کے اندر یہ تبدیلی دیکھ کر متفکر تھی۔ اب انگریز افسر مایا کو زیادہ توجہ دینے لگے تھے جو اب رفتہ رفتہ سنہری کی جگہ لیتی جا رہی تھی۔ اپنے دل ہی دل میں وہ خوش بھی ہو رہی تھی کہ اب اسے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور وہ سنہری کے مقابلے میں دوئم درجہ کی نہیں سمجھی جا رہی تھی۔

رات کا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دوسروں سے الگ شیر علی اپنے خیمہ میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ خیمہ کے اندر ایک کونے سے چاندنی روشنی گر رہی تھی۔ رات کی خاموشی میں بہتی ہوئی ہوا ایک خاص طرح کی جادوئی ترنم گھول رہی تھی جو ارد گرد کی پہاڑیوں پر اور سمندر پر چھائی ہوئی تھی۔ سمندر کی چمکتی لہریں سرگوشیوں جیسی آوازیں پیدا کر رہی تھیں جو سائے کی وجہ سے اس خیمہ تک صاف سنائی دے جاتی تھیں۔ سمندر کی لہروں کی آواز جیسے قدرت وفطرت کی عظمت کی گواہی دے رہی تھیں اور وہ بتا رہی تھیں کہ وہ عظیم تر ہیں۔ چاروں طرف، ہر جانب، سوائے انسان کی روح سے جو کسی بھی بلندی پر پہنچ سکتی تھی اور ایسے کام کر سکتی تھی جو سمندروں کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔

سنہری ایک دوسرے کونے سے احاطہ میں داخل ہوئی۔ لہنگا اور چولی پہنے سنہری گلے، بازو اور پاؤں میں گہنے پہنے ہوئے وہ چوروں کی طرح رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی شیر علی کے خیمہ کے پاس آئی۔ وہ دھیرے دھیرے خموشی سے آ رہی تھی لیکن دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ دوسرے کونے میں کھڑے گارڈ نے ادھر آتے دیکھا لیکن وہاں سے وہ محض ایک سائے کی طرح دکھ رہی تھی۔ اس نے سنہری کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ خیمہ کے قریب اندر سر بڑھا کر دیکھا۔ خان کا چہرہ چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کا پورا جسم دکھنے لگا۔ اس کی سانس کی آواز سنہری کو سمندر کی لہروں کی آواز سے بھی زیادہ طاقتور محسوس ہو رہی تھی۔ سنہری خان کو غور سے دیکھنے لگی۔ خان کسی شہزادے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ دور تک دائیں کو پھیلا ہوا تھا

اور دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر تھا۔ وہ اتنی بے فکری سے سویا ہوا تھا اور اتنے اطمینان کی سانس لے رہا تھا کہ سنہری کو اپنے اندر ایک تحفظ کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا وہ صحیح تھی۔ یہی وہ مرد تھا جس کی اس نے بچپن سے تمنا کی تھی۔ وہ بنگال کے ایک زمیندار خاندان کی لڑکی تھی۔ اس خاندان میں گیارہ برس کی عمر تک اس کی پرورش ہوئی تھی لیکن اچانک ایک رات اس کے گھر پر ڈکیتی پڑی وہ بھی اغوا ہوگئی۔ اس کے خاندان کے سارے افراد اس کے سامنے مارے گئے تھے اور چند لمحوں میں اس کی پوری دنیا بدل گئی تھی۔ وہ ایک کونے میں چھپی ہوئی تھی لیکن ڈاکوؤں نے اسے کھوج نکالا۔ ایک مضبوط موٹا، ہٹا کٹا ڈاکو اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے فوراً ایک اجنبی جگہ پر لے جایا گیا۔ وہاں ایک خوبصورت کمرہ تھا جہاں اس کو کئی دنوں تک رکھا گیا اور اس کو گہری مایوسی سے نکالنے کے لیے اسے ایک ڈاکٹر دوا بھی دیتا رہا۔ پھر ایک دن اس کے کمرے میں ایک آدمی آیا۔ وہ سفید پتلا اور لمبا تھا وہ اس رات اس کے ساتھ سویا۔ اس کے جسم کو بے دردی سے لوٹتا رہا اور اسے انگریزی میں گالیاں دیتا رہا۔ چند روز کے بعد اس نے آنا بند کردیا۔

اب اسے ایک کوٹھے پر بیچ دیا گیا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اس پر خاص توجہ دی گئی۔ اس کو تربیت کے لیے ایک ایسی طوائف کے ذمہ لگایا گیا جس کا مادری خاندان کئی پشتوں سے طوائف تھا۔ اس طوائف نے بے حد توجہ اور لگن سے اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے اس کی تربیت کچھ اس طرح کی کہ وہ ایک ایسی ماہر رقاصہ بن گئی جو ناچتے وقت محفل میں بیٹھے لوگوں کے دل و دماغ پر حکومت کرتی تھی۔ لیکن اس کی بچپن کی یادیں اکثر اس صورتحال کے مدمقابل آکھڑی ہوتی تھیں اور پریشان کردیتی تھیں۔ ایک دن ایک گراہک نے جو ایک بڑا تاجر تھا اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ جانے کے لیے کہا۔ ہاتھ پکڑ کر اس طرح کھینچا جانا اسے اچھا نہیں لگا اور اس نے انکار کردیا۔ گراہک نے اپنی پستول نکال کر اس پر گولی چلائی۔ سنہری کا خون اصل رنگ دکھا گیا۔ اس نے بے خوفی سے گراہک کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں نظریں گڑا دیں۔ گراہک اس کی آنکھوں کے جادو میں پھنس گیا اور اس سے پیار کی باتیں کرنے لگا لیکن سنہری کے دماغ میں کچھ اور ہی تھا۔ اس نے چالاکی سے پستول

چھین لیا اور چستی سے ٹھیک گراہک کے سینے میں اس کے دل کے سامنے گولی ماری۔ گراہک مرگیا۔ کوٹھے کی مالکن تھانے کو اپنی طرف کرنے میں مہارت رکھتی تھی لیکن اس معاملے میں وہ ناکام ہوگئی۔ سنہری پر مقدمہ چلا اور اسے کالا پانی کی سزا ہوگئی۔

اس طرح وہ آج یہاں تھی۔

وہ کچھ دیر تک خان کو دیکھتی رہی۔ وہ کبھی اپنے دونوں ہاتھ اکٹھا کرتی، کبھی کھلا چھوڑ دیتی۔ دراصل وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی اور اچانک جیسے اس نے کچھ فیصلہ کرلیا۔ وہ خان کے قریب گئی۔ خان کے ان پیروں کو بوسہ دیا جو پتھر کی اینٹوں کی سخت مضبوط تھے۔ خان کی نیند نہیں ٹوٹی۔ پھر اس نے اپنی ہتھیلی سے اس کے بازو پر رکھ دی۔ پھر کندھوں پر رکھا۔ پھر اس نے اپنا سر اس کے پھیلے ہوئے بازو پر رکھا اور اس کے برابر پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔ اس کی نظریں خیمہ کی چھت پر پھیلتی رہیں۔ وہ یوں ہی خاموش پڑی رہی اور اس کا سر خان کی سانسوں کے ساتھ ہلکے ہلکے ہلتے ہوئے بازو پر اونچا نیچا ہوتا رہا۔ اچانک خان کے جسم میں جھرجھری سی ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنا سر داہنے طرف موڑا اور جو کچھ نظر آیا اسے دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں اسے اس سر کو اپنے سے دور کرنے کا جی نہیں چاہا۔ وہ سمجھ چکا تھا، وہ اس احساس تحفظ کو بھی محسوس کررہا تھا جس کے تحت وہ عورت اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ کچھ نہیں بولا۔ سنہری نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ایک ضدی بچے کی طرح اس نے پھر سر نہیں اٹھایا۔ خان نے اسے دوبارہ دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر وہ اپنا بایاں ہاتھ اس طرف لایا۔ سنہری کی طرف کروٹ لی اور اپنا بازو اس کے گرد ڈال دیا۔ سنہری اچانک پوری طرح خان کے بازوؤں میں چلی گئی۔ خان نے اپنی پوری قوت سے اسے پکڑ کر اپنے بازوؤں میں رکھا۔ اس کے بعد وہ بولا۔

'اب تم کو وہ مل گیا جو تم چاہتی تھیں۔ اب جاؤ'

'میں نہیں جاؤں گی'

'کیوں'

میں نے فیصلہ کرلیا ہے میں تم سے بیاہ کروں گی'

خان اس کو دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

آگے دیکھ لیں گے۔ ابھی تم جاؤ۔

سنہری نے کچھ نہیں کہا لیکن اس نے خان کے بائیں بازو کی ہتھیلی کو سختی سے پکڑ لیا اور اسے اپنے سینے پر لانے کی کوشش کرنے لگی۔ خان نے اس کا ہاتھ روکا اور اسے پیچھے کر دیا۔

سنہری تم جاؤ، میں کہہ نہیں سکتا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں،

سنہری نے دوبارہ اس کے قریب ہونے کی کوشش کی۔

ایسا مت کرو، اگر میں تم کو قبول کروں گا، تو قبول کروں گا، اگر نہیں، تو نہیں، وہ کافی دیر تک خیمہ میں ساتھ رہے۔ پھر دونوں باہر نکلے اور خان نے سنہری کو الوداع کہا۔

اس دن کے بعد سنہری مکمل طور پر بدل گئی۔ اس نے رقص کرنا بند کر دیا اور صرف گانے تک محدود ہوگئی۔ مومن کی اردو غزل سیکھنے لگی اور اسے اتنی خوش الحانی سے گایا کہ لو اس کے فحش گانوں کو بھول گئے۔

اس کے چند ہی روز بعد اسے جیلر کے بنگلے میں بلایا گیا۔

ایک افسر نے اس کے پستانوں کے اوپر سے کپڑا ہٹانے کی کوشش کی۔ اس نے روکا۔

'تم ہتم نے روکنے کی ہمت کی، افسر چلایا۔

کیا ہوا، دوسرے افسر نے پوچھا۔

کچھ نہیں۔ یہ گر گئی ہے۔

کیا، یہ گر گئی ہے۔ یہ گر گئی ہے۔ تم نہیں جانتے۔ کسی کو نہیں معلوم لیکن مجھے معلوم ہے، اسے پیار ہو گیا ہے۔ اس نے سنہری کو زور سے دھکا دیا۔ اس نے اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ افسر نے اپنا ریوالور نکالا اور گولی چلا دی۔ گولی ٹھیک سنہری کے پیٹ میں لگی۔ وہ گر گئی۔ فرش پر بہت سارا خون بہا۔

'خان، اے خان، تم کہاں ہو۔ دیکھو۔ انہوں نے میرے ساتھ کیا کر دیا، اس کی لاش کو خاموشی کے ساتھ غائب کر دیا گیا۔ مایا نے خان سے یہ پورا منظر بیان کیا۔

خان صرف افسوس کر کے رہ گیا۔

جس افسر نے سنہری کو مارا تھا وہ براہ راست خان کا افسر بالا تھا۔

دوسرے دن خاں سمندر کے کنارے گیا۔ وہ جانتا تھا کہ انہوں نے سنہری کی لاش کہاں پھینکی ہوگی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو سمندری لہروں نے سنہری کی لاش کو کنارے پھینک دیا تھا جہاں وہ ایک سوکھے گرے ہوئے پیڑ میں پھنسی ایک چٹان پر ٹکی ہوئی تھی اور سمندری لہریں کبھی اس کے اوپر آجاتی اور کبھی اسے اوپر چھوڑ کر نیچے چلی جاتیں۔ وہ سنہری کے قریب گیا۔ اس کی لاش کو اپنے بازوؤں میں لیا، بے انتہا روتا رہا اور اللہ سے اس کی روح کے سکون کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔

اس کے اندر کسی بھی طرح کے غصے کا انتقام، خسارہ کا جذبہ نہیں تھا۔ یہ سب تقدیر میں تھا۔

لہریں سنہری کے قدموں کو پانی مارتی رہیں۔ اس نے غصے سے سمندر کو دیکھا۔

قیدی اب اپنی قسمت سے مصالحت کرنے لگے تھے۔ ملک، عوام افراد بھی اپنے طور پر اپنی نشوونما چاہتے ہیں۔ یہ کائنات کی گوناگوں سمتوں سے ابھری ہوئی زندگی کی آواز ہوتی ہے۔ زندگی کسی شے کو اپنے سے برتر تسلیم نہیں کرتی۔ انسانوں کی آوازیں اسی زندگی کی بنیادی رویہ کا اظہار ہوتی ہیں۔۔۔ لیکن دراصل یہ زندگی تھی جو اس صورتحال میں اپنی کسی نہ کسی شکل میں ابھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ قیدیوں کو معلوم تھا کہ ان کی تقدیر پر مہر لگ چکی ہے اور وہ اب اپنے بے رحم خونخوار مالکوں کے غلام کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ ان کی خدمات کو دوسرے قیدیوں کو قید و بند میں رکھنے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ انہی کے ذریعہ ان جیسے دوسرے قیدیوں کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈلوائی جاتی تھیں۔ ان کو اذیت دلوائی جاتی تھی۔ دوسروں سے زبردستی کام کرایا جاتا تھا۔ ان کے لیے جیل بنوائے جاتے تھے۔ عورتوں سے جنسی خدمات لی جاتی تھی اور ایسا نہ کرنے پر ان کے خلاف جھوٹی رپورٹ لی جاتی تھی تا کہ ان کی سزا کو بڑھا کر اسے سزائے موت میں تبدیل کر دیا جائے۔ ایسی ایک حسین و جمیل خاتون کو جو کسی بہت اچھے گھرانے کی تھی یہاں لایا گیا تھا۔ اس کو پہلے سزائے موت سنائی گئی۔ پھر اسے جیلر کے بنگلے میں بلایا گیا۔ وہاں کے افسروں نے رات بھر اسے کوچا، کھسوٹا اور صبح کے وقت اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا۔ یہاں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی اپنا کام پورا نہ کرنے کے پاداش میں پیٹا جاتا تھا۔ ان کی صورتحال جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ کوئی اس موضوع پر گفتگو نہیں کرتا تھا کیونکہ یہ خاموش دہشت پوری طرح یہاں کارفرما تھی۔

جن قیدیوں کو ترقی دے کر زنجیروں سے آزاد کیا جاتا تھا وہ رات میں آزاد

رہتے تھے۔ اور وہ کنٹیلے تاروں کے گھیرے کے اندر گھوم پھر سکتے تھے۔ رات میں وہ ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔ اس بڑے گھیرے کے اندر بڑے بڑے میدان تھے۔ درخت تھے اور چھوٹے موٹے ٹیلے تھے۔ اس کے باہر اس سے منسلک عورت قیدیوں کا بیرک تھا۔ ایک دن اس طرف سے گھیرے کے تار کچھ ٹوٹ گئے۔ لیکن اسے کبھی مرمت نہیں کیا گیا۔ اب قیدی کبھی بھی آسانی سے اس طرح جا سکتے تھے، وہاں جا کر وہ آسانی سے کسی عورت سے ملتے۔ کسی درخت کے نیچے بیٹھتے یا سو لیتے۔ رات گہری ہوتے ہی اگر وہاں کی تمام عورتیں وہاں آ جاتیں، گھنٹہ بجنے کے بعد وہاں چوکیدار آتا۔ اس سے پہلے سب واپس چلے جاتے۔ اس آنکھ مچولی میں جب کچھ عورتیں حاملہ ہوتیں تو ان کی ان قیدیوں سے شادی کر دی جاتی جو زنجیروں سے آزاد ہو چکے تھے۔ رفتہ رفتہ قیدیوں میں جنسی بیماریاں پھیلنے لگیں کیونکہ کچھ عورتیں جو یہاں لائی گئی تھیں وہ کوٹھوں پر دھندہ کرنے کے دوران ان بیماریوں کے جراثیم اپنے اندر پال چکی تھیں۔ ڈاکٹر اس کے لیے پہلے سے تیار نہیں تھا، اس کے پاس ان بیماریوں کی دوائیں بھی نہیں تھیں۔ نتیجتاً ڈاکٹر ایسے مریضوں کو گندی گندی گالیاں دیتا اور ان کو آرام کی ڈیوٹی دینے سے انکار کر دیتا۔ قیدیوں کو ڈاکٹر کے اس رویہ سے سخت صدمہ ہوا۔

محبت، جنس اور جنسی بیماریاں جیسے بھوکے پیاسے کو زہر ملا ہوا کھانا کھلایا جا رہا ہو۔ ڈاکٹر واکر کو معلوم تھا کہ کون سی عورتیں بیمار ہیں لیکن قیدیوں کو نہ معلوم تھا نہ وہ جاننا چاہتے تھے۔

ایک دن ڈاکٹر وہاں کے سپرنٹنڈنٹ سے ملنے آیا اور بالکل تخلیہ میں اس سے بتایا کہ جانچ کے دوران پایا گیا ہے کہ جنسی بیماریوں کے علاوہ تین انگریز سپاہیوں کو تپ دق ہے۔ یہ بات ہلچل مچانے والی تھی۔ بہت تشویشناک تھی۔ فوراً یہ پیغام کلکتہ بھیجا گیا کہ وہاں سے ایک جہاز ان مریضوں کو لے جانے کے لیے بھیجا جائے۔ پتہ نہیں کیسے ان مریضوں کے بارے میں یہ خبر کیسے دوسرے انگریز سپاہیوں اور افسروں تک پہنچ گئی۔ سب کے اندر ایک

خاموش خوف طاری ہو گیا۔

جو رپورٹ پورٹ بلیئر سے کلکتہ آئی تھی اسے ہائی کمان کے سامنے رکھا گیا۔ اور آگے بڑھ کر یہ رپورٹ وائسرائے لارڈ میو کی میز تک پہنچ گئی۔ سفارش میں یہ بات لکھی گئی تھی کہ فوراً انگلینڈ سے دوائیں منگائی جائیں۔ لارڈ میو کی سوچتی ہوئی نگاہیں ان کے طویل و عریض آفس کی دیواروں تک پہنچ گئیں اور پھر باہر گردش کرنے لگیں۔ اس کے دماغ میں چند سوالات ابھرے جن میں یہ سوال بہت اہم تھا کہ اگر یہ خبر انگریزی فوج میں پھیل گئی تو کوئی وہاں جانا پسند نہیں کرے گا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں جم گیا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تب اس نے دواؤں کی مانگ کو قبول کرتے ہوئے نیچے ایک نوٹ لکھا۔

''قیدیوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو ہماری ضمیر کی ذمہ داری ہے، سرکار کو انڈمان نکوبار میں ایک اسپتال اور ایک سینی ٹوریم بنانا چاہئے۔ اس کے لیے جگہ کا انتخاب کیا جائے اور میں خود اس کو حتمی شکل دینے کے لیے انڈمان نکوبار جانا چاہوں گا تاکہ قیدیوں کا حوصلہ بلند رہے۔ میرے اس حکم کی ترسیل فوراً مجرم آبادی اور اس کے حکام تک کی جائے اور قیدیوں کو خاص طور سے اس کے بارے میں اطلاع دی جائے۔

اس پیغام کو انڈمان بھیج دیا گیا ہے۔ تمام یہ خبر پھیل گئی کہ قیدیوں کے فلاح و بہبود کے لیے وائسرائے ...... انڈیا لارڈ میو بہ نفس نفیس اسپتال کے لیے مناسب مقام کا انتخاب کرنے آئیں گے۔

انگریز مریضوں کا وارڈ الگ تھا۔ وہاں ایک سپاہی جو تپ دق کا مریض تھا۔ اب قریب از مرگ تھا۔ اس نے اپنے پڑوس بیڈ پر پڑے دوسرے انگریز افسر سے کہا مریض

سپاہی ہم یہاں کیوں ہیں، یہ کس لیے، دوسرا مریض خود ہی دن رات سوچتا رہتا تھا۔ پلٹ کر بولا، اس لیے کہ کمپنی بہادر کی یہ مرضی ہے۔ کمپنی بہادر نے برطانوی تاجروں کا ایک بڑا سرمایہ زمین کے اس حصے میں لگا رکھا ہے اور اس علاقے کے تحفظ کے لیے ان جزیروں کو اڈہ بنائے رکھنا ضروری ہے۔ کمپنی بہادر نے یہاں کامیابی تجارت قائم کر رکھی ہے۔ یہاں سے اس کو بے تحاشا منافع ہو رہا ہے۔ انگلینڈ جیسے چھوٹے سے ٹاپو کے ہاتھوں ہندوستان جیسے ہاتھی مل گئے ہیں جن کا وہ شکار کر چکا ہے اور اب اس کی قیدیوں سے لے کر دانتوں تک ہر چیز کی کٹنی چھنائی جاری ہے۔ اس کمپنی کے شیرز کی قیمت آسمان چھو رہی ہے۔ اس آمدنی نے متوسط طبقے کی مشکل گھریلو زندگی کو شاہانہ ٹھاٹ باٹ عطا کر دی ہے۔ لندن شہر بلندی اور عظمت کی اوپری منازل طے کر رہا ہے۔ پرانے اور نئے محلوں میں عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ وہ بھی سمندروں میں کود پڑی ہیں۔ زبردست مقابلہ آرائی ہے اور کسی بھی وقت یہ مقابلہ آرائی کسی جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

تم کسی ایسی فوج کا حصہ نہیں ہو جو کسی ملک کے لوگوں کی زندگی، دولت اور عزت کی حفاظت کرتی ہو۔ تم یہاں تاجروں کی تجارت اور مفاد کے محافظ ہو۔ ان کے تاجرانہ پروجیکٹ کا حصہ ہو اور تمہاری تنخواہ کمپنی کے منافع میں سے دی جاتی ہے۔ تمہارے عہدے کرنل، جنرل، کمانڈر، سرجنٹ ضروری ہیں۔ لیکن یہ سب لفظوں کا غلط استعمال ہیں۔ یہ فوجیں دراصل تجارتی مفاد کی محافظ دستے ہیں جن کی زندگی تنخواہ اور کرائے پر لی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ تم کو یہ غلط فہمی ہو کہ تم سرکار کا حصہ ہو۔ ملکہ برطانیہ کے افسر ہو۔ اور انہی کی طرح تم افضل ہو، تم کو کوئی تاجر آنکھ نہیں دکھا سکتا۔ تم کو کمپنی کے نوکروں کی طرح ایک جھٹکے سے نکالا نہیں جا سکتا کہ تجارتی تنخواہ کوئی تاجر نہیں مقرر کرتا بلکہ ملکہ برطانیہ کے حکام طے کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب تجارت کے لیے سرکاری مشین کو استعمال کرنے کا ایک چربہ ہے۔ کسی کو بھی گولی مار کر قانون کی پکڑ سے مبرا رہنے کے تمہارے مراعات وہ ہتھیار ہیں جو ٹیکس دینے والے تاجر

اپنی تجارت کی توسیع کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تمہاری زندگی تجارت کی منطق اور فلسفے سے کنٹرول ہوتی ہے۔ سرکار کو چھتری کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ تاجر طبقہ مفاد کے لیے قانون بنائے جاتے ہیں اور اس کی اطلاق سرکار کرتی ہے۔ عوام کے فلاح کا خیال صرف اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ عوام کی خوشنودی، سیاسی تعاون ملتی رہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ دراصل تمہارا مرتبہ ان قیدیوں سے مختلف نہیں ہے۔ یہ قیدی اور ہم سبھی ایک ہی مقصد کے لیے کام کررہے ہیں۔ ان تاجروں کے لیے ورنہ ہم یہاں، اس خوفناک تنہا جگہ پر کیوں ہیں۔ اور یہ قیدی یہاں کیوں ہیں، اور کیوں سارے جہازوں کو ان سمندروں میں بھیج دیا گیا ہے۔ پوری برطانوی سرکار ہندوستان میں کیا کررہی ہے کہ انگریزوں کا ملک تو نہیں ہے۔ یہ انگریزوں کا وطن تو نہیں ہے۔ پھر انگریز اس ملک کی حفاظت میں اپنی جانیں کیوں گنواتے ہیں۔ یہ حب الوطنی تو نہیں ہے۔ یہ تاجرانہ مفاد کے لیے ہے۔ کوئی بھی انگریز سپاہی جو ہندوستان کی حفاظت میں مارا جاتا ہے۔ شہادت کا مقام نہیں پاتا اور اگر اس کو اس طرح یاد کیا جاتا ہے تو یہ لفظوں کا استحصال ہوتا ہے۔ صرف وطن کے لیے مرنے والے شہید ہوتے ہیں۔ حکومتوں کے لیے مرنے والے، تاجروں کے لیے مرنے والے شہید نہیں ہوتے۔ وہ صرف میدان جنگ میں کام آتے ہیں۔ یہ دراصل سپاہیوں کے جذبہ حب الوطنی کا استحصال ہے۔ یہ سب تجارت ہے اور تجارت کا کوئی دل نہیں ہوتا۔ اس میں جذبات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اس میں محض دماغ ہوتا ہے۔ یہ خودغرض ہوتی ہے۔ یہ صرف خودغرض نہیں ہوتی۔ یہ بے رحم ہوتی ہے۔ وحشی ہوتی ہے۔ خونخوار ہوتی ہے۔ یہ اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتی کہ ملک وہاں کے عوام کے ہوتے ہیں۔ جب ایسے لوگ اقتدار میں آتے ہیں۔ پارلیمنٹ پر ان کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ بیوروکریسی ان کے اختیار میں آجاتی ہے تو عوام کے تئیں سرکار کی صدق دلی ختم ہوجاتی ہے۔ بے رحم منافقت حکومت کرنے لگتی ہے۔ حکومت کی اعلان ہونے والی پالیسیاں بزنس گھروں کے شوروم بن جاتی ہیں اور عوام کو یہ جتایا جاتا ہے کہ پالیسی، ٹیکس، جنگیں سب ان کے فلاح وبہبود کے لیے ہیں لیکن دراصل ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ہندوستان کے راجہ اور

نواب اب انگریزوں کے ہاتھوں کے ہتھیار بن گئے ہیں۔ پرانی سرکاری مشین کے یہ ٹکڑے اب نئی تاجر حکومت کے کل پرزے بن گئے ہیں۔ اس لیے یاد رکھو کہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ سرکار عوام کے ساتھ تاجر کی طرح پیش آتی ہے۔ حاکم ومحکوم کے اس نظام کی جڑ پر یہ تاجر طبقہ اتنی مضبوطی سے حاوی رہتا ہے کہ جو کوئی بھی سربراہ حکومت بن کر آتا ہے وہ اسی جڑ میں لگی دھوری پر چکی کی طرح گھومنے لگتا ہے اور ہر منتخب سرکار اس بات پر مجبور ہوجاتی ہے کہ وہ ان تاجروں کے اشارے پر چلے اور ان کے مفاد میں وہ خود ان لوگوں کو دھوکا دے جنہوں نے اسے منتخب کر کے بھیجا ہے۔ انہیں کمزور تر کرے ان کی آواز کو دبائے اور ان کو اسی طرح گھیر کر رکھے جیسے لوگوں کو یہاں مجرم بستی میں رکھا گیا ہے۔ جمہوریت کو توڑ مروڑ کر ویسا بنایا جاتا ہے جیسا یہ اصلی حاکم چاہتے ہیں۔ جمہوریت میں لوگوں کو اپنے غم وغصہ کا اظہار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ لکھنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے، بولنے کی اجازت ہوتی ہے اور پھر ٹھنڈے ہونے کی اجازت ہوتی ہے لیکن یہ اصلی حاکم عوام کے رویہ پر ایسے نظر رکھتی ہے جیسے چرواہا اپنے مویشیوں پر رکھتا ہے۔ حکومتوں کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ سیاسی پارٹیوں کے مینی فیسٹو محض پلبٹی کا ذریعہ ہوتے ہیں جس کے بنا یوں بھی کوئی الیکشن نہیں لڑسکتا۔ اس طرح اس وسیع نظام میں یہاں ہم سبھی، کیا سپاہی اور کیا قیدی، ایک ہیں۔ ہم سبھی یہاں کے سخت موسم سے پریشان حال ہیں۔ کسی کو ہری سبزی نہیں ملتی۔ سبھی اپنے کنبوں سے دور ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم سپاہی اس سختی کو برداشت کرتے ہیں اور اس سے اکتا کر ان بیچاروں پر اور بھی زیادہ ظلم ڈھاتے ہیں۔ ہم سبھی دراصل درکنار کیے ہوئے لوگ ہیں۔ یہاں کہیں بھی کوئی ایسی سرکار نہیں دکھائی دیتی جو برطانوی آئین کی روح کے مدنظر کام کرتی ہو۔

مجاور بتا رہا تھا' لارڈ میو نے اپنے ایک رازدارانہ خط میں لندن کے ہوم سکریٹری کو لکھا تھا کہ ہندوستان کی زمین عظیم برطانوی سلطنت کا ایک اہم حصہ ہے اور اس ملک میں کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے اس کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ اس زمین پر ایک عظیم تہذیب کا قیام کیسے ممکن ہوگا۔ کہ عظیم تہذیبیں کہاں سے اپنی قوت حاصل کرتی ہیں۔ خصوصاً ایسی عظیم تہذیبیں جو مصر کے پیرامڈ' چین کی دیوار اور ہندوستان کا تاج محل پیدا کرتی ہیں۔ جن مغلوں نے تاج محل بنایا انہوں نے حکومت کو مضبوط بنانے کے لئے خود اپنے سگے رشتہ داروں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ لارڈ میو یہ بھول گیا تھا کہ اسکی حکومت نے تاج محل کو نیلام کردیا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ نپولین نے مصر کے پیرامڈوں کو توڑ کر اس سے ایک قلعہ بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک تاجر ملک کا کارندہ تھا جو خود تاجروں کے دئے گئے خوابوں میں گرفتار تھا۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس طرح انسان ان بڑے پروجیکٹس میں ایندھن بنتے ہیں۔ کس طرح عیسائیت' اسلام اور دوسرے مذہبوں نے ایک ذات کا تسلط دنیا پر قائم کرنے کے لئے دنیا کی ہر ذات اور شخصیت کو مسمار کرنے کا تہیہ کرلیا اور پوری دنیا کے افراد سے آزادی کے ساتھ سوچنے کا حق چھین کر وہ حق اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی۔ اور جن موضوعات پر اپنی رائے دے دی اس پر دوسروں کے سوچنے کا حق ختم کیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ انداز فکر کس طرح دوسروں کے کلچر کو ختم کرتا ہے۔

آج کیا ہو رہا ہے۔

اشتراکیت کیا کر رہی ہے۔ وہی جو فیصلہ ان مذاہب نے کیا۔

اور ہٹلر نے کیا کیا۔

کولون بناتے ہیں یہ لوگ۔

اور عام آدمی کے وجود کو کیسے نیست و نابود کیا جاتا ہے۔

اور اگر وہ زندہ بچ جاتا ہے تو بھی کس طرح وہ اپنے کو شیر علی کی طرح محسوس کرتا ہے۔ لارڈ میو کی سوچ میں یہی خطرناک خامی تھی۔

بڑی قومیں بڑے خواب دیکھتی ہیں۔ اس کے لئے ان کے اوپر الزام لگانا درست نہیں۔ ان کی اصل کمی ان کی کوتاہ اندیشی میں ہوتی ہے۔

ان کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ دنیا میں دائمی امن کے قیام میں دشواری کیسے اور کہاں سے پیدا ہوتی ہے' کہاں یہ طاقتیں غلطی کرتی ہیں جس سے وہ دوسروں کو بھی تباہ کرتی ہیں اور خود بھی تباہ ہوتی ہیں لیکن کس کوتاہ نظری کی وجہ سے وہ بار بار یہی غلطی دہراتی ہیں۔

کہاں ان کے کارندے عام انسانوں کو کمزور سمجھ کر اور ان کی توانائیوں کو نظر انداز کر کے اپنی طاقت کا ایسا بے جا استعمال کرتی ہیں۔

جب اس عمل میں حکومتیں' حاکم اور ان کی پشت پر چلنے والے مافیائے چہرے جب ان بڑے خوابوں کا ناپسندیدہ اور گھناونا ہتھیار بن جاتے ہیں تو اس سے انسانی زندگی کا امن تباہ ہوتا ہے۔

اس طرح عظمت کے متلاشی انسانی محبت کو فنا کرتے ہیں۔ اور اس کی خوبصورتی سے دنیا کو محروم کرتے ہیں۔ یہ گویا انسانیت کشی کا عمل ہوتا ہے۔ کام کرنے کا ایک غلط طریقہ ہوتا ہے۔ اور یہی غلط طریقہ تباہی کی اس عظیم خفیہ طاقت کو دعوت دیتی ہے جو دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور تہذیبوں کو تباہ کرتی آئی ہے اور اسی بات کو عظیم تہذیبیں نہ سمجھ پائیں نہ دیکھ پائیں۔ ان غلطیوں کی طرف خالد نے اپنی کتاب میں واضح اشارے کئے ہیں۔ لارڈ میو کے قتل کے اوپر غور کرتے ہوئے اس نے بڑے لوگوں اور بڑی طاقتوں کی کمزوریوں کی نشاندہی

کی ہے۔ یہ دبائے ہوئے اور بے بس بنائے گئے عام آدمی کی وہی طاقت ہے جس کا اظہار شیر علی نے کیا تھا۔

دنیا میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے اس لاوا کے وجود اور اس کے عمل کو سمجھنا ہوگا۔ اسی سمجھ سے دنیا کو ان تناؤں اور درد سے تحفظ حاصل ہوگا جس کا انسانیت نے ماضی سے لیکر حال تک بار بار تجربہ کیا ہے۔

یہ خالد کے تجربہ کا وہ بنیادی نکتہ ہے جو اس المیہ کا شکار ہے کہ انسان اس کو سمجھ تو لیتا ہے لیکن گیلی لکڑی کی طرح روشن نہیں ہوتا۔ ایک بانجھ عورت کی طرح مایوس ہوتا ہے لیکن کچھ پیدا نہیں کرتا اور آزادی کا چشمہ گندی نالیوں میں تبدیل ہو کر موریوں میں جذب ہو رہا ہے۔'

شیر علی کا چہرہ اب خالد کے پورے تخیل کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ اس نے شیر علی کے احساس کو جان لیا تھا۔ اس احساس نے ایک ایسی دنیا میں جنم لیا تھا جہاں قیدیوں کی داد صرف قیدی ہی محسوس کر سکتے تھے، جہاں سے ان کا مادر وطن ہزاروں میل دور تھا۔ ہندوستان کے ساحلوں اور جزیروں کے درمیان اتھاہ پانی سے بھرا وہ سمندر تھا جن کا سفر جہاز بھی کئی دنوں میں طے کرتے تھے۔ انسان جب کلکتے کی بندرگاہ سے باہر نکل کر بحیرۂ ہند میں داخل ہوتا تھا تو اس کی دنیا بدل چکی ہوتی تھی۔ وہ باقی تمام دنیا کے لیے اور خود اپنے لیے بھی تقریباً مر چکا ہوتا تھا۔ سزا کاٹنے کو اپنی تقدیر سمجھنے والے ان لوگوں کو اس موت کے بعد بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ جب ان پر منکشف ہوتا تھا کہ سزا کی مشقت کے عادی ہونے کے بعد جب اس زندگی کا معنی ان پر کھلتا تھا تو انھیں بے بسی کے عالم میں اپنے روح سے بھی گھن آنے لگتی تھی اور وہ اپنے ان ہم وطنوں کو کوسنے لگتے تھے جن کی کوتاہوں اور لاپرواہیوں اور کوتاہ نظری نے ان کے مادر وطن کو اس حال تک پہنچایا تھا کہ دور دیش کے ان اجنبیوں کو اس ملک

پر دسترس حاصل ہو گیا۔ وہ اپنے ہم وطنوں سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ان کی آوازوں کے اس جزائر سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سارے رستے بند تھے۔ جنگ ہارنا اور آزادی کھو دینا دنیا کی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانا کتنا خطرناک تھا، یہ کتنی بڑی غلطی تھی اس کا احساس انھیں یہاں ہوتا تو وہ کسی طرح ایک بار اپنے ہم وطنوں تک اپنے پیغام کو پہنچانے کے لیے کڑھتے رہتے، انھیں لگتا کہ اگر صرف ایک بار، کسی بھی صورت میں انھیں اپنے ہم وطنوں کو جھنجھوڑنے کا موقعہ مل جائے تو وہ ان سے کچھ ایسا کہیں گے کہ ان کے غفلت کی دھجیاں اڑ جائیں اور ہندوستانیوں کی روح آتش فشاں کی قوت اور سرعت کے ساتھ بے دار ہو جائے۔ لیکن سب سے بڑی دکھ کی بات تو یہی تھی کہ آج ایسا کوئی بھی ذریعہ دستیاب نہیں رہ گیا تھا۔ وہ خود اپنے کو سوچ کر تدبر، مشقت اور بصیرت سے کام لیتے ہوئے ایسا کچھ کیوں نہیں کیا؟ وہ خود اپنے کو ان گنہ گاروں میں شمار کرتے تھے جنھوں نے اپنے ساتھ اپنی اولاد کو بھی ایسی مصیبت کی چکی میں ڈال دیا تھا جہاں ان کے خون کا آخری قطرہ اور ان کی ایک ایک سانس غلام بن چکے ہیں۔ کبھی ان کا جی چاہتا کہ اپنے بدن میں آگ لگا لیں کبھی ان کے من میں یہ خیال اٹھتا کہ وہ سمندروں میں کود جائیں لیکن انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ سب کچھ خودکشی سے زیادہ کچھ نہیں اور ان کے ہم وطنوں تک اس خودکشی کی خبر تک نہیں پہنچائی جائے گی۔ حکومت وقت کے اس مکمل گرفت سے ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ حکومتِ وقت سے ان کو جو شکایت تھی اس کا اظہار کرنے تک کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کبھی وہ سوچتے کہ ان کی زندگی میں کیا بچا تھا؟ ان کو خود انھیں کی بنائی ہوئی پھانسی دینے کی بنائی رسیوں سے قید سے بھاگے ہوئے سیکڑوں معصوم قیدیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ ان کے بیویاں شادی پہلے اور شادی کے بعد داشتاؤں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں اور انکار کی صورت میں کسی بہانے سے پھانسی پر لٹکا دی جاتی تھیں۔ ذلت کا کوئی رنگ ایسا نہیں تھا جو ان کے چہروں پر ملا نہیں گیا ہو۔ شیروں کو کتوں کی طرح دم ہلانے اور مردوں کو نامردوں کی طرح بھڑوا بننے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ ان کو اتنا دہشت زدہ کر دیا گیا تھا کہ ان کے بدن ان کے اختیار میں نہیں رہ گیے تھے۔ اور ان کی مرضی کے خلاف انگریزوں کی چڑھی ہوئی تیوری ہی دیکھ کر کانپنے لگتے تھے۔ جب وہ اپنے

ملک کو یاد کرتے تو ملک اپنے ہی خون کے آنسو میں رنگین ہو ہو کر ان کے تخیل میں ابھرتا۔ سوچتے۔ سوچتے ان کو اکثر ایسا لگتا کہ وہ اپنے اندر سے پھٹ کر مرجائیں۔ یہ انتہائی کیفیت تھی جہاں پہنچنے کے بعد اس پر زندگی کے بلندترین آسمان کی باتیں کھلنے لگتی ہیں۔ خالد بھی اس وقت اس منزل کی بلندی پر پہنچ آیا تھا۔ جہاں ڈھیر ساری باتیں اس پر یوں عیاں ہو رہی تھی جیسے کھلے آسمان کے چاروں طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں ہوں تمام پہاڑیوں کے پیچھے سے یک بہ یک وقت کئی آفتاب طلوع ہو رہے ہوں اور ان کی کرنوں سے پورا آسمان بھر گیا ہو۔

''زندگی میں دھوکہ کھانے کی کہیں کوئی گنجائش نہیں۔''

اچانک اس کے ذہن میں ایک شعر خلق ہوا:

اب کوئی رات نہیں آئے گی ان آنکھوں میں

تیری کرنوں نے جلا ڈالی ہیں پلکیں میری

وہ کچھ دیکھ رہا تھا وہ سیاسی حقیقت کی آخری سرحد تھی۔ اور روشنی کی قوت کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

اب وہ تقریباً پاگل سا ہو گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف کے منظر پر نگاہ ڈالی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ دنیا کو ڈیڑھ سو سال کی ہی نہیں ڈیڑھ ہزار سال کی سیڑھیوں پر چڑھ کر وہ دیکھ رہا ہے۔ پوری دنیا کے حکمراں اس کے سامنے ان مینڈکوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جن کو چیر چیر کر اس نے جانوروں کی اندرونی ساخت کا مطالعہ کیا تھا۔ حکومتوں کے بڑے بڑے محلوں اور پہاں خانوں کے چلمن اٹھنے لگے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ سارے چلمن تو دراصل اس کے اعصاب اور ذہن پر لٹک رہے تھے جنھیں اس نے کبھی اٹھا کر دیکھا ہی نہیں۔ جب وہ کالا پانی سے متعلق فائلوں کی ورق گردانی کر رہا تھا تو اس کے سامنے شیر علی کا لکھا ہوا

ایک نوٹ ملا جسے لارڈ میو کی قتل کی تفصیل کے دوران انگریزی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

' I am eating but not according to my choice, as if, some body else is eating through me. My body is moving but not according to my desire, as if, some body else is moving in me. I negotiate, I promise, I assure, I smile, but I know, that it is some body else's smile that apears in my face -I challenge and threaten- but I feel like becoming a matter of great joke an my own eyes as I see what in fact I am- and how, I was posing to be powerful-like this how far I was going from my self-I dont feel insulted when some body spits on my face- because it is not my face-but some body else who acts through my face, feels insulted and shivers with enger through my hands and body -and threatens through my eyes-I speak not what I want to - but what he wants to! And I behave like not what I want to, ought to, but what he wants to. And I develope a friend circle of not the type what I want to, and which comforts me, but what he wants to and what suits him - not only that - if I would

marry, the girl would not marry me, but she would marry that who is visible on my face - and she would enjoy company, not of me, but of him who lives on my face - and I would not be proud of her but he would be proud of her - and if I disclose my real face to her, she would desert me and go over to him and the girl of my choice would not be able to marry me because I would not be able to show her my real face, and if I show her, she would not believe because, I do not exist - I do not have the evidence of my existence!

It is only Dr. Walker who exists ! It is Dr. Walker who is standing on my nose! A dirty fly ! People, when they see me, they see Dr. Walker in my face - and they hate me! They spit right and left on seeing me! And though, I do not like - still. Dr. Walker exists on my face like a patch of old eczema ! '

فائلوں میں لکھے نوٹ کے مطابق شیر علی کی یہ تحریر لارڈ میو کے قتل سے پہلے اور سنہری کی موت کے بعد لکھا گیا تھا۔لیکن فائل کے نوٹ اور تفصیلات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس تحریر کو تفتیش میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی اور اس کا تفتیش میں کوئی حوالہ نہیں دیا گیا تھا۔جیسے

اس تحریر کی شیر علی کے ذریعے کیے گئے قتل کو سمجھنے کے حوالے سے کوئی معنویت نہیں تھی اور اسے محض ایک جذباتی تحریر سمجھا گیا۔اس تحریر کو ایک قیدی کے جذباتی بڑ کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔جس پر یہ لکھ دیا گیا تھا کہ اس کی مقدمہ میں شہادت کے نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں تھی۔اور اس طرح اسے محض ایک فالتو کاغذ کے طور پر کیس فائل میں منسلک کر کے رکھ دیا گیا تھا۔

❖❖

جون کا مہینہ آ گیا تھا اور اب تک بارش نہیں ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں اپنی تمازت کی شان و شوکت کا مکمل کر اظہار کر رہی تھیں۔ اس سال گرمی کا موسم اپنی بدترین شکل میں آیا تھا اور کئی برسوں کا ریکارڈ ٹوٹ گیا تھا۔ چٹانیں جل رہی تھیں۔ درخت زرد ہونے لگے تھے اور لوگ ہر لمحہ کسی سائے کی تلاش میں نظریں دوڑاتے رہتے۔ جنگلوں کو کاٹنے اور مکان تعمیر کرنے کا کام بے حد مدھم ہو گیا۔ پورا آسمان اس طرح گرم ہو گیا تھا کہ سمندروں پر نظر ڈالنے سے بھی آنکھیں چوندھیاتی تھیں۔ سورج کی کرنیں صرف سمندر کے کناروں کی ریت سے ہی نہیں پانی کی لہروں سے بھی چمک کر آتی تھیں۔ آفس میں زیادہ سے زیادہ قیدیوں کے بیمار ہونے کی رپورٹ آ رہی تھی۔ دواؤں کی کمی تھی۔ جلد ہی قیدی زیادہ سے زیادہ تعداد میں مرنے لگے۔ دق کے مریضوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ کلکتہ خصوصی درخواست بھیجی گئی کہ وہاں سے دق اور دوسرے امراض کے لیے دوائیں بھیجی جائیں اور کچھ اور ڈاکٹر بھی وہاں سے روانہ کیے جائیں۔

اس وقت ہندوستان کا وائسرائے لارڈ میو لندن کے دورے پر گیا ہوا تھا۔ اور ہندوستان سے متعلق مسئلوں پر گفتگو کرنے کے لئے وہاں کے مختلف اعلی عہدیداروں سے ملاقات کر رہا تھا۔ وہاں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں تو اس کا ایک نجی دوست ہی سکریٹری تھا جو اس کا بہی خواہ تھا۔ گفتگو کے دوران اس نے ایک فائل اٹھائی۔ اور اس میں سے ایک خط نکالا جو لارڈ میو نے ہی لکھا تھا۔

فائل کے اندر اس کے خط پر دو تین لوگوں کے ریمارک لکھے ہوئے تھے جن میں ایک ریمارک خود وہاں کے وزیر اعظم کا تھا۔

لارڈ میو نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

"I have only one object in all I do. I believe we have not done our duty to the people of this land. Millions have been spent on the conquering race, which might have been spent enriching and elevating the children of the soil. We have done much. We can do a great deal more. It is how ever, impossible unless we spend less on the 'interests' and more on the' people' in the condsideration of all these matters.

We must first take into account the inhabitants of this country. The welfare of the people of India is our primary object."

اس خط سے متعلق سکریٹری نے لارڈ میو سے کہا

'Your policy in the Indian sub-continent as written in your letter is really causing some worry. Some senior members of the cabinet have raised their apprehensions on the point raised in your demi-official letter that you have written to me. They wanted me to

discuss with you. They feel that you are indulging into something of personal nature by considering humanitarian causes which are better left to the missionaries. The point needs clarifications for their satisfaction, so please tell me what exactly you mean.

لارڈ ہے

'See. The population of the colony- may be any- is a resource, an asset. Our own asset. it belongs to us. We have to see how best it can be exploited. Once the political consolidation is done and political conflicts are largely resolved, the next target should be not to see the inhabitants as hostile people but to see them as resource. For managing the be best the exploitation of the very vast resources of a territory like India this needs serious consideration. The population has to be enabled to meet the requirements. Their health is thus important. their whole hearted participation is also important. Thus exploitation of their spirit is required and for expoliting their spirit

environment has to be created. Thus so long they show the signs of participation in our programs there is no harm in talking in a language of well being.This should not only be told but should be expressed in actions, even in moods. Only then it will have real impact. This is essential part of diplomacy. Controlling the hearts and minds is very essential for turning controlled populations into natural subjects. Care is the the last weapon by which you can even make the subjects make sacrifices for you - sacrifices of labor as well as desires. This will ultimately cultivate them for making sacrifices of their lives for the empire. We should keep in view the fact that we do not only require labor but we also require forces- policemen and soldiers and buraucrates. The time has come after suppression of rebellions that we make some policy changes. It has to be shown. More over at certain places we have British populations for which we have to create facilities but why not to create it in the name of welfare of the inhabitatants. It has great

publicity value. Thus the justification for budgets have been given new words. You know, now we are engaging Indians in our official works and many of the correspondence passes from under their eyes. They should feel without our saying that the British empire is thinking in terms of their welfare and full participation in the process of growth of their own economy. It is only difference of language. The senior members seem to have missed the point that they are reading a letter of a viceroy, not of a missionary.'

لارڈ میو نے اپنے اس حکمراں دوست کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

'And keep in mind, we are not at all soft to those who are reluctant, or who resisit or those who oppose. We have implemented a policy to either 'submit or get finished, and in getting finished they are to serve as examples'.

'Further, open wars and open exploitation in terms in violation of laws

should not be resorted to as it creates doubts about the bonafides of the government. It must be the endeavour of the government to take some extra pains and formulate some laws, rules or provisions under which the required undesirable actions could be adjusted by executive actions. This is also essential for training purposes. When people see that some action is covered by some law or rule or by some power bestowed on some officer as executive power, they are discouraged from raising objections because raising objections on such point amounts to revolting against the government or inciting against governments. Thus every thing should be managed through approprite legislations and executive orders.'

گفتگو کے اخیر میں ہوم سکریٹری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'OK. This stands clarified.'

اپنی دلیل میں کامیاب ہونے کے بعد لارڈ میو کو محسوس ہوا کہ وہ واقعی عظیم ہے۔اور اس کا طریقہ کار اور وہاں سے ایسے نکلا جیسے وہ مہذب دنیا کا عظیم رہنما ہو۔اور برطانوی حکومت کی توسیع اور مضبوطی کے اسرار سے اس سے بہتر واقفیت رکھنے میں اس کا

کوئی ثانی نہ ہو۔

لارڈ میو لندن سے واپس آنے کے بعد اب اور بھی زیادہ انہماک سے برطانوی سامراج کو مضبوط کرنے میں لگ گیا تھا۔

ان دنوں جزائر انڈمان اپنے اندر سیاسی، سرکاری اور انسانی زندگیوں کے اختلاط سے ایک ایسا بھنور پیدا کر چکے تھے اور یہ بھنور حاکموں سے لے کر ملزموں تک سب کو پورے برصغیر سے اپنے اندر کھینچ رہا تھا اور ایک ایسی پراسراریت کا ماحول وجود میں آ گیا تھا جو جس کو بھی کھینچتا تھا اسے یہاں آنا ہی تھا اور آنے کے بعد اس بھنور سے بچنے کی کوشش بھی کرنی تھی اور یہ بھنور ایک قہقہہ لگاتا ہوا ابھرآنے والے کی تقدیر تھی کہ حیات و موت کا عصا لیے ہوئے قانون قدرت کو سمجھانے کا گویا فریضہ اٹھائے ہوا تھا۔ اسی بھنور کے کنارے اپنی جان کی حفاظت کا انتظام کیے ہوئے اور بھنور میں غلطاں و پیچاں ملزموں پر نظریں لگائے ہوئے نئے جیل سپرنٹنڈنٹ کے ذہن میں انتہائی خرم روی اور بے آواز قدموں سے ایک خیال پردۂ ذہن پر ابھرا کہ یہاں اس بھنور کی اوپری سطح پر اس تماشہ گاہ میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کو بھی بلایا جائے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کے اس خیال نے اس کے ذہن میں خودستائی ایک ایسی چکاچوند روشنی کر دی کہ اس کا ہاتھ اپنی میز پر رکھے قلم پر گیا اور کاغذ پر وہ سطور شروع ہو گیے جو نہ صرف ان جزیروں کے لیے بلکہ زمین پر چاروں طرف پھیلی ہوئی برطانوی حکومت کے لیے بھی ایک بڑا واقعہ ہونے کا امکان رکھتے تھے۔

خط پورا ہونے کے بعد جیل سپرنٹنڈنٹ نے خط کو دوبارہ پڑھا اور پورے ہوش و حواس میں اس نے محسوس کیا کہ اس نے لارڈ میو کو ان زہرناک اور خطرناک فضاؤں میں مدعو کیا لیکن اس کے دل میں اٹھی ہوئی خواہش کچھ اتنی دلکش اور شدید کروٹیں لے رہی تھی کہ اس نے اس خط کو کلکتہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

خط اس کی میز سے دراز میں رکھے ہوئے ایک لفافے میں داخل ہوا۔ اوپر سے سیل بند ہوا ڈاک کے بستے میں داخل ہوا جہاز پر سوار ہوا اور سمندر کی اونچی اونچی لہروں کو چیرتے ہوئے جہاز میں سوار ایک پراسرار اور قوی قاصد کی طرح تمام حفاظتی دروازوں سے گزرتا ہوا اور لفافے سے باہر نمودار ہو کر لارڈ میو کے ہاتھوں میں کھل گیا۔ کوئی اسے انڈمان کو بار کے زہرناک فضاؤں میں بلا رہا تھا لیکن اس خط میں ایسی کسی خطرے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یہ خط تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے جو احکامات دیے ہیں اس پر جوش و خروش اور مستعدی سے عمل ہو رہا ہے اور اس کے خوابوں میں اٹھی ہوئی ان جزائر کی تصویر اس کے احکامات کی طاقت سے حقیقت کا خط نے لارڈ میو کے دل پر ایک پراسرار ڈنک مارا۔ جس کا اثر تیز تلخ نہیں تھا بلکہ میٹھا اور گہرا تھا اور لارڈ میو کے ذہن میں جزائر انڈمان کے آفاق کسی جادوگر کے نقوش فریب کی طرح اجاگر ہونے لگے۔

اس خط میں انڈمان آنے کی گزارش کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ اگر وہ بذاتِ خود وہاں جاتے تو ان جزائر میں وجود میں لائی گئی آبادی اور برٹش راج کے مقاصد کے تئیں کیے جانے والے کاموں کی توسیع کی راہ میں جو دشواریاں ہیں وہ کتنی بڑی اور مشکل ہیں اس کا اندازہ وہ خود کر سکے گا اور اس میں اس کی موقعے کے اوپر معائنے کے بعد دیے گیے احکامات اس کی تکمیل میں زیادہ معاون ثابت ہوں گے۔ لارڈ میو کو یاد آیا کہ اس نے حکم دیا تھا کہ انڈمان کی آبادی اور دوسری ضرورتوں کے لیے ان جزائر میں ایک بڑے علاقے کو موجودہ علاقہ میں شامل کیا جائے جیل سپرنٹنڈنٹ نے لکھا تھا کہ 'وہاں کچھ ایسا ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا'

(No one can thouroughly understand this place untill he has seen it.)

لارڈ میوں نے سوچا اور خود وہاں جانے کی تجویز سے وہ متفق ہو گیا۔

اس جملے میں ایک سچائی تھی یہ سچائی خالد سہیل کے سامنے بھی آہنی دیوار بن کر کھڑی تھی۔ حالانکہ وہ اس جگہ کو ڈیڑھ سو سال پہلے والے ماضی کو جاننے کے لیے ان جزیروں میں آکر مہینوں سے سرگرداں تھا۔ اور تاریخ کے ذرائع سے لے کر لوگوں سے سننے والی کہانیوں اور وہاں کے آثارِ قدیمہ کی ایک ایک تفصیل کو باریک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے سمجھنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ لیکن حقیقی تصویر تھی کہ تاریخ کے اس گرداب میں مسلسل ڈوبتے ابھرتے اپنی شکل بدلتی ہوئی اسے نیچے اتارتی جا رہی تھی۔

❖❖

۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء کو کلکتہ کے اس بندرگاہ پر جہاں سے برطانوی جہاز مختلف سمندری راستوں سے ہوتے ہوئے کرۂ زمین کے مختلف مقامات تک جاتے تھے دو جہاز H.M.S. Prigate glassgow اور S.S. Dhaka وائس رائے کو لے جانے کی تیاری میں گویا اپنے چاروں طرف فخریہ نگاہوں سے ساحل سمندر اور دور دور کی عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کو اعلیٰ ترین سرکاری شان و شوکت کی تیاریوں کے ساتھ سجایا گیا تھا۔

انڈمان نکوبار کے اس سفر کا تعین لارڈ وائسرائے نے اپنی مشغولیات اور اپنی سوچ اور کارکردگی کے تحت نہیں کیا تھا بلکہ دعوت نے خود سے نازل ہو کر اس کے ذہن میں جگہ بنائی تھی اور اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک ایسی سمت میں کھینچا جا رہا تھا جس میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی۔ جس احساس نے اس کے اعتماد اور سکون کو پرے ڈال دیا تھا جو بڑی بڑی سیاسی بغاوتوں اور جنگی خبروں اور تیاریوں کو بھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا تھا۔ گویا تاریخ جس نے اس کو اب تک اپنی پیٹھ پر بیٹھا رکھا تھا، ایک پراسرار قوت کے ساتھ اب اسے جبراً پکڑ کر کھینچے لیے جا رہی تھی۔

بندرگاہ پر بنگال کے لفٹیننٹ گورنر اعلیٰ ترین انگریز آفیسر دوست اور احباب، لارڈ میو اور اس کے ساتھ جانے والے لوگوں کو جن میں اس کی بیحد خوبصورت اور حساس طبیعت والی اس کی بیگم بھی شامل تھی، جمع تھے۔ جب لارڈ میو کی سواری آئی تو سب نے اسے سرکاری سلام کیا، بگل بجے اور لارڈ میو کی نظر تمام لوگوں کو دیکھتی ہوئی اس جہاز پر گئی جس پر اسے سوار ہونا تھا۔ لیکن اس بار جہاز پر سوار ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر وہ کیفیت غائب تھی جو ان منزلوں پر جاتے ہوئے ہوا کرتی تھی جن کے بارے میں اس کا ذہن صاف ہوا کرتا تھا۔ لوگوں کے الوداعی شور و شرابے اور اظہارِ مسرّت کے درمیان وہ کچھ پریشان سا دکھ

رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نئی ایسے ملی مسائل گردش کر رہے تھے جنہیں پس پشت ڈال کر وہ اس سفر پر چل نکلا تھا۔ افغانستان میں ہونے والی بغاوت کو نمٹانے کے لیے اس نے جو نمائندے بھیجے تھے اس کے نتائج کے بارے میں وہ بہت متفکر تھا۔ کیونکہ اس مسئلے کا حل ہونا ہندوستان میں برطانوی راج کے استحکام کے لیے بہت اہم تھا۔ اس نے بری چند کو حکم دے رکھا تھا کہ اس سلسلے میں جو بھی نتائج برآمد ہوں اس کی خبر اس کو فوری طور پر دی جائے۔

انڈمان کے لیے جہاز برما سے ہو کر جاتا تھا۔ اس نے اپنے برما سے فوراً کلکتہ واپس لوٹنے کے انتظام کا حکم بھی دے رکھا تھا تا کہ اگر افغانستان کے معاملے میں بات چیت کے نتائج مایوس کن نکلیں تو وہ پروگرام بدل کر فوراً رنگون سے کلکتہ پہنچ جائے گا۔

لارڈ میو کے جہاز نے کلکتہ کا بندرگاہ چھوڑا۔ جب وہ برما پہنچا تو اسے لگا تار کئی ٹیلی گرام ملے کہ افغانستان کے معاملات میں امید افزا نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور کسی بڑی پریشانی کے امکانات لگ بھگ ختم ہو چکے ہیں۔ اس خبر کے بعد اس کا ذہن اس معاملے کے تناؤ سے رفتہ رفتہ فارغ ہونے لگا اور ۵ فروری کو وہ دوبارہ جہاز پر سوار ہوا اور قافلہ بنگال کی کھاڑی کو پار کرتا ہوا دن کے اجالوں اور رات کے اندھیروں سے مسلسل تین دن تک گزرتا ہوا آٹھ بجے صبح ان جزیروں کی طرف بڑھنے لگا جو سامنے دکھائی دے رہے تھے اور جنہیں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن لارڈ میو کے دماغ پر اب بھی افغانستانی معاملے کی بے چینی خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ان جزائر کا معائنہ کر کے فوراً دارالسلطنت کلکتہ پہنچنا چاہتا ہے۔

وائسرائے کے ان جزائر میں آنے کی خبر قیدیوں میں بھی پھیل چکی تھی۔

شیر علی جیلر کے دفتر میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے جب لارڈ میو ممکن ہے نہیں بھی آئیں' کیونکہ افغانستان کا مسئلہ ان کے پروگرام کو التوا میں ڈالے ہوا ہے۔ اور اگر افغانیوں نے اپنے کو انگریزی حکومت کے حوالے نہیں کیا تو افغانستان پر فوراً جنگ کر کے

اسے قبضے میں لینا پڑے گا۔

وہ سوچتا رہ گیا۔

وائسرائے کی شریف النفس اور ہمدردانہ شخصیت کے بارے میں یہاں کے قیدیوں نے سن رکھا تھا۔ لارڈ میو کے متوقع آمد نے ان کے دلوں پر جیسے سوکھی مٹی پر بارش کا چھڑکاؤ کر دیا تھا۔ ان کے اندر یہ امید نشو ونما پانے لگی تھی کہ جس ہمدرد ہاتھ میں ملک تھا اگر اس کو اندازہ ہو جائے کہ یہاں کے قیدیوں کی زندگی ایک دوزخ میں گزر رہی ہے تو وہ اسے قطعی نظر انداز نہیں کر سکتا اور ایک مضبوط توقع وجود میں آنے لگی تھی۔ اس بات پر چہ مگویاں ہونے لگی تھیں کہ یہاں کے حاکم ضرور یہ کوشش کریں گے کہ ان کے مظالم کی خبر کسی بھی طرح وائس رائے کو نہ ہو۔ اس بات کی روشنی میں قیدی اپنی تکلیفوں کو اس حاکم اعلیٰ کے گوش گزار کرنے کے لیے درخواستوں سے لے کر آوازوں اور اشاروں کنایوں کے ہر ممکن امکان کو عمل میں لانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

لارڈ میو نے حکم دیا کہ اس کے آمد اور معائنے کے دوران جیل اور اس کے باہر کے کام وحام کے روز مرہ میں کسی بھی طرح کی کوئی تبدیلی نہ کی جائے اور وہ وہاں کی اصلی زندگی کو دوران عمل دیکھنا چاہتا ہے۔

جیلر کے آفس میں میٹنگ چل رہی تھی۔ جیلر نے لارڈ میو کے احکامات کے پیش نظر اپنے ماتحتوں سے کہا، وائس رائے کے اس حکم کی تعمیل کرنے میں ہمیں اپنے طور پر کچھ باتوں کا لحاظ رکھنا ہے۔ پہلی بات یہ کہ ہر جگہ روز مرہ کا کام بالکل اسی طرح چلتا رہے گا جیسے باہر سے کوئی آیا ہی نہ ہو لیکن وائس رائے کی سیکورٹی اور سفر کا انتظام مکمل طور پر کیا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ روز مرہ کے طور پر سب کچھ چلن دینے کا مطلب صرف یہ ہے کہ قیدی اپنی اپنی جگہ کام کرتے رہیں لیکن ان پر سختیاں برتی جاتی ہیں اور جیل میں جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ مکمل طور پر وائسرائے کے دوران سفر بند رہیں گی۔ اور تیسری بات یہ کہ قیدیوں سے یہ بتایا

جائے کہ اگر وہ شور و شرابا نہیں کریں گے اور وائسرائے کے شایانِ شان ہی انتہائی انکساری کے ساتھ اپنی گزارشات پیش کرنے کی کوشش کریں گے تو حتی الامکان ان کو وائسرائے کے سامنے اور قریب آنے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ بھی دھیان رہے کہ ان تمام قیدیوں کو دور رکھا جائے جو منہ پھٹ یا سرکش ہیں بلکہ ان کو علاحدہ جگہ جمع کر کے وائسرائے کے معائنہ سے دور رکھا جائے۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد جیل کے ملازمین انتہائی چستی اور پھرتی کے ساتھ اپنی اپنی جگہوں پر پہنچے اور پورے جزیرے میں ہر جگہ جیلر کی دی ہوئی ہدایات قیدیوں کو سنائی جانے لگیں۔

بیگم لارڈ میو صبح سویرے ہی کمرے سے نکل کر ڈیک پر آ گئیں تھیں۔ وہ ایک بے چین روح کی طرح سمندر کو دیکھ رہی تھیں۔ جہاز کے ایک عملے نے بتایا کہ آدھے گھنٹے کے اندر جزائر دکھنے لگیں گے۔ اسے انگلستان کے ساحل سمندر پر واقع اپنا گاؤں اور محل یاد آیا جہاں سے سمندر گہرا نیلا دکھتا تھا اور اطراف میں کئی جگہ اس کی سہیلیاں اور اس کے ملنے جلنے والے رہتے تھے زندگی کیسے مضبوط سے مضبوط لوگوں کو اٹھا کر اپنی مرضی سے یہاں وہاں لے جاتی ہے اور وہ کچھ نہیں کر پاتے۔ وہ لارڈ میو کے ساتھ بہت خوش تھی لیکن اس زمین سے اس کا کیا تعلق تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا سوائے اس کے کہ انگریز قوم یہاں دھن لوٹنے آئی تھی اور اسے اب اپنی کھیتی بنانے پر کوشاں تھی۔ کیا دولت ہی سب کچھ ہے اور انسان کے نازک احساسات خواہش اور ارمان کچھ بھی نہیں۔ اسے خیال آیا کہ لارڈ میو تو اس لیے خوش رہتا ہے کہ وہ انتہائی مشغول ہے لیکن وہ خود؟

اسے خیال آیا کہ ان جزیروں کا سفر بھی تو محض ایک خوبصورت تماشہ ہے۔ وہ جانتی تھی کہ قیدخانوں میں کیا ہوتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ ان جزیروں پر اتری اور لارڈ میو کے ساتھ گھومی تو قیدیوں کے اداس دکھ بھرے رحم کی درخواست مانگتے چہروں کو دیکھ کر اندر سے لرز جائے گی اور اداس ہو جائے گی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ قیدی بھی کسی سرکاری تانے بانے میں متحرک کڑیوں کے ذریعے اپنے گھروں سے اٹھا کر تنہائیوں کے ان سمندروں کے

بیچ لائے گئے ہیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس قیدیوں کے دکھ اور اس کے اپنے دکھ میں مماثلت ہے۔ تھوڑی دیر میں جزیرے دکھنے لگے لیکن جزیروں کو دیکھ کر جس مسرت کی وہ توقع کر رہی تھی ویسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کی سمجھ میں اب یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ قیدیوں کی اس بستی کو دیکھنے کے سفر میں اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آ گئی ہے۔ ایک عجیب سی مجبوری سرکاری معاملات میں دخل نہ دینے کی لیڈی لارڈ میو کو لگ بھگ عادت سی ہو گئی۔ اس کو مطلب تھا تو صرف اپنے شوہر سے جس سے اس کی زندگی وابستہ تھی۔ جزیروں پر نظر پڑتے ہی اس کے اندر ایک ابکائی سی آئی۔

وہ ابھی اپنے اس احساس کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ پیچھے سے قدموں کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا لارڈ میو مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا۔

لارڈ میو۔ کتنی خوبصورت صبح ہے۔ کیا تمھیں پسند آیا؟

لیڈی لارڈ میو۔ میں بیماری محسوس کر رہی ہوں۔

لارڈ میو۔ فکر مت کرو۔ تم ان اَن دیکھے جزیروں میں اتر کر تازہ دم ہو جاؤ گی۔ نئی جگہوں کو دیکھنے کا تجربہ بہت خوبصورت ہوتا ہے۔

لیڈی لارڈ میو۔ مجھے شک ہے۔

لارڈ میو۔ اچھا چلو ناشتہ کر لیں۔ میں پہنچتے ہی نیچے اترنا چاہتا ہوں اور یہاں کا دورہ آج ہی مکمل کر لوں گا۔ پھر تمھیں واپس کلکتے پہنچا دوں گا۔ تمہاری دوستوں کے درمیان۔

جزیرے قریب آتے جا رہے تھے۔ بندرگاہ پر کھڑے لوگ دکھائی دے رہے تھے لیڈی لارڈ میو بے دلی سے پیچھے مڑی اور لارڈ میو کے ساتھ ساتھ چل دی۔ اپنے کیبن میں پہنچ گئی۔

لارڈ میو۔ تو تم ساتھ نہیں آ رہی ہو؟

لیڈی لارڈ میو۔ نہیں۔ میرا جی نہیں چاہ رہا ہے اور تم جلدی سے معائنہ ختم کر کے آجانا۔ مجھے بہت الجھن ہو رہی ہے۔

لارڈ میو۔ اسی کو عورت کا دل کہتے ہیں۔ او۔ کے میں جلدی جلدی فارغ ہو کر آجاؤں گا اور آج کی شام واپسی کے سفر پر چل پڑیں گے

لیڈی لارڈ میو۔ تم جاؤ۔ تم جاؤ۔ میں تمہارا شام کا ناشتہ اپنی نگرانی میں بنواؤں گی اور تمہارا انتظار کروں گی۔

دونوں تیار ہو کر ناشتے کے لیے نکل پڑے۔

ایک اوسط درجہ کی پہاڑی کے اوپر کھڑے ہو کر شیر علی نے سمندر میں کی طرف دیکھا۔ وہاں جہاز جزیروں کی طرف آ رہا تھا۔ ساتھ میں ایک دوسرا جہاز بھی تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ جہاز پر بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک فوجی ٹکڑی چلی آ رہی تھی۔ جہاز ساحل کے کنارے آ گیا۔ شیر علی نے اندازہ لگایا کہ یہی لارڈ میو کا جہاز تھا۔ فوجی وردی میں تاجروں کا ایجنٹ! پورے منظر پر جیسے خون کے تازہ چھینٹے بکھر گئے ہوں اور پورا سمندر اور سارے پہاڑ سرخ ہو گئے۔ ایک معمولی انسان کے دل میں ایک تاریخی کارنامہ انجام دینے کی خواہش جنم لے رہی تھی۔

باہر جہاز چلتا ہوا کیپ ٹاؤن کے قریب لنگر انداز ہو گیا۔ بندرگاہ سے چھوٹے چھوٹے بوٹ جہاز کی طرف دوڑ پڑے۔

شیر علی کا ذہن جیلر کے احکامات کے بارے میں سن کر اٹک سا گیا تھا۔ جب سے اس نے سنا تھا کہ لارڈ میو وہاں آ رہا ہے وہ لارڈ میو کے چہرے پر اس وقت پیدا ہونے والے تاثرات کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا جب وہ معائنے کے دوران قیدیوں پر ہونے والے مظالم اور اذیتوں کے بارے میں قیدیوں سے سنے گا۔ لیکن جیلر کی تیاریوں نے اس کی امید پر پانی پھیر دیا تھا۔ قیدی پر جوش طور پر یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ کچھ نہ کچھ اچھا ہوگا۔ اس کا اندازہ ان کے لہجے اور آواز سے بھی ہو رہا تھا جب وہ جوش میں اپنی امیدوں کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن شیر علی جوان قیدیوں کا ایک نگراں بن گیا تھا چپ چاپ صرف ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اپنے نیک چال چلن کی بنیاد پر شیر علی کو بہت ساری مراعات جو کسی قیدی کو مل سکتی تھیں، ملی تھیں، اسے شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جیل کا کوئی بھی ملازم اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ کئی بار جیلر نے اسے اپنے دفتر میں بھی بلایا تھا اور شیر علی مع اپنے کام کرنے کے آہنی اوزاروں کے ساتھ اس کے قریب تک گیا تھا لیکن جیلر کو اس سے تنہائی میں اس طرح ملنے سے کوئی تعمل نہیں ہوا تھا۔ جیلر نے اس سے ذاتی طور پر کہا تھا کہ اگر قیدی اپنے آپ کو قابو میں رکھیں تو ان کو وائسرائے سے رحم اور معافی کی گزارش کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ یہیں اس کا ذہن اٹک گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چند قیدیوں کو اگر نجات مل بھی گئی تو اس سے کیا ہوگا۔ اصل بات تفصیل میں وائس رائے تک کیسے پہنچے گی۔ لیکن (لارڈ میو تو ایک دانشمند اور ہمدرد انسان ہے۔ اسے خود بھی تو جاننے میں دلچسپی ہوگی اسے یہ جیلر کیسے روک سکے گا۔) لارڈ میو کی حفاظت کے لیے ہر جگہ خاص انتظامات کیے گیے تھے۔ مسلح محافظوں کا دستہ بوٹ سے اترتے ہی ان کے ساتھ ہو گیا تھا جو ان کے سامنے دائیں بائیں اور پیچھے ٹکڑیاں بنا کر چل رہا تھا۔ انتظامات میں ان جگہوں پر تحفظ کا خاص انتظام کیا گیا تھا جہاں جیل گھر واقع تھا خاص طور سے اہم تھا۔ یہاں خطرناک ترین مجرموں سے اس لیے کام لیا جاتا تھا تا کہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نظریں اس پرشکوہ پھانسی گھر پر بھی پڑتی رہیں جہاں سرکشی کرنے والے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ معائنہ کے لیے جگہوں کی فہرست بن گئی تھی۔ دفتر کو دیکھنے کے بعد وائسرائے کا قافلہ اس علاقے میں پہنچا جہاں بیشتر

قیدی کام کرتے تھے۔ چلتے ہوئے وائس رائے کے پہنچنے سے پہلے بگل بجا اور قیدی بتائی گئی جگہوں پر اپنے اوزار چھوڑ کر راستے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ وائسرائے اپنے چہرے پر حاکمانہ شان کے جلوے کے ساتھ انسانی رشتوں کا اظہار اپنی مسکراہٹوں سے کرتے ہوئے گزرنے لگے اور ان کے محافظ دستے قیدیوں میں اجازت لے کر آگے بڑھ کر درخواست دیتے ہوئے قیدیوں کی درخواست لینے لگے۔ ان درخواستوں میں یہ گزارش کی گئی تھی کہ وائس رائے کے اس دورے کے موقع پر رحم کا اظہار کیا جائے اور انھیں معاف کر کے اپنے وطن جانے کی اجازت دی جائے۔ لارڈ میو کی مسکراہٹ نے کشش کی ایک ایسی لہر دوڑائی کہ قیدیوں نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور بغیر اجازت وہ قریب آنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہر آنکھ میں امید اور ہر ہاتھ میں التجا چیخ رہی تھی۔ شیر علی دور کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک قیدی جس کے گھر پر اس کے بوڑھے ماں باپ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ چیخ کر یہ بات کہہ رہا تھا۔ اسے ایک گارڈ نے روکا اور ساتھ ہی ساتھ لارڈ میو ہر چند کہ ان کی نظر اس چیخنے والے کی نظر سے ملی، نے اپنا سر دوسری طرف کی قطار کی طرف موڑ دیا۔ قیدی کا ہاتھ توبہ کے لیے ترستا رہ گیا۔

شیر علی کی نظریں سارے منظر کو بھول کر نیچے جھک گئیں۔

اس دن جیسے جزائر انڈمان نکوبار پر کوئی سورج اتر آیا تھا۔ اس معمولی چھوٹی سی جگہ پر برصغیر کے کسی فرماں رواں کا قافلہ اس کی تاریخ میں پہلی بار اترا تھا۔ جدھر بھی لارڈ میو کی نگاہ اٹھتی تھی یوں لگتا تھا کہ اس وادی کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ پہاڑیوں پر نظر پڑتی تو دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ نئے سرے سے آراستہ کی جائیں گی۔ سمندر سے ساحل پر آنے والی لہروں پر جب نظر پڑتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ان لہروں کو پہلی بار دیکھے جانا نصیب ہوا ہے۔ جگہ جگہ دور تک پولیس ڈیوٹی پر تعینات تھی جیسے جیسے لارڈ میو آگے بڑھ رہا تھا آگے

آگے میلوں دور تک پہلے خبر پہنچ جاتی کہ اب وہ آ رہا ہے جیسے لارڈ میو کے قدموں کی چاپ پوری وادی میں حسن کے جال میں مسلسل جکڑتے ہوئے اسے مدہوش کرتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اردگرد کھڑے محافظ دستوں اور پولیس والوں کی بھیڑ سے اکتانے لگا۔ سامنے کے مناظر اسے چپکے چپکے اشارہ کرنے لگے کہ وہ اپنے اور ان مناظر کے بیچ کھڑے محافظ دستوں کو دور ہونے کا حکم دے اور ایسا ہی ہونے لگا۔ لارڈ میو نے محافظ دستوں کی بھیڑ پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا جس سے ڈیوٹی پر کھڑے سپاہیوں کو نظر نہ آنے والی جگہوں تک کھسک جانے کا اشارہ کیا گیا۔ لارڈ میو قدرتی حسن کے ساتھ ان قیدیوں کے ذریعہ اظہار کیے جانے والے عزت و احترام کی مسرت سے زیادہ سے زیادہ محظوظ ہونے لگا۔ قیدی لکڑی کے بنے پتلوں کی طرح بے جان تھے۔ ان سے کیا ڈرنا جب کہ محافظ دستے رائفلوں کے ساتھ پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ لارڈ میو کے چلنے کے لیے جیل سپرنٹنڈنٹ نے کھچروں کا انتظام کیا تھا جن کی پیٹھ پر کلکتے سے منگائے گئے زرق برق پوشاک ڈالے گئے تھے اور جنھیں سیرومونیل ڈریس میں ملبوس سائس ساتھ میں لے کر چل رہے تھے۔ لیکن ان جزیروں کی مسرت آفریں اور جاں فضا ہواؤں نے اس کے اوپر ایسا جادو کیا کہ وہ پیدل ہی تیز تیز مارچ کرتا رہا جیسے تھکنے کا نام نہ لیتا ہو لیکن اس کے ساتھ چلنے والا عملہ جن کے ذہنوں پر صرف ذمے داری کا بوجھ تھا اور جنھیں ان وادیوں کے بیچ لارڈ میو کے علاوہ اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ مختلف پہاڑیوں پر سے چڑھتے اترتے تھکنے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں لارڈ میو کے قافلے کے چند سربرآوردہ حکام کا اندیشہ ہونے لگا کہ لارڈ میو بے احتیاطی میں سکیورٹی کے جائز حدود کو پار کر رہا ہے۔ ان لوگوں میں لارڈ میو کا بھائی جو اس کا پرائیویٹ سکریٹری تھا، بھی موجود تھا۔ اس نے ہمت کر کے اصرار کے ساتھ لارڈ میو کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ اس کے اصرار پر بالآخر لارڈ میو نے اپنے ہاتھ میں ایک ہنٹر لے کر کہا کہ یہ اس کی حفاظت کے لیے کافی ہے اور وہ ہنٹر کو دائیں بائیں گھماتا ہوا آگے چلتا رہا۔

شام کے پانچ بج گئے تھے۔ سورج کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی پہاڑیوں سے لے کر سمندر تک ہر چیز کا رنگ بدلتا جا رہا تھا جیسے شام کی آمد آمد اس کو پراسرار انداز میں خوش

آمدید کہہ رہی ہو۔اب اس کی فہرست میں صرف ایک کام رہ گیا تھا یعنی سامنے کی پہاڑی ماؤنٹ ہیریٹ کی چوٹی پر جانا اور وہاں ملیریا اور تپ دق کے مریضوں کے لیے ایک سینی ٹوریم کی تعمیر کرنے کی تجویز پر غور کرنا اور اس کے امکانات پیدا کرنے کے لیے ضروری مصارف کی منظوری دینا۔لیکن اس کے علاوہ لارڈ میو کے دل میں نہ جانے کہاں سے ایک اور خواہش جاگ رہی تھی۔ جیسے یہ وادیاں اس کے دل و دماغ پر اپنے اسرار کی کھڑکیاں رفتہ رفتہ کھول رہی تھیں۔وہ اس پہاڑی چوٹی کے اوپر بیٹھ کر وہاں سے سمندروں پار شام کے ڈوبتے ہوئے سورج کے منظر سے محظوظ ہونا چاہتا تھا۔اور ڈوبتے سورج کا آنے والا یہ منظر بھی لارڈ میو سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔اسی خیال میں گم لارڈ میو نے چوٹی کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

لارڈ میو۔ابھی روشنی ختم ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔' مجھے وہاں تک جانا ہے۔'اس نے چوٹی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔اس کے اس جملے نے اپنے پیچھے کے لوگوں میں طرح طرح کی سنسنی پیدا کردی۔جیل سپرنٹنڈنٹ بے حد تناؤ میں آگیا۔مطلق العنان وائسرائے سے مزید کچھ کہنے کی ہمت کسی کی نہیں پڑی۔اس کا اشارہ حکم تھا۔اور ماؤنٹ ہیریٹ کی چوٹی پر پہنچنا اور اس بلندی سے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کو دیکھنا جیسے اس کی روح کی کسی بہت گہری پیاس کو بجھانے والی تھی۔

ادھر جہاز پر لیڈی لارڈ میو بار بار جزیروں کو دیکھتے ہوئے قافلے کو تلاش کر رہی تھی۔چاروں طرف آفاق سے رفتہ رفتہ تاریک سائے اوپر اٹھ رہے تھے پہاڑوں کے سائے میں آتی سمندر کی لہریں ڈراونا منظر پیش کرنے لگی تھیں۔لیڈی لارڈ میو بار بار جہاز کے عملے سے یہ پوچھ رہی تھیں کہ قافلہ کتنی دیر میں واپس لوٹے گا۔اس کی نظریں بار بار ان وادیوں میں جا رہی تھیں جن میں خاموش اجنبی پہاڑیاں تھیں۔شام کے اترتے سائے تھے اور جا بہ جا روحوں کی طرح گھومتے پھرتے قیدی نظر آرہے تھے۔

ماؤنٹ ہیریٹ تک پہنچنے کے لیے سمندر کے اس حصے کو بوٹ سے پار کرنا تھا جو

دور تک جزیروں کے اندر پھیلا ہوا تھا۔جیل سپرنٹنڈنٹ نے فوراً پولیس کا ایک دستہ کیپ ٹاؤن جٹی پر بھیجا۔اسی درمیان وائسرائے کا مخصوص بوٹ بھی وہاں آگیا اور قافلہ اس پر سوار ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ جہاز سے آئے ہوئے لارڈ میو کے بہت سے دوست احباب وہاں موجود کچھ کھانے پینے میں مشغول تھے۔بوٹ پر جانے سے پہلے لارڈ میو انتہائی شگفتہ دلی کے ساتھ لوگوں سے ملا جلا اور پھر ماؤنٹ ہیریٹ کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے ایک خاتون سے کہا۔

لارڈ میو۔آیئے آپ کو وہاں سے سورج کے غروب ہونے کا بے حد انوکھا منظر دیکھنے کو ملے گا۔

لوگوں کو حیرت تھی کہ لارڈ میو دن بھر پیدل دور دراز تک گھومنے کے باوجود بھی اس قدر تازہ دم کیوں ہے؟ لیکن جیسے ان جزیروں کی روح اس کے اندر حلول ہو کر اسے دیوانہ کر چکی تھی۔ان میں کئی لوگ اس کے ساتھ ہو لیے۔حالانکہ وہ سب بے حد تھکے تھکائے واضح طور پر آرام کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ماؤنٹ ہیریٹ پر چڑھتے ہوئے لارڈ میو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔اس کا ذاتی محافظ بہت ہی تھکا دکھائی دے رہا تھا۔لارڈ میو نے رک کر اس کہا۔

لارڈ میو۔تم بہت تھک گئے ہو۔میرے ساتھ آنے کی کوشش مت کرو۔یہیں آرام کرو اور شام کی ان چلتی ہوئی ہواؤں کا لطف لو۔

اسے وہیں چھوڑ کر لارڈ میو فوراً ماؤنٹ ہیریٹ کی بلندیاں طے کرنے لگا۔اسی دوران جیل سپرنٹنڈنٹ پہاڑی پر چڑھنے کے لیے جلد ہی ایک کھچر بھیجا۔

لارڈ میو۔لیکن باقی لوگ تو پیدل چل رہے ہیں۔میں کیسے کھچر پر چلوں؟

ایک افسر نے آگے بڑھ کر کہا۔''حضور والا آپ آرام سے کھچر پہ بیٹھ کر جائیں تاکہ وہاں پہنچ کر ٹھیک سے منظر کا لطف لے سکیں۔ہم آپ کے پیچھے دھیرے سے آئیں گے''

لارڈ میو کجھر پر بیٹھا لیکن اس کے اندر نہ جانے کیسی بے چینی تھی کہ اسے یہ سواری پسند نہیں آئی۔ وہ کود کر کجھر سے نیچے اتر آیا اور کچھ ہانپتی ہوئی آواز میں اس نے لوگوں کو نالنے کے لیے کہا۔

لارڈ میو۔ اب میری پیدل چلنے کی باری ہے۔ تم میں سے کوئی کجھر پر بیٹھ جائے۔

بالآخر یوں ہی پہاڑی چڑھائی سے پر جوشیلے طریقے سے جھمتے ہوئے پتھروں نالوں، پیڑوں، جھاڑوں اور نالیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے لارڈ میو ماونٹ ہیریٹ کی چوٹی پر پہنچ کر ایک صاف ستھرے پرسکون پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ ڈالی پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملاتے ہوئے اپنے ٹخنے کو پکڑا اور انتہائی پرسکون انداز میں دائیں سے بائیں پھیلی وادیوں کو دیکھا۔ یہاں تو دور دور تک بہت بڑی جگہ موجود ہے۔ ایک بار اس کی نظر نیچے بائیں جانب وائپر آئی لینڈ کے پھانسی گھر پر بھی پڑی۔ ایک لمحے کو ٹھہری اور پھر دوسری سمتوں کا محاسبہ کرنے لگی۔

لارڈ میو۔ ان جزیروں میں کوئی بیس لاکھ قیدی آباد کیے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ چند لمحہ خاموش رہا۔ لوگوں کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں اس نے سب کو دور ہونے کا اشارہ کیا اور ممکن خاموشی اور خود فراموشی کے عالم میں دیر تک پچھم کی جانب چمکتے رنگین بادلوں کے سائے میں ڈوبتے ہوئے سرخ سورج کو افق کے تاریک گود میں اترتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب سورج کا آخر حصہ بھی افق میں ڈوب گیا تو اچانک ایک عظیم تاریکی نے پورے منظر کو سیاہی مائل کر دیا۔ سمندر کی لہروں کا رنگ بدل گیا۔ تیز ہوائیں چلتی رہیں۔ جن کی بے معنی آوازیں دور پچھم دیشوں کی کہانیاں لارڈ میو کے ذہن میں بیدار کرنے لگیں اور اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور اس وقت ایک ایسے تنہا مقام پر ہے جو اس کا نہیں ہوتے ہوئے بھی اسے اپنی کشش کی گود میں اسطرح جکڑے ہوئے ہے کہ اس کا جی چاہ رہا ہے کہ اب تک وہ یہیں بیٹھا رہے۔ اس کے بعد وہ

وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر دور پیچھے کھڑا عملہ بھی اسی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

لارڈ میو۔ یہ اتنا خوبصورت منظر میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آج مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ خوبصورتی میں کتنی طاقت ہے۔ اس منظر نے تو میرے اوپر جادو کر دیا۔

عملہ اس کی بات سنتا رہا لیکن عملے کے لوگوں کی نظر وادیوں میں ابھرتے ہوئے اندھیروں پر بھی جا رہی تھی۔

لارڈ میو۔ آؤ اب چلتے ہیں۔ لارڈ میو نے تھکی ہوئی مدھم آواز میں کہا اور خود ہی آگے بڑھ کر نیچے اترنے لگا۔

ابھی قافلہ کچھ ہی دور نیچے اترا تھا کہ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ٹٹول ٹٹول چلتے راستے میں ساحل کی چٹانوں پر ٹکراتی سمندر کی لہروں کی آواز صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ سامنے دور سمندر میں کھڑا جہاز روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر کھڑی لیڈی لارڈ میو بے چینی سے جزیروں کے اندھیروں میں گھور رہی تھی۔ لارڈ میو کی پارٹی کہاں ہے اس کا وہ اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی۔ سمندر کی تیز ہواؤں کے جھونکوں سے گلاسگو آگے پیچھے ڈول رہا تھا۔ اس کے بازو میں دائیں بائیں دونوں چھوٹے جہاز ڈانا اور اسکوٹیا لنگر انداز تھے۔ تینوں جہازوں پر موجود لوگ بھی اب پریشان ہو رہے تھے انھیں اندھیروں میں موجود خطروں کا اندیشہ بے چین کر رہا تھا جو مہمان نیچے رہ گیے تھے وہ ان جہازوں پر جا چکے تھے۔ نیچے اب کوئی نہیں تھا۔ صرف اندھیرے میں یہاں وہاں حفاظتی دستے راستے میں تعینات تھے۔ ماونٹ ہیریٹ سے نیچے آتے آتے پوری طرح رات غالب آ چکی تھی۔ سات بج چکے تھے۔

شیر علی اپنے آپ سے ہم کلام تھا۔

"پہاڑوں کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اپنے ذوقِ حسن کی داد لینے والے لارڈ میو، تم پہاڑوں اور ہواؤں اور درختوں اور آسمانوں، ڈوبتے سورج، اور سمندر کی لہروں کی خوبصورتی تو دیکھ سکتے ہو۔ تم بگل اور شاہی سازوں کے معنی پر اپنے اچھے ذوق و مذاق سے اپنے تبصرے دے کر اپنے ذوق کا ثبوت تو دے سکتے ہو۔

لیکن تمہارا یہ ذوقِ حسن اس خوبصورتی کو کیوں نہیں دیکھ سکتا جو ان ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے دلوں کی ہمت میں ہے۔ جوان کی شخصیتوں کی کوششوں میں ہے، جو اس انسان کی ذات میں ہے جسے قدرت نے بڑے سلیقے سے بنایا ہے۔ تم ان انسانوں کے دل و دماغ میں رنگین کرنوں کی طرح کوندتی آزادی اور غرور کے جذبے کو کیوں مٹا دینا چاہتے ہو۔ تمہارا ذوق اس حسن کو کیوں نہیں دیکھتا۔ اس سے کیوں متاثر نہیں ہوتا۔

تم اصل حسن کے ذوق سے ابھی کتنی دور ہو؟

تم ابھی انسانیت کے حسن سے کتنے ناآشنا ہو؟

تم آنکھوں سے تو دیکھ سکتے ہو۔

کانوں سے سن سکتے ہو۔

چمڑے سے ہواؤں کی سرسراہٹ اور خنکی کو محسوس کر سکتے ہو۔

لیکن تم ان آنکھوں کی چمک، ان میں جھانکتی انسانی خواہش اور پکار کو کیوں نہیں دیکھ پائے جب یہ انسانی آنکھیں اپنی درد کو تمہارے سامنے پیش کرنے تمہارے ذوق کو پرکھ رہی تھیں! تم کس قدر ناداں لگ رہے ہو، کس قدر بے ذوق، غیر مہذب!

تم ان انسانی جسموں میں انگڑائیاں لیتی، اچھلتی کودتی، کوندتی خواہشات،

تمناؤں، ارمانوں اور ولولوں کے رقص اور دھن کو نہیں سن سکتے۔ تم نے اپنے لیے آزادی لینے کا اور اپنی آزادی کی حفاظت کا سلیقہ ضرور سیکھا ہے۔ دوسروں کو آزادی دینے کا اور دوسری کی آزادی کے احترام کا سلیقہ نہیں سیکھا ہے۔

شیر علی برطانیہ کے کسی ذمہ دار شہری کی طرح اپنے آپ سے گفتگو کر رہا تھا۔ انقلاب فرانس کے بعد والے جدید انسان کی طرح۔

"ایک ایسی حکومت جو خود قانون کی قدر کرنا نہیں چاہتی ہو اس کو خودمختاری اور راز داری کا کوئی حق نہیں دیا جا سکتا۔ ورنہ وحشت کی ایک بہت بڑی مشین وجود میں آ سکتی ہے۔ سرکار کو یا تو ایماندار ہونا چاہئے یا پھر شفاف۔ دنیا میں کسی ایسے جرم کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو سرکاری اختیارات کے بے جا استعمال سے بڑا ہو۔ کسی ایسی حکومت پر یقین کرنا اس وقت بند کر دینا چاہئے جب اس کے اعمال سے بے ایمانی کے ثبوت نمایاں ہونے لگیں۔ قیدیوں کی بدحالی کی طرف توجہ نہیں دینا اپنے آپ میں حکومت کو زمین کا سب سے بڑا مجرم پیشہ بنا دیتا ہے۔"

شیر علی سوچ رہا تھا۔

لارڈ میو ان جزائر میں آ رہا تھا۔

لارڈ پلون جزائر میں مریضوں کا مسیحا بن کر آ رہا تھا۔

لیکن وہ اسی کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جو یہاں کے لوگوں کو بیمار کرنے کا ذمہ دار تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو اس مشین کا مالک تھا جو کتنے ہی لوگوں کی بیماریوں سے موت کا ذریعہ بن گئی تھی۔

زمین پر کوئی ایسا نہیں تھا جو لارڈ میو کو اس کے سیاہ کارناموں سے روک سکتا تھا۔ اور اس کی سزا دے سکتا۔ اس کے اس کھیل کو روک سکتا جس میں وہ خود ہی لوگوں کو بیمار کرتا تھا

اور خود ہی ان کا علاج کرتا ہے۔

لیکن وہ سزا کا مستحق ہے، شیر علی نے سوچا۔

اسے سزا ملنی چاہئے، شیر علی نے اس فیصلے کو اپنے دل کی عدالت میں انسانیت، دانشوری، فطری ذمہ داری کے اصولوں کی روشنی میں لکھ دیا۔

لارڈ میو کو سزائے موت ملنی چاہئے، یہ فیصلہ اس کے ضمیر سے ابھرا اور اس کے دل و دماغ پر نقش ہو گیا۔'

وہ تیزی سے خنجر اپنے جیل کے لباس میں احتیاط سے چھپائے جٹی کی طرف بڑھ رہا تھا تاکہ وہاں لارڈ میو کے اترنے سے پہلے پہنچ جائے۔

''وہ کسی بھی قیمت پر اسے مارے گا۔''

لارڈ میو کے محافظ اس پر شک نہیں کریں گے کیونکہ وہ پھانسی پا کر جیل کے عملہ کا خاص آدمی بن چکا ہے۔ انگریزوں نے بھی اسی طرح خاص آدمی بن کر ہندوستان کے حکمرانوں کو مارا تھا مرنے کا یہی راستہ ہے۔

بے چینی سے ماونٹ ہیریٹ کی جڑ کی طرف دیکھتی ہوئی لیڈی لارڈ میو کو لالٹینوں کے ساتھ چلتا ہوا لارڈ میو کا چھوٹا سا قافلہ دکھائی دیا تو اس نے سوچا کہ اب ایک معمولی سی دوری رہ گئی ہے اور بس لارڈ میو چند لمحوں میں جٹی پر پہنچے گا اور بوٹ میں بیٹھ کر جہاز پر آ جائے گا۔ اس کی نظریں وائس رائے کے پہنچنے کے آخری لمحوں تک ادھر ہی لگی رہنا چاہتی تھیں۔ تا وقت کہ لارڈ میو اندھیروں کو پار کرتا ہوا ان جزیروں سے نکلتا ہوا روشنیوں سے بھرے جہاز پر آ جائے۔ وائس رائے کے جہاز پر واپس پہنچنے کے اس لمحے کو وہ استقبالیہ میں بدلنا چاہتی تھی۔ اس نے بینڈ پارٹی 'رول برطانیہ کے نغمے کا دھن بجانے کا حکم دیا جٹی پر لگا ہوا چھوٹا بوٹ

وائسرائے کو لانے کے لیے بھیجا گیا جٹی پر بندھا ہوا پانی میں ہلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ لارڈ میو اب تھکے قدموں سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے کانوں میں اب دھیرے دھیرے جہاز سے پھیلتا ہوا استقبالیہ نغمہ سنائی دینے لگا۔ جٹی پر آ کر اس نے آگے ان سیڑھیوں کو دیکھا جن سے اتر کر اس کو بوٹ میں سوار ہونا تھا۔ اور پھر اس نے سیڑھیوں سے اترنے کے لیے قدم بڑھائے۔ اسے محسوس ہوا کہ ان جزیروں کا سفر ان سیڑھیوں کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ اچانک اس نے سیڑھی کے بغل میں کسی پتھر کے کھسک کر گرنے کی آواز سنی۔ اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا تو دو خوفناک آنکھیں چمکتی ہوئی اس کے اوپر بجلی کی طرح گریں اور جیسے کسی شیر نے اسے اپنے پنجوں میں جکڑ لیا ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی گردن کو انتہائی مضبوطی سے دبوچ لیا اور پھر اس کی پشت میں کھچ کی آواز کے ساتھ ایک خنجر اس کے جگر تک اتر گیا۔

پھر اسی سرعت کے ساتھ بارہ محافظوں دستہ حملہ آور پر ٹوٹ پڑا اور لارڈ میو کو اس مضبوط ہاتھ کی پکڑ سے کھینچ کر باہر نکالا۔ اس سے قبل کہ محافظ دستوں میں سے کوئی حملہ آور کا مار دیتا ایک انگریز افسر نے تلوار نکال کر سب کو ایسا کرنے سے روکا۔ اس شور شرابے میں لالٹینیں ہاتھوں سے گر کر بجھ گئیں تھیں لارڈ میو شیر علی کی پکڑ سے چھوٹ کر سیڑھیوں کے اوپر سے نیچے، پانی میں گر گیا تھا۔ اندھیرے میں لڑکھڑاتے ہوئے سہارا لے کر لارڈ میو اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھوں سے اس نے اپنے بالوں کا پانی پوچھا جیسے اب وہ کچھ سنبھل رہا ہو۔ اس کا پرائیویٹ سکریٹری بھی اب اس کے پاس آ گیا تھا اور اسے چلنے میں سہارا دے رہا تھا۔

لارڈ میو۔ "بائرن"

اس نے دھیرے سے کہا۔

"انہوں نے مجھے زخمی کر دیا"

لارڈ میو کو سہارا دیتے ہوئے اور اس کے بعد پھر اٹھا کر ایک چٹائی پر جٹی کے

کنارے لٹایا گیا

لارڈ میو۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ مجھے گہرا زخم لگا ہے۔

چند لمحوں بعد۔

لالٹینیں دوبارہ جل چکی تھیں۔ اور اب سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ لارڈ میو کو چٹائی سمیت اٹھا کر ایک مختصر سے دیہاتی کھاٹ پر لٹا دیا گیا تھا جس پر اس کے پاؤں کا اگلا حصہ نیچے جھول رہا تھا اس کی پیٹھ سے نکلتا خون زمین پر ٹپکتا رہا۔ لارڈ میو نے آہستہ سے کہا۔

لارڈ میو۔ میرے سر کو ذرا اوپر اٹھا دو۔

لارڈ میو کے کھاٹ کو بوٹ میں رکھ کر جانے لگا سب کو معلوم تھا کہ یہ لارڈ میو نہیں صرف اس کا جسم ہے۔

تھوڑی دور پر رسیوں میں بندھے شیر علی کو ایک کھمبے میں جکڑ دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں اس کھاٹ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ جیسے ہی اندھیرے میں ڈوبے پانی میں بوٹ جٹی سے چھوٹ کر آگے بڑھا جہاز پر گھنٹے بجنے لگے۔ بوٹ اس جہاز کے پاس پہنچا جہاں مہمان پہلے سے پہنچے ہوئے سمندر کی تازہ تازہ شکار کی ہوئی مچھلیوں کے لذیذ دستر خوان پر چہل پہل کے ساتھ بے چینی سے لارڈ میو کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی دوران قافلے میں شامل ڈاکٹر نے لارڈ میو کے آخری سانس ختم ہونے کی تصدیق کر دی۔ جہاز پر کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ بوٹ کی بتیاں اچانک گل ہو گئی ہیں۔ بوٹ آ کر جہاز سے لگ گیا۔ اب وہاں سے لارڈ میو کا کھاٹ اٹھایا جا رہا تھا۔ لارڈ میو کی لاش کو اس کے کیبن میں لا کر اس کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ پورے جہاز پر سوار چھ سو لوگوں پر عمیق خاموشی طاری ہو گئی۔

جہاز پر لہراتا ہوا پرچم سرنگوں ہو گیا۔

جھکے ہوئے جھنڈے اور لارڈ میو کے مردہ جسم کے ساتھ جہاز تیزی سے سمندر کی لہروں کو پھلانگتا ہوا کلکتے کی جانب چل پڑا۔ رسیوں اور زنجیروں میں بندھا ہوا شیر علی جسے ایک کھمبے میں باندھا گیا تھا اس آسمان کی طرف دیکھتا رہا جس کے سائے میں جہاز واپس کلکتے کی طرف جا رہا تھا۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ جہاز ان لمحوں میں اس کا پیغام بر بن گیا تھا۔

"انسان لارڈ میو اور شیر علی سے عظیم تر ہے" اس نے جیسے چیخ کر اس جزیرے کی وادیوں میں بھاگتی ہواؤں سے کہا۔ اس کے اردگرد بھاری بوٹ پہنے اور سنگین لگی رائفلیں لٹکائے سپاہی پتنگوں کی طرح کاٹ رہے تھے۔

ایسی باتیں کیوں ہوتی ہیں۔ اتنے عظیم لوگ ناکام کیوں ہو جاتے ہیں کہ بار بار انسانوں کا خون دریا کی طرح بہتا ہے۔

❖❖

بہت سے لوگ زنجیروں میں بندھے شیر علی کے ارد گرد جمع کر دیا تھا۔ ایک وائسرائے کے قتل نے اسے قاتل ہوتے ہوئے بھی اہم اور اس کے مقام کو قابل رشک بنا دیا تھا۔ اب اس کے منھ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ اہم اور انتہائی بامعنی ہو گیا تھا۔ کبھی اس کو ذاتی طور پر پہچانتے تھے۔ وہ سب کو ذاتی طور پر دوستی کی حد تک جانتا تھا۔ وہ لوگ کہ رہے تھے۔

'تم نے ایک شریف النفس انسان کو قتل کر دیا۔'

"تم نے ایک شریف النفس انسان کو قتل کیا ہے، کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ لارڈ میو کی کیا غلطی تھی کہ تم نے اس کو ہلاک کر دیا؟ اس کی بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر دیا۔ کیا سوچا ہوگا اس شخص نے جب تم نے اس کو چاقو مارا ہوگا، لارڈ میو وہ شخص تھا کہ جس نے یہاں کے قیدیوں کے حقوق محفوظ کئے۔ وہ تم لوگوں کے لیے ایک ہسپتال بنانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے تمہارے اوپر بھروسہ کیا اور تمہارے بیچ کھلے دل سے آیا اور تم نے اس کے بدلے اسے چاقو مارا...... تم غدار اور باغی لوگ واقعی غدار ہو، تم وفاداری اور انسانیت کو نہیں جانتے"

شیر علی نے جواب دیا۔

"میں نے لارڈ میو کو نہیں، حکومت برطانیہ کو چاقو مارا تھا۔

'اگر انگلستان کے شہری ہوتے تو کیا کرتے؟ وہاں کے پرائم منسٹر کو خنجر مارتے یا نہیں۔'

'پھر یہ تم نے کیا سوال کر دیا۔ مجھے لگتا ہے تم نے میرے دل کی بات سمجھ لی۔

کاش میں برطانوی حکومت کا غلام نہیں بلکہ شہری ہوتا مجھے لارڈ میو کے خون سے ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں پڑتی میں اس سے بھی زیادہ نتیجہ خیز کام کرتا ہوں۔ میں کمپنی بہادر کی حمایت کرنے والی حکومت کو ایسے خنجر سے مارتا کہ خون کا ایک قطرہ نہیں ٹپکتا۔

سپاہی، میں نے یہاں جیل سے بہت سوچا ہے، رات بھر سوچا ہے۔ میرے جیسے آدمی کے لیے جان سے ہاتھ دھونے کا فیصلہ آسان نہیں ہوتا۔ انسان کی زندگی اس کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے اور میں نے اس دولت کو قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس قید کے خلاف کبھی احتجاج نہیں کیا،، میں نے جیل کی سختیوں کے خلاف کبھی احتجاج کیں میں نے جیل کی ہر جائز ناجائز سختی کو افسروں کی مجبوری سمجھ کر برداشت کیا لیکن جب سے مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ حکومت مکار ہے اور اپنے اقتدار کا استعمال تجارتی مفاد کے لیے کر رہی ہے اس دن سے نہ صرف میرے دل سے اس کے لیے احترام مٹ گیا بلکہ یہ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ انسان کو ایک ایسی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر تجارتی اور سیاسی مکاری کے خلاف اس کی حفاظت کرے۔ جس پر وہ آنکھ بند کر کے بھروسہ کر سکے۔ اور وہ چپکے چپکے تاجروں کے لیے ہمارا استحصال کرتی ہے۔ یہ ہماری پھانسیاں، یہ سارا زدو کوب، کالا پانی کی سزا۔ یہ حکومت کا حصہ نہیں دھندا ہے۔ یہ انسانوں کے جسم اور جان کالا پانی انسانوں کا خون چوسنے والی ایک مشین ہے، لارڈ میو یہاں ہماری صحت کی غرض سے یہاں ہاسٹل کھولنے آیا تھا، تا کہ اس کی مشین بہتر طریقے سے چل سکے۔ اس کے دل میں ہمارے لیے ہمدردی نہیں لالچ تھا۔ وہ یہاں اب ہماری تعداد بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ یہاں بیس لاکھ انسانوں کو لانا چاہتا تھا کس کے لیے دنیا کی کون سی حکومت اپنے شہریوں کو ان کے وطن سے اجاڑ کر اپنی ضرورت کے مطابق بسانا چاہتی ہے۔ یہ حکومت کا کام نہیں۔ حکومت پوری طرح تاجروں کے دست قدرت میں آچکی ہے۔ حکومت خود ایک قیدی بن چکی ہے، جواب تاجروں کی سنگینوں کے اشارے پر چلنے پر مجبور ہے۔ اگر میں برطانوی شہری ہوتا تو برطانوی پارلیمنٹ میں پہنچ کر حکومت کے ان غاصبوں کا خاتمہ کرتا لیکن میں تو محض کالا پانی کے اس مشین کا ایک پرزہ تھا اس لیے مجھے خنجر اٹھانا پڑا۔'

برطانوی سپاہی شیر علی کا جواب سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اسے لگا کہ اس جنونی دکھنے والے ہندوستان پٹھان نے آج پہلی بار اس پر جمہوریت کا معنی کھولا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بھول گیا کہ وہ ایک مجرم سے بات کر رہا ہے۔ اسے اپنے سامنے صرف لارڈ میو وائسرائے کا قاتل دکھ رہا تھا۔

"اگر اس شخص کے پاس حق رائے دہندگی ہوتی تو لارڈ میو کا قتل نہیں ہوتا۔"

کیمپ میں دوسرے قیدی محو گفتگو تھے۔

اس نے دراصل اس حکومت کو چاقو مارا تھا۔ جو ہمیں غلام بنانے کے لیے مسلسل اپنی طاقت، اپنا دباؤ اور اپنی ترکیبیں تیز تر کر رہی ہے جو ہمارے اوپر طاقت، خوف، لالچ اور ہر قسم کے حربے استعمال کر کے غلام بنانا چاہتی ہے ...... لارڈ میو ذاتی طور پر ایک شریف انسان ہو سکتا ہے ...... لیکن جس طرح میدان جنگ میں سپاہی کی ذاتی شرافت اور خاندانی حالات کو مدنظر نہیں رکھا جا سکتا اسی طرح حکمراں پہلے حکمراں ہوتا ہے اور اسکو حکومت کے حوالے سے پہچانا جائے گا اور اس سے ٹکراتے ہوئے اس کی ذاتی خوبیوں کا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا۔ میں غدار تو نہیں لیکن باغی ضرور ہوں، اور باغی سے اپنے کو محفوظ رکھنا حکومت کا کام ہے۔ یہ میری خطا، میرا جرم نہیں کہ میں نے لارڈ میو کو مار دیا۔ یہ لارڈ میو اور ان کی حکومت کی خطا ہے کہ اس نے ایسے انتظامات نہیں کیے کہ وہ لارڈ میو کی حفاظت کر سکتی۔ اگر لارڈ میو بے خوف اور کھلے دل سے ہم قیدیوں کے بیچ آیا تو یہ اس کی شرافت اور نیک دلی نہیں بلکہ اس کی بیوقوفی اور نادانی اور نااہلیت تھی۔

اور جو حکمراں اتنے نااہل ہیں ان کا اگر قتل ہوا ہے تو اس میں باغی مجرم نہیں کہ باغی کا باغی ہونا اپنی جگہ درست ہے۔ جرم اور غلطی حکمراں کی ہے۔ اور ہر حکمراں جانتا ہے کہ جب وہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں کیا خطرات ہوتے ہیں۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو اس کے لیے وہ لاپرواہ سیکورٹی فورس ذمہ دار ہے، اور نالائق ہے، میں نہیں ہوں۔"

اور اگر تم مجھے پھانسی کی سزا دینا چاہتے ہو اگر تم مجھے اس بات کی سزا دینا چاہتے ہو کہ میں نے حکمراں کو مارا ہے تو تم ان انگریزوں کو بھی سزا دو جنھوں نے بہادر شاہ سے دھوکے سے حکومت چھین لی تھی۔

یا پھر تم یہ تسلیم کرو کہ تم بھی غلط تھے اور ہم بھی غلط ہیں، مجھے صرف یہ کہنا کہ ہم اس لیے غلام بنائے جانے کے قابل تھے کہ ہم نااہل تھے، کافی نہیں ہے۔ جنگیں ہار جانے سے نااہلی نہیں ثابت ہو جاتی۔

تم نے تیل کی ان چکیوں میں ہندوستان کے جنگ آزادی کے سورماؤں کو جوت رکھا ہے یہ دکھانے کے لیے کہ یہ مجرم ہیں، ناکارہ ہیں، اگر تمہاری پوری فوج لارڈ میو کو ایک انسان سے نہیں بچا سکی تو تمہاری پوری فوج سے اگر مغل ہار گئے تو کیا ہوا؟

لارڈ اپنے جانے مانے دشمن سے اپنے کو نہیں بچا سکا تو ہندوستان کے شریف النفس بادشاہ انگریزوں سے دھوکا کھا گئے تو کیا ہوا۔ دھوکا میں نے نہیں کیا کہ میں نے دوستی کا ہاتھ بڑھا کر چاقو نہیں مارا۔ دھوکا تم نے دیا تھا کہ تم نے دوست بن کر ہمارے اسلاف کو دھوکا دیا۔

اگر کوئی ایک بات لارڈ میو کی موت کی ذمہ دار ہے تو یہ لارڈ میو کی یہ غلط فہمی ہے کہ آزادی کے احساس سے لبریز لوگ دباؤ اور اذیت میں دب کر ٹوٹ جائیں گے۔ غلام بن جائیں، آزادی سب سے عزیز شئے ہے اور اس کے لیے تو ہم جھوٹ بولنے، چوری ڈکیتی کرنے' گویا کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔"

اگر تم لارڈ میو کی موت سے کوئی ایک سبق یاد رکھنا چاہئے ہو تو یاد رکھو کہ جو قومیں آزادی کی لذت سے آشنا ہو جاتی ہیں ان کی فطرت بدل جاتی ہے۔ اور ان کو لالچ یا خوف کسی بھی چیز سے دوبارہ غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ عدالتی کارروائی سے واپس لاتے ہوئے ایک ہندوستانی سپاہی نے شیر علی سے کہا: "یہ ایک شریف النفس اور نیک انسان تھے، وہ ہماری

فلاح کے سلسلے میں جذباتی حد تک وابستہ تھے۔ مرتے وقت انھوں نے کیا محسوس کیا ہوگا کہ انھیں ان لوگوں نے قتل کیا، جن کی بھلائی میں وہ کوشاں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ بھی ان کو ایک شہید اور تم کو ایک خونخوار قاتل کے طور پر یاد کرے گی۔''

شیر علی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس کی سانس کسی گہری سوچ کے بعد تیز ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک غار سا بن گیا۔ لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا: ''تو پھر میں کس کو مارتا؟''

''اب تو مار چکے ہو، پہلے سوچا ہوتا اور پوچھا ہوتا تو کچھ اور ہی بات ہوتی۔ دشمن تو پیچھے کھڑا تھا۔'' سپاہی نے گہری سوچ میں ڈوب کر کہا۔ ''کون؟'' شیر علی نے اسے غور سے دیکھا۔

''وہ جس نے تم کو اکسایا۔''

شیر علی کی سوچ میں گڑبڑ پیدا ہوگئی۔

''ایک بات تو بتاؤ۔'' سپاہی نے محبت سے پوچھا۔

شیر علی اسے دیکھنے لگا۔

''اگر تمہارے پیغمبرؐ صاحب تمھیں خواب میں دکھ جاتے تو وہ تمھیں اس کی اجازت دیتے؟ ایک اتنے معصوم اور نیک انسان کے قتل کی اور وہ بھی اس انداز میں۔ بغیر مقدمہ چلائے، بغیر صفائی کا موقع دیے۔ اللہ نے اس کے دل میں نیکی کی شمع ڈالی تھی۔ تم نے اسے بجھا دیا۔''

''تو میں دوزخی ہوں، جہنمی ہوں۔''

''بے شک دوزخی ہو۔ لیکن ایک بات کہوں، شیر علی اب سرد پڑ گیا تھا۔ سپاہی نے کہا: ''قیامت کے دن تم کو سزا دینے سے پہلے خدا اس مقتول سے پوچھے گا۔ لارڈ کی روح سے اور وہ تمھیں معاف کر دے گا۔ مجھے یقین ہے وہ تمھیں معاف کر دے گا۔ پھر خدا بھی تم کو معاف کر دے گا۔ یہ مقتول سمجھتا تھا کہ دوزخ کی آگ کہیں کیسی ہے۔ اس نے کالا پانی کے اس دوزخ کی آگ کو محسوس کر لیا تھا جو اصل دوزخ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ کیونکہ اس میں معصوم لوگ ڈالے جاتے ہیں۔ تبھی وہ یہاں اپنے ہاتھوں سے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک جیل کی سلاخوں کے آر پار بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ایک بے پرواہوا مسلسل جنگلوں میں چلتی رہی۔ پھانسی گھر پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اور جیلر کے مکان کے سامنے کی فوجی ٹکڑی اور بھی مستعد ہوگئی تھی۔

❖❖

rekhta

رات کی پچھلی میں جذبۂ شہادت سے لبریز خواب نیست و نابود ہو چکا تھا۔ لیکن رات کے آخری پہر پٹھان جاگ اٹھا۔ ’تم نے آنکھوں پہ کالی پٹی باندھ کر اور ہماری زندگی ہماری نظروں سے دنیا کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا ہے۔ ہمارے دوسرے ساتھی قیدیوں سے دور لا کر پھانسی کے پھندے پر لیجاتے ہوئے تم یہ سمجھتے ہو کہ اب میری آواز صدا بہ صحرا اور صرف ایک بے معنی بکواس ہے، اب میرے نعروں پر بھی تم کو ہنسی آئے گی جن نعروں کا ذکر تاریخ میں کبھی نہیں آ سکے گا الفاظ میں جن کی قیمت مجھ سے بہتر تم جانتے ہو کہ یہ بھی صدا بہ صحرا ہیں۔

لیکن میں تم پر صرف ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ آوازیں جو میری زبان سے نکل رہی ہیں وہ صدا بہ صحرا نہیں، وہ بے معنی نہیں، وہ تو ایک گونج ہیں، عکس ہیں، روشنی کی وہ انمٹ کرن ہیں۔ پھول سے نکلی ہوئی وہ خوشبو ہیں جو اپنے ڈھول، اپنے چراغ، اپنے چمن سے دور ہو گئی ہیں۔ لیکن جنھوں نے اپنی جھنکار، اپنی چمک اور خوشبو کو کھویا نہیں ہے۔ یہ چمک، یہ جھنکار یہ خوشبو، اس اعلیٰ درجہ کی ہیں جو تنہائی میں بھی زندہ رہنا جانتی ہیں، یہ نعرہ، جو نعرہ میں لگا رہا ہوں، یہ نعرہ نعرہ نہیں، صرف گونج ہے، میری فنا اس نعرہ کی فنا نہیں، اس گونج اس چراغ، اس پھول اس چمن کی فنا نہیں جس سے میں نکلا ہوں۔ انسان تو پھول ہے، کھلتا ہے مرجھانے کے لیے لیکن چمن باقی رہتا ہے۔ انسان کو ایک خبر ہے، اس تاریخ، اس تہذیب، اس تمدن، اس روایت کی جو کبھی مرتے نہیں۔ انسان تو وقتی ہے، لیکن تہذیبیں دائمی ہیں، جنگیں لڑی جاتی ہیں، یہ جان کر کہ جب جنگ ختم ہوگی تو کافی لوگ اس فیصلہ کو، اس ملک اس سلطنت اور اس کے پرچم کو دیکھنے کے لیے باقی نہیں رہیں گے۔ انھیں یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ فتح ان کی فوج کی ہوگی یا دوسروں کی اور ان کے خواب تعبیر بنیں گے یا مر جائیں گے۔ لیکن سپاہی جنگ لڑتے ہیں اور جرأت سے لڑتے ہیں۔ اس لیے کہ جنگ سپاہی نہیں لڑا

کرتے بلکہ جنگ خواب لڑا کرتے ہیں مقاصد لڑا کرتے ہیں، اور سپاہی خود کچھ نہیں ہوتا، وہ خواب، وہ مقصد ہی سپاہی کو پیدا کرتے ہیں۔ تہذیبیں عظیم ہیں اور تہذیبوں کی لڑائیاں دن اور مہینوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں ہوتی ہیں، نسل در نسل ہوتی ہیں۔ کبھی دشمن حاوی ہو جاتے ہیں، اور کبھی خود ہم حاوی ہو جاتے ہیں، ہمارے کسی سپاہی کو دشمن مار دیتا ہے، اور دشمن کے کسی سپاہی کو ہم مار دیتے ہیں۔ جنگیں یوں ہی ہوا کرتی ہیں ہم تو اس جنگ کے سپاہی ہیں جو دو تہذیبوں کے، دو قوموں کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ ہم تو وہ سپاہی ہیں جن کی تلواریں ٹوٹ گئیں اور جن کو قید کرنے میں تم کامیاب ہو گئے۔ لیکن ہماری تہذیب کی لڑائی تم سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہو رہی ہے۔ شہروں کی بھیانک خاموشی میں جنگ کی دھڑکن موجود ہے۔ دیہاتوں کی اجڑتی بستیوں میں کشمکش جاری ہے۔ زبانوں، تہذیبوں، فن اور ادب کے محاذ پر جنگ جاری ہے۔ عدالتوں میں، جیلوں میں، پھانسی گھروں میں، حتی کہ جزائر انڈمان کی اس طویل ویران اور بھیانک سناٹوں میں بھی یہ جنگ جاری ہے۔ تاریخ کا قلم بڑا عجیب و غریب ہے۔ تاریخ ہمارے ان نعروں کو لکھ نہیں سکتی لیکن محسوس کر سکتی ہے۔ اور محسوسات کو لکھ سکتی ہے۔۔ ہماری تہذیب نے اپنی ساری کوششوں، ساری تربیتوں ساری تعلیم، اور صدیوں کے تجربات سے ہم کو جو شئے دی ہے۔ اور جو ہماری تہذیب کا اصل مقصد رہی ہے۔ وہ ہے وہ انسانی معیار جس بلندی پر ہم نے جانے اور رہنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ معیار ہی ہماری اس فانی زندگی کا مقصد ہوا کرتی ہے اور وہ معیار ہے خدا کے علاوہ کسی دوسری طاقت کے سامنے سجدہ نہ کرنا، اپنی خودداری، اور اپنی آواز کو باقی رکھنا۔ تمہاری ساری اذیت جو تم ہم کو اس لیے دے سکتے ہو کہ ہمارا جسم تمہارے قبضے میں ہے، ہم سے ہماری اصل دولت کو نہ چھین سکے۔ تم نے ہمارے جسم میں جونک لگا دئے، تم نے ہمارے جسموں کو کھنکھجوروں کے زہریلے ڈنک سے زہر آلود کر دیا اور تم خوش ہوئے اس لیے کہ تمہاری غلامانہ طبیعت اور تہذیب تم کو یہی تربیت دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ انسان جسم کا غلام اور عکس ہے۔ ہم اس جسمانی تکلیف کو، ایک محنت، ایک مشقت صرف مشقت سمجھتے ہیں، اور ہم اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس مشقت کو سہنے کے عادی ہیں۔ اور جسم کو زندگی اور شخصیت نہیں بلکہ زندگی اور شخصیت کو قائم

رکھنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، جسم ہماری سواری ہے، ہماری راہ، ہماری منزل نہیں۔

تم یہ سمجھتے ہو کہ تم میری زندگی کا خاتمہ کر کے میری زندگی کا چراغ گل کر دو گے۔ اور تم یہ نہیں جانتے کہ ہمارے نزدیک زندگی سانسوں کا نام نہیں، روز و شب کا نام نہیں، زمینوں، پہاڑوں، سورج، چاند، دیا، زمین اور جنگلوں کا نام نہیں، بچوں، عورتوں اور اہل و عیال کا نام نہیں، ہمارے نزدیک زندگی کا مطلب وہ عظیم خواب ہے جس سے ہم منسلک ہوتے ہیں۔ وہ غرور ہے، وہ ناز ہے، جو ہمیں اپنی تہذیب اور اپنے تمدن پر ہوتا ہے، وہ یادیں اور عظیم لمحے اور ان عظیم لمحوں کا سرور ہے۔ جو ہماری تمام کاوشوں کا مرکز ہے وہ بلندی ہے جس بلندی پر ہم زندہ رہتے ہیں اور مرتے ہیں، اس بلندی پہ ہم پیدا ہوئے تھے۔ اس بلندی پر رہنے میں ہم کامیاب ہو گئے۔ اس بلندی پر ہی ہمارا خاتمہ ہو رہا ہے' فرد کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ آنکھوں کا خاتمہ ہو رہا ہے ہماری قیمت، ہماری بلندی جو مرتے وقت باقی ہے وہ باقی رہے گی۔

تم نے شاید یہ سوچا تھا کہ تم ہم کو اپنے تباہ کن نظام کی بگھی کھینچنے والا گھوڑا بنا سکو گے۔ تم نے شاید یہ سوچا تھا کہ جب ہم کو اپنے جسم اور روح اور اپنے نعروں اور خوابوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا تو ہم یہ سوچ کہ یہ ہمارے نعرے اور خواب تو محض خواب ہیں، اور اب انڈمان کی اس مجبور و محصور تنہائی میں ان خالی بے معنی خوابوں کے لیے اپنے جسم اور روح کو برباد کرنا ہے سود اور بیوقوفی ہو گی لیکن تم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ خواب فرد کے خواب نہیں بلکہ ایک بڑا خواب ہے اور یہ معیار جو میرے ساتھ ہے اس معیار کا کسی ملک یا سماج سے اور کسی جگہ سے تعلق نہیں، اور ان کا کسی سماج اور تنہائی سے مطلب نہیں یہ آزاد ہیں' یہ ایک چمک ہے، ایک آبرو ہے اور ہم اپنی آبرو کے لیے باقی رہنا چاہتے ہیں اور مرنا چاہتے ہیں۔

میری اس طویل اور زندگی کی آخری گفتگو کا مطلب صرف یہ ہے کہ میں پھانسی کے پھندے پر جاتے ہوئے تم کو صرف یہ بتلا دوں کہ تم میری زندگی کے اس آخری لمحہ سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہو، کہ زندگی زندگی کی عظمت تجارت سے نہیں ہوتی، دولت سے نہیں

ہوتی، جنگیں جیتنے اور ملک فتح کرنے اور اپنے مخالفین کو قید کرنے اور ان کے جسموں کو اذیت دینے سے نہیں ہوتی' زندگی کی عظمت یہ ہے' یہ خودداری' یہ اٹل سچائی جو تم ابھی دیکھ رہے ہو اور تاریخ کی سب سے بڑی اور سب سے اٹل سچائی یہی ہے۔ یہی سچائی کہ کون سی تہذیب کتنے مضبوط کردار پیدا کرتی ہے کہ اس کے افراد تنہائیوں میں بھی اپنے وقار اور اپنے اصولوں کو باقی رکھتے ہیں اور تمہاری طرح تنہائیوں میں اپنے نقلی لبادوں کو اتار کر ننگے نہیں ہو جاتے! ہم تو صرف یہ جانتے ہیں اور ہمارے آبا و اجداد نے تو ہم کو پیدا کرنے کے بعد یہ تعلیم دی کہ ہم نے تم کو اس لیے پیدا کیا کہ تم یہ یاد رکھو کہ شیر کی موت ٹکڑوں پہ پلنے والے اور ظالم حکمرانوں کے سامنے دم ہلانے والے سرکاری نوکروں، اور جلادوں کی زندگی سے ہزار گنا بہتر ہے پھانسی کا پھندا کھینچ دو۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ ہمیں یہ پھندے ماریں گے، تمہیں موت مارے گی۔ اگلی صدی میں نہ ہم ہوں گے، نہ تم ہو گے' تمہاری تہذیب تمہارے لیے' ہماری تہذیب ہمارے لیے!! بھیج دینا میرا یہ پیغام لارڈ میو کے تابوت کے ساتھ لکھ کر بھجوا دینا اپنے اخباروں میں اور کہنا اپنے ملک کے ایوان حکومت کے اراکین سے کہ وہ محسوس کریں کہ معصوموں کے قتل سے کتنا درد پیدا ہوتا ہے۔

جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی۔ جلاد نے کہا: شیر علی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

صبح ایک رپورٹ جیل سے تیار ہو کر لندن بھیج دی گئی

'دہشت گرد قاتل شیر علی کو آج صبح ساڑھے چار بجے پھانسی دے دی گئی۔

کیا میں صحیح نوٹ کر رہا ہوں۔ خالد نے انٹرنیٹ پر دوبارہ میوزیم کی لائبریری میں جو لندن کی ایک قدیم عمارت میں واقع تھی۔ اس بوسیدہ ٹیلی گرام کو پڑھا جو اب ڈیجیٹل تصویری شکل میں تھا۔ اس نے اپنے نوٹ کو درست کر لیا کیونکہ وہاں صرف اتنا لکھا تھا: Sher Ali was hanged to death on this day.

ممکن ہے دہشت گرد کا لفظ میڈیا نے استعمال کیا ہو۔ لیکن شیر علی تو صرف قاتل تھا۔ البتہ وہ پوری برطانوی سلطنت میں دہشت کی ایک زبردست لہر ضرور پیدا کرنا چاہتا تھا۔

شاید یہی اس کے آخری الفاظ تھے جو اس نے ہلکے لیکن باوقار لہجہ میں نعرے کی طرح ادا کیے۔

پھر پھانسی کا تختہ کھینچ دیا گیا، اور ایک لاش رسی پر جھول رہی تھی۔

❖❖

اور پھر کئی برس گزر گئے۔

اور وہ جلاد بھی اور زیادہ شراب پینے کی وجہ سے مر گیا۔

عمر رفتہ کی رو میں رفتہ رفتہ وہ تمام لوگ جو قید تھے، اور وہ تمام لوگ جو جیل کے مالک تھے، سب فنا ہو گئے، خاک میں مل گئے۔ صرف چاتھم اور وائپر اور انڈمان کے دوسرے جزیرے باقی رہے۔

زمانہ ایک صدی سے زیادہ آگے آ چکا ہے

آج وائپر جزیرہ میں روزانہ ایک کشتی صبح جاتی ہے۔اور شام ادھر سے لگ کر آتی ہے وہاں ایک پھانسی کا کھنڈر ہے۔عمارت ایسی ہے مقدس جیسے گناہوں کی ہوتی ہے۔ دوسرے مکان جو تب جیل کے عملے کے تھے،اب وہاں صرف بنیاد کی اینٹیں اور دیواریں ہیں،ایک دیوار ایک پیپل کے بڑے پیڑ میں بلکی سی اگی ہے۔اور ایک لوہے کا پھاٹک بھی اسی میں پھنسا ہوا ہے،وہ مری طرف کی عمارت جو شاید سپاہیوں کے رہنے کے لیے تھی،اس میں ایک دو مزدور مویشیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔اس سے آگے اب بھی وہ سنتری کا پہرہ گاہ ہے اور اس سے آگے جیل کے مکان کے کھنڈر ہیں اور نوکروں کی مارکوں کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر ہیں۔ اس سے آگے اس اجڑے ہوئے جزیرے میں ایک تالاب ہے جس کی سیڑھیاں اب بھی کسی زمانے کے جیلروں اور ان کے احباب کے لیے غسل اور تفریح طبع کے زمانے کی یاد دلاتی ہیں۔تمام ہرے بھرے جنگل ہیں،گاڑیاں ہیں،سڑکیں ہیں۔نہر ہے۔کنارے گارڈ روم ہے جو شاید تھانہ بھی تھا۔اس کے ارد گرد جنگی کی دیواریں ہیں اور بس' نہ کوئی قبر ہے۔نہ مزار ہے!پھانسی کے گھر میں پھانسی دے کر لاشیں ایک طویل سرنگ کے ذریعہ سمندر میں ڈال دی جاتی تھیں جہاں وہ سڑ جاتی تھیں اور مچھلیاں ان کو کھا جاتی تھیں۔اگر دھوپ جلانا چاہیں،اگر دھوپ جلانا چاہیں،اگر چراغ روشن کرنا چاہیں۔

آپ اگر ان تمام لوگوں کے لیے فاتحہ پڑھنا چاہیں،تو اسی پھانسی گھر یہ پڑھنا پڑے گا۔جہاں شہید اور قاتل ایک ساتھ مرے ہیں،جہاں ہندو اور مسلمان ایک ساتھ دفن ہیں،جہاں کے دار و رسن پہ لوگوں کو اس لیے لٹکا دیا گیا کہ انہوں نے ظلم کے خلاف احتجاج کیا،جنھوں نے جسم کی موت اور اذیت اور رسوائی قبول کی لیکن اپنی انا کو رسوا نہیں ہونے دیا اور ان لوگوں کی بھی روحیں وہاں سے فنا ہوئیں اور لاشیں سمندر سے مل گئیں جنھوں نے

مظالم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے،اور معافیاں مانگنے کی کوشش کی اور ان عورتوں کی بھی لاشیں ہیں جنھیں رسوا کیا گیا۔جن کی عصمت دری کی گئی،اور جن کو کئی کئی مردوں کے ساتھ ننگے سونا پڑا' یہ تمام لوگ ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں یہ تمام خون، یہ تمام لاشیں،ایک ساتھ دفن ہیں' یہ ایک مقبرہ ہے ایک ایسا مقبرہ جو تمام مقبروں سے مختلف ہے لیکن آج یہاں وہ لوگ جاتے ہیں جن کے خاندان کا کوئی بزرگ یہاں آ کر مارا گیا اور وہ لوگ جاتے ہیں جو ایک پھانسی گھر اور پرانے جیل کو دیکھنے کی تمنا لے کر انڈمان کی سیر کو آتے ہیں لیکن اس جیل کے ریکارڈ بھی جو سیلولر جیل پورٹ بلیر میں رکھے ہوئے تھے، جاپانیوں نے تباہ کر دئے،اور آج وہ ایک ویران، گمنام، جزیرہ ہے جسے لوگ پھانسی گھر سمجھ کر، جہاں قاتلوں اور ڈاکوؤں کو اذیتیں دی جاتیں،نفرت کی نگاہ سے دیکھنے میں فاتحہ پڑھنے کوئی نہیں جاتا پھول چڑھانے کوئی نہیں جاتا اس لیے کہ کوئی نہیں جانتا کہ وہاں کیا ہوا تھا،اس لیے کہ جب وہ سب کچھ ہوا تھا وہ ہندوستان کے آباد شہروں اور گاؤں سے اس قدر دور اس گمنام جزیرے میں ہوا تھا جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا اور جو گواہ تھے،اور جن آنکھوں نے سارے عذاب دیکھے تھے۔اور جن کانوں نے سارے رسوائی کے جملے سنے تھے اور جن زبانوں نے احتجاج کے جملے بلند کیے تھے وہ سارے کے سارے لوگ دفن ہو گئے،مٹ گئے،اس قبرستان،اس مرگھٹ کی طرف جا کے دفن ہو گئے جہاں اب موت کا سناٹا ہے جہاں کوئی چراغ نہیں ملتا۔

سنتے ہیں جزیرہ وائپر کا ایک قیدی ایک گیت گایا کرتا تھا۔ایک سپاہی کو اس کی آواز بہت پسند تھی لہذا اس کو بھی وہ گیت یاد رہ گیا۔اور اس کے بچوں نے اس سے وہ گیت سن لیا ان کو یاد ہو گیا وہ بچہ ایک دن سمندر کے کنارے بیٹھا گا رہا تھا۔

اے سمندر کی لہروں!

تم تو بڑے بڑے جہازوں کو لے جاتے ہو۔

میں ایک خشک پتے پر

یہ خط لکھ کر تمھیں دیتا ہوں۔

تم اسے کسی برہا گانے والے تک پہنچا دینا

یا میری کہانی

بستیوں میں لو اور کش کی کہانی سنانے والے کو سنا دینا اور یہ بتا دینا، کہ میں سولی پہ جاتے وقت اتنا کہہ گیا تھا۔ ہمیں یہاں سزا نہیں دی جا رہی ہے۔

'اے تیز ہواؤ'

اے ناریل کے درختو!

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ

''یہ قید نہیں، بیگار ہے، اور ہم قیدی سے مزدور بنا دیے گئے ہیں۔''

پھر جیسے پورا منظر بہت گہری آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

کھیل کا میدان ہے

کھیلو گے تم گھر جاؤ گے

تم کو کیا معلوم کہ

اس ریت پہ کیا گزرے ہے

اس گھاس پہ کیا گزری ہے

تم کو کیا معلوم ہے

کہ کتنے پتھر ٹوٹے

کتنی آگ نکلی

کتنے طوفاں اٹھے

کتنے ابر برسے

تب کہیں ان پتھروں پہ گھاس ابھری

کھیل کا میدان ہے

دور سے تم نے بھی دیکھا ہے یہ نظارہ

کہ کتنی کشتیاں ڈوبیں

اور کتنے لوگ چلاتے ہوئے

لہروں کے نیچے دب گئے

پر وہ کیا کہتے ہوئے

ڈوبے تھے، یہ لہروں سے پوچھو

تم کیا معلوم

بچے ہو ابھی تم

کھیل کا میدان ہے یہ

کھیلو گے پھر گھر جاؤ گے

تم کو کیا معلوم

کیسے؟

اور کیوں

کچھ لوگ

مر جاتے تھے

ان پھندوں پہ جا کر

دل کے بھاری پتھروں میں

ان کہی باتیں دبائے

دوریوں کی دھند میں

جاتے ہوئے

ہنستے ہوئے، روتے ہوئے

یاد کرتے کرتے تم کو

اور یہ ارماں لیے

کہ ایک دن سمجھے گا ان کی بات کوئی

بات وہ جو وہ کسی سے کہہ نہ پائے

اور کوئی سن نہ پایا

تم نے گیتوں میں سنا ہوگا

کتابوں میں پڑھا ہوگا

ڈرامے تم نے کر کے خود دکھائے

ہوں گے لوگوں کو

مگر اسٹیج کیا ہے

کھیل کا میدان ہے

کھیلو گے، پھر گھر جاؤ گے

تم کو کیا معلوم ہے

اس ریت پہ کیا گزری ہے

اس گھاس پہ کیا گزری ہے

تم گھروندوں پر گھروندے

گھر پہ گھر

سڑکوں پہ سڑکیں

سب بناتے جا رہے ہو

کارنامے اپنے ان آزاد

ہاتھوں کے

دکھاتے جا رہے ہو

مسکراتے جا رہے ہو

تم کو کیا معلوم ہے اس

ریت پر کیا گزر رہے

اس گھاس پہ کیا

گزری ہے

آنے جانے والوں کا ایک سلسلہ چلتا رہا ہے

اور یہیں کا ہو کے رہ جانے کا، مر جانے کا

مٹ جانے کا بھی ایک سلسلہ چلتا رہا ہے۔

مجھ کو کیا معلوم لیکن

ایک دن وائپرا کے اوپر ایک لوہے کا زنگ آلود ٹکڑا

کہہ رہا تھا

'دیکھنے کی چیز ہے یہ، دیکھنے آئے ہو تم،

دیکھو گے پھر گھر جاؤ گے،

تم کو کیا معلوم کہ اس ریت پر کیا گذری ہے

اس گھاس پر کیا گذری ہے

وہ جو آئے تھے پکڑ کر نیند سے، گلیوں سے،

سڑکوں سے، اُٹھا کر چائے خانوں سے

بہت پہلے یہاں

یہ جزیرہ کہہ رہا تھا

اس گھاس پہ کیا گزری ہے

تم گھروندوں پر گھروندے

گھر پہ گھر

سڑکوں پہ سڑکیں

سب بناتے جا رہے ہو

کارنامے اپنے ان آزاد

ہاتھوں کے

دکھاتے جا رہے ہو

مسکراتے جا رہے ہو

تم کو کیا معلوم ہے اس

ریت پر کیا گزر رہے

اس گھاس پہ کیا

گزری ہے

آنے جانے والوں کا ایک سلسلہ چلتا رہا ہے

اور یہیں کا ہو کے رہ جانے کا، مر جانے کا

مٹ جانے کا بھی ایک سلسلہ چلتا رہا ہے۔

مجھ کو کیا معلوم لیکن

ایک دن وائپرا کے اوپر ایک لوہے کا زنگ آلود ٹکڑا

کہہ رہا تھا

'دیکھنے کی چیز ہے یہ، دیکھنے آئے ہو تم،

دیکھو گے پھر گھر جاؤ گے،

تم کو کیا معلوم کہ اس ریت پر کیا گذری ہے

اس گھاس پر کیا گذری ہے

وہ جو آئے تھے پکڑ کر نیند سے، بگلیوں سے،

سڑکوں سے، اُٹھا کر چائے خانوں سے

بہت پہلے یہاں

یہ جزیرہ کہہ رہا تھا

'ان کی خونی داستان'

وائپر اور سیلولر جیلوں کی دیواریں تو چپ تھیں

وہ درو دیوار لیکن شہر کے

انسانوں کی آواز میں کہنے لگے

'تم ہمیں مجرم کہو، قاتل کہو،

پر یاد رکھو، تم کو کیا معلوم کہ اس ریت پہ کیا گذری ہے

اس گھاس پہ کیا گذری ہے

لوٹ جاؤ

دیر سے آئے ہو تم

اسے یہ محسوس کر کے تکلیف بھی ہو رہی تھی، اور اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا 'آخر میں نے اب تک تاریخ کو اپنی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کی، جو چیزیں مجھے متاثر کر سکتی تھیں انھیں جاننے کی کوشش میں نے کیوں نہیں کی، یہ تو ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تاریخ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر اس پر دھیان دے۔ حتی کہ اپنے خاندان، اپنے گاؤں، اپنی قوم اور اپنے ملک کی تاریخ کی اپنے طور پر جانچ کرے۔ اور ان مورخوں کی باتوں کو صداقت نہ سمجھ لے جنھوں نے تاریخ نویسی پر قبضہ کر رکھا ہے کیونکہ مورخ بھی انسان ہوتے ہیں اور وہ تاریخ کو وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں وہ خود ہوتے ہیں۔ جس طرح آزادی

کی جدوجہد کرنے والوں اور انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار ہونے والوں کو انگریزی حکومت نے گمنامی وادی میں جان بوجھ کر پھینکا اس سے کچھ کم ان مورخوں نے بھی نہیں کیا جو ہندوستان کی تاریخ وقت اور جغرافیہ اسی نقشے کو دیکھ کر لکھ رہے تھے جو انگریز ہندوستان کی زمین پر لگا گئے تھے اور جن سے ہندوستانی آزاد حکومت نے کتب خانے، قوانین اور مدرس تو لیے ہی تھے وہ لوگ بھی جمہوریت کی راہ سے اقتدار کی بلندیوں پر پہنچے ہوتے تھے۔ جن کے باپ داداؤں نے کبھی کالا پانی جانے والوں کی زندگی اور دولت کی قیمت پر انگریزوں سے انعام کے طور پر زمینداریاں، راجواڑے اور بڑی بڑی تجارتیں حاصل کی تھیں۔

اس تاریخ کو نہ جاننے کا انجام یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم کسی دن اپنے قلم اور اپنی زبان سے اس نظام کی تعریف کر رہے ہوں جس نظام نے کالا پانی جیسا دوزخ پیدا کیا تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ جب واپس جائے گا تو اس دنیا کا جس میں وہ رہتا ہے 'زمین سے لے کر آسمان تک سب کو کھنگال کر اس مقدمے کا حساب صاف کرے گا۔ آخر جانوروں اور انسان میں یہی تو فرق تھا کہ جانور اپنی آنکھوں سامنے نظر آنے والی ہریالی کو دیکھتا ہے لیکن ان چیزوں پر نظر رکھتا ہے جو اس سامنے نہیں ہوتیں۔ لیکن جن کی اس کو جانکاری ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ کوتاہ نظر اور دور اندیش لوگوں میں یہی تو فرق ہے کہ کوتاہ نظر صرف آس پاس کی چیزوں کو دیکھتا ہے لیکن دور اندیش انسان اپنے ماحول کے ہر اس چیز کی خبر رکھتا ہے جو کسی بھی شکل میں، کسی بھی وقت، کسی بھی وجہ سے نمودار ہو سکتا ہے۔

اگر ہندوستانیوں نے یورپ میں ہو رہی تبدیلیوں کی خبر رکھی ہوتی اور ان سے ابھرنے والے امکانات کو دور اندیشی سے سمجھا ہوتا، اگر وہاں کے لوگوں کے سیاسی کردار کو سمجھا ہوتا ان کی اخلاقیات کو سمجھا ہوتا تو ان کے غلام بننے سے بچ سکتے تھے۔ اور آج تو پوری دنیا ایک ہو چکی ہے، آج تو دنیا کی ہر قوم کے کردار، مزاج اور انداز فکر کے بارے میں جاننا ضروری ہے اور کسی کو جاننے کے لیے اس کو اس کے ماضی کے آئینے میں دیکھنے سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

اور خود اس کا اپنا سماج اور اپنا ملک۔ لوگوں کو شکایت رہتی ہے کہ سیاست داں ان کو دھوکا دیتے ہیں' لیکن یہ بات کیوں عام طور سے کہی جاتی ہے کہ عوام کی یادداشت بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ لوگ اپنے سماج اور ملک کی سیاسی تاریخ کو کیوں نہیں یاد رکھتے ہیں؟ اسے محسوس ہوا کہ لوگوں کی یہ کوتاہ نظری اچھے سیاست دانوں کی ہمت شکنی کرتی ہے۔ لوگوں میں دوست دشمن کی پہچان ختم ہو گئی ہے۔

ہمارے ذہن میں سیاسی پارٹیوں اور سیاسی افراد کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ ہم اتنی بھی زحمت نہیں کرتے کہ ان کے اعمال کا سنجیدہ تجزیہ کریں۔

ورنہ اگر ہم نے ملک کی سیاست میں ہو رہی تبدیلیوں کی خبر رکھی ہوتی اور ان سے ابھرنے والے امکانات کو دور اندیشی سے سمجھا ہوتا' اگر اپنے ملک اور اس کے سیاست دانوں کے سیاسی کردار کو سمجھا ہوتا' ان کی اخلاقیات کو سمجھا ہوتا تو اپنے ملک کے لوگوں کو بے بس ولاچار ہونے سے بچا سکتے تھے۔ اور آج تو پوری دنیا ایک ہو چکی ہے' آج تو صرف اپنے ملک کو ہی کیا' دنیا کی ہر قوم کے کردار، مزاج اور انداز فکر کے بارے میں جاننا ضروری ہے اور کسی کو جاننے کے لیے اس کو اس کے ماضی کے آئینے میں دیکھنے سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ادھر خالد جس سمندر کے ساحل پر کھڑا تھا اس کا طوفان خود اس کے گھر پر دستک دے رہا تھا۔

❖❖

خالد کے ذہن میں بے پناہ تناؤ کی وجہ سے دھماکے ہو رہے تھے۔ کیونکہ وہ جس دنیا میں رہ رہا تھا وہ دنیا اس سے کچھ کم نہیں بلکہ زیادہ ہی تھی۔ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا تھا۔ کالا پانی میں جس چیز نے اپنا سر دکھایا تھا اس نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں لاکھوں کی جان لی۔ جس جنگ کی تصویریں اخباروں میں پیش کی گئیں انہیں تصویروں کے پیچھے کالا پانی والی ذہنیت موجود تھی۔ لیکن ایسے اندھیروں میں داخل ہونے سے میڈیا بھی گھبراتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہی تھا کہ اس جنگ میں کوئی مخصوص گروہ نہیں بلکہ ہر شخص یا تو ڈاکٹر والکر بنا ہوا تڑپ رہا تھا یا شیر علی بن گیا تھا۔ اپنے ذہن میں روشنی کی طرح داخل ہوتے ہوئے اس عرفان سے اس کا ذہن سکون محسوس کرنے لگا تھا اور اسے محسوس ہوا کہ یہاں کی تنہائی میں وہ اصل مسئلے کی وسعتوں کا وہ مکمل طور پر انکشاف کر سکتا ہے۔ اس نے یہاں ہوٹل میں چند روز اور رکنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ہوٹل کے عملے کو بھی ہدایت دے دی کہ چائے اور کھانے کے سوا کسے اور وجہ سے اس کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اس کے لئے اب کالا پانی تاریخ کے ایک کونے میں سمٹا ہوا واقعہ نہیں رہ گیا بلکہ پوری دنیا کا آئینہ بن گیا تھا۔

اس دنیا کو ایک پنجرہ بنا دیا گیا ہے۔

ادھر خالد سمندر کی مزید گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ ہوٹل کے لان میں چائے پیتے ہوئے اور انڈمان کی پہاڑیوں پر نظر ٹکائے وہ سوچ رہا تھا۔

لارڈ میو کو کسی معمولی انسان نے قتل نہیں کیا تھا۔

لارڈ میو کو انسانیت کی سیاہ کی ہوئی روح نے ایک انسان کے ذریعہ ڈنک مارا تھا۔

خالد سہیل کے ذہن میں نیویارک کے دو نام اور ایک چمک کی طرح آئے۔

ممکن ہے کہ یہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوئی سازش نہ ہو،

ممکن ہے یہ بھی تاریخی دھماکوں کی اسی سیریز کا ایک حصہ ہو،

اسے بابری مسجد کی یاد آئی،

اسے افغانستان کے مہاتما بدھ کے بت کی یاد آئی،

اس نے گاندھی کے قاتل کو یاد کیا،

یہ لوگ ہمیشہ صرف بھٹکے ہوئے لوگ نہیں ہوتے، انسانیت کی روح اپنی پالیسی بناتی ہے، معصوم لوگ معصوم لوگوں کا قتل کرتے ہیں، کیونکہ دنیا میں اس سے زیادہ گھناؤنا کوئی منظر نہیں ہو سکتا کہ ایک آمر کو لوگ معصوم سمجھیں۔ جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ کسی سے اس کی روح دھوکے سے چھین لی گئی ہے اور وہ بنا روح کے جی رہا ہے تو دیکھنے والے کے دل میں سمندری لہروں کی طرح غصہ پیدا ہوتا ہے۔ گاندھی جیسے لوگوں کو ناکام نہیں ہونا چاہئے۔ جب وہ ناکام ہوتے ہیں تو قتل کیے جاتے ہیں۔ ان کے اوپر یہ الزام ہوتا ہے کہ انہوں نے وہ ذمہ داریاں اٹھائیں جنہیں نبھانے کی ان کے اندر صلاحیت نہیں تھی۔ یہ بات سچ تھی کہ وہ ہندوستان کو تقسیم ہونے سے روک نہیں سکے۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کی موت بھی ہوئی اور کروڑوں انسانوں کے مابین تقسیم وطن کو لیکر نفرت بھی بڑھی۔ اس نفرت کی آگ کی لپٹوں نے برِصغیر کو دھواں دھواں کر دیا ہے۔ زمین پر جنت کہلانے والا خطہ دوزخ بن گیا ہے۔ سیاستداں، فلسفی، مفکر، سائنسداں، سرکاریں، مذاہب، انقلابات، یہ سب لامحدود امکانات کے خواب پیدا کرتے ہیں۔ لیکن عموماً وہ اپنے دعووں کو کر دکھانے میں بری طرح ناکام ہوتے ہیں۔ وہ ایسی تہذیبیں پیدا کرتے ہیں جن میں وائبر آئی لینڈ جیسے پھوڑے موجود ہوتے ہیں

بلکہ پوری تہذیب میں وہ زہر بھرا رہتا ہے جو اس لیڈر سے ہو کر نکلتا ہے۔ لیکن تاریخ ان سب کی نگرانی کرتی ہے۔ خصوصاً ان افراد کی جو اس کی نمائندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ صاحب اقتدار لوگ تاریخ کے اس عمل کی 'ان واقعات کی' ان کی اصل معنویت سے کتراتے ہوئے تشریح کرتے ہیں۔ تاریخ کی گاڑی کے بریک کو اہل اقتدار راستے کا روڑا سمجھ کر اس کے اوپر سے گزر جاتے ہیں۔ تاریخ اپنی مزاحمت جاری رکھتی ہے اور اس طرح واقعات مزید ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوئی طاقت نہیں جو سچ کے پنکھ کو کتر سکے۔ سچائی اکثر طاقت کے زور کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ یہ دہشت پیدا کرتی ہے۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ یہ اعلیٰ ترین قوت ہے۔ یہ معصوموں اور مجرموں میں فرق نہیں کرتی، تبھی تو یہاں اتنے معصوم آتے ہیں۔

جیسے اس کا پردادا میری علی آیا، وہ لوگ جو خود سوچتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں یا وہ لوگ جن کے بارے میں پوری دنیا سمجھتی ہے کہ وہ حق پر ہیں۔ وہ لوگ پوری طرح حق بجانب نہیں ہوتے۔ کسی کو بھی سو فیصد صحیح کہنا اپنے کو اندھا اور اپنے کانوں کو بہرہ کرنے کے برابر ہے۔ انسانوں کو چاہئے کہ تاریخ کے ذریعہ زندگی جو پیغام دے رہی ہو اسے خاکساری سے سنیں اور سمجھیں تبھی یہ حادثات رک سکتے ہیں۔ انسان کے خیالات کا چاہے وہ بہت طاقتور لوگوں کے ہوں یا انتہائی کمزور لوگوں کے احترام ہونا چاہیے۔

خالد مسلسل اس تاریخی سانحے کی گہرائی اور تفصیلات میں اترتا گیا۔ اس نے برطانوی پارلیمنٹ کی تقریروں میں اس واقعے کا حوالہ اور ذکر پایا۔ ان تقریروں میں اس واقعہ کو بنیادی طور پر عدم تحفظ کی مثال کہا گیا۔ یعنی یہ کیسے ممکن ہوا کہ وائسرائے جنگلوں سے گزر رہا ہے اور راستے کے ارد گرد کی جگہوں کی اچھی طرح تلاشی نہیں لی گئی ہو۔ اگر تلاش لی گئی ہوتی اور راستے میں محافظ تعینات کئے گئے ہوتے تو ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ یہی نہیں، اگر وائسرائے کے ساتھ ان کے ذاتی محافظ دستے کے لوگ اس بات کے لیے ذہنی طور پر مستعدی سے تیار ہو کر چلتے کہ اگر کسی نے ان پر حملہ کیا تو فوراً دفاع میں ان کے سامنے آ جائیں گے۔ حملہ آور سے ٹکرائیں گے، اسے روکیں گے، خود زخمی ہوں گے لیکن ان کو زخمی نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن

کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ وہاں یہ سب کچھ ہوا تھا لیکن جنگل میں تلاشی لینے والے کے ذہن پر حملہ آور کی بھی تو نگاہ تھی۔

جو محافظ دستے کے ساتھ چل رہے تھے وہ بھی انسان تھے۔ جب لارڈ میو ان اونچائیوں سے نیچے کے مناظر کی جادوئی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اسی لمحہ وہ جادوئی خوبصورتی ان کے محافظوں کے دل و دماغ اور نظر پر بھی تو اثر انداز ہو رہی تھی۔ اور وہ بھی اس حسن میں کھو گئے تھے۔ پارلیمنٹ میں بیٹھ کر شاید وہاں کے مقررین یہ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے تھے کہ یہ جگہ کتنی خوبصورت تھی۔ ان کے لیے تو یہ محض ایک مجرم بستی اور فوجی پڑاؤ کی جگہ تھی۔

مزید براں کچھ لوگوں نے یہ کہا تھا کہ یہ ان لوگوں کے غم و غصہ کا نتیجہ تھا جنہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اور انہوں نے یہ سازش رچی تھی۔ اس واقعہ کو محض سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔

جن لوگوں نے شیر علی کے ذہن کا تجزیہ کر کے نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی ان کا خیال تھا کہ چونکہ اس کو افغانستان کے مقامی قانون سے انحراف کر کے سزا دی گئی تھی اس لیے اس کے اندر یہ تکلیف پل رہی تھی کہ اسے یہاں بے قصور بھیجا گیا ہے۔ اور اس نے انتقاماً یہ قتل کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے شیر علی کو یہ کہتے ہوئے ایک وحشی شخص بتایا کہ اس نے ایک ایسے انسان کا قتل کیا تھا جو خود وہاں ان کے لیے ایک اسپتال بنوانے گیا تھا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر وہ اسپتال وہاں بنا کیوں نہیں۔ کسی جذبہ انتقام کے تحت یہ کام روک دیا گیا۔

جس بات کو سب نظر انداز کر رہے تھے کہ لارڈ میو کو قتل کر کے شیر علی نے خود اپنا بھی قتل کیا تھا۔

خالد سہیل یہ سوچتا رہا کہ شیر علی نے خود اپنا قتل کیوں کیا۔ یعنی اس نے وہ عمل

کیوں کیا جس کے متعلق یہ یقینی طور پر ایسا معلوم تھا کہ اس کا قتل ہو جائے گا۔ وہ حاصل کیا کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ سوال تھا جس پر ڈیڑھ سو سال سے روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔ اور اب بھی یہ سوال کسی حقیر کیڑے کی طرف لاپرواہی اور بے حسی کے ملبے میں دبا ہوا تھا۔

اس کے پردادا سے لے کر کتنے اور سوالات تھا جو جواب چاہتے تھے۔ یہ حق تاریخ نویسوں کو کس نے دیا کہ وہ حکمرانوں کی زندگی کو عام آدمی کی زندگی پر فوقیت دیں۔ یہ حق دیا تھا کہ خود عام آدمی کے اس رویے نے کہ وہ کمزور انسانوں کی باتوں کو جھٹلاتا ہے۔

کیا شیر علی جو پیام دینا چاہتا تھا وہ پیام پچھلے ڈیڑھ سو سال کے بعد بھی وہاں پہنچا جہاں اسے پہنچنا چاہئے تھا۔ یا ابھی بھی اس کے راستے میں بہت ساری رکاوٹیں کھڑی ہیں۔

وہ پھانسی گھر جس میں شیر علی کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا وہ آج بھی اس ویران جنگل میں نیک روحوں کی یادگار کے طور پر کھڑا تھا۔

ایک سوال خالد سہیل کے ذہن سے گزرا۔

کیا شیر علی ایک دہشت گرد تھا۔

شیر علی کو دہشت گرد قرار دینے کی وجہ سوا اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اس نے جس انسان کی جان لی تھی وہ ہندوستان کا وائسرائے تھا اور یہ وجہ کسی کو دہشت گرد قرار دینے کے لیے قطعی کافی نہیں تھی۔

اور آخری سوال جو اس کے ذہن میں گونج رہا تھا وہ یہ تھا کہ کیا شیر علی ایک مجرم تھا۔ اور اگر وہ مجرم نہیں تھا تو کیا برطانوی سرکار مجرم نہیں تھی جس نے اس کو پھانسی کی سزا دی۔ آخر انصاف ہے کیا۔ اور انصاف کی تعریف کون طے کرتا ہے۔ عوام یا حکومتیں۔ شاید تاریخ خود وائپر آئی لینڈ کو فراموش کر کے اس ذمہ داری اور اس سوال سے کترا گئی تھی۔

خالد سہیل اندر سے بے چین ہوا تھا۔ اسی کسک کی وجہ سے تو وہ وہاں آیا تھا۔ یہی درد تو اس کے اندر پل رہا تھا کہ حکومتوں کے کلچر نے جب ایسے ایسے بدنام زمانہ کارنامے کیے ہیں تو پھر ان کے لیے احترام کیوں؟ ان پر اعتبار کیوں؟

خالد سہیل اس جگہ جانا چاہتا تھا جہاں شیر علی کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ جیل گھر کی وہ مخصوص جگہ وہ کمرہ، اس کی دیواریں، وہ جگہ جہاں اسے کھڑا کیا گیا، وہ گڑھا جس میں وہ لٹکا اور عین اپنی جان کھوئی۔ وہ اس جگہ کھڑا ہو کر آخری سانس لی تھی۔ ضرور وہ کچھ کہنا چاہتا ہوگا۔ اس وقت اور شاید خالد وہاں کھڑے ہو کر شیر علی کے ذہن میں گھس کر ان باتوں کو سن سکے۔ وہ وہاں کے در و دیوار پر نظریں ڈال کر اس تنہائی کو محسوس کرنا چاہتا تھا جیسے شیر علی نے محسوس کیا تھا۔ اس سچائی کو محسوس کرنا چاہتا تھا جسے شیر علی کے بعد پھر کسی نے نہیں دیکھا۔

تب اسے تاریخ کے عظیم کوڑے دان پر شک ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ لارڈ میو کے قتل کے پیچھے کسی ایسے شخص کا ہاتھ تو نہیں تھا جسے خود لارڈ میو اپنی زندگی میں پہچان نہیں سکا۔ جی ہاں، خالد سہیل نے سوچا، تاریخ بار بار سازش کرتی ہے۔ زمین کے طاقتور ترین افراد کو ختم کرنے کی تاریخ ان لوگوں سے حسد کرتی ہے جو زمین پر بے حد طاقتور ہو جاتے ہیں اور یہ گمان پیدا کرتے ہیں کہ وہ تاریخ پر حاوی ہو گئے ہیں۔

خالد نے ان لوگوں کی فہرست میں اپنے پردادا کا نام بھی دیکھ ہی لیا جن کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ وجہ نہیں معلوم ہو سکی۔ کچھ نہ کچھ وجہ بتا کر ہی ان کی عمر قید کی سزا کو پھانسی کی سزا میں تبدیل کیا گیا ہوگا۔ شاید واحد وجہ یہ رہی ہو کہ وہ یہاں کی اذیت کو برداشت نہیں کر پاتے ہوں گے اور لارڈ میو یا کسی اور وائسرائے کی حکمرانی کے تحت ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ تو یہ تھا لارڈ میو، اسے محسوس ہوا کہ جیسے شیر علی نے اس کے دادا کا انتقام لیا۔

انتقام لیا ہو یا نہ لیا ہو لیکن خالد سہیل کو اپنے اندر تکلیف کی ایک چنگاری بجھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خالد سہیل نے محسوس کیا جیسے ہو پھانسی گھر ایک بھوت گھر بن گیا ہو اور اس

کی دیواروں کے پیچھے معصوموں کا بے رحمانہ قتل ہو رہا ہو۔ اسے لگا جیسے اسے اپنی پوری بلند آواز میں چلا کر ساری دنیا سے کہنا چاہئے کہ جیلوں کے پردوں کے پیچھے ایک خوبصورت درندہ رہتا ہے جو مردانہ ہے اور عورت بھی۔ جس کی آنکھیں خونخوار و خوفناک ہیں لیکن جو حسین ترین لباس اور زیورات سے ملبوس ہو کر سہانی آوازوں سے بھرپور رقص کرتا ہے اور اپنی خوش الحانی میں انصاف اور حق اور انسانی فلاح و بہبود اور جمہوری حقوق کے نغمے گا کر سب کو مسحور رکھتا ہے۔

وہ اس درندے کی شناخت کی کوشش کرنے لگا۔ یہ وہی درندہ تھا جس نے لارڈ میو کو بھی مروا دیا۔ اقتدار کے نقشہ میں چور، جھوم رہا تھا۔ لوگوں کو آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن انہیں چلمن کو کھسکا کر اندر دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔

تو یہ تھا وہ سب کچھ جو شیر علی نے اپنے آخری لمحے میں دیکھا تھا۔

اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ لارڈ میو ایک معصوم آدمی تھا لیکن اس کو تاریخ نے بے دردی سے مارا، اس کی خوبصورت نوجوان بیوی کو جو شام کے کھلے آسمان تلے سمندر میں لنگر انداز جہاز کے ڈیک پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی اس کو بیوہ کر دیا۔ شیر علی بیزی کے لیے سمندر کے کنارے جتنا رویا تھا، لارڈ میو کی بیوہ اس سے بھی زیادہ تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔

یہ خطرناک جہاز لارڈ میو کو بھی وہیں لے کر آ چکا تھا جہاں اب سے پہلے سیکڑوں قیدیوں کو لایا تھا۔ یہ معمولی کالا پانی کہلانے والا سانپ آج اژدہا بن گیا تھا۔ لارڈ میو کو وہاں نہیں جانا چاہئے تھا لیکن اسے کوئی کھینچ کر لے گیا۔

خالد سہیل کو محسوس ہوا کہ خود بھی کوئی چیز یہاں کھینچ کر لائی تھی۔ میں اس کشش کی جڑ تک نہیں پہنچ پایا۔

تاریخ کی کتنی ہی بڑی شخصیتیں کھینچ کھینچ کر اسی طرح موت کی وادی میں لائی

گئی ہیں۔ نپولین، کنیڈی، بھٹو، صدام حسین .... ایک لمحہ آتا ہے جب انسان کو سوچنا چاہئے کہ کہیں تاریخ اس کے خلاف سازش تو نہیں کر رہی ہے۔

تاریخ کی ان بڑی شخصیتوں کے قاتل ہمیشہ خود تاریخ کی پیداوار رہے ہیں اور ان میں کسی نے بھی عدالتوں میں اپنی دفاع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے ہمیشہ شیر علی کی طرح خاموشی سے اپنے عمل کا اعتراف کیا لیکن کبھی اس کو جرم تسلیم نہیں کیا۔ ہمیشہ انہوں نے اپنے عمل کو حق بہ جانب کہا، ان کی کبھی نہیں سنی گئی ورنہ وہ یہ بتاتے کہ وہ مجرم نہیں تھے بلکہ تاریخ کی بندوق سے داغی ہوئی گولی تھے۔

ہمیشہ ہی یہ گولی ایک حادثہ کی طرح معلوم ہوتی ہے جب کہ کبھی حادثہ نہیں ہوتا۔ ایسے کسی بھی قاتل کو ان کی قومیں اکسا کر نہیں بھیجتیں۔ وہ اپنے اندر سے پیدا ہوتے ہیں۔

پھانسی کے پھندے کو دیکھتے ہوئے خالد سہیل کا ذہن شیر علی کی پر مرکوز ہو گیا۔

اسے شیر علی کا اس طرح پھانسی کے پھندوں پر چڑھ جانا برا لگا۔ لارڈ میو کے بعد سیکڑوں لارڈ میو پیدا ہو جاتے لیکن شیر علی جیسے لوگ تو بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ تو انسانیت کے لیے بہت بڑی دولت تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو شاید اپنی قوم کی روح عظیم بلندیوں پر پہنچا سکتا تھا کہ ایسے لوگ کتنا پیدا ہوتے ہیں جو سماج اور انسانیت کے مفاد کے لیے اپنی پوری ذات کو مع اپنی خواہشوں کے، آرزوؤں اور تمناؤں کے مٹا لیں۔ وہ ایثار کے کس مقام پر پہنچ گیا تھا جس مقام پر پہنچتے ہوئے انسان کی تو سماج کو بہت ضرورت تھی۔ اسے جذبات کس گرفت میں آنے کی بجائے اپنے کو بچانا چاہیے تھا، اپنے کو ذرائع نہیں ہونے دینا چاہیے تھا، لارڈ میو کیا تھا اس کے مرنے پر تو برطانوی حکومت کسی کو بھی وائسرائے بنا سکتی تھی۔ وائسرائے بننے کے لائق انسانوں سے تو سماج بھرا پڑا تھا لیکن اس کے جیسے لوگ کہاں آسانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے زندگی کی مزید بلندیوں کی طرف سفر کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو شاید کوئی اور ہی انقلاب پیدا ہوتا۔ عظیم انسانوں کے اپنی قدر و قیمت کو محسوس نہیں کرنے کی اپنی

حفاظت نہیں کرنے سے ایسی غلطی ہو جاتی ہے جس سے ان کا تو کوئی نقصان نہیں ہوتا لیکن انسانیت کا بھاری نقصان ہو جاتا ہے۔

شیر علی کی لاش دیر تک پھانسی کے پھندے پر لٹکتی رہی اور وہ افسوس کرتا رہا پھر رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ لوگ اس کے بارے میں کتنی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ بظاہر طور پر سماجی طور پر ایک کمزور انسان تھا، خالد نے سوچ وہ بظاہر جتنا کمزور انسان تھا اتنا کمزور انسان کیسے بحیرہ ہند کے علاقے کے سب سے طاقتور انسان کا قتل کر سکتا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی کمزور ہوتا جو اس کا تصور ہی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا کہ وہ اس آدمی کا قتل کرے جو بحیرہ ہند کے سب سے بڑے علاقے کا نہ صرف مالک تھا بلکہ اس کی حفاظت میں اس ملک کی پوری حکومت کھڑی تھی۔ اصل چیز تو اس کی وہ روح تھی جو احساس کی وہ روح تھی جو احساس کمتری کے دبیز پردوں کو چیرتی پھاڑتی اس مقام تک پہنچ گئی تھی جہاں پہنچ کر اسے احساس کمتری کے دبیز پردوں لارڈ میو سے بھی بڑا ایک ایسا شخص جس لارڈ میو کی زندگی کو ایسے ختم کر سکتا تھا جیسے ایک شیر ایک بکری کو ختم کرتا ہے، اس طبقے کے سربراہ کو جس طبقے میں جلیل القدر ملک کو سرنگوں کر دیا تھا۔ ایسے انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے انسانوں کو زندہ رہنا چاہیے۔ ایسے انسان تو تاریخ کی جہاز پر مستول کی طرح ہوتے ہیں ورنہ کوئی تنہا انسان وائسرائے لارڈ میو کو کیسے مار سکتا تھا۔ وہ ضرور کسی کے کندھے پر سوار تھا۔ وہ ایک عظیم انسان تھا ایک ایسا انسان جو اپنے چہرے پر مجمد دار کو دیکھ سکتا تھا اپنے مفوضہ جسم کی حیثیت کو پہچان سکتا تھا۔ اپنی روح اور اپنے جسم میں فرق کر سکتا تھا۔ اپنے ہی نہیں، ہندی کی روح اور اس کے جسم میں فرق کر سکتا تھا اس میں تمیز کی صلاحیت موجود تھی تو انسان کی شخصیت اور ذات کے اتنے گہرے عرفان والے انسان کو تو اپنے اس عرفان کو پیغمبرانہ شان کے ساتھ انسانی تہذیب کی جھولی میں ڈالنا چاہیے تھا جہاں یہ عرفان کو وہ نور کی طرح چمکتے ہوئے انسانی عظمت کا درس دیتا رہتا۔ لارڈ میو کو مار کر تو وہ قاتل بن گیا شیر علی بھی تو انسان ہی تھا شاید وہ کسی کمزور لمحے میں اپنے جذبات کے ہاتھوں میں بے بس ہو گیا۔

"اگر وہ اپنے نفس پر قابو پا لیتا۔"

خالد کو یاد آیا وہ اپنے گھر میں بزرگوں سے نفس پر قابو رکھنے کی باتیں سنتا آیا تھا۔ اسے وہ شعر بھی یاد آیا جو اکثر موقعوں پر اس کے والد اپنے دوستوں کے بیچ یا گھر والوں کو سناتے تھے۔

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا

بلندیوں کے اس سفر میں شیر علی سے چوک سرزد ہو گئی۔ روحانی مقامات کا سفر اتنا مشکل تھا خالد نے سوچا۔ اسی لیے تو روحانی تربیت میں غصہ، نفرت، لالچ، غرور، خوف، بے صبری جیسی انسان کو مٹی میں موجود کمزوریوں کو جڑ سے ختم کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسے غالب کا شعر یاد آیا جو اس زمانے میں بھی دہلی باہر نکل کر دور دراز علاقوں میں پہنچ گیا تھا:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

شیطان زندگی ہر لمحے میں انتہائی مستعدی سے لگا رہتا ہے اور کبھی اپنے حصول میں چوکتا نہیں۔ سنہری کے درد نے شیر علی کو جو لازوال مشعل نور دیا تھا، شیطان نے اسے اچک لیا لیکن بلندیوں کے اس لق و دق صحرا میں انسان ہوتا بھی تو کتنا تنہا ہے۔ کوئی نہیں ہوتا جو ہاتھ پکڑ کے سنبھال لے ایک ہلکی سی پلک جھپکی اور صحرا ایک شکاری باز کی طرح انسان کو اچک لیتا ہے۔ ان للہ و ان الیہ راجعون خالد زیر لب بڑبڑایا اور خیالات کے اس تسلسل سے باہر آ گیا اس کے غور و فکر کا سلسلہ پھر سے تاریخ کے تناظر میں چلنے لگا۔ شیر علی کی ایسی ہستی کے کندھے پر سوار ہو چکا تھا جو وائسرائے جیسے طاقت ور کو ایک انسان سمجھتی تھی۔

شیر علی نے کسی حفاظتی انتظام کو توڑنے کی سازش نہیں کی تھی۔ اس کو اس کام میں کسی کا تعاون حاصل نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے لارڈ میو کو ایسے مار دیا جیسے وہ قصائی کے سامنے دم ہلاتا بکرا ہو۔ آہستہ آہستہ خالد سہیل کے ذہن میں کسی چشمے کی طرح ایک جواب ابلنے لگا جیسے کوئی الہام ہو رہا ہے۔

وہ بھی افراد جو چلمن کے پیچھے سے احکامات جاری کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو یہ یقین بھی دلانے لگتے ہیں کہ وہ لوگ جن کے خلاف وہ کارروائی کر رہا ہے ان کو وہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کے علاوہ کوئی ان کے دوغلے کردار کو نہیں پہچانتا جن لوگوں کے اوپر وہ اپنی نیت کا پردے کے پیچھے اظہار کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ تاثر دینا چاہتے ہیں وہ حقیقت کی طرح ٹھوس ہے۔ وہ اس بے خبری کی دنیا میں رہنے لگتے ہیں کہ دنیا میں کہیں کوئی ایسی دیوار نہیں، کہیں ایسا مادہ نہیں جس سے ایسی دیوار بن سکے جو کسی سچائی کو پھیلنے سے روک سکے اور انسانی دماغ میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ بھیس بدل بدل کر آگے بڑھتی سچائی سے مراسلے لے لیتا ہے کہ انسان چیزوں کی حرکت، ان کی سمتوں، حالات کے دباؤ اور تبدیلیوں کے ممکنہ اثرات سے اس سچائی کو اخذ کر لیتا ہے، زندگی ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جس میں گزرتی ہوئی مچھلی اپنے چال سے پیدا ہونے والی لہروں کو قید کر ہی نہیں سکتا۔ کبریں اگر دفتروں سے نہیں، دماغوں سے باہر اچھل جاتی ہیں، دماغوں سے نہیں تو تیوروں سے، تیوروں سے نہیں تو حرکتوں سے، حرکتوں سے نہیں تو بے حرکتی اور خاموشی سے۔ خبریں ہر دیوار کو پار کر جاتی ہیں۔ جب ثبوت کو بند کر دیا ہے تو سچائی بغیر ثبوت کے اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ انسانی دماغ کے لیے سارے الفاظ، پوری کائنات، پوری تاریخ، سب کے سب برہنہ ہیں۔ یہ تاریخ سب کے لیے برہنہ ہیں۔ یہ تاریخ نویسوں کا محتاج نہیں۔ یہ غیر تحریر شدہ تاریخ کو پڑھ لیتا ہے۔ یہ بچے کی طرح بغیر تجزیہ کے جان لیتا ہے کہ کون دوست ہے اور کون دشمن۔ اگر اسے کوئی دھوکا دے سکتا ہے تو یہ صلاحیت صرف فطرت کے اندر ہے۔ وہی اس کی آنکھوں کو اندر سے سلا دیتی ہے۔ وہی اس کی جگا دیتی ہے۔ یہ ذاتی چلاتی ماں کو پکارتا ہے اور مسکراتے دشمن سے بچتا ہے۔ طبقہ اشرافیہ لوگوں کے لبھانے کے فن میں مہارت

حاصل کرتی ہے، وہ انہیں خوش کرنے، دوست جیسا سلوک کرنے، اور ان سے شفقت کا اظہار کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اندر سے خوفزدہ انسان اس کو پہنچانتا ہے ان کی منافقت گہرے شکوک پیدا کرتی ہے۔ منافقت کا فن قابل اعتبار نہیں۔ ابتدا میں یہ دوسروں کو دھوکا دیتی ہے۔ انتہا پر پہنچ کر یہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتی ہے۔ یہ آدمی کے اندر غفلت پیدا کرتی ہے۔ اس کے اندر جھوٹی خود اعتمادی پیدا کر کے اس کے تمام دفاعی دیواروں کو رفتہ رفتہ مسمار کر دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ خطرناک قسم کی خوش فہمیاں اس کے اندر جراثیم کی طرح داخل ہو کر اس کے وجود کا حصہ بن جاتی ہیں۔

لارڈ میو نے غالباً یہ سوچا تھا کہ جو اسپتال وہ اس لیے بنوا رہا ہے کہ انگریز سپاہیوں کی موت نہ ہو، چونکہ اس سے قیدیوں کو بھی فائدہ پہنچے اس لیے وہ اس بہانے قیدیوں سے جھوٹی ہمدردی کا اظہار کر کے اس سے دوہرا فائدہ اٹھا لے۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید دکھوں میں گردن تک ڈوبے لوگ اس کے اس ارادے کی ان الفاظ میں خبر سن کر اس کو مسیحا سمجھ بیٹھیں گے۔ اس کو شاید اس کا یقین ہو گیا تھا، اور پھر اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک ہیرو کی طرح ان وادیوں میں بے فکری سے گھوم پھر سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پایا کہ جس طرح وہ جھوٹ کو سچ بنا سکتا ہے اسی طرح وہاں کے قیدی سچ کے اندر سے جھوٹ کو اخذ کر سکتے ہیں۔ لارڈ میو کی ناکامی کا خطرناک لمحہ وہ تھا جب اس کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ سچ مچ انگریز نسل ہندوستانیوں سے ذہین تر ہے، وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ سیاسی، معاشی، اور سماجی برتری، برتر ذہن کا ثبوت نہیں ہیں۔ لارڈ میو اسی وقت ناکام ہو گیا تھا جب انگریزوں نے انگریزی قانون کا اطلاق افغانی قبائلیوں پر کیا تھا۔ فوجی طاقت سے کامیاب ہونے والے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ فوجی اور سیاسی طاقت تاریخ کی بہت ساری طاقتوں میں سے صرف ایک طاقت ہے جن سے تاریخ دنیا کو چلاتی ہے۔ لارڈ میو کو پورے برصغیر کے انتظام کی ذمہ داری دے دی گئی تھی لیکن وہ ان حقائق سے واقف نہیں تھا جن کی بنیاد پر ملک اور قومیں تاریخ کی وادیوں میں جیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ نہیں پایا کہ دنیا کی ذلیل ترین شے وہ حکومت ہے جو پردۂ راز کے پیچھے اپنے ہی عوام کے مفاد کے ساتھ دشمنی کا سلوک کرتی ہے جب کہ عوام حکومت کو اپنے معاملات کو صیغہ راز میں

رکھنے کا حق اس لیے دیتے ہیں کہ وہ ان کے حقوق کی بہتر طور پر حفاظت کر سکے۔ یہ وہ سمجھ نہیں سکا کہ یہ غداری ہے۔ دھوکے بازی ہے۔ زیادہ تر ایسی حکومتیں سمجھ نہیں پاتیں کہ جب وہ اپنے اصلی آقاؤں کے سامنے چلمن کے پیچھے پالتو کتوں کی طرح رقص کر رہی ہوتی ہیں تو ان کے پائل اور دیگر زیورات کی آوازیں باہر تک پہنچتی ہیں اور خصوصاً اس وقت صاف صاف سنائی دیتی ہیں جب فضا پر امن ہو۔ بات بالکل صاف تھی۔ کیسے یہ ممکن تھا کہ ایک حکومت جو ایک اسپتال کی ضرورت کو محسوس کر سکتی تھی وہ ان قیدیوں کی دردناک زندگی کو، ان کی پریشانیوں کو ان کے جسم و روح کی حالت کو نہیں سمجھ سکتی تھی جن کو اس حکومت نے خود اس آگ میں جھونکا ہو۔ اور ان کو اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی خود آزادی نہ ہو۔ یہ منافقت تو اتنی واضح تھی کہ انڈمان کو بار کے چٹانوں پر لکھی ہوئی تھی اور سمندر کی لہروں کی طرف سے گونج کے ساتھ سنائی دیتی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا، تاریخ الفاظ پیدا کرتی ہے اور ان کی قدر بھی کرتی ہے۔ الفاظ کو زندہ حقیقت کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ مجرم بستیاں، دہشت گرد، جمہوریت، امن، جنگ، تحفظ جیسے الفاظ کو تاریخ جنم دیتی ہے تاکہ یہ الفاظ کچھ خاص معنوں کو کوزے کی طرح اپنے اندر بھر کر تاریخ کے سفر میں انسانوں کے ساتھ ساتھ چلیں۔ ان الفاظ کو احتیاط اور ایمانداری سے استعمال کرنا انسانوں کی ذمہ داری ہے، جب ان الفاظ کو زندہ جسم میں ڈالا جاتا ہے تو یہ اپنے اصلی معنی میں کام کرتے ہیں اور ان لوگوں کو تباہ کر دیتے ہیں جو ان کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ الفاظ ایماندار اور کمزور لوگوں کے دلوں پر بارش کے قطرے کی طرح گرتے ہیں اور انتہائی طاقتور، بے ایمان اشخاص پر شہاب ثاقب کی طرح مار کرتے ہیں۔

دنیا میں امن کی فضا قائم کرنے کے لیے دانشوروں کو ایسے شیروں کو پالتو بنانے کی خواہش سے باز آنا چاہیے۔ شیر ی عشر ...... رہتا ہے اور شیر علی ہمیشہ شیر علی ہوتا ہے، چاہے اس کو کوئی لاکھ مجرم کہے، ظالم کہے یا پاگل کہے، یا پاگل قرار دیتا رہے۔

اب وہ باہر آ چکا تھا۔ وائپر آئی لینڈ کے پھانسی گھر کے سامنے ان کھنڈروں کے پاس کھڑے ہو کر جہاں جیلر کے بنگلے میں ہنبری کا قتل ہوا تھا۔ اپنے چاروں طرف کی پہاڑیوں پر نظر ڈالتے ہوئے اسے پرانے وقتوں کے وہ قیدی یاد آئے جنہوں نے یہیں اپنی زندگی ختم کی تھی۔ انہی میں اس کا پردادا میر علی بھی تھا اور اب وہ یہاں کھڑا تھا۔ وہ یہاں کھڑا ہو کر حکومتوں کو زمانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے وائپر آئی لینڈ ایک ایسا مینار نور تھا جو اپنے سینے میں ہزاروں خطرات خاموشی سے چھپائے کھڑا تھا اور جہاں آ کر بڑے بڑے جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر ایسے پاش پاش ہو جاتے تھے جیسے کسی چھپے ہوئے شکاری نے اچانک کسی معصوم پرندہ کو گولی ماردی ہو۔

وہ مزید سوچنے لگا۔

تو پھر وہ کون سی چیز تھی جو ان جہازوں کو ادھر آنے پر مجبور کرتی تھی۔

سوچتے سوچتے اس کی نظر پھانسی گھر پر جا کر ٹک گئی۔ جو اتنا مضبوط بنایا گیا تھا کہ ان تمام کھنڈروں میں صرف یہی زمانے کے تھپیڑوں سے بے پروا، صحیح سالم کھڑا تھا۔

❖❖

12

جب جہاز آسمان کی بلندی پر پہنچا اور پھر ایک سرعت کے ساتھ آگے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ۱۹ ویں صدی سے ۲۱ ویں صدی کے پہلے پہر میں جا رہا ہے۔ سال دس سال رہنے دور ہے سب کے لمحے موجود کا حصہ تھے، اس نے محسوس کیا، تین دنوں پہلے کا کوئی وقعہ تین سال پہلے کا، تین سال پہلے کا یا تین سو سال پہلے کا کوئی واقعہ۔ کوئی واقعہ کتنا پہلے ہوا محسوس ہوتا ہے اس کا انحصار اس پر ہے کہ کوئی اس واقعہ سے کتنا تعلق محسوس کرتا ہے۔ اور یہ واقعہ کتنا تازہ اور موزوں ہے۔ اور یہ ذہن کی الماریوں میں بھیجنے کے لائق ہے۔ اس کے لیے اس لیے کالا پانی کا تاریخی واقعہ ایک ایک درخشاں سورج کی طرح تھا جو آسمان سے جھول رہا تھا اور اس کی کرنیں ڈیڑھ سو سال کو پار کرتی ہوئی انسانی تقدیر کے تمام رنگوں میں برتی ہوئی سیدھے موجودہ وقت کے دھارے اوپر اس طرح گر رہی تھی کہ موجودہ عہد کی ساری کائنات دھاریں اپنی حقیقت کے ساتھ روشن ہو رہی تھیں۔ اس کے ذہن کے نیچے موجود اخبار اور ٹی وی چینل فلمیں اور ڈرامے ہر ایک شہر پر ایک گھر ہر ایک گاؤں اب بھی ایک بہت بڑے روزمرہ کی واقعات کے نمائش کی طرح گزر رہی تھیں۔ جلیاں والا باغ کے خون کے چھینٹے ابھی بھی تازہ تھے۔ تقسیم ملک کی ہلاکتوں کا خون اب بھی کبھ رہا تھا اور جہیز کے لیے جلائی گئی عورتوں کی راکھ اس میں شامل ہو کر بہہ رہی تھی، جس طرح کسی نشتر کے چھوتے ہی کسی زخم کے اندر سے خون اور مواد بہنا شروع ہو جاتا ہے اسی طرح بے شمار دہشت ناک وقعات اپنے بھرپور رنگوں کے ساتھ خون کو منجمد کر دینے والے رنگوں اور شکلوں میں مل کر باہر آ گئے تھے۔ یہ تصویر سمندروں کی طرح وسیع اور چاروں طرف تھی۔ ایک ایسا سمندر جو ارتقا، اور نشو نما کی بلند و بانگ سرگوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھی۔ لیکن گنگا کے کسی عظیم

سیلاب کی طرح پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لوگ زندگی تمنا کے ساتھ چیخ چلا رہے تھے۔ یہ ایک بہت ہی تکلیف دے اور وسیع منظر تھا۔ اس نے اس منظر سے باہر آنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

اڑتا ہی تو نہیں رہے گا۔ آخرکار اس زمین پر اترے گا جس سے یہ اڑا تھا۔

ٹھیک ہے لیکن میں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے میں کبھی نہیں بھول پاؤں گا اور یہ شعور میری آنکھیں کھولے گا۔ اور میں اپنے لوگوں سے کہوں گا کہ وہ کسی ایسی دنیا کی تعمیر ہرگز نہ ہونے دیں۔ جہاز اب دہلی ایرپورٹ پر اتر رہا تھا۔

OO

دلی ایرپورٹ پر اترنے کے بعد اس نے دلی کو دیکھا۔ اسے یہاں کے ٹوائلٹ میں اپنا لکھا ہوا جملہ یاد آیا۔ لیکن وہ بالکل سرد تھا۔ اس کے دل پر تو ہزاروں من بھاری خاموشی تھی۔ دوسرے دن وہ ٹرین سے گھر پہنچ گیا۔

باہر برآمدے سے منسلک کونے والے روم میں اس کے بزرگ والد تسبیح پڑھ رہے کر رہے تھے۔ وہ ان کے پاس گیا۔ سلام کر کے واپس آیا۔ گھر کے اندر گیا۔

تھوڑی دیر میں سب نے اسے گھیر لیا۔ امی، پھوپھی، بہن، چھوٹے بھائی، بھابھی۔ اتنے میں والد صاحب بھی ہاتھ میں تسبیح لئے آتے دکھے۔ انہیں دیکھ کر سب ایک طرف ہو گئے۔ آ کر سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور تسبیح ذرا دھیمی ہو گئی۔

والد نے ہی سوال کیا، بابو کچھ دادا کا پتہ چلا۔ کتنے دن وہاں رہے، کب مرے۔ ان کی قبر کہاں ہے۔

خالد سہیل کے ذہن میں ہزاروں میل دور سمندروں کے درمیان گھرے جزائر میں سمندر کے کنارے لاشوں کو کھینچتے ہوئے گدھ چونچ میں گوشت کے ٹکڑے لے کر اڑتے تھے۔

سمندر کے کنارے پتھروں سے بھرا جزیروں کا بے رحم کنارہ، دھوپ میں جلتے جسموں پر چہرہ بھینچے کے لیے گلے میں پھانسی کے پھندوں کی آکری آوازیں کٹ کٹ اور لاشوں کو اسی سے کھینچنے والوں پر مزید انگریزی کوڑوں کی سٹ سٹ کی آواز اور قیدیوں کی بے زبانی! وہ کیا بیان کرے کیسے بیان کرے۔ اس کا دل...... گیا۔

ماں نے کہا، وہاں کام کراتے تھے نا۔ کیسے کام کرتے ہوں گے وہ۔ کبھی زندگی میں ناگی سے جلاون تک نہیں کاٹا انہوں نے۔ مٹی اور لکڑی کٹواتے ہوں گے۔ مکان بنواتے ہوں گے۔ اماں دوسروں کی طرف دیکھ دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔

والد بے حد انہماک سے، تسبیح روکے، آنکھیں خالد پر مرکوز کیے انتہائی اشتیاق سے سننا چاہتے تھے۔ خالد سہیل نے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جھلکتے اشتیاق کو دیکھا۔ وہ تو صرف سننا چاہتے ہیں کہ میں ان کو بتاؤں کہ میر علی کی زندگی کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہو سکا۔ ان کی قبر کا پتہ لگا کہ نہیں۔ اگر پتہ لگا تو وہ شاید کہیں گے کہ مجھے ایک بار وہاں لے چلو۔ خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔ اور چپ رہا۔ جب باپ کی نظروں میں مایوسی جھلکنے لگی اور تسبیح کی رفتار بڑھ گئی تو خالد کی آنکھوں سے آنسو کے دو موٹے قطرے اس کے رخسار پر ڈھلک آئے۔ سب کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور بھیگی آنکھوں کے پیچھے اس کے ذہن کے اندر انڈمان کے سمندروں میں تیرتی ہوئی لاشیں اور اوپر منڈلاتے گدھ دکھائی دیتے رہے۔

خالد سہیل نے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جھلکتے اشتیاق کو دیکھا۔ وہ تو صرف سننا چاہتے ہیں کہ میں ان کو بتاؤں کہ میر علی کی زندگی کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہو سکا۔ ان کی قبر کا پتہ لگا کہ نہیں۔ اگر پتہ لگا تو وہ شاید کہیں گے کہ مجھے ایک بار وہاں لے چلو۔ اور چپ رہا۔ خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔

میر علی سے جڑا ہوا پرانا گھاؤ بھی اپنی پوری لگن کے ساتھ تازہ ہو گیا تھا۔ اور ان پر ٹوٹی ہوئی ہیبت کا خیال تازہ ہو کر اپنے سے جڑے ہوئے تکالیف دہ سوالوں کو چھیڑنے لگا تھا۔ کالا پانی میں جانے کے بعد ان پر کیا گزرا، انھوں نے کس حال میں اپنی زندگی کاٹی، وہ یہاں کے بارے میں کیا کیا سوچتے تھے، کیا کیا تمنا رکھتے تھے، وہیں آباد ہو کر مطمئن ہو گئے

تھے یا گھر واپس آنا چاہتے تھے تمناؤں کے خون میں سنے ہوئے سوالات گھر کے در و دیوار پر چھینٹے بکھرنے لگے۔

اس نے گھر والوں کو کالا پانی کی جو کہانی سنائی تھی اس نے گھر میں کئی دنوں تک ماتم کا ماحول بنائے رکھا۔ لیکن ابھی لوگ اس گہری تکلیف کے صدمے سے باہر نکل بھی نہ پائے تھے کہ گویا یاد دہانی کے طور پر اسی بیچ عدالت سے ایک نوٹس آ ہی گیا۔ نوٹس کے مطابق کچھ انجان لوگوں نے دعوی کیا تھا کہ وہ میر علی کی ان تین بیٹوں کی اولاد میں جو کالا پانی میں ان کی دوسری بیوی سے پیدا ہوئے تھے اور اس بنا پر انہوں نے میر علی کی جائداد میں بٹوارے کا مقدمہ دائر کیا تھا۔ یہ مقدمہ ان کے خاندانی دشمنوں کے ایک رشتے دار نے مختار نامے کی بنیاد پر عدالت میں دائر کیا تھا۔

❖❖

اس سے پہلے تو خالد اور اس کے گھر والے کالا پانی کے بارے میں برائے نام ہی کچھ جانتے تھے۔ لیکن اب کالا پانی ان کی زندگی کا ایک ایسا جیتا جاگتا سروکار بن گیا جس سے ان کا پورا وجود جڑا ہوا تھا۔ معاملے کی نزاکت نے ان کو شدت سے جھنجھوڑ کر انھیں احساس دلایا کہ انہوں نے اپنے خاندان کی تاریخ کو اس قدر بھلا کیسے دیا تھا کہ وہ محض ایک کہانی اور ایک جذباتی چیز بن کر رہ گئی تھی۔ ان کی زندگی کے معاملے، مقدمے اور تاریخ اس طرح ایک دوسرے سے منسلک تھے اس کا انکشاف ان پر ایسے ہوا کہ سارا حال دور بھاگنے لگا اور ماضی میں دھیرے دھیرے نیچے اتر کر اپنے کو ان کی روز مرہ کی سوچ اور گفتگو کا مرکز بنا لیا۔

اس کے ساتھ ہی ان خاندانی دشمنوں کے چہرے کا گھناؤنا پن پوری شدت سے ان کے سامنے ابھرنے لگا کہ۔ پہلے تو انہوں نے انتہائی مکاری اور عیاری سے میر علی کے اوپر ایک جھوٹا مقدمہ چلوا کر ان کو کالا پانی بھجوایا اور اب انہی بنیادوں پر انہوں نے ان کی جائداد پر دعوی ٹھونک دیا۔

وراثت کا تاریخ سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور جو لوگ اپنی تاریخ نہیں جانتے ان کے لیے مقدموں کا لڑنا مشکل ہو جاتا ہے اس واقعے کے بعد اس نے دھیرے دھیرے سب کچھ بتانا شروع کیا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک دنیا کو حکومتوں، جنگوں اور قوانین کو اپنے والد کے کہے گئے جملے کی روشنی میں پڑھتے ہوئے یہ تجزیہ کرتا رہا کہ یہ بات کہاں کہاں کس حد تک صحیح تھی اور جہاں جہاں یہ بات صحیح تھی وہاں کی عوام اس بارے میں باشعور تھے یا نہیں۔ تجارت اور تلوار کی جوڑی اسے تاریخ کی آماجگاہ میں کئی جگہ چمکتی ہوئی دکھی۔ اور اس کے ساتھ ہی پشت در

پشت جاری عیاری اور مکاری کی لکیریں صاف صاف کھنچی ہوئی دکھنے لگیں۔

ایسا لگنے لگا کہ یہ سازش اس کے پردادا کے وقت سے ہی مسلسل جاری رہی اور اندر ہی اندر یہ سب کچھ کرنے کی تیاری چلتی رہی۔ جس کا انہیں کبھی احساس ہی نہیں ہوا اور ان کے ذہن کا کوئی نہ کوئی گوشہ جسے جاگتے رہنا چاہئے تھا گہری نیند سوتا رہا۔

اہم بات یہ تھی کہ مقدمے پر توجہ دی جائے۔

❖❖

ابھی وہ کچہری جا کر کچھ کرنے کی سوچ ہی رہی تھے کہ اور تیار ہو کر ناشتے پر بیٹھے ہوئے پہلا لقمہ اٹھانے ہی والے تھے کہ خادمہ نے آ کر بتایا کہ باہر کوئی آیا ہے اور بت پچھلے دن کی طرح وہ بھی بتا رہا ہے کہ وہ کچہری سے آیا ہے اور ان کو پوچھ رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ ہے۔ ان کو گہری تشویش ہوئی اور وہ اٹھنے لگے۔ بیگم نے ان سے اطمینان سے پہلے ناشتہ کر لینے کے لئے تسلی کے لئے کہا لیکن ان کے ذہن میں اتنے اندیشے پیدا ہو گئے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

عدالت کے ہرکارہ نے ان سے رسید لے کر باضابطہ ایک لفافہ دیا۔ سمن کے بعد عدالت کا یہ دوسرا مراسلہ تھا۔ اس مراسلہ کے مطابق ان کی تمام خاندانی زمینوں کی فروخت پر روک لگائی گئی تھی اور انہیں کسی ریسیور کے حوالے کرنے کی تجویز تھی۔ اسی دن شام کو وہ اپنے خاندانی وکیل کے پاس پہنچے۔

❖❖

وکیل نے بتایا کہ اس میں پہلے ان کے پاس جو نوٹس آ چکا تھا اس کا اطمینان بخش جواب جانا چاہئے تھا۔

'لیکن یہ تو سراسر بنائی ہوئی کہانی ہے۔ اور میں نے اپنے بیٹے کو اس کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اور پھر عدالت نے کوئی نوٹس نہیں بھیجا تھا۔'

انہوں نے عدالت میں کہا ہی کہ آپ فوری طور پر زمینیں بیچنے کی تیاری کر چکے ہیں اس لئے عدالت نے احتیاطاً یہ آرڈر کیا ہے لیکن اب جب تک اس مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو جائے گا تب تک آپ نہ اپنی کوئی زمین بیچ سکتے ہیں اور نہ اسے گروی رکھ سکتے ہیں نہ اسے اپنے نام پر منتقل کرا سکتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے عدالت سے یہ درخواست بھی کی ہے کہ پوری جائداد کا انتظام وقتی طور پر کسی تیسرے آدمی کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

تو کیا عدالت ایسا حکم دے سکتی ہے؟

دینا تو نہیں چاہئے لیکن عدالت کو ایسا کرنے کا اختیار تو ہے۔

اس کا مطلب یہ ہو بھی سکتا ہے۔

یہ کھیل ہے تو بہت خطرناک اور آجکل عدالتوں میں کچھ بھی ممکن ہے۔

لفظ آجکل پر والد کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آ گئی۔

وکیل نے ان کے چہرے کو دیکھا۔

انہوں نے وکیل کے لفظ کو دہرایا۔

'آجکل'۔

عدالت میں بڑے بڑے گھپلے تو ہمیشہ سے ہی ہوتے آئے ہیں لیکن آجکل یہ بیماری کچھ اتنی بڑھ گئی ہی کہ سچ پوچھیے تو اب وکالت کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم مقدمہ کی تیاری چاہے جتنی بھی اچھی کرلیں' ہمیں نتیجہ کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ ہوتا وہی ہے جو پہلے سے طے ہوتا ہے۔

اب کرنا کیا ہے۔

'جواب دیں گے۔' ایک وقفے کے بعد اپنی طرف دیکھتے ہوئے والد سے نظریں ملیں تو اس نے آگے کہا۔

'ہوشیار رہنا ہوگا۔'

کاغذات وکیل کے پاس ہی چھوڑ کر خالد اور اس کے والد لوٹ گئے۔ والد نے خالد کو حکیم کے یہاں سے اپنی دوائیاں بنوا کر لیتے آنے کی ہدایت دیتے ہوئے خود ایک رکشے پر بیٹھ کر گھر کی طرف چل پڑے۔

وہ رکشے میں واپس آرہے تھے۔ بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی دشمنوں کا مکان پڑتا تھا۔ اتفاق سے وہ لوگ باہر ہی دروازے پر کھڑے تھے۔ ان کو دیکھا تو آپس میں زور سے مسکرائے۔

والد ان کو کاٹنے والی نگاہوں سے گھورنے لگے۔ رکشہ آگے بڑھ گیا تو وہ لوگ نظروں سے اوجھل ہوگئے لیکن ان کی مسکراہٹ بچھو کی طرح ان کو ڈنک مارنے لگی۔

کافی گہری سوچ میں ڈوبے واپس گھر کے لئے رکشے پر بیٹھتے ہوئے لوٹ آئے۔

خالد سہیل کے والد جب گھر پہنچے تو ہر چیز کی شکل بدلی ہوئی تھی۔ وہ مکان جسے وہ بچپن سے اپنا سمجھ رہے تھے وہ اجنبی سا لگنے لگا۔ بیگم ان کی تکان دور کرنے کیلئے شربت بنا کر پلاتی رہیں لیکن انکی تکان بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ہوشیار رہنا ہوگا۔

گھر میں پہنچے تو ان کی طبیعت بہت بوجھل تھی۔ اور وہ آرام کرنے کے بجائے بے معنی ہی گھر میں ادھر ادھر چلتے پھرتے رہے۔

بڑے دالان میں ان کی نظر اپنے دادا کے اسلحوں پر پڑی۔

سب بیکار ہیں۔

اس جنگ کے لئے نئے اسلحے چاہیے۔ ہوشیار رہنے کا مطلب وہ سمجھ گئے تھے لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ ان کے مخالفین کے پاس پیسے بہت تھے اور وہ پرانی رقابت اور دشمنی کا بدلہ صرف گاؤں میں فوقیت حاصل کر کے ہی نہیں لینا چاہتے تھے بلکہ ان کی نظر جائداد پر تھی۔ ان کے اندر کوئی ایسی بھوک تھی جس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ انہی باتوں کو لیکر اس زمانے میں بھی ٹکراؤ ہوئے تھے۔ انہوں نے پیسے کا استعمال کیا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو عدالت سے یہ آرڈر ہی نہیں آتا۔ لیکن جب یہ ہوا ہے تو اب اسے دیکھنا ہی پڑے گا۔ ان کی تسبیح کی رفتار سست ہوگئی۔ خالد کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ یہاں کا ٹاور خراب ہونے کی وجہ سے موبائل سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میر علی کی زندگی کے حالات کا ریکارڈ لانا اب بہت ضروری

ہوگیا تھا کیونکہ ان لوگوں نے فرضی کاغذات داخل کردئے تھے اور وہ بھی ایسے جن کی تصدیق ممکن ہی نہیں تھی اور ان کے صحیح غلط ثابت ہونے کا سارا انحصار زبانی گواہوں اور عدالت کی مرضی کے اوپر تھا۔ وہ کوئی بہت بڑی اور کسی ماہر وکیل کے مشورے سے گڑھی گئی سازش تھی جو میر علی کے مقدمے والی سازش سے کسی اعتبار سے کم تیاری کے ساتھ نہیں ہوئی تھی۔ اب دشمن پیچھے سے نہیں سامنے سے اور نوٹس دیکر حملہ کررہا تھا اور قانون کا مافیائی استعمال کرنے کا اعلان کرچکا تھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ خالد کو بتانا چاہتے تھے کہ ریکارڈ لانا کتنا ضروری ہوگیا تھا بلکہ اب ان کو اس کا بھی بھروسہ نہیں تھا کہ ریکارڈ سے بھی کچھ ہوگا کیونکہ لڑائی دشمنوں کی طرف سے ریکارڈ سے بھی آگے کسی اور چیز کی بنیاد پر لڑی جارہی تھی اور ان کی اپنی کامیابی کا یقین اس پر قائم تھا۔۔

والد کو لگا جیسے ان کا پورا گھر کسی سنامی کے جھٹکے محسوس کررہا ہے۔

❖❖

خالد کچہری سے نکل کر بازار میں آیا۔ دکانوں اور عمارتوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے اس کا دماغ ان کے اوپر ہی اوپر گردش کرتا رہا۔ اپنی زندگی کی حقیقت سے بے خبر لوگ کس طرح رواں دواں زندگی گزار رہے تھے۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ ایک خوفناک پنجرے میں زندگی گزار رہے تھے۔ ان پرندوں کی طرح جو صرف چھننے کا احساس ہونے کے بعد پھڑپھڑاتے ہیں۔ اسے گھر کے لئے تھوڑی سی خریداری کرنی تھی۔ وہ بازار کے اندر داخل ہوگیا۔ وہی سامانوں کی نمائش، وہی مول تول، وہی سیدھے سادے لوگ، کیڑوں کی طرح زندگی گزارتے ہوئے۔ کسی چیز سے ٹکرانے پر آمادہ نہیں۔ وہ وہاں سے نکلا۔ بس اسٹینڈ کچھ دور تھا۔ رات ہوچکی تھی۔ وہ ایک چائے خانہ میں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ خریداری اور پیدل چلنے کے باوجود اس کا ذہن شہر کے اوپر ہی چکر لگاتا رہا۔ نہ جانے کیوں چائے خانے سے بس اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک جگہ کھڑا ہوکر شہر کے اوپر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اور وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کافی عرصہ بعد اس کا ذہن شاعری پر مائل ہورہا تھا۔ اس کی نظریں شہر کی روشنیوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ پھر جیسے پورا منظر اس کے ذہن میں اٹک سا گیا۔

تمام رات کسی دیوتی کے سائے میں

تمام شہر خوشی کی نیند سوتا ہے

تمام رات لہو کے چراغ جلتے ہیں

تمام نور اندھیروں کی نذر ہوتا ہے

یہ اشعار لکھنے کے بعد اس کی طبیعت ہلکی ہوگئی۔

بس میں بیٹھا تو اسے پھر وکیل کی بات یاد آنے لگی۔

کتنا ہوشیار۔

اس کے ذہن میں یہ سوال کچہری سے یہاں تک راستے بھر گونجتا رہا اور ان کو اپنے آباو اجداد کے دنوں کی یاد دلاتا رہا۔

رات میں اس نے اپنے والد سے اس موضوع پر دیر تک بات کی۔

خالد نے معاملے کو سلجھانے کی آخری کوشش کی۔ وہ بستی کے کچھ لوگوں کو لیکر دشمن کے گھر پہنچا۔ گاؤں کے تمام لوگ خالد کی شخصیت کی عزت کرتے تھے۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد انہوں نے کہا۔

'ہم یہ مقدمہ واپس لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس مقدمہ میں سچائی نہیں ہے۔ لیکن ہم تمہارے باپ کو بتانا چاہتے تھے کہ وہ کس دنیا میں رہ رہے ہیں۔'

دشمنوں نے بھی خالد کا احترام کیا لیکن اپنے ڈنک کا پورا زہر اس کے دل میں اتار ہی دیا۔

'ہم آپ سے صلح کی درخواست لیکر آئے ہیں، آپ سے تربیت لینے نہیں آئے ہیں۔'

اچانک ماحول بہت گمبھیر ہو گیا۔

دشمنوں کے اس جملے نے خالد کے لئے انڈمان کے مقدمے کو اب خالد کا وہ مقدمہ بنا دیا جس میں اس کا پورا جینیس بھنور میں گھرے جہاز کی طرح پھنس گیا۔

چاروں طرف سمندروں کا اتھاہ پانی اور ان کی فلک بوس موجیں اس کو دعوت سفر دے رہی تھیں۔

مقدمہ ختم نہیں ہوا تھا۔ دشمن عظیم اس کے سامنے ننگا کھڑا تھا۔ اور مقدمہ پوری کائنات میں پھیل گیا تھا۔

❖❖

گاؤں کے دشمنوں نے بہت بڑا طنز کیا تھا لیکن انہوں نے صحیح کہا تھا کہ اس کے والد دنیا کو نہیں سمجھتے اور اس نے خاموشی سے اپنے باپ کی اس کمی کا اعتراف کر لیا تھا۔ اسی کمی کی بنیاد پر ان لوگوں نے گویا اپنا مقدمہ واپس لینے کا آفر دیا تھا۔ خالد کے دل کو یہ بات کچوکے لگانے لگی کہ اس کے خاندان کو وہ لوگ قابلِ رحم سمجھ رہے تھے۔ یہ اس کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ شریف لوگوں کو ظالموں کے رحم کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ ان شریف لوگوں کی کمزوری کی رگ میں کون سا خون دوڑتا ہے؟

- یہ سوال اس کے ذہن میں گہرائی سے چبھ گیا۔

اور پھر اس میں درد ہونے لگا۔

درد بڑھتا گیا۔

ان شریف لوگوں کی کمزوری کی رگ میں کون سا خون دوڑتا ہے؟ کیا انہیں مسلسل رحم و کرم کا زہر پینے کی کہیں سے لت لگ جاتی ہے؟

یہ زہر ان کے وجود کو اور کہاں کہاں خراب کرتا ہے؟

کہیں چین کے افیمچیوں کی طرح صدیوں صدیوں کی اس زہر نوشی نے ہی تو عام انسانوں کو اتنا ناکارہ نہیں بنا دیا ہے کہ وہ غلامانہ ذہنیت کو اپنے دردِ زندگی کا اکسیر سمجھنے لگا ہے اور اس کے زخموں کو زہریلے کیڑوں نے اپنا مسکن بنا لیا ہے۔

اب وہ اپنے دل میں اس بات کا کھلا اعتراف کرنا چاہتا تھا کہ دشمن دراصل اس کے خاندان کا مذاق نہیں اڑانا چاہتے تھے بلکہ وہ وہ ایک سچائی کی طرف پرزور طریقے سے اشارہ کر کے خود اس کے خاندان کی کمی کو اس پر واضح کر کے اپنی صفائی دی رہے تھے تا کہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا اس کے لئے وہ انہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرائے۔ وہ دل میں کہیں اس کی بیحد قدر کرتے تھے اور اس لئے انہوں نے اس کے جاتے ہی معاملے کو رفع دفع کر دینے کا آفر دیا تھا لیکن تکلیف دہ چیز ان کی آنکھوں میں چمکتا ہوا وہ غرور تھا جس کی بنیاد مکاری پر قائم ان کا احساسِ برتری تھا اور ان کی یہی چیز اس کے لئے حتمی و ختمی طور پر ناقابلِ قبول تھی۔

اسے یاد آیا کہ وہ جزائر انڈمان صرف اپنے دادا کی زندگی کے حالات اور ان کی شادی اور اولاد کے بارے میں پتہ لگانے کے لئے نہیں گیا تھا بلکہ وہ تو اپنی صحافتی زندگی کا ایک ایسا مقدمہ لڑنا چاہتا تھا جس سے اس کی زندگی کی پوری معنویت وابستہ تھی، ایک ایسا مقدمہ جو اسے تاریخ انسانی میں امر کر دے۔ اسے بس اب اس مقدمہ کی عمیق گہرائیوں میں اتر کر پوری دنیا کے سامنے اس مقدمہ کو جیتنا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ انسان سب سے بڑا خوش قسمت ہوتا ہے جسے وہ کرنے کا موقع مل جائے جو اس کا دل چاہتا ہو کہ دل کی مراد پوری ہونے میں ہی انسان کی سب سے بڑی خوشی پنہاں ہوتی ہے۔ اور اس نے اپنے لئے اس عظیم خوشی کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ 'یہ مقدمہ کوئی معمولی مقدمہ نہیں تھا۔' اس نے سوچا۔ اس مقدمے کا مقابلہ ان بڑے بڑے سائنسدانوں اور ریفارمرس اور یہاں تک کے پیغمبروں اور اوتاروں کے مقدموں سے کیا جا سکتا تھا جنہوں نے تاریخ میں انسانی فلاح و بہبود کے کارنامے انجام دئے کہ اس مقدمہ کا تعلق ایک ایسے مسئلے سے تھا جو پوری نسلِ انسانی کی ایک بڑی آبادی کے سر پر تاریخ کی عمیق گہرائیوں سے ہی مسلسل آسیب بن کر چھایا ہوا تھا۔

انڈمان کے سفر نے اس کو بیحد سنجیدہ بنا دیا تھا اور وہ اب اس سنجیدگی سے باہر آنا

بھی نہیں چاہتا تھا اور شاید کوشش بھی کرتا تو نہیں آ پاتا کہ اس کا دل اور اس کا دماغ دونوں ہی اندر سے پگھل کر دائمی طور پر کسی اور شکل میں ڈھل کر منجمد ہو چکے تھے اور انسان فنا تو ہو سکتا ہے لیکن اپنے علم کو نہیں مٹا سکتا کہ علم وہ نقش بناتا ہے جو دائمی اور انمٹ ہے اور علم وہی ہے جس سے آزادی اور فرار ممکن نہیں اور باطل اور علم میں یہی فرق ہے۔ علم کی روشنی نے خالد کا مکمل طور پر شکار کر لیا تھا۔

مسئلہ، خاندان، افراد اور ان کی جائداد کو بچانے کا نہیں تھا۔ مسئلہ معصوم انسانوں کو ڈسنے والے سانپ کو اس کی گردن سے پکڑنا اور اس کے پیچھے کے ماسٹر مائنڈ کے چہرے پر پنجہ گڑا دینے کا تھا۔

اس پریشانی اور تناؤ کے عالم میں بھی اسے کبیر داس کی بات یاد آئی کہ پڑوس میں دشمن رکھو وہ تمہاری کمیوں کی نشاندہی کرتا رہے گا۔

'بڑے انسان وہ ہوتے ہیں جو پریشان کرنے والی باتوں میں بھی علم کا پہلو نکالتے ہیں۔'

اس نے سوچا۔

بلکہ پریشانیوں میں قدرکا پہلو یہی ہے کہ وہ دکھوں کی چھڑی سے انسان کو اندھیروں میں چلنے میں مدد کرتی ہیں اور بڑی اور پنہاں بیماریوں کی جانکاری دیتی ہیں کہ اگر دکھ نہ ہوں تو آدمی مکمل طور پر بیمار ہونے کے باوجود اسی غفلت میں جیتا رہے گا کہ وہ مکمل طور پر صحت مند ہے۔

❖❖

اسی بیچ ایک اور واقعہ ہو گیا۔ دلی میں ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے دلی سے واپس جانے سے پہلے ملک کی سب سے بڑی نوکری کے مقابلے کا امتحان دے ڈالا تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد ہی وہ جزائر انڈمان کے سفر پر نکلا تھا۔ انہیں دنوں میں اس امتحان کے نتیجے بھی آ گئے لیکن اس کا انتخاب نہیں ہوا۔ وہ فوراً دلی پہنچا۔ وہاں اس کی ملاقات اپنی دو چار دوستوں سے ہوئی۔

وہ اپنے آپ سے اچھی طرح واقف تھا۔ دوستوں کی مشورے سے اس نے امتحان لینے والے ادارے کو چیلنج کیا کہ کسی بھی کامیاب امیدوار ساتھ کسی بھی موضوع پر اسے دوبارہ امتحان میں بٹھا کر دیکھ لیا جائے۔ اس نے مانگ کی کہ امتحان کے نمبر ظاہر کیے جائیں۔ جب اس کی بات نہیں مانی گئی تو وہ عدالت میں گیا۔ پہلے تو عدالت میں امتحان لینے والے ادارے کی طرف سے اس طرح آنا کافی ہوئی جیسے بحیثیت ایک شہری کے کسی امیدوار کو یہ جاننے کا اختیار ہی نہ ہو کہ اس کے ملک کی اعلیٰ ترین نوکریوں کے لئے انتخاب صحیح طریقے سے ہو رہا ہے یا نہیں لیکن جب عدالت کے حکم سے نمبر دکھانا پڑا تو اس کے ابتدائی نمبر ان سے زیادہ نکلے جو کامیاب ہوئے تھے۔ خالد اور اس کے دوستوں میں اس کامیابی پر خوشی کی ایک لہر سے دوڑ گئی لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔

اب یہ کہا گیا کہ ادارے کو امتحان میں ملے ہوئے نمبروں کو کم بیش کرنے کا اختیار ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ انتخابی نتیجہ سوالوں کے صحیح جواب کی بنیاد پر ہو۔ یعنی عوام کا یہ عام خیال کہ یہ انتخابات امیدواروں کی ذہنی صلاحیتوں کی بنیاد پر خود بخود طے ہوتے ہیں ایک خیال خام تھا۔

اس بات پر اسے حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ بہت کچھ جان گیا تھا لیکن وہ خفیہ چہروں کو یہاں بھی ٹٹول کر دیکھنا چاہتا تھا۔۔

جب خالد نے پوچھا کہ ایسا کن بنیادوں پر کیا جاتا ہے تو جواب ملا کہ انتخاب کے لئے جو معیار بنائے گئے ہیں وہ اس ادارے کی خالص ذہنی اثاثہ ہیں۔

اس پر اسے زندگی میں پہلی بار غصہ آ گیا تھا۔

'یہ کیا ہے؟' اس نے جھنجلا کر کہا تھا' یہ کیسی جمہوریت ہے جس میں ملک کا ذہنی اثاثہ عوام کی نہیں بلکہ کسی اور کی ملکیت ہے اور وہ جو کوئی اور ہے وہی اس نظام کی تعمیر کرتا ہے۔'

اور وہ عدالت میں بلا وجہ شور مچانے کی لئے توہین عدالت کے جرم میں جیل جاتے جاتے بال بال بچا تھا۔

اسے اپنی ناکامی پر اپنی تذلیل کا بھی احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ جمہوری جمہوری قدروں کو اپنے سینے سے لگائے ہونے کے باوجود اپنے جمہوری معاشرے کا ہی ایک دھتکارا ہوا کتا بنا دیا گیا تھا جبکہ بظاہر جمہوریت اپنی جگہ اپنے تینوں ستونوں پر پورے جاہ و جلال کے ساتھ کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اپنے اردگرد کے اسی منظر کو دیکھ کر اسے پہلی بار اس حقیقت کا بھی ہلکا پھلکا عرفان ہوا تھا کہ جمہوریت راستہ ہے منزل نہیں اور اسے اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے خوفناک پہاڑیوں اور درندوں کے درمیان سے ہو کر لڑتے ہوئے گزرنا ہے۔

ایک رات سوچتے سوچتے اس کے اوپر منکشف ہوا کہ اسے اپنے حاکموں کے انتخاب کا حق ضرور تھا، اسے اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی بھی حاصل تھی، لیکن وہ آزاد نہیں تھا۔ اس کی زندگی ان حاکموں کے تابع تھی جن کا وہ انتخاب کرتا تھا۔ وہ جس سول سوسائٹی کی بات کرتا تھا وہ محض اس کے ذہن میں بسا ہوا ایک خوشنما اور خود ساختہ خواب تھا جو

بیشمار تلواروں کی نوکوں کے بیچ گھرا ہوا تھا اور جمہوریت میں اس خواب کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

دنیا کو وہ جس طرح اب دیکھ رہا تھا اس تجربے میں وہ تنہا تھا۔ اس تجربے کے اظہار میں الفاظ تک اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ اپنے اس تجربے کو ایک جنگلی زخمی پرندے کی طرح تنہا ڈھوتا رہا۔

❖❖

ایک شام رات کے دھندلکے کے پھیلنے کے وقت خالد بھی اپنے دروازے پر والد کے پاس ہی ایک آرام کرسی پر دراز تھا۔ وہ کافی دیر سے خاموش تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک بات آئی اور اس کا جی چاہا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا تھا اس میں وہ اپنے والد کو شامل کرے۔

'ابا جان۔ میرا ذہن کہ رہا ہے کہ ہمارے مقدمے اب تجارت کا حصہ بن چکے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مقدموں کے غلط فیصلے کیسے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تاجر کوئی اور نہیں بلکہ یہ وہی ہیں جو مقدموں کے فیصلے کرتے ہیں اور شیر علی نے صحیح کہا تھا اور اگر وہ آج کے ہندوستان کا شہری ہوتا تو یقیناً وہی کرتا جو اس نے کہا تھا کیوں کہ اس نے جدید حکومتوں کا اصلی روپ دیکھ لیا تھا۔ اس نے لارڈ میو، وائسرائے، کو یہی پیغام دینے کے لیے تو مارا تھا کہ غلام حکومت کو مٹانے کے لیے اپنی جان بھی دینی پڑے تو دو۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ غلام تھا اور اس کام کے لیے اسے اپنی جان دینی پڑی۔ لیکن اس کے ذہن میں آزادی کا خواب روشن تھا۔ وہی نجات کا راستہ تھا اور آج بھی وہی نجات کا کارگر راستہ ہے جو شیر علی نے سوچا تھا اور کہا تھا۔ بس اتنی سی بات کا فرق ہے کہ اب ہم لوگ غلام نہیں ہیں، اور ہماری اور ہماری نجات کے بیچ سمندروں اور پہاڑوں کی دوریاں اور جیل کی اینٹ اور پتھر کی دیواریں نہیں ہیں بلکہ ایوان حکومت اور عوام کے درمیان ایک چلمن جیسی دیوار ہے۔ سرکار چلمن کے پیچھے برہنہ کھڑی ہے۔'

اس کے والد دھیان سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ ان کے اوپر گہری سنجیدگی چھا گئی تھی۔ جب خالد سہل ایک ایک باتیں بتا چکا تو بزرگ باپ کی آنکھوں میں جھانکا۔ اتنی دیر تک وہ صرف خالد کی گفتگو کو صرف آگے بڑھنے کے لیے ہوں ہاں کرتے رہے لیکن جب

پوری بات سن چکے تو ایک بار اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا اور پھر اسے نیچے جھکانے کے بعد انہوں نے ایک سوال کیا۔ پہلی بار ان کا ایک سوال جو میر علی کے بارے میں نہیں تھا۔ یہ سوال شیر علی کے بارے میں تھا۔

''شیر علی نے اپنے آخری بیان میں کیا کہا تھا۔''

''اگر میں برطانیہ کا شہری ہوتا تو میں اس کو ایک ایسے خنجر سے مارتا کہ کا ایک قطرہ نہیں ٹپکتا لیکن میں برطانیہ کا شہری نہیں برطانیہ کا غلام تھا۔''

یہ سنتے ہوئے عبدالرحمان بن خدا بخش بن میر علی کی روشن آنکھیں اپنے پورے جلال کے ساتھ خالد سہل کے چہرے کو تک رہی تھیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ شیر علی کی روح کو فردوس بریں میں رکھے۔ آمین۔ آمین کہنے کے بعد انہوں نے تسبیح کو چوم لیا تھا۔

تب خالد سہل کو خیال آیا کہ یہ جملے سنتے ہوئے ان کی انگلیوں کی حرکت کچھ دیر کے لئے رک گئی تھی۔ خالد سہل نے ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

اسے محسوس ہوا کہ شیر علی ہی اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں مسلسل ان کی آواز داخل ہوتی رہی:

'اگر ہم نے یہ بات نہیں سمجھی تو بار بار میر علی کی طرح مقدموں میں پھنستے رہیں گے، بار بار وہ مقدمے ہاریں گے۔ ہماری سزا ختم نہیں ہوگی، صرف کالا پانی میں بدلتی رہے گی۔ اور بار بار سمندروں کی انجان جگہوں میں انوکھے انوکھے جیل بنتے رہیں گے اور میر علی کی قبر مچھلیوں کے پیٹ میں بنتی رہے گی۔'

پھر انہوں نے گھوم کر خالد طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'تمہاری والدہ نے کہا ہے کہ میں ان کے زیورات فروخت کر کے تمہیں دے دوں۔تم زندگی میں آگے بڑھو۔اس مقدمے کو میں دیکھ لوں گا۔'

'ابا جان، مجھے تو اب آپ اس بڑے دشمن سے برسر پیکار ہونے کیلئے چھوڑ دیں جو اس کے پیچھے ہے۔'

والد نے سر جھکا کر کچھ سوچا۔پھر نظریں اٹھاتے ہوئے بولے۔

'میری اور تمہاری والدہ کی یہ خواہش تھی کہ تم زندگی میں ایک کامیاب انسان ہو اور ہمارے خاندان کا نام اس طرح روشن کرو کہ ایک بار پھر ہمارا خاندان اس علاقے میں سرخ روئی حاصل کرے۔'

'ابا جان، میں جو کام کر رہا ہوں وہ اتنا اہم ہے کہ اس سے ایک دن آپ کا یہ گھر پوری دنیا کے نقشے پر پہچانا جائے گا۔اور آپ کا نام میرے ساتھ انسانیت کی تاریخ میں لکھا جائے گا۔میں اس سلسلے میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہوں۔اور ابا جان میرا مقصد ویب سائٹ نہیں تھا۔ویب سائٹ ہو نہ ہو،کوئی کیریر ہو نہ ہو،میرے لئے تو میری زندگی ہی اپنے آپ میں ایک مقصد ہے۔اور جب ایک ایسا کام میرے سامنے ایک اتنا اہم کام ہے تو نہ صرف یہ کہ میں اسے کرنا چاہوں گا بلکہ اسی کے لئے جینا مرنا چاہوں گا۔اس سے مجھے جو اطمینان ملے گا وہی میری زندگی کا حاصل ہوگا۔اب جان، اس کام سے میری جو وابستگی ہو چکی ہے وہ میرے لئے ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔'

'ایمان۔' عبدالرحمان بن خدا بخش بن میر علی اندر سے ہل گئے۔ایک مکمل خاموشی نے انہیں آسمان کے بادلوں کی طرح ڈھک لیا۔

دونوں ہی چند لمحے خاموش رہے۔پھر والد نے ہی خاموشی توڑی۔

'لیکن بیٹا یہ عالمی اور تاریخی پیمانے کا ایک بہت مشکل کام ہے۔تمہارے جیسا ایک انسان اس کو مکمل کرنے کا خواب بھی کیسے دیکھ سکتا ہے؟تمہیں ایسا فیصلہ کرنے سے پہلے بہت غور کر لینا چاہئے۔یہ بہت بڑے انسانوں کا کام ہے۔'

'ابا جان، بڑے انسان بڑے پیدا نہیں ہوتے ہیں۔یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ بڑے انسان بڑے مقاصد سے پیدا ہوتے ہیں اور میرے سامنے ایک عظیم مقصد موجود ہے۔بڑے انسان بڑی ایجادوں اور بڑے مجاہدوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ایجادیں اور مجاہدے ضرورتوں کی اولاد ہوتی ہیں اور یہاں ضرورت بھی موجود ہے۔عظیم انسان ایسے لوگوں کے اندر سے پیدا ہوتے ہیں جن میں کسی بھی حد تک سوچنے کی'اس سوچ کے نتیجوں پر غور کرنے کی' اپنے اخذ کئے ہوئے نتیجوں کا اظہار کرنے کی اور ان پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔اور اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کیا وہ مقصد ایسے فرد کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ شخص اس کام کو کرنے کیلئے پیدا ہوا ہے اور یہ سب میرے ساتھ ہو رہا ہے۔اس لئے میں اپنی زندگی کو اسی مقصد کے لئے صرف کرنا چاہتا ہوں۔'

اس کے والد بالکل خاموش ہو گئے۔کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔

'بیٹا، مجھے یہ سب کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔جب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تم وہی کرو جو تمہارا دماغ کہتا ہے۔ہاں، جب تم نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میری کچھ باتوں کو ذہن نشین کر لینا کیونکہ یہ میری اپنی زندگی بھر کی سوچ کا نچوڑ ہے۔سب سے ضروری بات یہ ہے کہ سوچو اور تلاش کرو کہ ان تمام باتوں کے پیچھے کون ہے۔جس دن وہ دکھائی دے جائے گا اس دن یہ کالا سحر ٹوٹ جائے گا۔اور جب کھلے میدان میں لڑائی ہوگی تو انشاء اللہ تمہاری جیت ہوگی۔بس یوں سمجھو کہ شاہانہ شان وشوکت والا ایک محل نما قلعہ ہے۔جس میں ہم

احتراماً نہیں جھانکتے لیکن جیسے ہی اس کے دروازوں اور کھڑکیوں کے چلمن ہٹاؤ گے سارا منظر سامنے آ جائے گا۔' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھے اور ہاتھ میں دوبارہ پھر سے چلتی ہوئی تسبیح کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

اس بات کو اس نے اپنے سوچنے کے عمل کا کھونٹا بنا لینے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ سوچے گا۔

کولہو کے بیل کی طرح سوچے گا۔

اسے ہنسی آ گئی۔

یہ اس کی زندگی کی آخری ہنسی تھی۔

وہ سوچنے میں مستقل مزاجی سے لگ گیا۔ سوچنا بھی جنگ کی طرح ایک کام ہوتا ہے یہ اسے اب محسوس ہوا تھا۔ سوچنے میں صحت بھی خراب ہوتی ہے' مایوسی بھی ہوتی ہے' ڈر بھی لگتا ہے اور جان بھی جاتی ہے یہ اسے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا۔

وہ سوچنے لگا۔

سوچنے لگا۔

سوچنے لگا۔

اسے محسوس ہوا کہ دراصل وہ آج کے اس کالا پانی کا جبر جھیلتا ہوا شیر علی ہے

جس میں نہ کوئی دائمی پھانسی گھر ہے نہ جیل کی دیواریں ہیں نہ قید و بند ہیں نہ پابندیاں لیکن جس کا ڈھانچہ بھی موجود ہے اور وہ کچھ اس طرح نہ دکھائی دینے والا ہے کہ پوری طرح سب کو گھیرے ہوا ہے اور اس میں یہ سب کچھ موجود ہے لیکن نظروں سے اس طرح پرے ہے کہ گرفت میں نہیں آتا۔

تبھی تو ہم چاہتے ہوئے بھی اپنی پسند کی' اپنی خیر خواہ اور ایماندار سرکار نہیں لا پاتے اور سرکاریں جو بنتی ہیں وہ اس معاشی نظام کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بنی رہتی ہیں جو پوری دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی ہیں اور ان کو نہ ہماری زندگی کے ارتقاء کو متاثر کرنے والی مہنگائی کو کم کرنے میں کوئی دلچسپی ہے نہ ہماری اولادوں کے صحیح طور پر پھلنے پھولنے سے مطلب ہے اور وہ ہمیں صرف اپنے کاروباری مفاد کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور لارڈ میو کی طرح تجارتی چاپلوسی سے بات کرتے ہیں۔

اسے جب دکھنے لگا کہ یہ سب کچھ کالا پانی کی طرح ہے تو وہ کانپ اٹھا کیونکہ اسے دکھائی دینے لگا کہ کس طرح سیاسی لوگ جب الیکشن میں ہوتے ہیں تو ہمارے خوابوں کو فٹ بال بنا کر گیم کی طرح کھیلتے ہیں اور جوئے کی طرح کھیلے جانے والے اس گیم میں ہار جیت کو پورے احترام سے مان لیتے ہیں اور سختی سے اس کے پابند رہتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جمہوریت کا گیم کھیل رہے ہیں۔

اب اسے سیاسی لوگوں اور جواریوں میں صاف صاف فرق دکھنے لگا تو یہ بھی دکھنے لگا کہ اس میں داؤ پر کون سا مال لگا ہوتا ہے اور اس کے بعد تو سب کچھ کھل گیا کیونکہ پھر اس کے ذہن میں ایک تصویر بنی کہ جوا گھر بڑی بڑی کاروباری ہستیوں کی آمدنی کا ذریعہ ہوتے ہیں اور پھر یہ خیال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا کہ عموماً جو لوگ جوا گھروں میں اپنی پونجی لگاتے ہیں وہ افیم اور جسم فروشی کے عالمی کاروبار کرنے والے ہوتے ہیں۔

اور یہ لوگ لارڈ میو کی طرح کام بہت صفائی سے کرنا چاہتے ہیں لیکن ڈاکٹر

والکر بھی انہی کے نامزد کئے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ یا تو ڈاکٹر و والکر کو ہٹاتے نہیں یا ہٹاتے بھی ہیں تو صرف جرمن فلسفی ''میک ویلی'' کی کتاب ''دی پرنس'' میں دیئے گئے اصول کو پابندی سے عمل کرنے کے لئے کہ حکمرانوں کو چاہئے کہ اپنی نمائندوں کے ذریعے ہی وہ تمام کام کریں جن میں جور وظلم کی ضرورت ناگزیر ہو اور جب عوام شکایت کرنے لگیں تو اس کا اپنے پر بھروسہ قائم رکھنے کے لئے اور ان کو مطمئن کرنے کے لئے نہ صرف اس نمائندے کو تبدیل کردیں بلکہ اسے معزول کردیں اس پر مقدمہ چلا کر اسے ضرور سزا دیں حتی کہ مناسب سمجھیں تو قتل کروادیں اور یہ نہ دیکھیں کہ اس شخص نے انہیں کے اشارے پر سب کچھ کیا تھا اور انتہائی وفاداری کے ساتھ کیا تھا کیونکہ حکمرانی کے فن کا یہ اہم ترین سبق ہے کہ حکمرانی کرنی ہے تو کسی کے تئیں وفادار نہ ہوں چاہے وہ کتنا بھی معتمد خاص کیوں نہ رہا ہو۔

وہ مزید سوچتا رہا اور اس ڈھانچے کا ایک ایک اندیکھا پہلو اس کے ذہن میں ابھرتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ سب کچھ کھل گیا اور مزید کھلتا چلا گیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا چلا گیا کہ ذہن پر کتنے پردے فطری طور پر پڑے ہوئے رہتے ہیں جنہیں آدمی کو چاہئے کہ اٹھائے یا پھر ڈالے گئے ہوتے ہیں اور یہ جو ڈالے گئے ہوتے ہیں یہ پرندوں کو پھانسنے والے ہتھکنڈوں کی طرح ڈالے جاتے ہیں جو صرف تب استعمال ہوتے ہیں جب پرندہ اڑان بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اپنے چاروں طرف دکھائی دینے والی حقیقت کو باہر سے دھند کی طرح لپیٹے ہوئی یہ دنیا اب دکھائی دینے والی حقیقت سے زیادہ اہم بنتی چلی گئی۔

لیکن اب جو تشویش اس کے دل میں جنم لینے لگی وہ خاصی تکلیف دہ تھی کہ وہ اس حقیقت کو لوگوں کو دکھائے گا کیسے۔

مجاور نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

'وہ نہیں جانتا تھا کہ معاملہ صرف یقین کا نہیں نیت کا بھی ہوتا ہے۔ دکھا ان کو سکتے ہو جو دیکھنا چاہتے ہوں لیکن جو اتنا ڈرتے ہوں کہ دیکھنا ہی نہیں چاہتے ہوں ان کی بات بالکل الگ ہوتی ہے۔'

اب وہ ایک سمندری سطح کی طرح ایسی دنیاؤں میں داخل ہونے لگا تھا جہاں اس کی موجودہ دنیا چھوٹنے لگی تھی اور دھیرے دھیرے دور ہوتی گئی اور جو کچھ ابھر رہا تھا وہ اپنے آپ میں ایک مکمل ماحول کے ساتھ دکھتا تھا جیسے اخبار پڑھتے وقت واقعات کی ایک اپنی دنیا خود بخود ذہن کے اندر وجود میں آجاتی ہے یا کوئی جادوئی کہانی پڑھتے وقت اس کی دنیا پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ خیالات کے جن سمندروں سے گزر رہا تھا اس میں دنیا کے حقیقی واقعات اور کردار ابھرا ابھر کر سامنے آتے چلے جا رہے تھے۔

اور یہ سب کچھ اخبار کی خبروں سے بہت زیادہ گہرا اور تھا اور جادوئی کہانیوں کی طرح بھی نہیں تھا کیونکہ اس سفر میں دکھائی دے جانے والی چیزوں سے چھٹکارہ بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ تو اپنے ہی گھر کے اندھیروں میں ہمکتے ڈاکوؤں اور غاصبوں کو ڈھونڈنے کے لئے چراغ جلانے جیسا تھا۔

'' یہ کتنا مشکل کام تھا وہ سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، نوٹس پیچھے چھپے ہوئے اقرار اور پیچیدگیاں گویا یہ در اور کروڑوں ٹن مادہ اور رکاوٹوں کے پیچھے تھے اور بیک وقت یہ ایک ایسے سانپ کی طرح تھا جو اسے کاٹنے والا تھا۔ وہ اس کے نشانے پر تھا۔

اسے ان رکاوٹوں کو اور ان غلافوں کو ہٹانا پڑے گا۔ یہ مشکل کام اس بات کا تقاضا کر رہا تھا کہ اسے یہ سب کچھ جو دکھائی دینے والی حقیقت کے پیچھے تہہ تھا ہٹانا اور کھولنا پڑے گا جو حقیقت سامنے اور چاروں طرف دکھائی دے رہی تھیں ان میں کی منطق کے بجائے افراتفری تھی۔ اور یہ افراتفری خطرناک تھی صرف وہی نہیں بلکہ عام پر لوگ اس بات سے واقف تھے کہ اس افراتفری میں کوئی کسی مثبت نظام میں تحفظ کی تعمیر کو ناممکن کر دیا ہے۔ ایک ایسا نظام جو گہرائیوں سے سانپوں کے نمودار ہونے، کاٹنے اور غائب ہونے سے روک سکے۔

اس صورت حال کی وجہ سے لوگ مسلسل خطرے اور بے چینی کے عالم میں جی رہے تھے، ہنسنا، بولنا، قہقہا لگانا بہت کم ہو گیا تھا۔ لوگ تناؤ سے بھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے، پریشان اور سنجیدہ۔ خوش دل اور من موجی ہونا فیشن سے باہر ہو گیا تھا۔ عزت نفس خود اعتمادی اور برائی مذاق کا موضوع بن گئے تھے جہاں تک اس کا تعلق تھا سانپ کا آنا یقینی تھا۔ وہ صرف اپنے دانتوں اور زہر کو اس قابل بنا رہا تھا کہ بھرپور طور سے کاٹ سکے اور اپنے اوپر ہوئے کسی حملے کو کامیابی کے ساتھ ناکام کر سکے یہ صورت حال بالکل ایسی تھی جیسے موت سر کے بالکل قریب لٹک رہی ہو۔

اس نے پوری تاریخ کے تئیں ایک گہری مایوسی محسوس کی کیوں کہ انسانی تاریخ کے لمبے سفر کے بعد بھی بڑے بڑے دانشوروں اور مفکروں کے دیئے ہوئے خیالات اور روشنی کے باوجود بھی انسان ایک عام انسان ابھی بھی محفوظ نہیں کیوں ان کی ساری کوششیں ایک عام انسان کو تحفظ دینے میں ناکام ہو گئیں۔

کیوں ایک معصوم اور ایماندار آدمی یا اس کا کنبہ محفوظ نہیں رہ سکتے۔ کیوں یہ ضروری ہے کہ سانپ آئے اور کاٹے۔

اس سانپ کا پس منظر کیا ہے؟ اس کے پیچھے کام کرنے والا دماغ کہاں ہے؟ اس دماغ کے اندر کیا اجزائے ترکیبی ہیں۔ یہ ضرور ایک بڑا دماغ ہوگا۔ عام آدمی کے دماغ

سے بڑا۔ کسی ماسٹر مائنڈ کی طرح۔

جسے چھپنے، حاوی رہنے انتظام کرنے کے فن پر مہارت ہے۔ اور جو سچائی، خود، قربانی، تحمل جیسی لافانی تہذیبی قوتوں کو دبا کر رکھنے میں کامیاب ہے۔

اس خیال نے ہی اس کے سامنے ایک بہت وسیع و عریض درندہ کھڑا کر دیا۔

یہ صرف چلمن کو اٹھانے کا سوال نہیں ہے۔ چلمن کو اٹھانے کے بعد سانپ کا سامنا بھی کرنا ہے۔ اس عظیم درندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لیکن کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا اور خالد سہل خوف زدہ ہونے والا انسان بھی نہیں تھا۔ مشکل اس درندے کے آمنے سامنے آنے اور اس سے لڑنے میں نہیں تھی اصل مشکل تو اس بھاری چلمن کو اٹھانے میں تھی جو نہ صرف غیر شفاف تھا بلکہ بہت بھاری تھا، اس نے سانپ کو صرف اپنی تہوں سے نہیں بلکہ اپنے وزن سے اور موٹاپے سے بھی چھپا رکھا تھا۔

اسے ہٹانے کے لئے ایک بہت ہی مضبوط، نئے اور جرأت مند دماغ کی ضرورت تھی جو تجسس، مسلسل کوشش تجزیاتی اور درکار وقت سے لیس ہوں۔

خالد نے محسوس کیا کہ اس کے پاس یہ سب کچھ تھا۔

اس طرح اب یہ مہم اس کی زندگی کی تمام حرکتوں اور کوششوں کا مرکزی نقطہ بن گیا۔

ہر دوسری چیز ثانوی بن گئی۔

وہ اب ایک ایسا کام کرنے جا رہا تھا جو صرف اس کا ذاتی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ دنیا کے ہر شخص کا سروکار تھا۔ لیکن اسی طرح تو دنیا کے تمام سائنسدانوں، مفکروں، انقلابیوں، ریفارمرس نے بھی اپنی زندگی گزاری تھی جن کے مسئلے ان کے لئے اہم ترین چیلنج تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ان مسئلوں کا تعلق دنیا کے ہر انسان سے تھا۔ اور کیوں نہ ہو عوام کی مشکلات کی ذمے داریاں تو ان لوگوں پر ہوتی ہی ہیں جو ایسی ذہنی اور جسمانی صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں کہ وہ ان مسئلوں کا حل تلاش کر سکیں اور عوام ان سے توقع بھی رکھتے ہیں اور جب عوام کسی سے اس کی صلاحیت کے مطابق توقع رکھتی ہے تو یہ فرد کا سماجی فرض بنتا جاتا ہے۔ خالد نے محسوس کیا کہ اسے اس مہم کو پوری طاقت سے شروع کرنا ہوگا اور نتیجے تک پہنچنا ہوگا۔ ایک سائنسداں کی طرح جس کا ذہن سنجیدگی سے کسی چیلنج کرتے ہوئے سوال کو لے کر آگے بڑھنا ہے اس نے اس کام پر اپنے کو مرکوز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

سانپ تھا۔ سانپ کے پیچھے ماسٹر مائنڈ تھا۔ اس کے اور سانپ کے بیچ میں کروڑوں ٹن کا بھاری پردہ تھا جو اس سانپ کی ڈھال بھی تھا اور اس پردے میں سوراخ تھے جس سے ہو کر سانپ کو آنا تھا۔

لیکن وہ کون تھے جو سانپ کی مدد کو آسکتے تھے۔ کوئی ایسا بھاری بھرکم سرکار میں اثر رکھنے والا سیاسی شخص کوئی عیار آدمی جس نے سرکار کے اندر چپکے سے آنے جانے کا راستہ بنا لیا ہو، کچھ ایسے جرائم پیشہ اور سازشی لوگ جو سیاست دانوں کو سرکار میں اور سرکاری ملازمین کو اپنی من مانی جگہوں پر پہنچنے کا ٹھیکا لیتے ہوں اور ان رائے دہندگان کو دھوکے میں رکھتے ہیں جو ان پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں کوئی جج جو عدلیہ کے وقار کی پرواہ کئے بنا چپ بچا کر ان سازشوں میں شامل ہو جاتا ہو اور کوئی ایسا طرز فکر جو اس طرح کی زندگی کا بہترین فلسفہ سمجھتا ہو۔ سوچنے کے لئے بڑی گنجائش تھی۔

❖❖

اسے قدرت کی طرف سے ایک سوچنے والا اور تخلیقی ذہن ملا تھا۔ اسے ادب اور انسانیات میں خصوصی دلچسپی تھی۔ لڑکپن میں اسنے کچھ کچھ شاعری بھی کی تھی۔ جس سے اس کے مزاج کا پتہ چلتا تھا۔

وہ اپنے گاؤں اور یہاں کے حالات کو کبھی نہیں بھولا۔ اس موضوع پر بھی اس نے ایک نظم لکھی تھی اور ملک کی ابتر ہوتی ہوئی صورتحال کی ایک معنی خیز تصویر کھینچی تھی۔ یہ نظم اس کے کمرے کی دیوار پر کچھ یوں لٹکی ہوئی تھی۔

وحشی

میں انقلاب کی نہیں انقلاب سے واپسی کی بات کر رہا ہوں

میں ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں

اور دھنسے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ نہیں کرتا،

میرے نزدیک، ان کے میلے دانت

اور بڑھے ہوئے ناخن

زیادہ اہم بنتے جا رہے ہیں

اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا ہو رہا تھا لیکن اتنا واضح تھا کہ اس کے ذہن کو کسی آسیب نے مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ کب دن نکلتا تھا اور کب رات ہوتی تھی یہ باتیں دھندلی پڑتی چلی گئیں۔ کئی دنوں تک وہ صرف انہی باتوں سے متعلق سوچتا رہا۔

ایک دن وہ اپنی ایک ایسی پرانی نظم اپنے لبوں سے دہرا رہا تھا جسے اس نے بالکل شروع میں لکھا تھا اور جسے اس نے اپنی ذاتی قسم کی تحریر قرار دیا تھا اور اسے کہیں چھپنے کے لئے نہیں بھیجا تھا کیونکہ اس کی شروع کی لائنیں گنجلک سی تھیں حالانکہ یہ سطریں اسے بہت پسند تھیں۔ وہ اپنے گھر سے ملحق باغ میں ایک کونے میں کھڑا تھا اور الفاظ اپنے پورے درد کے ساتھ اس کے لبوں پر دل آویز ترنم کے ساتھ جیسے خود بخود چلے آ رہے تھے۔

تمنا اگر ہے تو میں کیا کروں

جہاں بے جگر ہے تو میں کیا کروں

چلے جا رہے ہو بیاباں کی سمت

یہ شب بے سحر ہے تو میں کیا کروں

تفکر میں ڈوبے درختوں کے بیچ

تری رہگزر ہے تو میں کیا کروں

چند روز تک کبھی گھر کے اندر اور کبھی باہر بیٹھے بیٹھے اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔ بچپن

سے ہی اسے انسانی دکھوں کو لے کر غم تھا۔

سفید و سیاہ کھچڑی بالوں والے مجاور نما مجذوب نے کہا۔ سامنے کے جنگل میں ایک تازہ قبر دکھائی دے رہی تھی اور اس کے پیچھے وہ پرانا کمرہ نما مچان تھا جہاں اسکی موت ہوئی تھی۔ اس قبر کے ادھر ادھر بہت سے لوگ دکھ رہے تھے جن کے اوپر ابھی تک اس جگہ کی پراسراریت کی وجہ سے سکتہ طاری تھا۔

'اس کی یہ جنگ تبھی شروع ہو گئی تھی جب وہ ابھی چھوٹا سا بچہ تھا۔'

اس کے بچپن کی بات ہے۔ شہر سے کچھ افسر پولس کے ساتھ بستی میں آئے تھے۔ اس گاؤں کے مرکزی محلّہ میں واقع پرانے پیپل کے پیڑ کے نیچے لگ بھگ پوری بستی جمع ہو گئی تھی۔ خالد وہیں کچھ دوری پر دوسرے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ پولس کو دیکھ کر وہ بھی کھیل بند کر کے وہاں آ گیا۔ افسر وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور چوکیدار بستی کے لوگوں کو ناموں کی بتائی گئی فہرست کے مطابق بلاتا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بستی کے اور لوگوں کے علاوہ اس کے دادا شیخ خدا بخش بن میر علی بھی وہاں آ گئے تھے۔ باقی سارے لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ کھڑے تھے کیونکہ وہاں کوئی کرسی خالی نہیں تھی۔ لوگوں کی نظریں انہیں پر جمی ہوئی تھیں۔

ان کو دیکھ کر ایس۔ ڈی۔ او۔ نے پوچھا' آیئے' مولوی صاحب' ہم لوگ سرکار کی طرف سے گیہوں خریدنے آئے ہیں۔'

دراصل اس کا مطلب بالکل سستے داموں پر گیہوں سرکار کو دینا تھا۔

شیخ نے سر نیچے کر کے کچھ سوچنے لگے۔ خالد ان کے پریشان چہرے کو غور سے

دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ 'ہمارے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ گیہوں تو نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم آپ کے حکم کی تعمیل ضرور کریں گے۔'

'ٹھیک ہے۔ آپ پچاس کوینٹل گیہوں دے دیں۔'

شیخ نے متحیر ہو کر ان کو دیکھا۔

'اتنا گیہوں تو کل ملا کر ہمارے یہاں پیدا بھی نہیں ہوا ہوگا۔'

'تو آپ ہی بتائیں کتنا دیں گے۔'

'سچ تو یہ ہے کہ ہمارے لئے کچھ بھی دینا مشکل ہے۔ پھر بھی چونکہ آپ نے کہا ہے اس لئے ہم دو کوینٹل دے دیں گے۔'

'دو کوینٹل؟' افسر نے جیسے ان کا مذاق اڑایا 'دس کوینٹل۔'

شیخ اس افسر کو دیکھنے لگے۔

'سوچئے نہیں، اب آپ جائیں اور گیہوں ہمارے عملہ کے حوالے کریں۔ آپ کو سرکار پیسہ دے رہی ہے۔'

لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ شیخ کی طرف سے اس حکم کو ماننے کا مطلب تھا کہ اب دوسرا کوئی تو اعتراض کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ خالد اپنے دادا کے ٹھیک پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے دادا نے بڑے

احساسِ مجبوری کے ساتھ اپنے مزدوروں سے کہا کہ وہ جائیں اور گھر سے گیہوں کی بوریاں لیکر آئیں۔

خالد اپنے دادا کے دکھ کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔

اپنے گھر سے گیہوں نکلواتے وقت دراصل ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں جسے خالد نے دیکھ لیا تھا۔

اپنے دادا کی آنکھوں کے ان آنسوؤں کا اس دن اس کے اوپر اتنا اثر پڑا کہ اس نے اس دن سوچ لیا کہ وہ زندگی میں کبھی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیگا۔ اور اسے اس کے بعد کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا۔

جب اس کے دادا گیہوں کی بوریاں سرکاری کارندوں کو دیکر وہاں لوٹے اس وقت وہ افسر دوسرے کسانوں کو ڈانٹ رہا تھا۔ خالد کی نظریں اس افسر کے چہرے پر گڑ گئیں۔ وہ محض چودہ سال کا ایک بے ضرر سا لڑکا تھا۔ اچانک وہ پیچھے سے نکل کر افسر کے سامنے آ گیا۔ ایک سپاہی نے ذرا اونچی آواز میں اسے قریب آنے سے منع کیا لیکن خالد رکا نہیں اور افسر کے بالکل قریب سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ کھڑا ہو کر افسر کے نظریں اٹھانے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک دو سپاہی اسے پیچھے کھینچنے کے لئے آگے بڑھے۔ اسی بیچ افسر نے نظریں اوپر کیں تو خالد کو دیکھا۔

'کیا ہے؟' افسر نے سخت لہجے میں اس سے کہا۔

'ہمیں اس گیہوں کی ضرورت ہے۔ اسے آپ کیوں لے جا رہے ہیں؟'

اس سوال میں ایک عجیب طاقت تھی کیونکہ خالد کے جملوں میں گیہوں دینے سے انکار نہیں تھا۔ بلکہ اس نے ایک سوال کیا تھا جو قابل غور سوال تھا۔ اس میں کوئے گذارش بھی نہیں تھی۔ یہ ایک خالص سوال تھا۔

وہ دراصل نئے ہندوستان کا ایک بچہ تھا۔

'تم کون ہو؟' افسر نے سوال کیا۔

شیخ نے آگے بڑھ کر کہا 'یہ میرا پوتا ہے۔'

'آپ اسے ہٹائیے۔'

شیخ آگے بڑھے' بچے کا بازو پکڑا اور اسے پیچھے کی طرف کھینچا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ اس کے بچے پر حملہ نہ کردیں۔ لیکن خالد کسی الگ ہی دھات کا بنا ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے جب شیخ اسے پیچھے کھینچ رہے تھے اسی بیچ اس نے پوری قوت سے چلا کر افسر سے کہا تھا۔

'آپ ایسا نہیں کرسکتے۔'

افسر نے گویا اس کی گستاخی پر اسے گھور کر دیکھا۔

'آپ زبردستی ہمارا گیہوں چھین رہے ہیں؟ مجھے بڑا ہونے دیجئے۔ میں آپ

کو سزا دونگا۔'

افسر اس کے ان جملوں پر بھونچکا رہ گیا تھا۔ اگر انگریزوں کا زمانہ ہوتا تو یہ بچہ باغی کہلاتا لیکن آزاد ہندوستان کے اس بچے کو کیا کہیں گے، میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آسکی۔

جیلانی کی پیشانی سکڑ گئی تھی۔

مجاور نے جیلانی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور پھر اوروں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

خالد نے افسر کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر اپنے دادا کی طرف مڑ گیا تھا۔

افسر ابھی خالد کو حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ کھڑے کسانوں میں سے بہت سے لوگوں نے تالیاں بجادیں۔

تب سے وہ پورے گاؤں کا دلارا بچہ بن گیا تھا۔ لوگ اس واقعے کو ہمیشہ یاد کرتے تھے اور اب یہ واقعہ روشنی کی ایک تیز کرن کی طرح ذہن کے اندھیروں کو چیرتا ہے۔

مجاور کی آنکھیں سامنے کے درخت پر جیسے ٹک کر اٹک گئی ہوں اور زبان پر تالا لگ گیا ہو وہ خاموش ہوگیا تھا' پھر بولا۔

'وہ مر گیا۔'

اس کی نظریں اسی طرح ٹنگی رہیں۔

’سزا دینا ابھی باقی ہے۔لیکن فیصلہ ہونا چاہئے اور سزا ملنی چاہئے اور خالد کی موت کو ہم اس سزا کے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیں گے۔ خالد کے منھ سے نکلا ہوا ہر ایک جملہ اس کی موت کے بعد اب ہمارے لئے فیصلے کی اہمیت رکھتا ہے۔جن کو ہم بغیر غور کیے ہوئے نہ تبدیل کریں گے نہ اس کے اطلاق کو ملتوی کریں گے۔

اس کی نظریں پیڑ سے اتر کر سامنے واپس آ گئیں۔

وہ پیدائشی طور پر ہی ایک خوفناک پلیتہ تھا۔مرنے سے پہلے اس نے اپنی انگلی گھسیٹ کر آگ پیدا کی تھی۔

شاید وہ اپنے ساتھ لوگوں سے بھی بہت امیدیں رکھتا تھا کہ لوگ اس کا ساتھ دیں گے۔ پتہ نہیں اس بچے کے اوپر کیا مصیبت آ گئی کہ اسے ان لوگوں پر بھی بھروسہ نہیں رہ گیا جنہوں نے اس کے بچپن میں اس کے لئے تالیاں بجائی تھیں ورنہ ہم تو اس کے ساتھ تھے۔

وہ ایسا ہی پیدا ہوا تھا۔اور عمر کی اس منزل پر خاص طور سے اسکے ذہن میں لاعلاج مسائل کینسر کی شکل میں ایک گچھے کی طرح ابھرنے لگے جن کو سلجھانے کی اس نے بہت کوشش کی لیکن یہ مسائل اتنے سخت تھے کہ انہوں نے اس کا پورا خون پیکر اس کو کھوکھلا کر دیا۔ وہ فکر و تخیل کی تیز تلوار سے ان کو کاٹتا رہا لیکن وہ بڑھتے رہے۔اور آخر میں ان کے درد کی تاب نہ لا کر اس نے دم توڑ دیا۔اس کی موت کا واقعہ اسی المیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک ایسے دیوانے کی طرح جو اپنے بال نوچنے لگتا ہے اور کپڑے پھاڑنے لگتا ہے لیکن اپنی دیوانگی سے نجات حاصل کرنا نہیں چاہتا، خالد کے اندر خود ہی اس دیوانگی سے رشتہ توڑنے کی خواہش نہیں تھی۔ وہ جسمانی طور پر نحیف ہوتا جا رہا تھا لیکن روحانی سطح پر ہار ماننے والا نہیں

تھا۔اس کی تحریریں اس کے دل و دماغ میں بتدریج اٹھنے والی موجوں کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔انہیں تحریروں میں ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے خیالوں کی بھاری زنجیروں میں بندھا ہوا ہماری زندگی کی عظیم ترین مشکلات سے برسرِ پیکار رہا اور اس ذہنی سفر میں وہ کن کن منزلوں سے گزرا۔ان تحریرون سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جاگتے میں بھی اپنے چاروں طرف عجیب و غریب چہرے دیکھتا تھا۔اس نے ان چہروں اور ان کی آوازوں اور ان کے اعمال کا جو بیان اپنی ڈائری میں لکھا ہے ان کو پڑھنے کے بعد مومن اور غالب کے دو شعر میرے ذہن میں بسے رہے۔ کبھی مومن کا شعر یاد آتا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کبھی غالب کا یہ شعر میری شعر فہمی کی تربیت کرنے لگتا۔

ہے آدمی بذاتِ خود اک محشرِ خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

میں ان شعروں کو خیالِ محض کے طور پر ہی لیتا تھا لیکن اب میری سمجھ میں آیا تھا کہ بڑے شعرا کی شاعرانہ گفتگو کو بھی ٹھوس حقیقت کے طور پر ہی دیکھنا چاہئے کہ ان کے شاعرانہ اظہار کو خیالِ محض سمجھنا خود ہمارا خیالِ محض ہو سکتا ہے۔ خالد کے اندر بھی چیز غیر معمولی حد تک بڑھ گئی تھی اور اسے سچ مچ سب کچھ حقیقی دنیا کی طرح دکھنے لگا تھا۔وہ خیالوں کی دنیا کا تو شہزادہ تھا لیکن اس کی موت اس کے اندر موجود ایک خاص قسم کی ناپختگی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے اور یہ تھی اس کے اندر موجود معصومیت۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا مفکر تھا

لیکن ادنیٰ درجے کا بھی لڑا کو نہیں تھا اور اپنی اس کمزوری سے وہ واقف نہیں تھا۔

بہت سے لوگ پیدائشی طور پر ہی ایسے ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں اسی ذمہ داری کے لئے پیدا کرتی ہے۔ جس طرح کچھ خاص لوگ اچھا گاتے ہیں' کچھ پہلوان ہوتے ہیں' کچھ اداکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ خاص لوگ انسانیت کی لڑائی لڑنے اور انسانیت کے لئے قربانیاں دینے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔

اس نے خود اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

'شاید میں بھی اسی کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اس زمانے میں کسی کو یقین نہیں آ سکتا کہ یہ ممکن ہے لیکن میں اپنے بارے میں جانتا ہوں کہ جب میں رات کی تنہائی میں ہوتا ہوں تو میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میری نظمیں کسی کو یہ دکھانے کے لئے نہیں لکھی گئی تھیں کہ میرے اندر شاعر بننے کی صلاحیت ہے۔ یہ نظمیں اس درد سے راحت کے لئے لکھی گئی تھیں جو میرے دل میں عود کر آتا تھا۔ اور آج پھر ایسا ہی ہو رہا ہے۔

آج کائنات کتنی بے نقاب ہو کر میرے سامنے ابھر رہی ہے' جیسے وہ چیزیں سامنے آنا چاہتی ہوں جنہیں میں نے نہیں دیکھا ہے۔'

آج اسے ہر چیز پہلے سے زیادہ صاف نظر آ رہی تھی۔

وہ کائنات کی اس نوازش پر بہت خوش تھا۔

کائنات اپنی پوری بیکرانی کے ساتھ رفتہ رفتہ اس کے دل و دماغ میں سما رہی تھی۔ ایک بہت بڑا کھلا ہوا منظر تھا جس سے وہ اسیر ہو رہا تھا۔ عموماً وہ کبھی کبھی صرف راتوں

میں ہی ایسا محسوس کرتا تھا لیکن آج کا دن کچھ مختلف تھا۔ اور ان راتوں سے کہیں زیادہ روشن تھا۔

غور و فکر کے عمل کا سفر کچھ دور تک طے کرنے کے بعد اب خالد نے اپنی کتاب شروع کر دی تھی۔

اسے ہندوستان کے وہ کسان' انڈمان کے قبائلی اور معاشرے کے وہ دبے کچلے لوگ یاد آ گئے جن کے پاؤں کے نیچے سے کبھی نہ کبھی زمین چھین لی گئی تھی۔ جن کے نہ اپنے گھر تھے نہ زمینیں تھیں اور وہ دراصل زندگی کے ایک کونے میں محدود کر دئے گئے تھے۔ اسے وہ فارم ہاؤس' وہ بڑی بڑی کمپنیاں یاد آ گئیں جن کی پوری دنیا چہار دیواریوں میں محفوظ تھی اور جہاں اردگرد کے کسانوں کی زمینیں نوٹس دیکر خالی کرائی جاتی تھیں۔

ان کی یہ پشتینی زمینیں ان کے اپنے لئے' اپنے نقطہ نظر سے کتنی ضروری اور اہم تھیں اس کی کوئی سنوائی نہیں تھی۔ ایسے لوگوں پر کتنی بار لاٹھیاں اور گولیاں چلی تھیں یہ بھی اسے یاد آنے لگا۔

وہ آسیب نما طاقت جو یہ سب کچھ کرتی ہے اس آسیب کے خوابوں کے مطابق صرف لوگ ہی بے زمین نہیں کئے جاتے بلکہ ملک تک تقسیم ہو جاتے ہیں۔

لاکھوں کروڑوں لوگوں کو اپنی مرضی کے خلاف ہجرت کرنی پڑتی ہے۔ پوری دنیا کی عام آبادی آج بھی بھیڑ بکریوں بلکہ ان قبائلیوں کی طرح ہانکی جاتی ہے۔

ان سرکش قبائلیوں کے چہروں کے ساتھ اسے نہ جانے کیوں فلسطینی بھی یاد

آئے اور جرمنی سے نکالے جانے والے یہودی بھی یاد آئے۔

یہ حکومتیں اگر عام انسانوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں تو پھر کیوں یہ حکومتیں زمینوں کو اپنی اور آبادیوں کو غیر سمجھتی ہیں۔ وہ محسوس کروا دیتی ہیں کہ وہ زمینوں کی محتاج ہیں، آبادیوں کی جانوں کی محتاج نہیں کہ آبادیاں تو مرغی کے بچوں کی طرح پیدا کروائی جا سکتی ہیں۔ امپورٹ کی جا سکتی ہیں، ایکسپورٹ کی جا سکتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے پوری زمین پر پھیلے ہوئے جسم فروشی کے کاروبار کی یاد آگئی، جنگ عظیم میں جھونکے گئے نوجوانوں کی یاد آگئی۔

ایک بار حکومتوں کو انسانیت کا اسیر بنانا کتنا ضروری ہے۔

اس نے سوچا۔

یہی تو اس نے چند برسوں پہلے اس عالمی کانفرنس میں کہا تھا۔

سوال یہ ہے کہ وہ اصل طاقت کون سی ہے جو حکومت کے وجود کے پیچھے ہے اور اس کے ارادے اور مقاصد کیا عوام کے ارادوں اور مقاصد سے مختلف ہیں؟ یقیناً ہیں۔

اور وہ طاقت اپنے مقاصد کو بہرصورت پورا کرتی ہے چاہے وہ شہنشاہیت کے ذریعے ہو، آمریت کے ذریعے ہو یا جمہوریت کے ذریعے ہو۔ اور جیسے ہی ان میں سے کوئی بھی نظام اس کے مقاصد کو پورا کرتے رہنے میں ناکام ہونے لگتا ہے، وہ اس نظام کو ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے، اور شہنشاہیت سے جمہوریت، جمہوریت سے آمریت، آمریت سے بادشاہت یا پھر جمہوریت کا کرسیوں کے دائرے والا کھیل اس طاقت کا وہ ازلی کھیل ہے جو انسانی روح اور زندگی کا آج بھی سب سے بڑا چیلنج ہے۔ حکومتوں کی یہ مختلف شکلیں Rulers اور Ruled کے بنیادی نظام کی گھومنے والی چکیاں ہیں۔

پوری انسانیت کے سر پر ظلم، رسوائی، تناؤ اور دہشت کا یہ وہ آسیب ہے جس سے نجات کے لئے ہونے والی جنگ ابھی باقی ہے لیکن یہ جنگ تلوار سے نہیں تخلیقی قوت سے ہی جیتی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے لئے مزید ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔

لیکن اسے لڑنا اور جیتنا ضروری بھی ہے اور ممکن بھی کہ جس طرح انسان نے پچھلی صدیوں میں بیماریوں، قحط، غربت، بارش، طوفان، سیلاب اور جنگلی درندوں کے خلاف سائنسی اور معاشی لڑائی لڑی ہے اسی طرح اس لڑائی میں بھی کامیابی ممکن ہے لیکن یہ یقیناً ان لڑائیوں سے زیادہ گمبھیر لڑائی ہے کیونکہ وہ لڑائیاں تو قدرت کی ان بے جان قوتوں کے خلاف تھیں جن میں صرف طبیعاتی طاقت تھی، دماغ نہیں تھا لیکن اس آسیب کی تخلیق انسانی دماغوں سے ہوئی ہے۔

اس لئے یہ لڑائی صرف عام آدمی کے ذہنی فروغ سے جیتی جا سکتی ہے۔ جب ہر عام آدمی کا دماغ بصیرت اور شعور کے اعتبار سے اپنی بلوغت اور ارتقاء کے اس جسامت کو پہنچے گا جو اس کے نشوونما کی فطری منزل ہے، جہاں وہ کسی اور کے دماغ سے سوچنا بند کر دے گا اور فطرت کی گود میں پیدا ہوئے ایک ایسے انسان کی طرح سوچے گا جو اپنے طور پر سیدے کائنات سے اپنا رشتہ قائم کرتا ہے تبھی اس دنیا میں سوچوں کا ایک ایسا توازن پیدا ہوگا جو سول سوسائٹی کو اس کا جائز مقام دے سکے گا۔

ہمیں جمہوریت سے بھی آگے بڑھ کر ایک مضبوط سول سوسائٹی کی تعمیر کرنی ہوگی۔ اس کے لئے ہمیں سول سوسائٹی کو حاکم و محکوم والے نظام سے چھٹکارہ دلانا ہوگا۔ اور اس میں سائنسدانوں کی طرح بڑے تخلیقی ذہنوں کا رول ہوگا۔ انہیں نئے محاذ کھولنے ہونگے۔ انہیں قبول کرنا ہوگا کہ قدرت نے انہیں وہ طاقتیں دی ہیں جن سے وہ انسانی زندگی کے کارواں کے لئے مینارہ نور بن سکیں۔ یہ لوگ دنیا کو دانشوری کا ایک نیا معنی دیں گے۔ کوتاہ اندیشی اور لالچ میں ملوث دانشوری سے آزاد، ممتاز تر اور ہمت مرداں کے ساتھ بڑی

ذمہ داریاں اٹھانے والی دانشوری۔

لیکن یہ تخلیقی ذہن کون ہیں۔

ان کی پہچان کیا ہے؟

اس نے بہت غور کیا اور پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ تخلیقی ذہن کی ایک پہچان ہے اور ان کو ہم ان کی تحریروں سے پہچان سکتے ہیں کہ تخلیقی ذہن کے معنی ہیں وہ ذہن جو جراتِ تخیل، جراتِ فکر اور جراتِ اظہار کی بے انتہا قوتوں سے لیس ہوں۔ ایسے ذہن جن کو کوئی عقیدہ پابند نہ بنا سکے، کوئی وسعت ڈرا نہ سکے اور کوئی مصلحت متزلزل نہ کر سکے کہ انسانی ذہن تخیل کی آنچ پر چڑھ کر ہی پلاؤ کی طرح خوشبو دیتا ہے۔ لیکن بقول اقبال کے

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے

ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تو ہمیں انسانی ذہنوں کی تاریخ پر بھی نظر ڈالنی ہوگی کہ سیاست میں براہیم جیسے تیور والے رہنما ابھرے تو ضرور لیکن وہ کس کس طرح ہوس کا شکار ہوئے۔ اور ہوس نے کس کس طرح ان کو اپنا غلام بنایا۔

والد ٹھیک ہی کہتے تھے

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا

کہیں یہ دراصل نفسِ انسانی میں مقیم شیطان ہی تو نہیں ہے جو ہمارے اوپر حکومت کر رہا ہے؟

اسے اپنی نظم شیطان یاد آ گئی۔

چھوٹے چھوٹے ذہنوں والے مغرور لوگ حکومت، میڈیا، بزنس میں چھائے ہوئے یہ دراصل دور اندیشی سے گھبراتے ہیں اور اپنی کوتاہ اندیشی کو چھپانے کے لئے اپنی پوزیشن اور اپنی تحریر کا استعمال کرتے ہیں۔ اور یہی لوگ اس آسیب کے سپاہی بھی ہیں۔ یہ اپنے کو انتہائی حقیقت پسند سمجھتے ہوئے ہیجڑوں کی طرح ان دانشوروں اور تخلیق کاروں کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں جو انسانیت کا راگ الاپتے ہیں جیسے انسانیت اور خاص طور سے طبقہ اشرافیہ کو پسند نہ آنے والی باتیں بذاتِ خود کوتاہ نظری کی پیداوار ہوں۔ لیکن پھر اسے خود لکھنا چاہئے۔

مجاور نے خالد کے اس ذہنی میدانِ رزم کی تصویر کھینچی جس میں فکر کے ہتھیاروں سے لڑتے ہوئے خالد کی موت پر ہوئی تھی خالد کی اس ذہنی لڑائی کے حوالے سے اس نے کہا، میدانِ جنگ میں تو بالکل آخر میں لڑائی ہوتی ہے۔ اصل لڑائی میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ ان کارخانوں میں ہوتی ہے جس میں فیصلہ کن اسلحے تیار ہوتے ہیں اور اس میں کارآمد ہتھیار بنانے کے دھن میں لگا ہوا سائنسداں اپنی کاوشوں میں لگا ہوا ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ خود ہی میدانِ جنگ میں ہو اور جنگ کے نتائج کا دارومدار اس کی کوششوں پر ہو۔ انتہائی توجہ اور وسعتِ نظری سے دشمن کے ہر ایک ہتھیار اور حربے کی کاٹ اس حد تک پیدا کرنا کہ فتح کے پورے امکانات روشن ہو جائیں انکا جنگی فریضہ ہوتا ہے۔ اور یہ دراصل خالد کی طرف سے جنگ چھیڑنے سے پہلے کی جنگ کی تیاری تھی۔ خالد کو جنگ کے شعلوں اور دھویں سے گزرنے سے پہلے خود اپنے ذہن کے اندر ان شعلوں اور دھویں سے گزرنا تھا۔

فکر کی ناکامی کے ہر اندیشے پر اسے اپنے جسم و جان پر چوٹ سی لگتی محسوس ہوتی تھی یہاں تک کہ اسے اپنے پورے جسم و جان میں کمزوری محسوس ہونے لگتی اور سوچ کی ہر

کامیابی پر وہ تازہ دم ہو اٹھتا تھا۔ اسے وہاں سے نکلنا تھا اور ساری دنیا سے لڑنا تھا لیکن وہ نکلنے سے پہلے اپنے ذہن اور اپنی میز پر اس جنگ کو جیت لینا چاہتا تھا۔

سپہ سالار میدان جنگ میں لڑتے ہیں۔ سرجن آپریشن تھیٹر میں۔ سائنسداں لیب میں۔ اور مفکر اپنی فکر گاہوں میں اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ان سب کی کامیابی اور ناکامی بلکہ ان کی ذات کے وجود و فنا کا فیصلہ انہیں جگہوں پر ہوتا ہے۔ خالد سہیل جس محاذ پر برسر پیکار تھا وہ ایک طرف اس کے معاشرے کے لوگوں کے ذہنوں پر کچھ طاقتوں کی منظم چڑھائیوں، قبضوں اور مفتوح کو رام کر کے غلام بنانے کی کاروائی تھی تو دوسری طرف خالد کی جانب سے ان طاقتوں کے خلاف جنگ آزادی چھیڑنے کا عمل تھا۔ دنیا کے انسانوں کو منظم طریقے سے بڑے پیمانے پر صرف فکر کی رسی سے ہی باندھا اور دائمی طور پر غلام بنایا جا سکتا ہے اور اس کاروائی میں نہ صرف ذہنوں میں خیالات ڈالے جاتے ہیں بلکہ ذہنوں کی از سر نو ایسی آرائش کی جاتی ہے کہ وہ قابض قوتوں کے طرز عمل میں بندھ جائیں۔ ایک ایسے ماحول میں تبدیلی اور آزادی کے نقیب کے سامنے جو چیلنج ہوتا ہے اس کو خالد کے ذہن کے اس اندرونی کشمکش، بے چینی اور گھن گرج میں دیکھا جا سکتا ہے جس سے وہ اپنی خلوت نشینی کے دنوں میں گزر رہا تھا۔ خیالات کی بے ترتیب یورش، جھکڑوں کے ساتھ اس کے سامنے ابھرنے والے سوالوں کے نوکیلے پتھر، وہ گویا اپنے ہی آپریشن تھیٹر میں اپنا ہی پیٹ چاک کر چکا تھا۔ اور وہاں اس کا ہاتھ بٹانے والا دوسرا کوئی نہیں تھا۔

لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ مکمل طور پر تنہا بھی نہیں تھا۔ اس کی پشت پر پیچھے کالا پانی کے قیدیوں کی روحیں مشعلوں کی قطار لئے اس کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں اور کالا پانی کوئلے سے ایک چمکتے ہوئے ہیرے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

خالد نے اپنی ڈائری میں پہلا جملہ لکھا تھا

'میں دنیا سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'

پھر اس نے سوچا وہ کہاں سے شروع کرے۔

پھر اسے خیال آیا۔

وہ صرف لکھے نہیں۔

کہے بھی۔

اعلان کرے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ اس دن کمرے سے باہر آ گیا تھا اور وہ اس وقت اپنے گھر کے سامنے بالکل تنہا تھا۔

وہ ذہنی طور پر مکمل کائنات اور زندگی کو سامنے رکھ کر سوچنے کا عادی تو بچپن سے ہی تھا' شیر علی کے واقعے نے اس کو اس دنیا کی بڑی طاقتوں کے سامنے عملی طور پر ابھر کر فیصلہ کن مقابلہ کرنا سکھا دیا تھا۔

بلند و بالا درختوں کے بیچ تیز رفتار بادلوں سے جزوی طور پر ڈھکے ہوئے کھلے آسمان میں جھانکتا ہوا جو کبھی کبھی پورے منظر کو تاریک کر دیتا تھا۔

وہ پورے ملک اور پورے برصغیر ہمالہ سے۔ بحرۂ ہند تک اور بحرۂ عرب سے خلیج بنگال تک — تمام علاقے کا پورا اٹلس اپنے وسیع جغرافیے اور آبادی کے ساتھ اور میدانوں، دریاؤں، پہاڑوں، ریگستانوں، ہنگاموں بھرے شہروں کے ساتھ جن میں عظیم معاشی معاملات پر عمل درآمد ہو رہے تھے اور جو ٹرانسپورٹ کی حرکتوں، سڑکوں، بسوں، ٹرینوں، جہازوں اور پانی کے جہازوں سے لیکر سیاسی، تمدنی، سماجی اور معاشی تحریکات میں ہزاروں لوگوں کو لپیٹے ہوئے تھے اور ان گاؤں کو جو کسی صاف رات کے آسمان میں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے' اسے

یہ سب کچھ دن میں دکھائی دینے والے خواب کی طرح لگ رہے تھے۔

اچانک اسے ایک انسان آسمان سے لٹکا ہوا دکھائی دیا۔

اب مجاور کی زبان سے کہانی یوں باہر پھیل گئی جیسے انار جل اٹھا ہو۔

ایک لٹکا ہوا انسان !

بادلوں کے بیچ۔

خالد اپنے اعصاب کی جڑوں تک سناٹے میں آگیا تھا اور اس کا ذہن چاروں طرف سے ایک دہشت ناک اور دھماکہ خیز سماں کی لرزش سے تملا اٹھا۔

وہ یہ کیا دیکھ رہا تھا۔

یہ وہ صدیوں سے بے بسی اور بے وقعتی کے آسمان سے لٹکے ہوئے انسان کا ڈھانچہ تھا۔

وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن پورا منظر اس پر طاری تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس محویت کے عالم میں اس پر ایک نظم نازل ہونے لگی جسے اس نے اپنی آواز میں جیسے پڑھنا شروع کر دیا ہو۔ وہ پاگلوں، دیوانوں کی طرح بولنے لگا اور اس کی نظروں میں انسانی تاریخ کے سارے سوچنے والے دماغ آندھیوں کی طرح گونجنے لگے۔

وہ بے چین ہو اٹھا۔

"یہ سارے دماغ ناکام رہے ہیں۔"

یہ آواز گویا اس کی روح سے اٹھی اور آتش فشاں کی طرح ایک نظم اس کے اندر سے ابھرتی چلی گئی۔ اب وہ اس نظم کو قدرے اونچی آواز میں گنگنانے لگا تھا۔

بام گردوں پہ لٹکا ہوا انساں کب سے

بادلوں میں کبھی چھپتا نظر آتا ہے کبھی

اس پر حال سا طاری ہونے لگا اور وہ بے چینی میں جیسے ہلتے ڈولتے رقص کرنے لگا ہو۔

جتنے بہکے ہوئے بھٹکے ہوئے دانشور ہیں

مڑ کے دیکھیں تو انہیں کوئی صدا دیتا ہے

وہ انتہائی بے تکلفی سے اونچی آواز میں گھر کے سامنے کے اس منظر میں گانے لگا تھا جیسے ہر جھجک کو توڑ کر دنیا سے ہم کلام ہونا چاہتا ہو اور اسے اس بات کی کوئی پروا نہ ہو کہ دائیں بائیں سے اسے کوئی اس حالت میں دیکھے گا تو اسے دیوانہ سمجھے گا۔ اس کے قدم لان میں گویا بھٹک رہے تھے اور وہ تملا رہا تھا۔

بام گردوں پہ یہ لٹکا ہوا انساں کب سے

بادلوں میں کبھی ڈھلکتا نظر آتا ہے کبھی

چاند سورج کبھی پہلو سے گزر جاتے ہیں

تکتی رہتی ہیں نجوی کا نگاہیں ہر سو

کشتیاں کتنی اڑی جاتی ہیں سیاروں کی
مشرق و مغرب عالم میں سیاحت کے ہجوم
بجلیاں دوڑتی ہیں کاہکشاؤں کی طرف
دوربینوں میں نظر آتے ہیں کھل کر تارے
ہو ازل یا کہ ابد کھلتے ہیں سارے اسرار
ایک ہی شے ہے جو نظروں سے پھسل جاتی ہے
بام گردوں پہ یہ لٹکا ہوا انساں

آس پاس کچھ بچے، عورتیں اور ایک آدھ آدمی دور کھڑے اسے دیکھنے بھی لگے تھے اور اس کی آواز کو حیرت کے ساتھ سن بھی رہے تھے لیکن وہ ایسے گائے جا رہا تھا جیسے میوزک کے کسی دھن کا ریاض کر رہا ہو یا کسی مشاعرے میں نظم پڑھ رہا ہو۔

بام گردوں پہ یہ لٹکا ہوا انساں کب سے
بادلوں میں کبھی ڈھلکتا نظر آتا ہے کبھی

اس کی آواز اور اونچی ہوگئی جیسے وہ چیخ رہا ہو۔

اس کی چیخوں سے پرندوں کی بھی نیندیں ہیں حرام
جابہ جا مچتا ہے انسانوں میں اس سے کہرام

اب وہ گویا دیکھنے والوں کو بھی مخاطب کر رہا تھا۔

ہاتھ اٹھتے ہیں دعاؤں کے لیے سوئے فلک
ہوتے رہتے ہیں علاقے نئے پھر خون آشام
چھینٹوں سے خون کے موسم نئے آجاتے ہیں
سب درو بست کے آداب بدل جاتے ہیں
کبھی جنگل تو کبھی صحرا لرز جاتے ہیں
ان دھماکوں سے جو دھرتی پہ کیے جاتے ہیں

اب وہ اپنی پوری بھرپور چیخ کے ساتھ گا رہا تھا:

یہ شکاری ہیں چلاتے ہیں دھڑا دھڑ گولی
شیر گرتے ہیں بیابان تڑپ جاتے ہیں
اپنے کھیتوں کی تباہی پہ یہ روتا انسان

اب وہ چاروں طرف ہاتھ پھیلائے گھوم رہا تھا۔

شاہ راہوں پہ ہر اک گام پہ لٹکا انسان
تیز طوفانی ہواؤں میں یہ بھٹکا انسان

چھٹپٹاتا ہوا منجدھار میں لٹکا انسان

زندگی نے اسے بیگانہ کیا ہے ایسے

دولتِ دنیا میں اس کا نہیں کچھ بھی جیسے

اپنے قدیم خاندانی کوٹھی کے صحن سے آگے لان میں کسی دیوانے کی طرح اپنے بغیر استری کیے ہوئے کرتے اور پاجامے میں وہ کسی اور ہی دنیا میں کھو چکا تھا۔

چند لمحوں بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی خواب جیسی صورت حال میں گرفتار تھا اور اب وہ رفتہ رفتہ اپنے ذہن کو نارمل حالت میں لانے کی کوشش کرنے لگا اور پھر جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ دیکھنے والے بھی اس کی دیوانگی کے اس منظر کے ختم ہونے پر واپس لوٹ گئے۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ شاعر تھا اور سوچا کہ آج وہ بہت موڈ میں ہے۔ اس کے درد کی طوفانی شدت کا اندازہ کسی کو نہیں ہوا کیونکہ اس عہد کے بیشتر لوگ شاعری کو ہلکی پھلکی چیز سمجھتے تھے۔

چند روز بعد وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی سوچ کی لغت' نحو اور گرامر بھی بدلتے جا رہے تھے وہ تیزی کے ساتھ اپنی رضامندی سے اپنی زبان کو بھی اپنے نئے ذہنی ماحول کے مطابق بدلتا جا رہا تھا۔

اس نے اس تبدیلی کو صاف صاف محسوس کیا کہ اس کی سوچ نے جو، لہجہ، زبان اور طرز بیان اختیار کیا ہے وہ اس بصیرت کے تابع ہے جو اس پر نازل ہو رہی تھی۔

اس نے اس بات کو خصوصی طور پر اس وقت محسوس کیا جب ان نئے خیالات کو لکھنے بیٹھا جو اس کے اندر سے چشمے کی طرح پھوٹ رہے تھے۔ اس وقت جب اس کی نظریں

دنیا کو اس دروازے سے دیکھ رہی تھیں۔

پوری دنیا خصوصاً پورا برصغیر اس کے سامنے ایک پرزم سا بن گیا تھا۔ جس میں سو سال کی اونچائی تھی اور جس کی چوٹی پر کالا پانی واقع تھا۔ اور تب اس نے محسوس کیا کہ یہی کالا پانی نیچے آگے جا کر پورے برصغیر پر اور اس کے آگے گلوب کی مختلف سمندروں میں پھیل گیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ زمانہ حال کے بے شمار وقعات یعنی وہ جہاں سے دیکھ رہا تھا وہاں سے مستقبل کی طرف ڈیڑھ سو سال آگے جہاں دنیا پہنچی ہوئی تھی وہاں کے واقعات کو سمجھنے میں اسے ایسے ہی آسانی کا احساس ہو رہا تھا جیسے کسی مسافر کے سفر کو پیچھے بیٹھا کوئی شخص دوربین سے مسلسل دیکھ رہا ہو اور اس کی پیچھے کی تمام حرکتوں اور تیاریوں کے حوالے سے اس کے بارے میں اچھی طرح جان رہا ہو۔

اس میں' ہو سکتا ہے' جیسا کوئی سوال نہیں تھا۔

جو کچھ تھا صاف تھا۔

اس کے حقیقی ہونے کے یقین نے اس کے ذہن میں خیالات کی ایسی اچھال پیدا کی جیسے ایک سو ڈگری درجہ حرارت پر پہنچتے ہی پانی ابلنے لگتا ہے۔ خیالات اس کے ذہن کی رگوں سے اس کی طرف بہنے لگے اور اس کا قلم کاغذ پر ایسے دوڑنے لگا جیسے ٹیپ ریکارڈر کا ہیڈ آوازیں تخلیق نہیں کرتا بلکہ ان کو صرف ریکارڈ کرتا ہے۔

"یہ دنیا جس میں میں رہتا ہوں اس دنیا سے قطعی الگ نہیں ہے جو کالا پانی میں موجود تھی۔ یہ اسی کا تسلسل ہے اسی کی توسیع ہے۔ غیر ذمے دارانہ حکومت کا جو بیج کالا پانی میں بویا گیا تھا وہی اب ایک درخت بن گیا ہے، اور بڑا ہونے کے بعد بے شرم و بے حیا بھی ہو گیا

ہے جس نے رول آف پاور کے فلسفے کا لحاف بھی اوڑھ رکھا تھا۔ جس میں رول اور سیاسی اقتدار کی حکومت، معاشی طاقت کی حکومت، کلچرل قوتوں کی حکومت اور بھیڑ کی قوت کی حکومت بھی دنیا کی حتمی وختمی حقیقت ہونے کا دعویٰ کر رہے تھے۔

ایک تازہ پرشکوہ انداز بیان اس کی تحریروں کے ذریعے دنیا کے سامنے وارد ہو رہا تھا اور وہ اس کی گونج اور لہروں کو اپنے تخیل میں محسوس کر رہا تھا۔

وہ لکھ رہا تھا کہ...

''انسان کھلے آسمان میں صدیوں سے لٹک رہا ہے۔ ایسے جیسے تاریخ کے پنجرے میں کوئی طوطا بند ہو۔

اس کے غموں کی سرحدیں ابھی بھی حد نظر سے کہیں آگے ہیں۔ اس کی صورت حال اور اس کی آزادی کا مسئلہ تمام سوچنے والے دماغوں اور حساس دلوں کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے جینئس اس منظر کے سامنے اپنا سر ٹیک چکے ہیں لیکن کچھ ہے جو ابھی تک کھلا نہیں ہے۔

یہ بصیرت اور زیادہ الفاظ میں ابھر کر اس وقت تب آنے لگی جب اس کی نظروں کے سامنے انسانیت اپنی پوری بدحالی کے ساتھ سسکتی دکھائی دی۔ بے آواز درد اور بے چینی، جیسے مسلسل دھوکے، بے رحمی اور مقدر نے اختیارات نے ایسا بنا دیا تھا کہ ان کے پاس صرف ایک دبی ہوئی رگ رہ گئی اور یہ رگ تھی نجات کے خوش نما خواب کی۔

اس نے اسے ایک نام دیا۔

''ایک عالمی خواب''

پھر اس نے تفصیل لکھی۔

''انسانیت کا ایک عالمی خواب مسلسل دھوکے کا شکار ہو رہا ہے۔ پورے عالم میں ہر جگہ گذشتہ کئی صدیوں میں لوگوں سے استحصال سے آزادی کا باوقار وعدہ کیا گیا۔ لیکن ہر آنے والے نظام میں ان کے ساتھ دھوکہ ہوا چاہے وہ بادشاہت رہی ہو جمہوریت رہی ہو یا آمریت۔ اور ایسا ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ہوا۔ استحصال کرنے والوں اور انسانوں پر من مانی حکومت کرنے والوں کی حکومت کی چھتری نما قید میں پوری دنیا آج بھی اپنے کو بے بس محسوس کرتی ہے۔ کوئی ہے جو اپنے کو ان انسانوں کا آقا سمجھتا ہے اور اپنی آقائیت کو بزور طاقت عام انسانوں پر قائم رکھتا ہے اور وہی اس مافیا طرز فکر کا سرچشمہ ہے جو مذہب سیاست معاشیات اور خاندان ہر جگہ موجود اور مسلط ہے۔ حکمرانی کی ہی خواہش ہر طرح کی انانیت کا بھی سرچشمہ ہے۔''

خالد کے ذہن پر چھایا ہوا دباؤ بہت ہی سنگین تھا۔ جو اس کی اور اس کے عہد کی لوگوں کی زندگی میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ یہ دباؤ رفتہ رفتہ اسے ایک سائنسداں کی طرح مسلسل آگے سوچتے جانے پر مجبور کر رہا تھا اور یہیں سے زندگی کی سطح پر موجود پیچیدگیاں اور دھند ٹوٹ ٹوٹ کر صاف ہو رہے تھے۔

دنیا پہلے سے ہی بے حد بے چین تھی۔ اب اس بصیرت کی بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ جس حقیقت کو دیکھ رہا تھا اسے وہ لوگوں کے نظروں پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹا کر صاف صاف دکھائے گا کہ ان حقیقتوں نے بہت ہی پراسرار انداز میں معاشرے کو دھوکے میں رکھا۔

گہری ذہنی مشقت نے خالد سہیل کی سانسیں بھی تیز اور گہری کر دی تھیں۔

اب اس کے سامنے تصویریں اور بھی صاف ہو کے آ رہی تھیں۔ اس کا ذہن ایک جہت سے اپنے معاشرے کے مکمل وجود کے ایک جہت سے دوسرے جہت کی طرف لگاتار سفر کر رہا تھا۔ اور اس میں اپنی زندگی کے سالہا سال کے مشاہدات و تجربات اس کی مدد کر رہے تھے۔ تکلیف دہ تجربات کی چھوٹی چھوٹی تفصیل چیختے ہوئے جانداروں کی طرح ابھرنے لگیں۔ اور اسے یہ منظر بہت دل چسپ لگا کہ ان سب کے پیچھے ایک ذہنی ترتیب جو پوری سوسائٹی کو پس منظر عطا کر رہی تھی اور جس میں طرح طرح کے کردار اور ادارے اور ان کے حرکتیں تھیں۔ ایک داد چہرے کی طرح ابھرنے لگا۔ اس وقت وہ ٹھیک ویسا ہی محسوس کر رہا تھا جیسا شیر علی نے محسوس کیا تھا۔ داد کی طرح کوئی چیز پورے سماج پر چھائی ہوئی تھی جس سے لوگوں کا بگڑا ہوا خون مواد کی شکل میں ان روحوں سے نکل کر بہہ رہا تھا۔ اسے اطمینان ہوا کہ وہ چیز جواب تک مرئی تھی اور ٹیس بن کر ابھرتی رہی تھی اس کی شناخت ہونے لگی تھی۔

یہ منظر بہت ہی دہشت ناک تھا کہ لوگوں کی زندگیاں ایسے فلسفوں کے دبیز کمبلوں میں لپٹی ہوئی تھیں جو کمبل Parasites کی طرح تھے اور جن کا علاج ناممکن نظر آتا تھا۔ اس نے ان تمام باتوں کو قلم بند کرنا شروع کر دیا جو اس کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ کالا پانی سے یہاں تک جو باتیں اس پر واضح ہوئی تھیں انھوں نے اس کے اعصاب کو اتنا متاثر کیا تھا کہ چلمنوں کا وجود خالد کے لیے صدمے میں ڈالنے والا سراب بن گیا تھا۔

تین چار دنوں تک وہ اپنے کمرے میں ہی رہا۔ باہر کہیں نہیں گیا۔ کوئی اخبار نہیں پڑھا۔ کسی سے نہیں ملا۔

اس کی حالت لگاتار بدلتی گئی۔ پہلے وہ کسی کسی وقت کھانا نہیں کھاتا تھا لیکن بعد میں اکثر ایک ایک دن، دو دو دن تک اس کا کھانا چھوٹ جاتا تھا۔ جب کوئی اس کے پاس جا کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا یا سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ غصہ میں آنے لگتا۔ دنوں دن وہ دبلا

ہونے لگا۔ کپڑے نہیں بدلتا تھا۔ نہانا بھی بند ہو گیا تھا۔ اس کے کپڑے میلے اور بدبودار ہونے لگے تھے۔ اس کے گال پچک گئے تھے۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسنے لگی تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ وہ کچھ لکھ رہا تھا اور ان سب باتوں کی فکر کرنے سے یا کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے سے اس کے ذہن کی یکسوئی ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے اور صرف باتیں کرنے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اسے سمجھانے کے لئے مکمل تصویر کی ضرورت ہے۔ اور وہ ابھی اس تصویر کی جستجو میں ہے۔

اس کے بعد صرف ایک چھوٹی سی بچی کو وہاں چائے یا کھانا وغیرہ لے کر جانے کی اجازت تھی۔ لیکن جب وہ کھانا لے کر جاتی تھی تو اسے بھی بھوک نہ ہونے کی وجہ سے وہ کنارے رکھ دیتا تھا۔ یا اندر الماری میں ڈال دیتا تھا کہ کسی کی نظر نہ پڑے اور کوئی تنگ نہ کرے۔

شروع میں جب وہ انڈمان کو بار جا رہا تھا تو کلکتے تک بڑے شوق سے بھرپور ناشتہ لیتا رہا۔ یہ اس ہوٹل والے نے بتایا تھا جہاں وہ ٹھہرا تھا۔ اور بہت ہی تر و تازہ دکھتا تھا لیکن پورٹ بلیر پہنچنے کے بعد اس کی خوراک میں کمی واقع ہونا شروع ہو گئے۔

اس کے ذہن کی کھڑکیاں ان دھماکوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے کھلتی گئیں۔ وہ ان دھماکوں کے بعد نازل ہونے والے خیالات کو مناسب عنوان دیتا ہوا لگاتار لکھتا چلا گیا۔

تین چار دنوں تک وہ اپنے کمرے میں ہی رہا۔ باہر کہیں نہیں گیا۔ کوئی اخبار نہیں پڑھا۔ کسی سے نہیں ملا۔ اس کے ذہن کی کھڑکیاں ان دھماکوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے کھلتی گئیں۔ وہ ان دھماکوں کے بعد نازل ہونے والے خیالات کو مناسب عنوان دیتا

ہوا لگاتار لکھتا چلا گیا۔

اب وہ زمین کی موجودہ دنیا کے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ نظامِ دنیا اسے زیادہ صاف صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ کچھ ایسا جیسا اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اس نے محسوس کیا' مجھے یقیناً نہیں معلوم کہ ہم کس طرح کے سماج میں رہتے ہیں۔ میں نے دنیا کو جس طرح دیکھا ہے اس میں یقیناً کچھ نہ کچھ کھوٹ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں جنگ ختم ہوئی اور صدام حسین پر مقدمہ چلا۔

اس غریب نے تو بش کے ایک کتے کو بھی قتل نہیں کیا۔ پھر بھی اس پر ایٹمی اور کیمیائی بم بنانے کے اندیشے کے نام پر حملہ ہوا۔ وہ قید میں ہے۔

کیا یہ واقعی تعجب کی بات نہیں کہ CIA کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بغداد میں کوئی بم نہیں بن رہا تھا۔ صرف شک نے عراق کے حملے کو ضروری بنا دیا۔ اور اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اسے پھانسی ہونی تھی۔ ہوئی۔

میر علی کی کہانی یا میر علی کی اولاد کے نام پر اٹھائی جانے والی کہانی ایک دائمی پلاٹ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہ پلاٹ ہر جگہ ہوتا ہے۔

چاہے اجودھیا ہو یا گودھرا۔

کچھ ایسے ذہن ہوتے ہیں جن میں یہ پلاٹ پورے شد و مد کے ساتھ ابھرتے ہیں اور الگ الگ ذہنوں میں الگ الگ طرح کے پلاٹ ابھرتے ہیں جیسے آم کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ کھٹے سے لے کر میٹھے تک۔ چھوٹے سے بڑے تک۔ ہرے سے پیلے تک۔ لیکن یہ زرخیزی بھی کچھ خاص موسموں میں بڑھ جاتی ہے اور کچھ ایسا ہی موسم زمین پر آیا ہوا ہے۔ سرکاری طاقتوں کو ایسے پلاٹوں کو بڑھاوا دینا اسی پلاٹ کا اظہار ہے۔ آبادی کے

ایک بہت بڑے طبقے کو مکمل طور پر مجبور اور بے بس تماشائی بنا دینا۔ شہریوں کو وفادار بھیڑ بکری بنا دینا۔ لڑاؤ اور حکومت کرو خریدو اور حکومت کرو کو عام چلن بنا دینا۔ لوگوں کی ہمت شکنی' احتجاج کرنے والوں کی مسلسل دھلائی' اور ان کا منہ بند کرنا' ایماندار ملازموں کو مظلومیت کا نمونہ بنا دینا۔ یہ سب اسی ڈرامے کے ابواب ہیں۔

اس تخلیقی توانائی کو پیدا کرنے کے لیے جو عوام کو اس لائق بنا دے کہ وہ ڈاکٹر والکر پر چاروں طرف سے بھرپور وار کر سکیں اور تاریخ کے سب چیلنجنگ معاشرتی قوت اور ارتقاء پر قابو پا سکیں۔ ایک جہدِ مسلسل کی ضرورت ہوگی۔

ڈاکٹر والکر جو ایک چھوٹے سے جیلر سے پیپل کے پیڑ کی طرح بڑا ہو کر پورے سماج کو ایک جیل میں تبدیل کر چکا ہے۔ کوئی جگہ ہے جہاں سے اس چھوٹے پودے کو ایک بے جا اور بے شرم قد و قامت والے درخت بننے کے عمل میں خوراک مہیا کرتی ہے۔ کھاد کی طرح کوئی چیز ہے جو چاروں طرف موجود ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں گھستی جا رہی ہے اور لوگ اسے کوکا اور کوکل کی طرح پیتے جا رہے ہیں یعنی کوئی ایسا مشروب ہے جسے پینے کے بعد عام آدمی بھی کسی تناؤ سے نجات حاصل کرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے اور وہ ڈاکٹر والکر نام کے مے خانے کا اسیر ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے کلچر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ جس میں انسانوں کا خون سگریٹ اور الکوحل سے زیادہ طرب انگیز ہے۔ یہ مشروب پی کر لوگ چاروں طرف ایک دو پیگ اور کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ ان کے چہرے کی حیا مکمل طور پر ختم ہو جائے۔

ڈیڑھ سو سال پرانی یہ مشروب کئی گنا زیادہ لذیذ اور تاثیر کن ہو گیا ہے۔ اس لیے کسی بھی ایسے تاجر، سیاست داں، مجرم یا دانشور سے جو طاقت شہرت اور دولت کے گلیاروں میں پہنچ چکا ہے یہ امید کرنا کہ وہ اپنے نشے سے باہر آئے گا یہ فضول خیال ہے۔ لوگ ایماندار نہیں ہیں پہلے وہ منافق تھے تو اب بے حیا اور بے شرم ہیں۔ جب تک وہ چیز چھپتی ہے تب تک وہ منافق رہتے ہیں لیکن جیسے ہی ان کا پردہ اٹھتا ہے وہ پوری بے حیائی، جرأت اور

طاقت کے ساتھ خنجروں سے بات کرتے ہیں۔

اس ڈاکٹر والکر کو للکارنے کے لیے شیر علی جیسے لوگوں کے ایک پورے قبیلے کی ضرورت ہوگی۔ جو صرف لارڈ میو پر نہیں 'ڈاکٹر والکر پر حملہ کرے۔

لیکن اس میں شیر علی کی بینائی اور تحمل بھی چاہیے۔

کچھ نئے سوالات ابھرنے لگے۔

ہندوستان فکشن اور ادب نے کہاں تک سماج کے اس نئے کردار کی گہرائیوں کو دریافت کیا؟

کیوں انتہائی مہذب لوگ بھی بے ایمانی اور تشدد کو فطری قرار دینے کے لیے مضحکہ خیز حد تک دوسرے ملکوں کے ایسے واقعات کی مثالیں دینے لگتے ہیں؟ کیا یہ بالکل ویسے ہی نہیں ہے جیسے ایک ڈاکو اپنی دفع میں دوسرے ڈاکوؤں کی مثال دے؟

میبل پر رکھا ہوا کاغذ ختم ہو گیا تھا تو اس نے کچھ اور ایسے ردی کاغذ نکالے جن پر ایک طرف کچھ بیکار چیزیں لکھی ہوئی تھیں۔

طاقتور لوگ انسان کشی کے صحرا میں پہنچ چکے ہیں۔

نوکروں کے تئیں بے رحمی،

بیویوں کے ساتھ بے اعتنائی اور تشدد'

فرقہ پرستی،

گینگ وار'

کرپشن اور عصمت دری'

نوٹس کے پیچھے کا چہرہ اسے دکھائی دینے لگا۔

تو یہ ساری سوچ اس شخص کے بارے میں ہے جو پردوں کے پیچھے بیٹھا عدالتی فیصلے لکھتا ہے اور اس کا اطلاق کرتا ہے۔ لیکن وہ انصاف دینے کی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا۔ انصاف لینے کی ذمہ داری وہ ان لوگوں پر عائد کرتا ہے جن کے خلاف مقدمے درج ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنے والا کردار یقیناً انصاف پسند اور عادل حکومتوں کی طرح نہیں ہے جن پر خفیہ انداز میں ظالمانہ فیصلے صادر کرنے کا الزام عائد نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ ان حکومتوں کو اس دھوکہ دھڑی اور چشم پوشی کی ضرورت نہیں تھی۔ تاریخ نویس ان کرداروں کے ان پہلوؤں پر خاموش رہے ہیں کیوں؟

اس لیے کہ حکومتیں ان تاریخ نویسوں کی سرپرستی کرتی تھیں اور یہ بھی چاہتی تھیں کہ یہ منصف معاملات کی سنگینی پر پڑے ہوئے پردوں کو چھیڑے نہیں۔

ممکن ہے یہی رویہ بہت سی میں ماضی میں بھی رہا ہو۔ تعجب کی بات ہے کہ تاریخ کے کسی بھی دور میں تاریخ نویسوں نے عدالتوں میں معصوموں کے ساتھ کھیلے جانے والے گھناؤنے کھیلوں کو کبھی بے نقاب نہیں کیا۔ میر علی کے طبقے کے لوگوں کو اپنی تاریخ خود ہی لکھنی چاہیے اور حکومتوں کے مکارانہ کردار کو واضح کر کے دیکھنا چاہیے۔ یہ کام اس طبقے کی سلامتی کے لیے کتنا ضروری ہے اس کو بیان کرنا مشکل ہے۔

تاریخ اپنی خاموشی کے اندر کس قدر بے ایمان ہے؟

صرف تاریخ ہی نہیں سیاسیات، مذہبی علوم کا خزانہ، ادب بھی اس پہلو پر خاموش رہے ہیں۔

کسی نے بھی حکومتوں کے کردار کو اپنا نشانہ نہیں بنایا اور حکومتیں ہمیشہ سے بچتی چلی آئی ہیں۔

یہ انسانی علوم کا تاریک ترین پہلو ہے اور اس پہلو کو بہت ہی مستعدی کے ساتھ صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے یا اسے نظر انداز کیا گیا ہے۔

اگر میر علی کو معاشرے کے اس تاریک پہلو کی موجودگی کا علم اور اندازہ ہوتا تو وہ کتے والے مقدمے کی سزا سے بچ سکتے تھے۔

لیکن ان کے ذہن میں تو وہی انصاف پسند حکومتوں اور عدلیہ تھے جن کی تصویر ہمارے عظیم ادب میں پیش کیا گیا تھا اور اسی لیے وہ اپنے قاتلوں میں بھی انصاف پسند عدلیہ اور حکومت دیکھتے تھے۔

مجھے اپنے والد سے کہنا چاہیے کہ وہ محتاط رہیں اور وہ کم از کم اپنی زندگی کے اس مقام پر اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھول لیں کیونکہ حکومتوں کی سوچ کا موازنہ مافیا طرز عمل سے کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کی سوچ کو مافیا طرز فکر بھی کہا جاسکتا ہے۔'

خالد نے محسوس کیا کہ اسے اس انداز فکر کی شناخت پر قدرت حاصل ہو رہی ہے جو لوگوں کی زندگیوں میں داخل ہو کر ہر طرح سے پریشان کر رہا ہے۔

ہاں یہ مافیا ہی ہے۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی نئی بات دریافت کرلی۔

یہ مافیا ہے۔اس نے اپنے آپ سے کہا۔

رفتہ رفتہ وہ ان باتوں کو الفاظ دینے میں کامیاب ہونے لگا تھا جو ابھی تک بے نام تھیں۔یعنی وہ باتیں جو لوگوں کے دماغوں کو متاثر کر رہی تھیں اور ان کی روحوں میں وحشت پیدا کر رہی تھیں، یہ انسانوں کا یہ کردار بے رحمی نہیں تھی، بے دردی نہیں تھی۔یہ اس سے بہت آگے کی کوئی چیز تھی۔یہ کاروبار تھی۔خنجر سے چہرہ اتار کر کمائی کرنے والا اور دولت بٹورنے کی لذت اٹھانے والا کاروبار۔

اب اس عظیم الجثہ، دیو قامت، غیر انسانی، آسیب کے باریک پر کھلنے لگے تھے۔اب معاشرے کی اس شکل کو اپنے اندر ایک نظام تحفظ لیے اس کے ذہن میں موجود تھی۔ پرنچے اڑ چکے تھے۔اور وہ ٹوٹے ہوئے شیشے کے برتن کی طرح چاروں طرف اپنے کاٹنے دار دھاروں کے ساتھ بکھر چکا تھا۔اب اگر ویسا معاشرہ چاہیے تو اس کے لیے ان ٹکڑوں کو از سر نو پگھلانے اور اسے ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت آن پڑی تھی۔اس ڈھانچے کے ابتدائی خطوط کسی پینٹنگ کے ابتدائی خطوط کی طرح اس کے ذہن کے کینوس پر ابھرنے بھی لگے تھے۔

مافیا کی دہشت وہاں بھی رواں دواں ہے جہاں کسی اسلحے کا استعمال نہیں ہوتا لیکن جہاں یہ ایک روحانی اور ذہنی مشین بن کر انسانوں کا خوں ریز استحصال کرتی ہے اور مخالفتوں کا مختلف حربوں کے ذریعے خاتمہ کرتی ہے۔یہاں ان کا طریقۂ کار مختلف ہے۔ یہاں جو ہتھیار استعمال ہوتے ہیں وہ بہت پختہ اور اعلیٰ درجے کے اسٹیل سے بنے ہوئے اور ان کی ایک لمبی فہرست ہے۔

منافقت، مکاری وعیاری، بے حسی، فریب، جھوٹ کی تشہیر، پرفریب چہروں کی تشکیل، مخالف چہروں کی تحلیل، اچھے مقاصد کے نام پر بنائے گئے قوانین، کمزوروں،

مجبوروں، ماتحتوں، عقیدت مندوں اور شاگردوں کا استحصال، پردے، پہرے دار، رازداری، سنسر اور لذت آقائیت سے بھرے قوت و حکمرانی کے پیالۂ جاں فزا۔

یہاں ڈاکٹر والکر کی کارروائی نہیں تھی، نہ ہی لارڈ میوتن وہی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ یہاں روئے زمین کی بہترین جمہوریت کا دعویٰ کرنے والوں کی ہم سری کرنے والی جمہوریت تھی اور کہیں اس سے بھی زیادہ ترقی یافتہ شکل میں۔ یہ ہے وہ جمہوریت جس میں شکار کرنے کی تمنا اپنے پورے جوش و خروش کے ساتھ ہر دل و دماغ میں رواں دواں ہے۔ دنیا کے کسی بھی خلاف تشدد کے استعمال فطری سمجھا جاتا ہے اور اس فلسفے کے راستے میں آنے والے کسی بھی مزاحمتی عمل کے خلاف یہ پورے غیظ و غضب کے ساتھ تلوار بن کر نازل ہوتی ہے۔ صرف میرے اپنے معاشرے میں ہی یہ بات نہیں ہے کہ بلکہ پوری نسل انسانی ایک غلط وادی میں اس نئے طرز زندگی کی راہ پر گامزن ہو گئی ہے۔ انسانوں کی ایک آبادی پر ایک ایٹم بم گرانے کو کافی نہیں جانا گیا اور اپنی برتری کے پیغام کو اور اپنی روح فرسا طاقت کی موجودگی کے ثبوت کو پوری گہرائی سے پوری انسانیت کی روح میں کھلنے کے لیے دوسرے ایٹم بم کا استعمال کیا گیا۔ اور ایک ایسی کہانی لکھی گئی جس کے پلاٹ میں انسان ایسے پھنسا ہوا ہے جیسے شیر کی نظروں میں آنے کے بعد ہرن۔

اس کے سینے میں ایک درد سا محسوس ہوا۔ وہ پچھلے زمانوں پر غور کرنے لگا۔ پچھلی صدیوں میں صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ترقی نہیں ہوئی تھی ایک نئی سیاسی سوچ بھی اس کے پیچھے پیچھے جنم لیا تھا اور اس کے ساتھ پورے روئے زمین پر پھیل گئی تھی۔ اس سیاسی سوچ نے اپنی درندگی کو چھپانے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کو نقاب اور ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور اپنے خونی پنجوں کے کارناموں کو انہی کے متھے منڈھ دیا۔ یہ نئی سیاست جو تجارت کے ساتھ قدم ملا کر فوجی مارچ کر رہی تھی اس قدر جارحانہ تھی کہ تمام انسانی

قدروں کو تہ و بالا کرنے پر یہ آمادہ تھی۔ دنیا کے کئی ملکوں میں جمہوریت جمہوری کردار پر نہیں تلواروں کی مصالحت کے اوپر قائم ہوئی۔ ایسے ملکوں کی جمہوریت کو فرانسیسی انقلاب کی روشنی میں دیکھنا یا فرانسیسی انقلاب کو آفتاب انسانیت سمجھنا عقل کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے جیسا ہے۔ یہاں جمہوریت پیدا ہوئی لیکن وہ انسانی قدروں سے خالی کسی دھات سے بنی ہوئی چمکتے دمکتے بت کی طرح تھی تبھی تو آج بھی لوگوں کو ان ممالک کے چہرے میں جمہوریت سے زیادہ استبداد دکھائی دیتا ہے۔ اسے اچانک خیال آیا کہ اتنی دور دراز کی باتیں کیوں سوچنے لگا۔

جب مغربی کمپنیاں ہندوستان کی گلی گلی میں گھوم رہی ہیں اور چینی سامان گھر گھر میں آندھی میں اڑتے ذروں کی طرح داخل ہو رہے ہیں تو اس آندھی سے بے خبر کیسے رہا جا سکتا ہے۔

ان تمام چیزوں پر حکومت کر کون رہا ہے؟

اگر یہ جمہوریت نہیں تب پھر کون ہے؟

کوئی بادشاہ؟

نہیں، کوئی آمر؟

نہیں یہ کوئی اور ہے۔

خالد کو اپنے ذہن پر زور ڈالنا پڑا اور تب اس نے محسوس کیا کہ یہ ڈاکٹر والکر ہے۔

ڈاکٹر والکر کمزوروں، مجبوروں، بے کاروں اور نادانوں کے استحصال اور موت میں یقین رکھتا ہے تو کیا ڈاکٹر والکر کو ایک نوکر شاہی مافیا کا حصہ کہا جا سکتا ہے؟

ڈاکٹر والکر کے حوض والی شراب اور بھی شکلوں میں بہہ رہی تھی۔

اس کے پینے والوں میں فرقہ پرست تھے جو دوسرے فرقوں کو دبانا اور کچلنا چاہتے تھے۔

نسل پرست تھے جنہیں زمین پر دوسری نسل کی عزت و آبرو قبول نہیں تھی

اور ان سب سے بلند و بالا مقام پر بیٹھے ہوئے وہ خفیہ مہذب اور دانش مند شرابی تھے جنہیں فلسفی مافیا کہا جاسکتا تھا۔ ان کا ایک خیال تھا کہ فلسفوں کا مقام انسانی قدروں اور خواہشوں سے بلند تر ہے اور ان دونوں میں حاکم و محکوم کا رشتہ ہے۔

مافیا طرز فکر نے تو بارش کی طرح ہر ایک کو ڈبو دیا ہے۔

ایسے لوگ بڑی تاریخی سواریوں پر بیٹھے دندناتے پھرتے ہیں جن کے پیچھے جھومتی جھامتی بھیڑ پاگل فوجوں کی طرح اپنے راستے میں آئی ہر چیز کو مسمار کرتی چلی جاتی ہے۔

دوسری طرف ایسے بیکار اور غریب انسانوں کی بھیڑ بھی ہے جو خود تبدیل ہونے پر آمادہ نہیں اور دوسرے پنپتے ہوئے لوگوں کا بھی سر قلم کرنے کو تیار رہتی ہے۔

لیکن ان سب میں کسی انوکھے جانور کی طرح وہ کردار ہیں جو عزت و غیرت کے نام پر اپنی مرضی سے شادی کرنے والی لڑکیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ جیسے وہ ان کی زندگی اور موت کے مالک ہیں۔

اس گھنگھور اندھیرے سے نکلنے کا اسے ایک ہی طریقہ دکھائی دے رہا تھا، اپنی ذہنی طاقت کو مکمل طور پر ایک ہتھیار بن کر لڑنا کہ یہی وہ طاقت تھی جو ایک آزاد ہتھیار کی طرح چل سکتی تھی اور یہی وہ ہتھیار تھا جسے مافیا کا آسیب پوری انسانیت پر حکومت کرنے کے لیے

استعمال کر رہا تھا۔

انسانی زندگی اور مافیا کے درمیان کی لڑائی در حقیقت دانشوری کی سب سے بڑی اور آخری شکل تھی۔

مافیا اپنی طرف سے اپنے اعمال کو ایک روشن وجود کے طور پر منوانے کے لیے تصورات، اندھی عقیدت اور تخیلی دنیا کی مخلوقات کا استعمال کر رہا تھا۔

وہ اپنی سوچ کو دیوی دیوتاؤں کے قصوں کے کیپسل میں ڈال کر بیچتا تھا۔

الہام، اوتار، تاریخ، قوم، سیاست، معاشیات اور معاشرت یہ سب اس کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے تھے۔

ان کھلونوں سے ہتھیار کا کام لیتے ہوئے صرف عوام کو ہی نہیں حاکموں اور حکومتوں کو بھی اپنے ان دانشورانہ شکنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔

یہ مہم بہت مشکل تھا۔ لیکن اس نے اپنے پیروں میں ایک حرکت، ایک جھرجھری محسوس کی کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا مقابلہ کرے اور اس پورے لشکر سے ہاتھا پائی کرے۔

ایک لمحے کے اندر وہ سارے چہرے جو بہت بڑے بڑے تھے اس کی نظر میں بونے ہو گئے۔ ملکوں کے صدر، وزرائے اعظم، پارلیمنٹ، عدالتیں، یونیورسٹی، بڑی بڑی کمپنیاں ایسے کردار بن گئے جن کی چھان بین کرنا اور جن پر فیصلے صادر کرنا ضروری ہو گیا۔

سوسائٹی، ملک، مذہب ان سب کی سچائی فوائد، اعتبار اور نئے سرے سے ان کی قدر و قیمت کو آنکنا خالد کے لیے زندگی کا ضروری کام بن گیا۔

وہ ایک انسان تھا۔ آج' آج ہی اس نے، پہلی بار یہ محسوس کیا کہ ایک تنہا انسان بھی کتنا اہم ہے۔ اس نے آج یہ محسوس کیا کہ انسان اپنے آپ میں بغیر کسی کی مدد کے کتنا عظیم ہے۔ شاید انسان کے اپنے بارے میں اس جانکاری کی کمی ہی تمام دنیا کے انسانوں کے دکھوں کو سب سے بنیادی وجہ تھی۔ ایک انسان کی حیثیت سے، اسے آج یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز دنیا کی ہر شے کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنا ہر انسان کا فرض تھا بلکہ ہر انسان کا اس پر قادر ہونا ضروری بھی تھا۔ انسان کے لیے ہر چیز کے بارے میں اپنی رائے رکھنا چاہے وہ بڑی سے بڑی ہو یا چھوٹی سے چھوٹی چاہے کوئی عام سی چیز ہو یا دنیا کی مقدس ترین چیز، جگہ، شخصیت یا کتاب۔

یہاں آتے آتے خالد کے لیے دنیا کا چہرہ اور اس کی ہر چیز کے ساتھ اس کا رشتہ مختلف ہو چکا تھا۔

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا اس لمحے سے اب تک کے درمیان وہ کتنا لمبا سفر طے کر چکا تھا اس کا خیال اس کے اندر زلزلہ پیدا کر رہا تھا۔

اس سے قبل ہمیشہ اس نے یہی جانا تھا کہ مافیا ایک بہت لمبے چوڑے اور بے پناہ طاقتوں سے لیس گروہ کو کہا جا سکتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک انسان کے اندر سمندروں کے پانیوں سے بھی زیادہ ایسی طاقت موجود ہے جو پوری دنیا پر چھائے ہوئے مافیا کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانے کی قوت اور جرأت رکھتی ہے۔

چیختے چنگھاڑتے خیالات اب اس کے ذہن میں رواں دواں تھے۔

مجھے لوگوں کو اپنی سوچ میں شریک کرنا چاہیے۔ خیالات کی جنگ کا یہی طریقہ کار ہے۔ جب تک کسی تنہا انسان کے خیال میں دوسرے لوگ شامل نہیں ہوتے یہ خیالات عملی

طاقت سے خالی رہتے ہیں۔

خیالات کو عام کرنا کسی ایجاد کو دنیا کے سامنے لانے جیسا ہے۔

ملک آزاد ہوتے ہیں اور ہوئے ہیں لیکن پرانے قانون دبے پاؤں اپنی تمام کرنبوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔

کوئی بھی جمہوریت حاکم اور محکوم کے رشتے کو ختم نہیں کرتی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم جن لوگوں کے ہاتھ میں اپنی پوری زندگی کے فیصلے لینے کا مختار نامہ ووٹ کی شکل میں دے دیتے ہیں وہی ہمیں چلمن سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔

کیا یہ تاریخ کا آٹھواں اور سب سے بڑا عجوبہ نہیں ہے۔

تم اپنے حاکموں کو بدل تو سکتے ہو لیکن حاکم و محکوم کے رشتوں سے نجات نہیں پا سکتے اور تم میں سے جو بھی حاکم بنے گا وہ سب سے پہلے مافیا کے ابدی چشمے سے سرخ مشروب پی کر بکری سے شیر بنے گا اور پھر تمہارا ہی خون پیے گا۔

ہمارا غلامانہ ذہن آزادی سے گھبراتا ہے، بیابانوں اور کھلے آسمانوں کی وسعت ہمیں ڈراتی ہے۔

اسے جلیاں والا باغ کی یاد آئی۔

کس بات نے جنرل ڈائر کو نہتے عوام پر گولی چلانے پر آمادہ کیا۔

اس خود مختاری نے جو اس عہد کے حکومت کے پاس تھی۔ اگر جنرل ڈائر کے

ذہن میں یہ بات صاف ہوتی کہ اگر وہ نہتے عوام پر اپنے اسلحوں کا استعمال اس طرح کرے گا جیسے وہ انسانوں پر گولی نہیں برسا رہا ہو بلکہ پتھر توڑ رہا ہو، تو اس کے ساتھ وہی ہوگا جو بے رحم مجرم کے ساتھ ہوتا ہے تو پھر جنرل ڈائر کو محسوس ہوتا کہ اسے عوام کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے۔ لیکن جنرل ڈائر بیسویں صدی کا ڈاکٹر ڈالکر تھا۔ جو کچھ ڈاکٹر ڈالکر نے کالا پانی کے گوشۂ عافیت میں کیا تھا وہ اب پھیل کر بے حیائی کے ساتھ ایک بڑھتے ہوئے مرض کی طرح پورے ملک میں رواں دواں تھی اور اس کے پیچھے حاکم و محکوم کا ایک ازلی رشتہ تھا۔

سوچتے سوچتے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس کے سامنے جیسے مختلف قسم کے کردار اس کے روبرو ابھرنے لگے۔ جیسے کسی سنیما حال میں خیال کردار بچے دکھنے لگتے ہیں۔

یہ سب اس کے مخالف تھے۔

اس کے خلاف نہ صرف کچھ حکمرانوں کے چہرے ابھرنے لگے بلکہ کچھ چہرے کارپوریٹ کی وادیوں میں اور کچھ ان کے پیچھے دھوتی اور تلک میں ابھرے اور بہت سارے تجارتی گھرانے، نجی بینک اور منڈی ایک آواز ہو کر بے چین لوگوں کی طرح چلانے لگے۔

'یہ بات نہیں ہے، اگر سماج میں امن نہیں ہو، اگر لوگوں کو درست رکھنے والے ڈنڈے نہ ہوں، اگر کنٹرول نہ ہو تو لوگ ہمارے ساتھ براہ راست مسئلے کھڑے کریں گے۔ مسئلوں کا حل عدالتوں میں ہونا چاہیے اور اگر لوگ مطمئن نہ ہوں تو ان مسئلوں کو قانون میں تبدیلی لا کر حل کرنا چاہیے۔'

وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

'اس سے ہمیں اپنے معاملات میں جوگاڑ کرنے کے لیے وقت اور موقع ملتا ہے، ہم

وکیلوں کے دستوں پر پیسے خرچ کر سکتے ہیں ان سیاست دانوں کے ذریعہ جن کو ہم چندے دیتے ہیں ہم اپنے پسند کے قوانین بنوا سکتے ہیں۔ جو لوگ براہ راست ہمارے خلاف اٹھیں انھیں پولس کے ذریعہ دبانا ضروری ہے۔ امن قائم رہنا چاہیے۔'

خالد کو کالا پانی کے زمانے کے برطانوی پارلیمنٹ کے ممبران کے چہرے یاد آئے ایک تلخی کے ساتھ وہ مسکرایا۔

یہ چہرے شور مچا کر غائب نہیں ہوئے بلکہ انہیں خالد کے خطرناک خیالات میں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور وہ تجسس اور اندیشے بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔ ان کی نظریں اس کے اس قلم پر ٹکی رہیں جس سے یہ سب کچھ لکھا جا رہا تھا۔

وہ لکھ رہا تھا——

''محکوم بننا ضروری نہیں ہے محکوم بن کر محفوظ رہنے کا خیال کاہلی اور الجھاوے کی مٹی پر نشوونما پاتا ہے۔''

ان چہروں کے پیچھے بھی لاکھوں انسان دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی زندگیوں کے درد کو محسوس کر کے وہ شاعری کرتا آیا تھا اور جن کے لیے وہ اکثر تنہائی میں رویا اور چیخا تھا۔ یہ لوگ بھی اس کے خیالات سے بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی زندگی کی کوئی بہت بڑی چیز داؤ پر لگی ہو۔ وہ لوگ بھی خالد کے ان خیالات پر دور سے ہی اعتراض کر رہے تھے جن خیالات کا مقصد ان کے اندر خود اعتمادی اور خود مختاری پیدا کرنا تھا۔

پیچھے کھڑی بھیڑ میں سے ایک آواز آ رہی تھی—— 'کیا ہر شخص ملک کی حکومت چلا سکتا ہے، کیا تم سوچتے ہو کہ حکومت کو چلانا کوئی آسان کام ہے۔ نہیں خالد، تم مخلص

ہو سکتے ہو، ممکن ہے تم ہمارے لیے سوچتے ہو لیکن ایسے خیالات؟ حکومت کرنا ایک بہت مشکل فن ہے۔'

ان میں سے ایک جو اپنے کو دوسروں سے زیادہ ذہین ظاہر کر رہا تھا کچھ آگے بڑھ کر بولا ——'' کوئی بھی ملک ترقی کب کرتا ہے جب اسے کوئی اہل حکمراں ملتا ہے۔ حکمراں کو صرف اپنے ملک کے اندرونی معاملات کو نہیں دیکھنا ہوتا۔ اسے بیرونی معاملات کو بھی حل کرنا پڑتا ہے۔ بین الاقوامی معاملات کو۔''

خالد کا جواب بھی احتجاجاً اونچی آواز میں ابھرا——

''شہری کو اس بات کو سمجھنا چاہیے اور ایک بدلے ہوئے معاشرے کی تعمیر کے لیے اٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں حاکم اور محکوم کی دوری ناپید ہو جائے۔''

خالد کی آواز سے بھی اونچی ایک آواز بھیڑ کی طرف سے آئی——

''کیا کبھی کوئی معاشرہ ایسا رہا ہے جس میں کوئی حکمراں نہیں رہا ہو؟''

''اگر ہر شخص بادشاہ ہو جائے تو کام کون کرے گا۔ مجھے تمہاری نامعقول بات پر تعجب ہے۔''

قہقہوں کی آواز افق تک گونج گئی۔

خالد کے لیے یہ بڑا چیلنج تھا۔

''دیکھو کون تمہیں رد کر رہا ہے؟ وہی جنہیں تم قومی بنانا چاہتے ہو۔ خود وہ لوگ طاقتور ہونے کی ذمہ داری سے ڈرتے ہیں۔''

خالد اندر سے بہت مضبوط ہو چکا تھا۔ خود مختار شہری کو وجود میں آنا ہوگا۔ سب سے پہلے کسی مفکر کے ذہن میں۔

لیکن دوسرا سوال ہے کہ مفکر کون ہے؟ اور موجودہ صورت حال میں فکر کا معنی کیا ہے۔

لوگ کچھ دلچسپی اور دھیان سے اسے سننے لگے جیسے وہ کوئی نئی اور دلچسپ بات کر رہا ہو۔

''سوچنے والے لوگ۔ ممکن ہے کچھ لوگ ان کے بارے میں سوچیں، ممکن ہے اس میں نجات کا کوئی راستہ ہو۔''

اس کے مطالعہ گاہ کی دیواریں غائب ہو چکی تھیں اور چاروں طرف سمندر کی طرح اسے وہ لوگ دکھائی دے رہے تھے جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔

'مفکر کون ہے؟'

'عام طور سے لوگ اپنے فرقے اور اس کے سیاسی مفاد کے حوالے سے سوچتے ہیں لیکن ایک مصنف کی آواز خالق کائنات کی آواز ہوتی ہے۔ اس کی روح عالم گیر سروکار رکھتی ہے۔ وہ کسی انسان کو اجنبی یا غیر نہیں مانتا اسے ایسا ہونا چاہیے کہ دنیا کا کوئی بھی شخص اسے دوسروں کا مصنف نہ سمجھے۔'

''یہ تو بڑی اور عمدہ باتیں کر رہا ہے، اچھے خیالات، انصاف پسندی کی باتیں۔ صحیح باتیں کہہ رہا ہے۔''

لوگوں میں آپس میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔

سوال یہ ہے کہ سوچ کیا ہے؟

سوچ تہذیب کا ایک عمل ہے اور تہذیب کے اعصاب کا مرکزی نقطہ ہے۔ تہذیب کے خواب اس کی تمنائیں اور بصیرتیں اس کی سمتوں کو متعین کرتی ہیں۔ تازہ سوچ کسی قوم کی پوری موجودہ سوچ کو تولتی اور روشن کرتی ہے۔ یہ کسی تہذیب کی تخلیقیت اور اس کی قانون سازی، حکمت عملی اور عدلیہ کو بصیرت دیتی ہے۔ اور جب کبھی یہ روشنی لینا بند کر دیتی ہے یا متروک ہو جاتی ہے تو کسی ملک کے سارے اعضاء بے سمتی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایک کہرام کا عالم پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے آج کے معاشرے میں ہو گیا ہے۔

اور اگلا سوال ہے کہ مفکر کون ہے؟

مفکر ایک ایسا شخص کو کہہ سکتے ہیں جو اپنے جسمانی اور جذباتی دائروں سے باہر نکل کر عالمی سروکار کو اپنی روح سے جوڑ لیتا ہے۔ ایک عام آدمی جانور اور انسان کا مرکب ہوتا ہے وہ جانوروں کی طرح لالچ سے متاثر ہوتا ہے اور ہری گھاس کی طرف کھنچتا ہے۔ اس کے اعمال انتقام، موقعہ پرستی، تشدد اور عدم تحفظ کی قوتوں سے طے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک مفکر انتقام کے جذبے سے نہیں بلکہ امن کے تقاضوں سے متاثر ہوتا ہے۔ موقعہ پرستی سے نہیں بلکہ تہذیب کے بنیادی تقاضوں سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ جانوروں کی طرح صرف ہری گھاس تک نہیں دیکھتا بلکہ نظروں سے بعید تر دنیا کو بھی سامنے رکھتا ہے۔ وہ دور اندیش ہوتا ہے اور چیزوں کا جائزہ بہتر تناظر میں لے سکتا ہے۔

ایک تاجر مفکر نہیں ہوتا۔

ایک عیارانہ مسکراہٹ تجارتی گھرانوں کے چہروں پر ابھری جو ابھی تک اسے دیکھے جا رہے تھے۔

"یہ تو بہت دلچسپ بات کر رہا ہے۔ یہ یونیورسٹیوں کے دانشوروں جیسا لگتا ہے بے وقوف۔ بھلا پیسے کے بھلا سوچ کی کیا اہمیت۔" ایک نے کہا—

دوسرے نے قہقہہ لگایا۔

"مفکر؟ مفکر ہوتے ہیں او، یہ وہی تو ہوتے ہیں جنہیں ہم تنخواہ دے کر کام لیتے ہیں، جن سے ہم دس روپے کا کام لیتے ہیں تو ایک روپے دیتے ہیں بے چارے مفکر، وہ جائیں بھی تو کہاں جائیں۔ ان کے پاس پیسہ تو ہوتا نہیں۔"

اب خالد کہہ رہا تھا۔

"تاجر فائدوں کا شکار کرنے والا ایک موقعہ پرست ہوتا ہے۔"

تاجروں کی طرف سے احتجاج میں ابروئیں تنی ہی تھیں کہ خالد کا اگلا جملہ سنائی دیا—

"وہ ایک ایسے جانور کی طرح ہوتا ہے جس کے خیالات کی رہنمائی ہری گھاس سے ہوتی ہے۔ سیاستداں بھی اپنے مخصوص لوگوں کے لیے سوچتے ہیں۔

وہ سیاستداں جو تاجروں کے ایجنٹ ہوتے ہیں مفکر نہیں ہوتے۔ مفکر سب کے لیے سوچتے ہیں، غیر مفکر صرف اپنے لیے سوچتے ہیں یا پھر اپنے گروہ کے لیے اس لیے غیر مفکر عام آدمی کے فلاح کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے۔

کچھ ایسے بھی مفکر ہوتے ہیں جو خیالوں کی تجارت کرتے ہیں۔

اگر کسی وزیر اعظم کے چہرے کو دیکھ کر کسی ایک بھی فرد کے ذہن میں یہ خیال

آئے کہ وہ وزیر اعظم کچھ خاص لوگوں کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے دل کے نہاں خانے میں دوسرے لوگوں کے مفاد کا دشمن ہے تو پھر ایسا وزیر اعظم مفکر نہیں۔

ایک سچا مفکر چاہے وہ مذہبی آدمی ہو یا سیاسی یا فلسفی ایک ایسے سائنسداں کی طرح ہوتا ہے جو مکمل انسانیت اور عالمی معاشرے کے بارے میں سوچتا ہے اور ایسے ہی شخص کو معاشرے اور ملک کا رہبر ہونا چاہیے لیکن ایک جمہوری نظام میں ایسا شخص تب تک ابھر ہی نہیں سکتا جب تک ملک کے ہر شہری کے اندر ایک سچے مفکر کی خوبیاں پیدا نہ ہو جائیں۔

لیکن یہی آدمی تو منظر میں نہیں ہے۔

ہم اپنے معاشرے کے کرداروں کا مطالعہ اپنی کہانیوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ہمارے سارے فکشن کی سوچ کا اصل مرکز کہاں ہے۔ یہ کرداروں کی بات کرتا ہے۔ یہ کردار سوچتے کس طرح ہیں اور ان کے درمیان کس طرح زندگی کے رشتے سے یہ اہم ترین آدمی غائب ہے۔ ہم ایک آبادی ہیں اور جب آبادی ایک ساتھ رہتی ہے تو ملک وجود میں آتا ہے۔ ملک وجود میں آتا ہے تب شہری وجود میں آتا ہے۔ جب شہری وجود میں آئے گا تب اس شہری کا ایک کردار بھی ہوگا۔ اس شہری کی متوقع تعریف کیا ہو سکتی ہے۔

یہ شہری فرقہ پرست نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک جمہوری ملک فرقہ پرست نہیں ہو سکتا۔

یہ شہری بزدل نہیں ہو سکتا کیونکہ کوئی ملک بزدل نہیں ہو سکتا۔

یہ شہری جعلساز نہیں ہو سکتا کیونکہ ملک جعلساز ملک جعلساز ملک کے طور پر نہیں جانا جا سکتا۔

یہ شہری خود غرض نہیں ہو سکتا کیونکہ ملک اپنے شہریوں کے تئیں خود غرض نہیں ہو سکتا۔

یہ شہری کاہل نہیں ہو سکتا کیونکہ ملک کاہل ہو کر باقی نہیں رہ سکتا۔

یہ شہری بے ایمان نہیں ہو سکتا کیونکہ ملک کرپٹ نہیں ہو سکتا۔ اور ان تمام باتوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ شہری خود مختار ہوگا کیونکہ ملک خود مختار ہوتا ہے اور خود مختار شہری ہی ایک خود مختار ملک کو جنم دے سکتا ہے۔ صرف صحت مند شہری ہی ایک صحت مند ملک قائم کر سکتے ہیں۔ صرف مکمل آزادی کا احساس رکھنے والے افراد ہی ایک آزاد ملک کو وجود میں لا سکتے ہیں۔ ایک خود مختار ملک کی تعمیر خود مختار شہریوں کے اکٹھا ہونے سے ہوتی ہے نہ کہ شہریوں کی خود مختاری کو سلب کرنے سے۔ کسی ایک بھی شہری کی خود مختاری کو ختم کرنا خود ملک کی خود مختاری کو ختم کرنے کے برابر ہے اور خود مختار ہوتا ہے ملک لیکن حکومت خود مختار نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ شہریوں کی کارندہ ہے۔ یہ صرف شہریوں کی خود مختاریوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ لوگ سرکار کے اندر ایک بند کمرہ بنا لیں اور اس کے اندر اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے تمام شہریوں کے مالک و مختار بن جائیں۔ ملک کی مشینری کا نظم ایسا ہونا چاہیے جو شہریوں کی مکمل خود مختاری کی گارنٹی دے نہ کہ وہ ایسے قوانین اور ضابطے بنائے کہ وہ شہریوں کی خود مختاری کی طرف سے بے نیاز ہو جائے۔

اور ملک کے ان خود مختار شہریوں کو چاہیے کہ وہ کسی ایسی تجارت یا معاشرت کو تعاون نہ دیں جو انسان کش خصوصیات رکھتی ہو۔

سوچتے سوچتے خالد سہیل جہاں پہنچ گیا تھا وہاں سے دیکھنے پر معاشرے میں ہونے والی بہت سی باتیں معاشرے میں بڑے بڑے سوال کھڑے کر رہی تھیں۔

ابھی چند روز پہلے اخبار میں جو خبر آئی تھی وہ اس کی نظروں کے سامنے سے گھوم گئی۔

سپریم کورٹ میں ایک مقدمے کی سماعت ہوئی تھی جس میں دلی میں سرکاری زمینوں پر رنگ روڈ کے کنارے جھگیوں میں رہنے والے لوگوں کو ہٹانے کا مسئلہ سامنے آیا

تھا۔ یہ لوگ یہاں پندرہ برسوں سے رہ رہے تھے۔ ان کے وکیل نے کہا کہ مئی کے مہینے کی جلتی ہوئی دھوپ میں ان کے پاس سر چھپانے کے لیے کہیں کوئی سایہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کو کچھ مدد ملنی چاہیے۔ انصاف کرنے کی اہم ترین ذمے داری سونپے گئے اس سب سے اونچے ادارے نے اس کی درخواست کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ اس ادارے نے یہ نہیں پوچھا کہ انہیں کن لوگوں نے یہاں آنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ جواب صرف یہ تھا کہ معاشی اور سیاسی عمل نے انہیں اپنے گھروں سے نکال کر اس بڑھتے ہوئے جانور جیسے شہر کے پیٹ میں لا پٹکا تھا۔ اس لیے اس ادارے نے ان لوگوں سے کہا کہ ''کسی نے تم کو دلی آنے کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔''

یہ کون کہہ رہا تھا؟

کوئی تھا جو دعویٰ کر رہا تھا کہ دلی، دلی سرکار اور دلی کے لوگوں کی ہے اور کوئی اس بات سے انکار بھی کر رہا تھا کہ پورے ملک پر حکومت کرنے والی دلی ملک کی آبادی کو بھوک مری کے دہانے پر لانے کے لیے ذمے دار نہیں ہے۔

اور کوئی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ انصاف کے اس ادارے میں رحم و کرم کے جذبے کی قیمت دھول مٹی سے زیادہ نہیں۔

تو پھر دکھوں کی آواز کون سے ادارے میں سنی جائے گی۔

یہی ادارہ تو ہے جسے شاعروں اور ادیبوں کا ذہن کہا جاتا ہے۔ عدالتوں، قانون ساز اسمبلیوں اور سرکاروں کے کام انسانی آوازوں میں شامل درد کی چیخ کو نہیں سن سکتے صرف ایک تخلیق کار ایسے دکھی لوگوں سے اس زبان میں بات نہیں کرے گا کہ کس نے انہیں دلی جیسے شہر میں آنے پر مجبور کیا۔ تخلیق کار دکھی انسانوں کے مقدمے کو تہذیب کی عدالت میں لڑتا ہے۔

یہ ہمارے مسئلوں پر بات کر رہا ہے۔

کروڑوں لوگوں کی نگاہیں خالد پر جم گئیں۔

اگر ہم انسانی زندگی کو دو سطحوں میں تقسیم کریں تو اوپری سطح خیالات، معاشرت، اخلاقیات، عقائد اور جذبات کی دنیا ہوگی۔ اور نچلی سطح وہ ہوگی جہاں سرکاری قوانین اور عدلیہ کام کرتی ہیں۔ اور انسان صرف قانون کی سطح پر سرکاروں کی گرفت میں ہے لیکن انسان خیالات کی سطح پر آزاد ہے۔ ایک تخلیق کار اوپری سطح کی کچھ ذہنی اور جذباتی دنیا کا خالق ہوتا ہے۔ وہ ملک کا نہیں تہذیب کا معمار ہوتا ہے۔ وہ ان انسانوں کی تخلیق کرتا ہے جو نچلی سطح میں جا کر دنیا کے کاروبار کو چلاتے ہیں۔ تبدیلی سوچ کی اس اوپری سطح سے آئے گی۔ خالد کے چاروں طرف پھیلے ہوئے کروڑوں لوگوں کے سروں کے اوپر آسمان میں جیسے بجلی سی کڑکی۔ تاریخ میں چمکتے کئی بادل نظروں میں آ گئے۔

چانکیہ ـــ!

ہاں۔

مفکر، حکمرانوں سے بڑے ہوتے ہیں۔

اور یہ سارے لوگ جو بڑے ہو کر حکومت پارلیمنٹ، عدلیہ، پریس، مذہب، میڈیا، تجارت اور صنعت کو چلاتے ہیں۔ یہ ابتدائی دنوں میں اپنے اسکولوں میں سیکھتے ہیں کہ دنیا کیسی ہے۔ وہیں سیکھتے ہیں کہ کیسے سوچنا چاہیے۔ معاشرے کے تخلیق کار لکھتے ہیں اور اسکولوں کے اساتذہ ان کی تحریروں کو بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ یہ بچے جب بڑے ہو جائیں اور خود سے پڑھنے کے لائق ہو جائیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے عہد کے تخلیق کاروں کو پڑھیں اور ان کی تحریروں کے آئینے میں اپنے چاروں طرف کی دنیا کو دیکھیں اور سمجھیں۔

پھر غلطی کہاں ہوتی ہے؟

اور خود ہمارا معاشرہ جو ادب پیدا کر رہا ہے وہ کیسا ہے اور کہیں ادب کی بارے میں ہمارا جو تصور ہے اسی میں تو خطرناک گراوٹ نہیں آ گئی ہے۔ ادب کیا ہے۔ ہر وہ لفظ جو سوچنے کے بعد اور اپنے ضمیر سے تصدیق حاصل کرنے کے بعد لکھا جائے ادب ہے۔

اس کا ذہن بے ترتیب طریقے سے آگے بڑھ رہا تھا۔

کیا سوچنے کا طریقہ کسی واضح تصویر تک پہنچ سکتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ہے۔ کوئی بھی مربوط سوچ اپنے انجام تک پہنچتے پہنچتے سیلابی دریاؤں کی طرح بے ترتیب انداز میں بڑھنے والی تحریک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسانی ذہن کی تکمیل اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو رابطہ کے ڈھانچوں سے آزاد بھی رکھے اور توازن کے ساتھ غیر متوازن رہنے کو بھی اپنا وطیرہ بنائے۔

''دنیا، میرے اوپر تیوری مت چڑھاؤ' مجھے اپنی وسعتوں اور بے ترتیبی سے مت ڈراؤ' میرا وجود اور میرا ذہن تمہیں جاننے کی اور سمجھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔'' وہ کچھ اس طرح بڑبڑایا جیسے وہ کسی سے کہہ رہا ہو۔ حالانکہ بنیادی طور پر وہ خود ہی اپنے جملے کو سن کر اسے مضبوطی سے اپنی بصیرت کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔

لوگ اپنی ہتھیلی میں اپنی تھوڑیوں کو ٹکے ہوئے اب اسے بہت غور سے سن رہے تھے۔

'جن لوگوں میں دیکھنے کی جرأت، سوچنے کی جرأت، جاننے کی جرأت اور جرأت تخیل بے پناہ طور پر موجود نہیں ہوتی ان کا غلامی کی زد میں آنا اور رہنا ان کی تقدیر ہے۔ کیا ہم یہ دیکھے بغیر کہ ہمارے معاشرے اور دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور اس کو دیکھنے کے لیے

صرف اخباروں ٹی وی اسکرین میں اپنے ذہن کو مقید کر کے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اخباروں اور ٹی وی کے پردوں کے پیچھے خود جھانکیں کہ کروڑوں لوگوں کی زندگیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ جن کے کلوز اپ مصلحتوں کے تحت ٹی وی کے پردوں پر نہیں لائے جاتے' انہیں ہم نہیں دیکھ پاتے، نہیں جان پاتے، میڈیا کے لوگ تربیت یافتہ پولس کے لوگوں کی طرح صرف اپنے مالکوں کے احکامات کے تحت کام کرتے ہیں اور جس طرح پولیس اپنے حاکموں کے اشاروں پر احتجاج میں اٹھے لوگوں کے سینوں پر گولیاں چلاتی ہے اور نہیں سوچتی کہ وہ کیا کر رہی ہے ٹھیک اسی طرح میڈیا سچائیوں کو اپنے مالکوں کے حکم پر دکھاتی یا پوشیدہ رکھتی ہے۔ ان کے پاس تخیل ہے ضرور لیکن انہوں نے اپنے تخیل کو کہیں بیچ دیا ہے، کہیں گروی رکھ دیا ہے۔ ان کے ذہن اور تخیل کسی عمارت کی اینٹ کی طرح، کسی درخت کے ریشوں کی طرح، کسی جسم کے پٹھوں کی طرح کسی نہ کسی مفاد پرست نظام کے اندر قید ہو گئے ہیں۔ ان کا کوئی آزاد وجود نہیں۔ آزادی تخیل کی شاہراہ پر گامزن ہونا چاہتی ہے۔ وہ آزادی جو بندوق کی نالی سے پیدا ہوتی ہے اور تشدد کی شکل میں پرورش پاتی ہے۔ وہ آخر کار ناکام ہوتی ہے اس لیے کہ اسے تخیل کی جولانیوں کا قطعی علم نہیں ہوتا۔ میڈیا کی طرح ہی شاعر اور ادیب جن میں دیکھنے، سوچنے، جاننے اور خیال کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ سچے ادیب نہیں بلکہ ادب کے نام پر غلامی کے پرچار کرنے والے ہوتے ہیں۔

انسانی زندگی اس کی خوشیاں، اس کی آزادی، اس کی فلاح ہی سچے ادیبوں کا واحد سروکار ہے۔ سماجیات اور میڈیا، سماجی ڈھانچوں کا معائنہ تو کر سکتے ہیں لیکن انسان کی روح میں برپا قیامت کی تصویریں صرف جذبۂ رحم اور درد کی نگاہوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔

اس نے اب لکھنے کے بجائے اپنے سیل فون کو آواز ریکارڈ کرنے کے موڈ میں ڈال کر سامنے رکھ دیا اور ان چہروں سے اپنی بات کہتا رہا جو اسے غور سے سن رہے تھے۔

''کتابیں اسی طرح کام کرتی ہیں۔ جب کتابیں مقبول ہوتی ہیں تو انہیں دنیا

بڑھتی ہے۔ کتابیں لکھنے والوں سے پڑھنے والوں کے ذہنوں کی طرف بادلوں اور تیز ہواؤں کی طرح، دریاؤں اور طوفانوں کی طرح سفر کرتی ہیں اور ایٹم بم کی طرح پھٹتی ہیں اور طلوع آفتاب کی طرح دنیا کو روشن کرتی ہیں۔''

میں پوری دنیا کو تبدیل کرنے کی بات کر رہا ہوں۔ میں دنیا کے موسم کو بدلنے کی بات کر رہا ہوں۔ اس دنیا میں دو قطب ہیں۔ تاریکی کو مکمل طور پر ختم کرنا ناممکن ہو سکتا ہے لیکن انسانی قدروں کے روشن میناروں کو بجھنا نہیں چاہئے ان کو مسلسل روشن رکھنا ادب کا فریضہ ہے۔ تاریخی روشنی سے خوف زدہ ہو یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن روشنی تاریکی سے گھبرا جائے یہ بات فہم انسانی سے بعید ہے۔

یہ تاریکیاں ہمارے موجودہ ادب کی نس نس میں داخل ہو چکی ہیں اور ہمارے ذہنوں کو آلودہ کر چکی ہیں۔

لوگ سر جھکائے بہت سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔

انسان کے اندر عظمتِ انسانی کا قتل ہو رہا ہے۔ مقابلے Survival of the fittest, Killing instinct اور Superman کے تصورات انسان کو بے رحم درندہ بناتے جا رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے یہ حملہ کہاں سے ہو رہا ہے؟

آج کی بڑی میڈیا اپنے قارئین کے ذہن کو ۸۵ فیصد عوام کی زندگیوں سے دور رکھتی ہے اور سو فیصد انسانوں کے دلوں میں اٹھنے والے درد کو نظر انداز کرتی ہے اور درد کے احساس سے ٹوٹتے ہوئے دل و دماغوں اور جسموں کو Glamour اور Sex کا مشروب پلا کر انہیں مستی کے عالم میں رکھتی ہے۔ تاکہ تاریکی میں کام کر رہے قزاقوں پر ان کی نظر نہ پڑے۔

جب بھی کوئی اندوہناک واقعہ ہوتا ہے میڈیا اس کے درد کو بھی فوراً Cola اور Pepsi میں تبدیل کر کے بیچ دیتی ہے۔

بڑی میڈیا کا نشانہ طاقتور گراہک ہے۔ یہ اسی کے لیے کھانا پروستی ہے۔ Killing instinct اور Competition والے اس گراہک کا دل سوکھی لکڑی کی طرح خشک ہوتا ہے۔ اپنے دل کی اس خشکی کو مٹانے کے لیے وہ درد بھرے مناظر کو دیکھنا چاہتا ہے۔ بڑے اخباروں میں ہر دو روپے کے اخبار پر اشتہار دینے والوں کے 29 روپے لگے ہوتے ہیں۔ اس میں صرف وہی باتیں اور اسی انداز میں جاتی ہیں جو طاقتور گراہک پسند کرتے ہیں اور طاقتور گراہکوں، اندوہناک حادثوں کی آگ سے ہاتھ تاپنا تو پسند ہے لیکن ان حادثوں کے پیچھے کیونکہ اکثر وہ خود ہوتے ہیں اس لیے ان کے پیچھے کی تفصیلات میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس طرح سچائیاں عوام تک صرف کہانیوں سے پہنچ سکتی ہیں اخباروں سے نہیں۔

رفتہ رفتہ اس کے چاروں طرف کا منظر بدلتے بدلتے کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ اسے محسوس ہو گیا کہ وہ کالا پانی کے انڈمان میں بیٹھا ہوا ہے اور وہیں سے آج کی دنیا کو دیکھ رہا ہے۔

اسے لگا کہ وہ کسی پہاڑ کی چوٹی سے انتہائی بلند اور پر جوش آواز میں بول رہا ہے اور آوازیں نیچے آکر لوگوں تک پہنچ رہی ہیں۔

وہ کہہ رہا تھا۔

''پرانے عہد کی حکمرانی ختم ہو چکی اب یہاں کوئی حکمرانی نہیں۔

اب یہاں بغیر کسی ذمے داری کے اختیارات کا عہد قائم ہو چکا ہے۔

اور وہ لوگ جن کے پاس کوئی اختیار نہیں ان کا شیر علی کی طرح کوئی وجود نہیں وہ صرف سرکاری اور نجی اداروں کے ہاتھ میں کہیں کسی کی حکمرانی ہی ہے۔

لوگ اسی لیے حکمرانی سے تنگ آ گئے ہیں۔

لوگوں کو حکمرانی کے نام پر اختیارات کے استعمال نے اتنا ناکام اور مایوس کیا ہے کہ حکومتوں میں ان کا یقین ختم ہو چکا ہے۔ جو لوگ اب بھی تحفظ کے لیے حکومت کی تلاش کر رہے ہیں وہ دراصل احمقوں کی دنیا میں جی رہے ہیں۔

مرد، عورت، جوان، بوڑھے، بچے، لڑکیاں، والدین سب ایسی تنہائی میں جھونک دیے گئے ہیں جہاں انہیں از خود اس زندگی اور دنیا کا ماضی تلاش کرنا ہے اور یہ بھی جاننا ہے کہ کہیں کسی حکومت کا وجود نہیں۔

معاشرے، ملک، اخلاقیات کی حکومت غائب ہو چکی ہے۔

ہمارا وزن تمہارے اختیارات سے آنکا جاتا ہے۔ تمہارے حقوق سے نہیں۔

اگر تم مکمل تحفظ چاہتے ہو تو تمہیں اس کے لیے اپنی سمجھ خود پیدا کرنی ہوگی۔

شیر علی کا زمانہ گزر گیا۔

دنیا نے شیر علی سے کم اور لارڈ میو سے زیادہ سیکھا ہے۔

کامیابی تو آخر کار لارڈ میو کو ملی تھی شیر علی کو نہیں۔

شیر علی تاریخ میں شہید کا درجہ دیے جانے کے لیے اچھا ہے۔

شہادت کو خود ماضی کی چیز بن چکی ہے۔

بڑھتے وقت کے ساتھ صرف ڈاکٹر والکر کے قبیلے کی توسیع ہوئی ہے اور وہی

داد بن کر پورے زمانے کے چہرے پر چھا گیا ہے۔

اس داد نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں کروڑوں لوگوں کو مارا۔

یہ داد ایٹم بم کا پھوڑا بن کر پھٹا۔

کوئی اس کا علاج نہیں کر پایا۔

اب یہ پورے گلوب پر چھایا ہوا ہے۔

قلیل اور کمزور لوگوں کی تہذیبیں اس داد آلود تہذیب میں جگہ پانے کے لیے خودکشی کر کے دوبارہ پیدا ہو رہی ہیں۔

شیر علی نے صرف مکاری کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن دنیا اب اس کے اوپر سے پردے کو پوری طرح کھینچ چکی ہے اور اسے اقتدار کے قلعہ نما محل کا اندرونی حصہ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔

کسی سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔

یہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور شفاف دنیا ہے۔

سارے جادو ٹوٹ چکے ہیں۔

تاریخ کے سارے کردار ننگے ہو چکے ہیں۔

عظیم نصب العین اپنی چمک کھو چکے ہیں کیونکہ ان کے معجزے، کرامات، جادو اور شمع ہدایت کا راز فاش ہو چکا ہے۔

اب انسان کو جو کچھ چاہیے اس کے آس پاس چاہیے۔

عظمتیں زمیں بوس ہو چکی ہیں کیونکہ آزمائشوں کے دور میں انہوں نے اپنا اعتبار کھو دیا۔

برطانوی جمہوریت کی عظمت جزائر انڈمان کے کالا پانی اور زندگی کے دوسرے جزیروں میں منہ کے بل گر گئی تھی۔

بڑی سے بڑی سیاسی شخصیتوں کے وعدوں کو اشتہاری کاغذوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

کردار نام کی چیز کا کوئی خریدار نہیں۔

انسان آج سب سے زیادہ ناقابل اعتبار مخلوق کے طور پر ابھرا ہے، بالکل ویسا ہی جیسا میکیاویلی نے بادشاہ کو بتایا تھا۔ اب اس کی کتاب صرف بادشاہ کی تربیت تک محدود نہیں اسے پوری دنیا اتنی گہرائی سے پڑھ اور سمجھ چکی ہے جتنا بادشاہ نے بھی نہیں سمجھا ہوگا۔ بادشاہت کے یہ گر سوائے ان کے تمام دوسرے لوگ سمجھ چکے ہیں جو اب بھی اپنے اوپر حکمرانی کے لیے کسی بادشاہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔

دنیا رفتہ رفتہ انسانی معاشرے میں امن وامان کے نئے امکانات کی تلاش کرتی جا رہی ہے۔

اب اسے کسی فلسفی کی ضرورت نہیں۔

انسانی معاشرے میں اب امن تبھی قائم ہوگا جب اس کا ہر فرد اس کی تمنا کرے گا۔ لیکن ابھی امن کا وقت آیا ہی نہیں۔

یہ جنگ کا وقت ہے۔

ہر فرد ہر دوسرے فرد کے خلاف برسرپیکار ہے اور ہر چیز پر حملہ آور ہے کہ اس میں سے بھی وہ اپنا حصہ حاصل کرے۔

اور ہر فرد کو ہر شیر علی سے اپنے کو محفوظ بھی رکھنا ہے شیر علی ایک مسلسل موجود رہنے والا جراثیم ہے۔

ہر شخص جو بہادر لیکن کمزور ہے وہ اس میدان جنگ میں ایک خطرہ ہے۔ وہ شیر علی کی طرح اچانک پھوٹ پڑتا ہے۔ ہر چند کہ وہ صرف ایک صدا بصحرا بن کر رہ جاتا ہے۔

وہ اپنے کمرے سے باہر کھلی ہوا میں آیا اور آنگن میں دور تک نکل آیا۔ اس کی سوچ رک گئی تھی اور اس کا ذہن آرام کرنا چاہتا تھا—

اس کی نظریں اب کسی درخت، کسی چڑیا یا زندگی کی کسی اور چیز پر ٹکنا چاہتی تھیں۔

اس نے 19 ویں صدی کی بلندیوں سے برطانوی سامراج کو یوروپ کے ایک جزیرے سے ابھر کر پوری دنیا پر پھیلتے ہوئے دیکھا۔ تاجروں کا ایک دستہ ہندوستان کے ساحل پر پہنچ رہا تھا۔ ٹیم کے رہنما کے ہاتھ میں ہندوستان کا نقشہ تھا اور اس کی نظروں میں ملک کا کھلے ہوئے ساحل، ریگستان، شہر، ہمالہ پہاڑ اور اس کی چٹان — اس نقشے کو اپنے ذہن میں بسائے ہوئے وہ ایک خادم کی طرح مغل شہنشاہ کے دربار میں پہنچا۔ ایک معمولی خادم کے بھیس میں جس کا اعلانیہ مقصد مغل شہنشاہ کی خدمت تھی، وہ ہندوستان کے دل و دماغ میں گھسنے کی شاہراہ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ دستے جاپان پہنچ کر اس کی جدید کاری میں لگ گئے، ترکی کی عظیم حکومت میں کیڑے کی طرح گھسے، تاریخ کے تناظر میں یہ انتہائی قابل دید منظر تھا۔ ان دستوں کے لیے دنیا کے لوگ اختیار میں لینے اور استحصال کرنے کی چیز تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سائنسی اور تکنیکی مشین تھی اور ان کا مکار ذہن میکیاولی کے فلسفے سے روشن تھا اور اس کے ساتھ ہی جنم لے رہی تھی ایک نئی تہذیب جو پوری دنیا میں پھیل رہی تھی اور دوسرے لوگوں سے اپنی تہذیب کی برتری کو منوا رہی تھی۔ کامیابی کا فلسفہ ان کی اجارہ داری بن گئی تھی۔ وہ زمانے گزر چکے تھے جب حکومتیں اپنے عوام کی زندگی کی فکر کرتی تھیں اور اس کو اپنی ذمے داری سمجھتی تھیں یہ وہ جمہوریت تھی جس میں ڈوبتے ابھرتے حاکموں کا کوئی چہرہ نہ تھا۔ کوئی بھی حاکم کسی بھی طرح کی ذمے داری کا کمبل اوڑھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

یہ سیاست نہیں سیاسی چونچلوں کا دور آ گیا تھا اور اس کے اندر سے پنپنے والی تھی ایک Micro Democracy۔

پھر اس نے کہا

'لٹکے ہوئے آدمی کا زمانہ آخرکار قریب آ گیا ہے۔'

اس نے اپنی جگہ پر جا کر آسمان کو دیکھا جہاں سے اس نے ایک سائے کو آسمان سے لٹکتے دیکھا تھا لٹکا ہوا آدمی اب وہاں نہیں تھا۔ بادل کے ٹکڑے بھی جا چکے تھے۔

آسمان صاف ہو چکا تھا۔

❖❖

اس کا ذہن مزید اپنی راہ پر چلتا رہا۔

وہ کوئی دیو پیکر انسان نہیں تھا۔ وہ ایک معمولی انسان تھا جو ایک بیکراں ریگستان میں جا رہا تھا اور گویا اس ریگستان کے ایک چھوٹے سے حصے کو بھی ٹھیک سے دیکھنے سے پہلے ہی اس نے اپنی رائے بنانی شروع کر دی تھی۔

لیکن وہ سفر کرے گا۔

اس کو سمجھنے میں چند دن لگ سکتے ہیں، مہینوں لگ سکتے ہیں، سال دو سال، پانچ سال، دس سال، بیس سال، تیس سال، بلکہ ساٹھ سال بھی لگ سکتے ہیں۔

اور اسے اس کو سمجھ جانا چاہیے۔

اور اپنے کو ان تمام آلوں سے مسلح کر کے اس لائق بنانا چاہیے کہ انسانی سماج کو ابد سے بیماریوں کی طرح بار بار پکڑنے والے مافیا کے خلاف ایک سائنس داں کی طرح جنگ کا آغاز کر سکے۔

وہ جتنا ہی زیادہ سمجھے گا اسی قدر زیادہ کامیابی سے اسے اپنے مہم میں کامیابی ملے گی کہ اس کی بصیرت و اعمال میں ایک خود کار رشتہ تھا۔ مجھے صراط مستقیم پر بڑھتے جانا ہے۔

لیکن صراط مستقیم ہے کیا؟ اس نے سوچا۔

کالا پانی اور ڈاکٹر والکر سے نجات۔

لیکن اس کو کرنا کیسے ہے۔

شیر علی کی طرح۔

نہیں۔

اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

یہ خیال کروڑوں اربوں ڈالر سے زیادہ قیمتی تھا۔

''اپنے تمام الفاظ اور خیالات کو واپس اپنے اندر بھیجو، اور اس پر مسلسل غور کرو اور ان کی چھان بین کرو۔ حتیٰ کہ یہ الفاظ اور خیالات لفظ اور خیال نہ رہ جائیں بلکہ تمھارے وجود کا حصہ بن جائیں۔ سادھنا اور تسبیح و وظیفہ اسی طرح تو کام کرتا ہے۔''

اس نے پھر محسوس کیا کہ وہ اپنے خیالات کے بارے میں حد سے زائد خود اعتمادی کا شکار ہو گیا تھا۔ اور ان میں قبل از وقت خطرناک حد تک کھو گیا تھا اور یہ انسانوں کے بار بار ناکام ہونے کی بڑی وجہ ہوتی ہے۔

اور الفاظ اور خیالات کے بارے میں اس کا سارا جوش ختم ہو گیا لیکن وہ اب اپنے آپ میں کچے لوہے سے اسٹیل میں تبدیل ہو گیا تھا۔

❖❖

وہ نزدیک کے ایک چٹان نما پتھر کے ٹکڑے پر جسے اس کے اجداد نے کہیں سے لا کر لان میں نصب کروایا تھا، جا کر بیٹھ گیا اور اپنی ٹھوڑی اپنی ہتھیلی میں لے کر بیٹھا رہا۔

''صحافی دماغ ان لوگوں کے فکر و خیالات پر مرکوز ہونے کو فوقیت دیتے ہیں جو ارباب حل و عقد ہیں۔ اور ان کی پالیسیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن یہ صحافی دماغ یہ دیکھنے میں کام ہو جاتے ہیں کہ یہ نمایاں ہونے والی ساری تبدیلیاں دراصل پستیوں کی بنیاد پر کھڑی ہیں اور بلندیوں سے یہ نمایاں ہونے والی ساری تبدیلیاں دراصل پستیوں میں موجود لوگوں کے دل و دماغ سے ہی جنم لیتی ہیں۔ لیکن یہ تبدیلیاں جن کی لہریں ان پستیوں سے ابھرتی ہیں میڈیا کی رپورٹوں سے باہر اس لیے رہ جاتی ہیں کہ یہ علاقہ تخلیق کاروں کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے تو یہ کہا جاتا تخلیق کار معاشرے میں تغیر اور انقلاب برپا کرتا ہے جبکہ صحافیوں کے بارے میں ایسا نہیں کہا جاتا۔ سیاست، کلچر، تعلیم، تحقیق، مارکیٹنگ اور مائنگ۔۔۔ ہر جگہ تغیرات اسی میں جنم لیتے ہیں۔ عوام حکومت نہیں کرتی لیکن وہ حاکموں کو پیدا کرتے ہیں عوام تجارتی منڈیوں کو خود نہیں چلاتے لیکن وہ ان منڈیوں کو جنم دیتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں سے اٹھی ہوئی آوازیں کبھی بھی خاموش نہیں ہوتیں، وہ پانی کی طرح مقدار اور رفتار میں بڑھوتری کرتی ہیں اور سیلاب کے پانی کی طرح جمع ہو کر بے چین لہروں کی طرح جب ایک ہو جاتی ہیں تو جوالامکھیوں کی طرح غیر منطقی طاقتوں کے ساتھ پھٹتی ہیں اور دنیا کی شکل کو تبدیل کرتی ہیں۔ جب یہ ہوتا ہے تو نئی دنیا میں وجود میں آتی ہیں جو نئی حکومتوں، نئی کمپنیوں اور نئے حاکموں کو جنم دیتی ہیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے اسے ان تمام تخلیق کاروں کو از بر پڑھنا چاہیے جنھیں وہ پہلے پڑھ چکا ہے، اسے اپنے عہد کے تمام تخلیق کاروں کو از سر نو پڑھنا چاہیے ان کو بھی جو سنجیدہ تخلیق کار ہیں اور ان کو بھی جو مقبول عام اور مشہور ہیں۔ اور ان کو بھی جنھیں بہت کم

لوگ جانتے ہیں اور ان کو بھی جو بدنام ہیں۔ ان کو بھی جنھیں اکادمیوں سرکاروں یا عوام نے بھی براہ راست یا بالواسطہ سزائیں دیں۔ اور ان کو بھی جو ڈرامہ نگار ہیں فلم ساز ہیں، شاعر ہیں یا گیت کار ہیں۔ کیونکہ ان تخلیق کاروں کا عظیم تخلیق کا سرمایہ۔ ایمانداری اور بے ایمانی اور غلط یا صحیح مشاہدوں کی شکل میں پستی کی اس دنیا کا خاموش آئینہ ہے جو حقائق و مشاہدے اور سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات صاف ہوئی کہ ادب الہامی کتابوں کی طرح آسمان سے نہیں اترتا اور سائنسی سوچ اور ایجادات کی طرح شاہراہوں پر نہیں چلتا بلکہ یہ سماج کے بہ ظاہر خاموش سمندر کے نیچے زیر زمین لاوا کی طرح ابلتا رہتا ہے اور اس حقیقی طاقت کو جمع کر کے آناً فاناً کسی ایسی شکل میں نمودار ہوتا ہے کہ پورے معاشرے کو اس کی ٹھائیں ٹھائیں' دھائیں دھائیں کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ ان زمینوں میں بھی شگاف پڑ جاتا ہے جن پر دریا بہتے ہیں۔ ان زمینوں میں ہی تغیر برپا ہونے لگتی ہے جن پر عظیم الشان عمارتیں کھڑی ہوتی ہیں۔ اور یہ سب ہوتا ہے چھوٹے چھوٹے دلوں کی دھڑکنوں کو مطمئن کرنے کے لیے یا انسانی دماغوں کے اعصاب کی ہی تعمیر نو کرنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی یہ تبدیلی بہت فعال ہونے کے باوجود بڑے بڑے مفکرین، میڈیا اور سیاسی تجزیہ کاروں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ صرف اس لیے کہ بڑھتے ہوئے پانی کی طرح ان کی اس وقت تک کوئی نیوز ویلو نہیں ہوتی جب تک وہ تاریخ کی اہم ترین خبریں نہیں بن جاتیں۔ اور کاروباری میڈیا کو ایسی بارش میں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی جس کی خبر بازار میں نہیں بکتی۔ یہ تبدیلیاں دھماکہ خیز صورت حال میں پہنچنے کے بعد شیر علی کی خبر کی طرح نمودار ہوتی ہیں۔

اسی لئے سیکڑوں لوگوں کو دی گئی پھانسی میڈیا کے لیے ایک خبر بنتی ہے لیکن ان پھانسیوں کا جو زہریلا اثر شیر علی جیسے لوگوں کی روح کے اوپر ہوتا ہے اس کی خبر اخباروں میں نہیں چھپتی نہ مخبر اپنے حاکموں کو اس سے مطلع کرتے ہیں اور سرکاریں صرف اخبار پڑھتی ہیں ادب کو نہیں پڑھتیں اسی لیے وہ سمجھ نہیں پاتیں کہ کیوں مینارے گرتے ہیں۔ کیوں مسجد مسمار ہوتی ہے۔ کیوں ملک کا بٹوارہ ہوتا ہے۔ میڈیا کی طرح سیاست بھی یک ایسی تجارت ہے جو صرف ہنگامی معاملات کے لین دین کو سمجھتی ہے۔ حتی کہ سول سروسز میں بھی زیادہ سوالات

حالاتِ حاضرہ پر ہی کئے جاتے ہیں۔ وہ امیدوار جو حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھتے ہیں انھیں سمجھتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں انھیں ان امیدواروں کے مقابلہ زیادہ ذہین سمجھا جاتا ہے جو لوگوں کی ذہنی حالت اور رکھتے خوابوں کی روشن بصیرت رکھتے ہیں اور انھیں بے عمل اور فلسفی قرار دے کر سرکاریں چلانے کے بجائے انقلاب لانے کے لیے لمبے سفر پر بھیج دیا جاتا ہے۔

خالد سہیل کو سوچ کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد محسوس ہوا کہ اس کی بے چینی ختم ہو رہی اور اس کے خیالات نئے تناظر میں منجمد ہو رہے تھے۔

اسے محسوس ہوا کہ دھماکے دھیرے دھیرے مندمل ہو رہے تھے اور مندمل ہوتے ہوتے خاموش ہو گئے اور ایک نیا منجمد منظر ابھرنے لگا۔ اب ایک ایسی تصویر ابھر رہی تھی جس میں معصومیت اور لاعلمی کی نا پختگی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ یہ پختہ دنیا تھی، صاف روشن اور لافانی طاقتوں سے بھری ہوئی جس کی اپنی غنائیت تھی جو صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس میں جنگی دھن کے اوصاف تھے۔ جو روح کو آواز دے رہی تھی کہ وہ باہر آئے اور دنیا کا سامنا کرے۔

چلمن ایک ایسی تیز ہوا کے جھونکوں سے بار بار اٹھنے لگا تھا جو چاروں طرف پاگلوں کی طرح دوڑ رہی تھی۔ وہ کبھی دور چلی جاتی اور کبھی قریب آ کر اسے ساڑی کی طرح اٹھا دیتی تھی۔ کسی مجرمانہ ذہنیت والی فاحشہ کی ٹانگوں کو اس حد تک اٹھاتی ہوئی جو اس حقیقت کو عیاں کرنے لگی تھی کہ یہاں تو کچھ اور ہی تھا جو فطری نہیں تھا لیکن پھر بھی پیدا ہو گیا تھا۔

❖❖

یہ معجزہ تھا۔ قانون نہیں تھا۔ اس نے سوچا اور اس کے پریشان دل کو اطمینان حاصل ہوا۔ اس دل کو جواب تک اتنے دکھوں سے گزرا تھا کہ انتہائی کمزور ہو گیا تھا۔ اس آدمی کی طرح جو کئی دنوں سے بخار میں جل رہا ہو۔

اس کی سمجھ میں بہت کچھ آنے لگا تھا۔ ساری سرکاریں، ساری کمپنیوں اور تجارتی منڈیوں کی پالیسیاں سارے جرم اور ساری مہذب نما جارحیت۔ ان سب کا بنیادی ڈھانچہ ایسا ہوتا ہے جو عوام کی ذہنیت سے اور جذبات سے تال میل کھائے۔ ایک تنہا انسان کا اپنا کروموزوم اپنے میں اتنا ہمہ گیر اور عظیم ہوتا ہے کہ اگر اس کو کسی بے حد طاقت ور خورد بین سے بڑا کر کے دیکھا جائے تو یہ صاف صاف دکھائی دے گا کہ کس طرح تمام حکومتوں، اداروں، تجارتوں، صاحب اقتدار لوگوں، سیاسی پارٹیوں، تحریکوں، قوانین، تجارت اور مارکٹنگ پالیسی کی بنیادیں اس پر قائم ہیں بلکہ باہر کی پوری دنیا اسی کروموزم سے نکلے ہوئے دھاگوں کے آگے بڑھ کر بنے ہوئے سطونوں پر قائم ہے۔ یہ بنیاد اور جڑ ہے بنیادی یا اور ہاؤس ہے۔ ساری طاقتوں اور تجارتوں کا۔ سرکاریں، تجارت اور جراثیم ہمارے ہی خارجی وجود ہیں جو ہمارے داخلی وجود کے باہری حصے ہیں۔

اور انسان کے اندرون سے اس کے بیرونی ذات کی چوٹیوں تک سفر میں منارۂ نور کا کام کرتا ہے 'شہری کا تصور معیار' اور چیلنج یہ ہے کہ اپنے اعمال کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھی جائے اور جب تک اپنے آپ کا مطالعہ یعنی اپنے اندرون سے بیرون تک کے پوری کائنات کا مطلع اس حد تک نہ ہو جائے کہ اس پر مکمل عبور حاصل ہو جائے کہ یہ دکھ صرف علاج سے ٹھیک ہوں گے صحت کی خواہش رکھنے سے نہیں۔ کوئی بھی باہر سے ہماری تقدیر کو نہیں بدل سکتا لیکن دنیا ہمارے مطابق بدلنے کو تیار ہے۔ اس لئے اپنی صورت حال کے لئے اپنے کسی رہنما

کو قصوروار مت گردانو۔ اگر وہ قصوروار ہے تو اسے رہنما بناتے ہی کیوں۔ ان کو رہنما بنانے کی حقیقت کی جڑ بھی تمہارے اندر ہے۔ اس کو روشن کرنا تمھارا اپنا کام ہے۔ تم باہر کے انسانوں کا قتل کر کے کبھی بھی اپنی اس بیماری سے نجات نہیں پا سکو گے تمھیں اپنا علاج خود کرنا ہے۔

شیر علی یہ ہمارے اپنے جسم کی ساخت ہے جو جسم اور چہرے پر موجود داغ کو برقرار رکھتی ہے اسے خوراک دیتی ہے۔ تم نے لارڈ میو کو بلاضرورت قتل کیا۔

خالد کی نظر پھانسی پر لٹکے ہوئے شیر علی پر چلی گئی۔

❖❖

اچانک اسے تیز بھوک محسوس ہوئی۔ اب جبکہ اس کی سوچ کا سلسلہ اختتام کو پہنچ گیا تھا بھوک نے اولیت حاصل کر لی اور اس میں زیادہ طاقت تھی۔ کیونکہ خالد سہیل کی قوت کی ضرورت اس وجہ سے بڑھ گئی تھی کہ ایک بہت بڑے ٹاسک نے اس کے دل اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

وہ لوٹا اور چلتا ہوا اپنی اسٹڈی روم کی طرف مڑ گیا۔

ٹھیک اسی لمحے جب وہ کمرے میں داخل ہونے جا رہا تھا اس کے موبائل پر ایک فون آیا۔

یہ اس کے ایک کزن کا فون تھا جو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کا طالب علم تھا۔ اس کے والد ۲۷ سال سے کلکتے میں رہتے تھے اور اسٹیل سے بنائی جانے والی عمارتوں کے ٹھیکیدار تھے۔ اپنے کاروبار کی مخصوص نوعیت کی وجہ سے انھیں ملک کے مختلف حصوں میں اپنے کام کے سلسلے میں جانا اور ٹھہرنا پڑتا تھا اور بار بار اپنے ٹھہرنے کی جگہ بدلنی پڑتی تھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن انجینئرنگ کے علاوہ ان کا سارا مطالعہ ان کے ذاتی شوق کا نتیجہ تھا کیونکہ اپنی آزاد طبیعت کی وجہ سے انھوں نے کبھی کالج وغیرہ کی تعلیم میں دلچسپی نہیں لی۔ مختلف ماحول اور آب و ہوا میں رہنے اور کھانے پینے کی لاپروا عادتوں کے باعث ان کے جگر اور اسپلن کی مختلف طرح کی بیماریوں کا شکار ہو گیے تھے۔ لیکن وہ کبھی اپنا سفر روک نہیں پائے کیونکہ انھیں اپنے بچوں کی تعلیم کا خرچ کے لیے پیسے کمانا پڑتا تھا۔ جو بہت اچھے اسکولوں اور

کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔فون پر اس وقت انکا بیٹا جو بڑی بڑی لڑکی کے بعد پیدا ہوا تھا۔ وہی خالد سے زیادہ قربت رکھتا تھا۔اس کی آواز سے ہی خالد کو محسوس ہوا کہ وہ کسی زبردست تناؤ میں ہے۔

''بھائی سلام علیکم میں جمشید بول رہا ہوں''

''سب خیریت ہے؟اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

بھائی ہم لوگ بہت پریشانی میں ہیں۔ پاپا کی طبیعت ادھر بہت خراب رہنے لگی تھی،ادھر ان کے اسپلن میں بلوکڈ ہونے کی وجہ سے پایپ لگا ہوا ہے اور ڈاکٹروں کو پابندی سے دکھانا پڑتا ہے کیونکہ پایپ بدلنا پڑتا ہے اس لیے انھوں نے سوچا تھا کہ اب باہر کا کام نہیں کریں گے،اس لیے وہ کل صبح یہاں آئے تھے اور سارا سامان باندھ کر وہ اب گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ پولیس آئی اور ان کو بلا کرلے گئی۔''

''کیوں؟''

''بھائی جان۔ایسا ہوا تھا کہ یہاں ایک کیس ہوا ہے جس میں کچھ لوگوں نے تین ملین ڈالر چرایا ہے۔وہ لوگ پکڑے گیے ہیں۔ان لوگوں نے،جن میں ایک آدمی یہیں محلے کا ہے،پاپا سے ایک دن کہا کہ ان کے یہاں باہر سے کوئی مہمان آنے والے ہیں اور ان کو کھانا کھلانا ہے اور ان کے پاس کوئی اچھی جگہ نہیں ہے وہ لوگ مزدور طبقے کے لوگ ہیں اور پاپا یہاں ڈیڑھ سال سے کام کروا رہے ہیں۔انھوں نے ان کے کھانے کا انتظام کردیا۔ان لوگوں سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔اب انھوں نے پاپا کو جیل بھیج دیا ہے''

''جیل بھیجا ہے یا پولیس کسٹڈی میں رکھا ہے''

''ٹھیک سے بتا نہیں رہے ہیں۔''

اس سے تو چپکے سے اس کے جانے کا اختیار بھی چھین لیا گیا تھا لیکن اس کو اس کا احساس اس انتہائی تیز دھار والے ہتھیار کی طرح ہو رہا تھا جس کی کاٹ کی گہرائی کا علم زخمی کو تب ہوتا ہے جب وہ اپنے زخم میں انگلی ڈال کر دیکھتا ہے۔

''بھائی جان ان کی حالت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔وہ تو اسی وجہ سے اپنا کام بند کر کے بچا کھچا کام کسی اور کو سونپ کر جا رہے تھے۔''

خالد کے مشورے پر انھوں نے سب سے پہلے ایک وکیل کیا۔پھر وکیل نے جب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ معاملہ عدالت میں جا چکا ہے اور ان کو جیل بھیجا گیا ہے۔خالد سے بات ہوئی تو وکیل نے بتایا کہ پولیس کی کہانی کے مطابق وہ دوسرے چار آدمیوں کے ساتھ موٹر سائکل سے جا رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی گرفتار ہوئے تھے اور ان لوگوں کے پاس سے ڈالر برآمد ہوئے تھے۔اور یہ مقدمہ وہاں کا ہائی پروفائل مقدمہ تھا جس کا نیوز میں بھی چرچہ تھا۔جمشید نے بتایا کہ ان لوگوں نے گھر آنے بعد اس کے پاپا نے کہا تھا کہ ان کے پاس کچھ ڈالرس ہیں جسے وہ ہندوستانی کرنسی میں تبدیل کرنا چاہتے تھے اور ان سے پوچھا تھا کہ کیا وہ اس سلسلے میں کلکتے میں کسی کو جانتے ہیں۔انھوں نے صاف انکار کردیا تھا۔

''پاپا اس میں بلکل ملوث نہیں ہیں۔وہ لوگ صرف اتنی سی مدد چاہتے تھے کہ مہمانوں کو بٹھانے کے لیے کوئی ٹھکانے کی جگہ نہیں تھی اس لیے اخلاقاً ان کی مدد کردی تھی۔''

خالد نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ ڈی۔ایس۔پی۔سے ملے۔

اگلے فون میں جمشید نے بتایا کہ اس نے ڈی۔ایس۔پی۔سے ملاقات کی تھی اور اس کے پاپا سے بھی ڈی۔ایس۔پی۔نے پہلے بات کی تھی۔اس کے پاپا نے ڈی۔ایس۔پی۔کو پوری کہانی صاف صاف بتا دی تھی۔ڈی۔ایس۔پی۔نے تعجب کرتے ہوئے ان سے کہا تھا کہ اتنے پڑھے لکھے اور بزرگ ہو کر بھی وہ ان لوگوں کی صحبت میں کیسے آگیے۔

جب جمشید ڈی۔ایس۔پی۔ سے ملا اور اپنے پاپا کے معصوم اور بے قصور ہونے پر اصرار کیا تو ڈی۔ایس۔پی۔ نے کہا کہ وہ معصوم نہیں تھے بلکہ اس کیس میں اس وقت پولیس کا مخبر بھی شامل تھا اور اس کے پاپا نے ان لوگوں کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ جمشید نے ڈی۔ایس۔پی۔ کو بتایا کہ وہ ڈنر پر ان کے ساتھ کہیں نہیں گیے تھے بلکہ انھوں نے مہمانوں کی ضیافت کے بارے میں جب بیوی کو ہدایت دی تو بیوی نے کھانے کا وقت ہونے کی وجہ سے ہلکے پھلکے چائے ناشتے کے بجائے کھانا بھی بنا دیا تھا۔ ڈی۔ایس۔پی۔ چپ تھا۔ جمشید نے اس کو بتایا کہ ان کو سڑک پر موٹر سائیکل پر نہیں پکڑا گیا تھا بلکہ گھر سے لایا گیا تھا۔ ڈی۔ایس۔پی۔ نے اس کے جواب میں کہا کہ اس کے پاپا کے موبائل میں اس سے متعلق فون نمبر ملے ہیں۔ جمشید نے ان کی صحت کے بارے میں بات کی تو ڈی۔ایس۔پی۔ نے کہا کہ وہ جیل میں ہیں اور ان کے صحت اور علاج وغیرہ کی ذمے داری جیل کے حکام کی ہے، پولس تو صرف انکوائری کرتی ہے۔

جمشید پاپا کے پاس دوائیاں پہچانے کے لیے بے حد پریشان تھا۔ خالد نے جمشید کو کہا کہ وہ جیل کے حکام سے مل کر بات کرے اور ان کو کچھ لے دے کر دوائیاں ان تک پہنچائے کیونکہ جیل کا عملہ تو اپنے ڈاکٹر کی بتائی ہوئی دوا ہی دیں گے۔ لیکن جب جمشید جیل میں بات کرنے پہنچا تو جیل کے ایک گارڈ نے اسے اتنی بری طرح ڈانٹ کر بھگایا کہ وہ سہم گیا۔ اسکول اور کالج سے IIM میں پہنچے ہوئے بچے کو اتنی فرصت ہی کب ملی تھی کہ وہ ان دنیاؤں کے دستور کو جانے، وہ تو قانون اور اقدار کی روشنی میں دنیا کو دیکھ رہا تھا۔

خالد نے اسے بتایا کہ یہ سب پیسے لینے کی ابتدائی کاروائی ہے اور جب وہ دوبارہ جائے گا تو وہی اسٹاف پیسے کی من پسند رقم ملنے پر اس کی ہر طرح کی مدد کرے گا۔ ذہنی پریشانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسی بیچ پولیس اپنی تفتیش میں کافی آگے بڑھ چکی تھی اور اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ جمشید کے پاپا کا معاملہ واقعی اتنا ہی تھا جتنا کہ وہ بتا رہے تھے اور ان کی گرتی ہوئی صحت کے مدنظر انھوں نے فوراً ان کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے عدالت میں ان کا بیان کرا کر ان کو سرکاری گواہ بنا لیا کیونکہ ملزموں نے ان سے ڈالر کی بات کی

تھی۔ قصہ بنا کہ وہ عدالت میں کہیں گے کہ وہ بیمار ہیں۔ دوا لانے گیے تھے، کوئی سواری نہ ملنے کے سبب پیدل آ رہے تھے۔ اچانک طبیعت خراب ہونے لگی تو موٹر سائیکل سے لفٹ مانگی، کچھ دور گیے تھے کہ پولیس نے سب کو پکڑ لیا اور ان لوگوں کے پاس سے ڈالر برآمد ہوئے۔

پولس نے یہ رپوٹ عدالت میں داخل کر دی اور یہ لکھ کر دے دیا کہ وہ بے قصور ہیں اور ابھی تک کی تفتیش میں ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ پولس نے ان کو چھوڑنے کی شفارش کر دی۔

ادھر ان کی طبیعت، پریشانی اور روزمرہ میں کھانے والی دواؤں کی کمی کی وجہ سے اور خراب ہونے لگی تھی اور انھوں نے بتایا تھا کہ ٹیوب بدلنے کا وقت آ گیا تھا۔ بچوں کے اندر مقدمے سے زیادہ پریشانی ان کی صحت کے خطرے کو لے کر تھی اس لیے انھوں نے ان کی خراب ہوتی حالت کو دیکھتے ہوئے انھیں عدالت سے چھوٹتے ہی فوراً انہیں لے جانے کے لیے گاڑی کا بندوبست کر لیا اور خالد سہیل کو بھی بتایا کہ پولیس نے ان کے بے قصور ہونے کا اعتراف کر لیا ہے اور آج عدالت میں ان کے بے قصور ہونے کی سفارش لگا دی ہے اور وہ آج چھوٹ جائیں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ جج نے ایک دو کاغذ اور مانگتے ہوئے پندرہ دن آگے کی تاریخ ڈال دی۔ ان باتوں کا گویا جج کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا کہ وہ مریض ہیں۔ دوسرے دن علاج کے حوالے سے درخواست دی گئی لیکن اس کو بھی اسی پندرہ دن آگے والے تاریخ میں پیشی کا حکم ہوا۔ جمشید نے وکیل سے تیسری ارجنٹ درخواست دینے کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا کہ وہ جج کو ناراض نہیں کر سکتا۔ جمشید نے جیلر سے بات کی تو اس نے کہا کہ درخواست دینے کے بعد اگر انھیں کلکتہ لے جانے کی اجازت مل گئی تو اس کے لیے پٹنہ سے I.G کی بھی اجازت چاہیے کیونکہ صوبے سے باہر لے جانا ہے اور اس حکم کے لیے چٹھی ڈاک سے جائے گی اور پھر وہاں پانچ دس دن لگیں گے اور اس کے بعد جواب آئے گا تب پولیس گارڈ میں ان کو بھیجا جائے گا۔

''اگر اس بیچ میں ان کو کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟''

جمشید نے مایوس ہو کر پریشانی میں پوچھا۔

''یہ سرکار جانے۔''

کس کس طرح جمشید کو اس کی دنیا کی سچائی سمجھائی جا رہی تھی۔

جیلر نے یہ کہا تو ضرور لیکن جب اس نے ڈاکٹر سے بات کی تو ڈاکٹر نے کہا کہ ان کی طبیعت واقعی بہت بگڑ گئی تھی۔ جیلر نے ان کو میڈیکل بورڈ کو دکھانے کی ہدایت کی۔ میڈیکل بورڈ نے بھی یہ سفارش کر دی کہ ان کی حالت نازک ہے اور ان کو فوراً کلکتہ بھیجا جائے۔ میڈیکل بورڈ کی رپورٹ کے حوالے سے جمشید نے بضد ہو کر وکیل سے ایک اور ارجینٹ درخواست کورٹ میں ڈلوائی لیکن جج نے رپورٹ دیکھنے کے بعد اجازت دینے کی بجائے کہا۔

''بہت ڈالر پیٹ میں دبا رکھا ہے اسی لیے طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

جمشید کی بہن اور ماں دونوں ساتھ تھے۔ سبھی پریشان ہو اٹھے۔ پھر جمشید نے آگے بڑھ کر جج سے کہا پاپا کی لائف خطرے میں ہے۔ بنا پائپ بدلے وہ زندہ ہی نہیں بچیں گے۔ اگر وہ مر گیے تو۔''

''شبھ شبھ بولو۔ اشبھ کیوں بول رہے ہو۔''

جج نے آرڈر لکھ کر فائل ہٹا دی۔

یہ کہتے ہوئے اس نے درخواست مسترد کر دی اور فیصلہ سنایا کہ یہ درخواست بھی

اگلی تاریخ میں ہی سنی جائے گی۔

جونڈس کی کوئی دوا ان کو نہیں دی جا رہی تھی۔ اگلی تاریخ سات دن آگے تھی۔ ڈاکٹر کہہ چکا تھا کہ اب پائپ نے کام کرنا بند کر دیا ہے اور ان کی حالت تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔

دوسرے دن جمشید کی ضد پر اور جیل میں پاپا سے ملنے کے بعد جمشید ایک بار پھر عدالت میں حاضر ہوا اور انتہائی بے چینی کے عالم میں اس نے جج سے کہا۔

''آپ میرے پاپا کو چھوڑ دیجیے نہیں تو پولیس کسٹڈی میں بھیج کر صرف پائپ بدلنے کا موقع دے دیجئے۔''

جج نے سنی ان سنی کر دی۔ وکیل بچوں کو لے کر واپس باہر آ گیا۔

چاروں طرف سے راستہ بند تھا۔ سخت پریشانی کے عالم میں رات دن وہ کبھی اداس ہوئے۔ کبھی روئے کہ کہاں سے کہاں وہ شیطان لوگ ان کے گھر آ گیے تھے۔ لیکن اب تو پولس نے ان کو معصوم قرار دے ہی دیا تھا پھر عدالت ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کہیں جج پیسہ تو نہیں چاہتا۔ انھوں نے بھی دلی کے ایک جج کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ فائلیں اپنے گھر لاتا تھا اور جن لوگوں کا مقدمہ ہوتا تھا وہی لوگ اس کے گھر بیٹھ کر ججمنٹ لکھتے تھے۔ کسی جج کے پاس اتنے اختیارات ہوتے ہیں کہ یہ بات سب کے لیے ممکن نہیں کہ اپنے کو لالچ سے روک سکیں۔ انھوں نے اپنے وکیل سے بات کی۔

وکیل نے کہا کہ یہ جج بہت سخت ہے۔

اس کے پاپا کی آنکھیں پوری طرح پیلی ہو چکی اندر دھنس گئی تھیں۔ بستر ہی پر حاجات ہونے لگی تھی۔ کوئی دوا نہیں دی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ جو دوائیاں اسے دی

جارہی تھیں وہی ان کی زندگی کو سنبھالے ہوئے تھیں۔

بچے اور بیوی رات دن تڑپنے لگے۔ روتے روتے جب ان کی بیوی کی آنکھیں سوج گئیں تو رات میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد ان کی بیوی نے بہت گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ 'پروردگار۔ تو جج کے دل میں رحم کا جذبہ ڈال کے وہ میرے شوہر کی حالت کو سمجھ سکے۔ پروردگار تو جج کے اندر یہ سمجھ پیدا کر کہ وہ میرے شوہر کو لاحق خطرے کو سمجھ سکے۔ یا پروردگار عدالت کے بعد ہم تیرے سوا اور کہاں جائیں۔ یا پروردگار تو نے ایسے انسان کو جج کیوں بنادیا اور میرے شوہر کو اس کے ہاتھ میں کیوں ڈال دیا۔ یا پروردگار اگر میرے شوہر نے زندگی میں کوئی خطا کی ہو تو انہیں معاف کردے۔ یا پروردگار میرے اور میرے بچوں پر رحم فرما۔ یا پروردگار اس موذی سے میرے شوہر کو نجات دلا۔' وہ نہ جانے رات میں کب تک وہیں دعائیں مانگتی اور روتی ہوئی جانماز پر ہی آگے سر جھکائے ہوئے سو گئی۔

اب صرف تین دن رہ گیے تھے۔ جمشید کو امید تھی کہ جو رپورٹ جج نے مانگی تھی وہ اگلی تاریخ پر پہنچ جائیگی۔ پھر بھی اس نے تصدق کے لیے تھانے میں پوچھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی۔ نے بتایا کہ سارے کاغذ عدالت میں جا چکے ہیں ڈی۔ ایس۔ پی۔ اب اس کے تئیں کا ہمدردرویہ رکھا رہا تھا۔ جمشید نے اس معاملے میں بالکل بے بسی کا اظہار کیا۔ جوڈیشری کا معاملہ تھا۔ کچہری اور تھانے میں جمشید نے اور لوگوں سے بات کی۔ کئی لوگوں نے اس کی پڑھے لکھوں والی ماڈل صورت اور طور طریقے دیکھ کر کہا کہ " یہ ایک دور دراز علاقہ ہے۔ یہاں یہی ہوتا ہے۔"

کسی نے اسی بیچ بتایا کہ جج کا پی۔ اے۔ ۲۵ ہزار روپے مانگ رہا ہے۔

جمشید رد و قدح کرنے کے بعد دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن کوئی معتبر ذریعہ دکھائی نہیں دیا۔ پیسوں کے مارے جانے کا خطرہ تھا۔ وہ یہی سوچتے ہوئے پیسوں کا انتظام بھی کررہا تھا۔ حالانکہ اس دور دراز جگہ پر وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ بہت عجلت میں چلا آیا

تھا اور کام کا بل نہیں ادا ہونے کے سبب اس کے پاپا کے پاس بھی ابھی زیادہ پیسے نہیں تھے۔

اسی دن جب وہ جیل کے اسپتال میں پاپا سے ملنے گیا تو دیکھا کہ ان کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ آنکھیں مردہ سی ہو گئیں تھیں اور پیٹ پھول گیا تھا۔ پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ لکھ کر تو نہیں دے سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ ۴۸ گھنٹے کے مہمان ہیں۔ اور وہ یہ بات آج ہی جا کر جج کو زبانی بتا آیا ہے۔ جمشید فوراً وہاں سے آ کر عدالت آیا اور فوراً کورٹ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ جج نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس نے فوراً کہا۔

"سر، میرے پاپا مرنے والے ہیں۔ ابھی بھی آپ اجازت دے دیں تو ان کا علاج ہو جائے گا۔"

اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ سے لکھی ہوئی درخواست جج کے سامنے رکھدی۔ جج نے اس کی درخواست منشی کی طرف بڑھادی

"Put up on the next date"

انگریزی میں جج کی آواز نے جمشید کے ذہن میں انگریزوں کے دور اور بدلے کی یاد تازہ کردی۔

بھائی جان میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ پرسوں تک شاید وہ بچیں نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں ان کو اسپتال سے ہی اٹھا لے جاؤں اور باہر کار میں رکھ کر چلا جاؤں پاپا تو بدل جائے پھر دیکھا جائے گا۔

" No. Do not try this. They kill you like. "

"God will help you and do whatever you can do. Do everything. Do anything that can give result. Go to the judge again, in the court or at residence, whenever he is. You get the number of the senior judge and talk to him."

خالد یہ سب کچھ انگریزی میں ہی بولتا چلا گیا۔

لیجئے، پاپا سے بات کیجئے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

کیسے ہیں۔

"I am not OK. Can you hear me."

ان کی آواز میں بے حد نقاہت تھی۔

"No. I am not OK."

"Why do you feel like this. Have courage."

. "Death is staring in my eyes.

My death has beome certain."

"I will try my best. "

"No try. Can you save me ????"

سوال اتنا بھاری تھا کہ خالد اس کے نیچے ایسے دب کر رہ گیا جیسے کوئی بھاری ٹرک اسے کچل کر آگے بڑھ گئی ہو۔

دوسرے دن جمشید پہلے تو جج کے پاس گیا اور رونے اور چلانے لگا۔ وہ بار بار جج سے اپنے باپ کی جان بچانے کی التجا کر رہا تھا۔ جج خاموش رہا۔ وہاں کچھ اور بھی لوگ تھے جو اس کی فریاد سن کر اداس ہو گیے تھے۔ باہر آنے کے بعد انھوں نے کہا' عدالت ایک ایسی ہستی ہے کہ اس کے سامنے کسی کا چارہ نہیں چلتا۔ اور کوئی اس کی تنقید نہیں کر سکتا۔ کوئی اس کو حکم نہیں دے سکتا۔ کوئی ان کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتا۔

"پھر ہم نے ایسی عدالتیں کیوں پال رکھی ہیں۔" جمشید نے مجبور چہرے کے ساتھ لگ بھگ روتے ہوئے کہا اور جھٹکے سے اپنا منہ پھیر لیا۔

پھر اس نے جج کے پی۔اے۔ کے پاس جا کر بالاتر ججوں کے نمبر مانگے۔ پی۔اے۔ نے فون نمبر دے دیے۔ لیکن نمبر دیتے ہوئے اس نے کہا کہ۔

"جج صاحب ایک لاکھ روپیہ مانگ رہے ہیں"

"ہم دے دیں گے"

پہلے لے کر آؤ پھر بات کرو۔

"ان کو ابھی صرف کسٹڈی میں علاج کے لیے بھیج دیں۔ ابھی ہم پیسوں کا انتظام کہاں سے کر پائیں گے"

اگر ان کی جان بچانا چاہتے ہو تو کوشش کرو۔ اور ان کے اوپر کے ججوں سے تم کچھ کہو گے تو کوئی تمھاری بات کو قبول نہیں کرے گا اور پھر تمہیں اس سے بھی زیادہ دینا پڑے گا۔

جمشید خاموش رہا۔ ایک وقفے کے بعد پی۔ اے۔ نے کہا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے کہ واقعی یہ پیسہ جج صاحب کے پاس جائے گا۔ تمہیں میرے اوپر شک ہے۔ تم پیسے کا انتظام کر کے لاؤ تمہارا کام ہو جائے گا۔ لیکن تمھیں لانا پڑے گا۔"

آپ ہی سوچیے اس اجنبی جگہ پر ہم پیسوں کا انتظام کہاں سے کریں گے"

یہاں صبح تک کوئی آدمی کلکتے سے پیسے لے کر یہاں پہنچ سکتا ہے۔ اگر تم یہاں انتظام نہیں کر پا رہے ہو تو وہاں سے منگاؤ۔ کوشش کرو۔"

یہ کہتے ہوئے پی۔ اے۔ کھڑا ہو گیا۔

شام دیر گیے جمشید نے سینیر جج سے بات کی لیکن اس کا ردعمل بہت ہی سخت تھا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"اگر آپ نہیں کریں گے تو کون کرے گا"

میں صرف تبھی اس معاملے کو دیکھ سکتا ہوں جب یہ میرے پاس آئے گا لیکن اگر میرے پاپا کی جان چلی گئی تو کیا ہوگا؟"

بھگوان پر بھروسہ رکھو۔

اسی درمیان جمشید کی ماں اور بہن نے فوری طور پر اپنے زیورات بیچ کر اور کچھ ادھار لے کر ۳۵ ہزار کا انتظام کر لیا تھا۔ جمشید نے وہ روپے لیے اور سیدھے پیش کار کے گھر

پہنچا۔ پیش کار جمشید کو لے کر جج کے گھر اس انداز میں چلا جیسے وہ قطعی پیسوں کی ذمے داری اپنے سر لینا نہیں چاہتا تھا پیسے اس نے اپنے پیچھے اپنے گھر میں ہی چھوڑ دیے۔

یہ جج کا گھر تھا۔ پیش کار اندر گیا اور پھر باہر آیا اور جمشید کو لے کر اندر گیا۔ جج وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

"سر"

پیش کار نے جج سے کہا۔

"پورے ایک لاکھ روپے کا انتظام نہیں کر پائے ہیں کیونکہ یہ باہر کے رہنے والے ہیں۔"

یہ الفاظ جمشید کے کان میں اس طرح داخل ہو رہے تھے جیسے وہ الہامی آیات ہوں جن کو سننے کی اس نے کبھی توقع بھی نہیں کی ہو

اس لیے میں نے ان سے ۳۵ ہزار لے لیے ہیں اور باقی یہ چند ہی روز میں دے دیں گے۔

جج نے جمشید کو دیکھتے ہوئے پی۔ اے۔ سے پوچھا۔ تمہیں یقین ہے کہ یہ دے دیں گے۔

"یہ دے دیں گے سر۔ مجھے یقین ہے۔"

"ٹھیک ہے"

اس کے بعد جج نے جمشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شام کے وقت تم بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ تم نے بالاتر جج کا نمبر مانگا تھا ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ سب دنیاداری کی باتیں ہوتی ہیں۔

اس کی آنکھوں میں جج کی تصویر ایسے جم گئی جیسے مرنے والے کی آنکھوں میں قاتل کی تصویر بس جاتی ہے۔

❖ ❖

دوسرے دن خالد سہیل سے جمشید کی بات نہیں ہو پائی۔ خالد سہیل اپنے مطالعے میں بیٹھا تقریباً آدھی رات گیے کچھ پڑھ رہا تھا کہ جمشید کا فون آیا

''ہم لوگ کار سے کلکتہ جا رہے ہیں۔ اور سات گھنٹہ میں پہنچ جائیں گے۔ راستے میں ان کی ضمانت ہوگی۔ صبح تک اسپتال پہنچ جائیں گے۔ وہ بالکل مرنے کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں لیکن ہم لوگ کہہ نہیں سکتے کہ زندہ ہیں یا مردہ نبض کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔''

''بدن میں کچھ حرکت ہے یا نہیں؟''

بدن میں کبھی کبھی کچھ حرکت محسوس ہو رہی ہے، But I am not sure. It may be due to the movement of the car.

اچانک فون نیٹ ورک پرابلم کی وجہ سے کٹ گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ کار سفر میں تھی۔ اس کے ذہن میں ایک کمزوری آواز اٹھی جو دیر تک گنبد کی طرح گونجتی رہی۔

Can you save me.

پھر خالد سہیل کا ذہن جج کی طرف مڑ گیا اور اس کے ذہن میں ایک ہیولہ سا ابھرنے لگا۔ مافیا برگد کے کسی عظیم درخت کی طرح بڑا ہو چکا ہے اور اس کے نیٹ ورک میں جو لوگ اس کو غذا پہنچا رہے ہیں وہ لوگ صرف مزدور نہیں ہیں وہ خود بھی اپنے اختیارات کا استعمال من مانی طور پر کر رہے ہیں۔ پوری انسانی زندگی اس کے پنجوں کے دائرہ کار میں آ چکی ہے۔ ہر جگہ زندگی کو خطرہ ہے مافیا صرف اوپری دائرے میں نہیں اس کے ڈاکٹر وا کر ہر جگہ

پیدا ہو چکے ہیں۔ لیکن کسی بات نے اس کی سوچ کو پر روک لگا دی۔

اس نے اپنے ماموں کو بچپن سے دیکھا تھا۔ انتہائی مہذب انسان تھے۔ اس نے فون دوبارہ ملانے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں ملا۔ اسے ایک شدید مجبوری کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کو نڈھال سا محسوس کرنے لگا لیکن پیچھے اس کا ذہن کسی اور سطح پر اپنا کام کرتا رہا۔

''ڈاکٹر واکر صرف ایک وفادار نوکر تھا۔ لیکن، وہاں، وہاں دوسرے ایسے افراد بھی ضرور تھے جنھوں نے سنہری کا قتل کر دیا۔'' اور یہ سچ۔

کیا شیر علی صحیح تھا؟

شیر علی نے جو کیا ٹھیک ہی ہوگا۔

اس نے اپنی رائے میں صحیح قدم ہی اٹھا ہوگا۔ یہ ایک فیصلہ تھا۔ ممکن ہے اس کا اٹھایا ہوا قدم درست نہیں ہو لیکن اس حد تک ضرور درست تھا کہ اس نے یہ قدم اپنی ذاتی رائے کے تحت اٹھایا تھا۔ اسی لیے شیر علی اہم اور قابل غور ہے۔ اسی لیے شیر علی لگاتار میرا ذہن کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس وقت سے جب سے میں انڈمان گیا تھا۔ اس بات کو بھولا نہیں جا سکتا کہ اس نے ان حالات میں کوئی قدم نہیں اٹھایا جہاں اس نے قدم اٹھانا مناسب سمجھا جیسے اس کا طرزِ عمل جیل کے قوانین کے عین مطابق تھا اور قید کے دوران مکمل طور پر ایسا ہی رہا۔ تو اس نے قدم تو تبھی اٹھایا ہوگا جب اسے محسوس ہوا ہوگا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ درست ہے۔

شیر علی کا خیال خالد کے ذہن میں اعلیٰ ترین انسانیت کے اقدار کے چشمے چھوڑ رہا تھا خالد کے ذہن میں رات کے اندھیرے میں جاگتی ہوئی کار میں اس کے ماموں کی شبیہ اسے اس طرح ہلا رہی تھی جیسے کوئی طوفان سمندری طوفان کی تباہیوں کے ساتھ گزر رہا ہو۔

انھیں دوبارہ فون پر بات کرنے کا اس کا جی نہیں چاہا۔ بری خبر ملنے میں جتنی دیر ہو بہتر ہے۔ ہر لمحہ یہ تشویش اس کے دل پر بھاری پتھر کی طرح گھومتا رہا۔

اس کا دل اب اُوب گیا۔ اب سوچنے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت ہے۔ اب وہ پوری قوت سے لڑنا چاہتا تھا۔

❖❖

اسے جنگل کا خیال آیا۔

وہاں سے وہ ایک فیصلہ کن جنگ' دنیا کے عوام کو اپنے ساتھ لے کر لڑے گا۔ جنگ کی طرف یہ اس کا پہلا اعلانیہ قدم تھا۔ اس نے کسی اور سے نہیں لیکن اپنے آپ سے کھلا اعلان کیا تھا اور جنگ کا بگل بجا بیٹھا۔ اس کے سامنے اب اس جنگ کو جیتے بغیر واپسی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ اس جنگ میں مرجانا چاہتا تھا کیونکہ اس کے اندر کا دباؤ اس پر شکنجہ کس چکا تھا۔ اسے پختہ یقین ہوگیا کہ وہ یہ جنگ جیتے گا۔ اس کی سوچ بالکل واضح اور مکمل طور پر کارگر تھی۔ وہ دشمن قوتوں کی ساخت پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ مزید آگے طبل جنگ بجانے سے پہلے کچھ اور تیاریاں کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے اس خلوت کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے مزید سوچنا ضروری تھا اور یہ لوگوں کے فون اور اس پاس میں لوگوں کی موجودگی اس کے ذہن کو باندھے ہوئی تھی۔

اس کے کھیتوں کے پار ندی سے کچھ قریب ہی اس کا وہ خاندانی مچان تھا جو ویران پڑا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس وہ جب بھی جایا کرتا اسے یک گونہ سکون کا احساس ہوتا تھا۔ وہاں اتنی خاموشی اور وسعت تھی کہ وہ مراقبے کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتر سکتا تھا۔ اب اسے اپنے اس کمرے میں بے چینی سی ہونے لگی۔

وہ رختِ سفر باندھ کر یہاں سے نکل پڑنے کے لئے تیار ہوگیا۔

اس نے اپنی ماں سے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو وہ گھبرا گئی۔ اس کی گرتی ہوئی صحت اور کھانے پینے کی طرف سے لاپرواہی سے وہ پہلے ہی بے حد پریشان تھی۔ خالد نے

بہت مشکل سے ہی صحیح لیکن بہت پیار سے ان کو سمجھا لیا کہ جنگل کی ہوا میں درحقیقت اس کی صحت بہتر ہو جائے گی۔ وہ ایسا محسوس بھی کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی گرتی ہوئی صحت کی اصل وجہ وہ بیماری ہے جو اس کے دل و دماغ کو لگی ہوئی تھی اور اس کا علاج وہ سب کچھ حاصل کرنے میں ہی تھا جس کے لئے وہ پیدا ہوا تھا۔ باپ کو معلوم ہوا تو وہ خاموش رہے۔ وہ خالد کو جانتے تھے۔

وہ اپنے کپڑے وغیرہ لے کر اس مچان میں چلا آیا۔ اس سے پہلے اس نے جو نظم کمرے سے باہر آ کر پڑھی تھی اس کے پڑھنے کے لہجے نے سب کو تعجب میں ڈال دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مکمل طور پر دیوانہ ہوگیا ہو۔ لوگ اس کو بستر وغیرہ کے ساتھ جاتے ہوئے حیرت سے دیکھتے رہے۔

یہاں وہ اس تالاب کے کنارے اکثر آ کر بیٹھ جاتا تھا اور رات دیر گئے تک بیٹھا رہتا تھا۔ جو لوگ یہاں تالاب سے سینچائی کے لئے پانی نکالنے آتے تھے ان سے اکثر بہت سی باتیں بھی کرتا تھا اور ان سے گھلا ملا رہتا تھا۔

پرانے زمانے میں اس مچان کا استعمال آرام کرنے کیلئے رقص کی محفل آراستہ کرنے کیلئے اور شکار کے دوران ٹھہرنے کے لئے ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ ویران پڑا تھا کیونکہ پرانی باتیں ختم ہو چکیں۔

رات میں وہ جانوروں کی اجنبی آوازوں کو بہت دھیان سے سنا کرتا تھا جیسے اس سے اس کو سوچنے میں مدد ملتی ہو۔

رات میں کچھ پرندے بھی ادھر ادھر درختوں پر کبھی کبھی بلاوجہ پھڑپھڑاتے۔ یا محض کسی چیز کی حرکت سے خوفزدہ ہو کر۔

وہ واپس اپنے کمرے میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ ٹھیک اسی لمحے اس کے موبائل پر ایک خاتون کا فون آیا جس سے پہلے بھی اس سے گفتگو ہو چکی تھی۔ اس عورت کو کوئی پریشان کر رہا تھا۔ اس عورت نے بھی اپنے خاندان کو معاشی دشواریوں سے نجات دلانے کے لیے اس وقت ایک ملٹی نیشنل بینک سے اپنا بوتیک چلانے کے لیے لون لینے کی رضامندی اسے دی تھی جب ایک میٹھی آوازوں والے آدمی نے اسے فون کر کے بہت آسان شرطوں پر بینک سے لون دیے جانے کے بارے میں بتایا تھا۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے لون لینے کے بعد اسے کاروبار میں اور بھی نقصان ہوا اور وہ قسطیں ادا نہیں کر پائی۔ تب اس کے پاس بینک سے یاد دہانی کے فون آنے لگے۔ دو تین کال کے بعد فون کرنے والے کا لہجہ تبدیل ہونے لگا۔ اس نے عورت کو جا کر ملنے اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کہا اس کے لیے اس نے اس بینک کے کینٹین میں بلایا۔ کافی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے وہ آدمی بغیر کچھ کہے ہوئے صرف اسے گھورتا رہا۔ وہ جوان اور خوبصورت تھی صرف 27 برس کی دلکش اور پتلی دبلی۔ اس آدمی نے اسے بینک کے لئے کام کرنے کا مشورہ دیا۔

''دیکھو اگر تم نے اب بینک کی قسطیں دینے میں مزید تاخیر کی تو بینک تمہارے خلاف چیٹنگ کا مقدمہ دائر کر دے گا۔''

''لیکن میں نے کوئی چیٹنگ نہیں کی ہے۔ میں صرف بزنس میں ناکام ہوئی ہوں۔''

''بینک تمہاری اس صفائی کو قبول نہیں کرے گا۔ وہ کہیں کہ تم نے لون واپس نہ کرنے کی نیت سے ہی لون لیا تھا۔ وہ کہیں گے کہ یہ تم نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ یہ تمہاری

سازش تھی۔ لون واپس کرنے کا کبھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم ان بینکوں کو نہیں جانتی ہو۔ یہ Bankers ہیں۔ بے رحم سود خور۔ یہاں کوئی انسانی جذبہ نہیں ہوتا اور عدالت ان کو خاص اہمیت دیتی ہیں اور ان کی مدد کرتی ہیں۔ تم کو جیل جانا پڑ جائے گا۔ تمہاری جائیدادیں ضبط ہو جائیں گی اور بینک انہیں بیچ کر اپنا پیسہ نکالے گا۔''

عورت کو یاد آیا کہ اس کا شوہر اس لون کو لینے کے خلاف تھا اور اس نے اپنے شوہر کے مشورے کے خلاف صرف اس خود اعتمادی کی بنیاد پر لون لیا تھا کہ وہ اسے اپنے خاندان کی معاشی صورت حال کو پلٹ دے گی۔ اس نے سامنے بیٹھے ہوئے اس آدمی کو دیکھا جس کی آنکھوں میں تیز کلباڑی تھی۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ درحقیقت چاہتا کیا تھا تب اس آدمی نے کہا—

''ہم لوگ تمہیں کچھ اہم گراہکوں کے پاس بھیجیں گے۔ بڑے بڑے تاجر لیکن معذرت اور خوش سلیقہ ہم ان کو پہلے فون کر دیں گے۔ جیسے ہم نے تمہیں فون کیا تھا اور انہیں بتا دیں گے کہ ہم تمہیں بینک کی شرطوں اور فوائد کو واضح کرنے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ تم اس کے بعد ہی جاؤ گی اور ان سے ملنے کے بعد تم ان کو کسی اچھے ہوٹل میں لنچ یا ڈنر پر مدعو کرو گی۔ ہوٹل کے خرچے کا انتظام بینک کی طرف سے ہوگا۔ ہم لوگ تمہیں ایک خصوصی Cerdit Card دیں گے جس سے تم اس طرح کے اخراجات کی ادائیگی کرو گی۔ ان تاجروں کے علاوہ بھی اگر تم کبھی کسی کو تعلقات بڑھانے کے لیے ہوٹل وغیرہ میں کھلانے پلانے پر کچھ خرچ کرو گی تو ایک خاص حد تک تمہیں اپنے فیصلے کے مطابق خرچ کرنے کا اختیار ہوگا۔ ہم لوگ ہوٹل میں کمرہ بھی بک کرا دیں گے۔

''اس آدمی نے بہت عجیب نظروں سے عورت کو دیکھا جیسے وہ اپنے دباؤ کا بھرپور استعمال کر رہا ہو اور ایسی بات کرنے میں اسے کسی تکلف کی ضرورت نہ ہو۔ تم جب ہوٹل کے کاؤنٹر پر جا کر ہمارا دیا ہوا Booking slip انہیں دو گی تو وہ خود ہی تمہیں کمرے

تک پہنچا دیں گے۔ کھانے پینے کی ساری چیزیں جو تم آرڈر کرو گی وہاں ملیں گی۔ وہاں تم مکمل یکسوئی اور بغیر کسی مداخلت کے اپنے Client سے بات کر سکو گی۔ بس صرف اپنے ہاتھوں سے کھانے اور Drinks انہیں Serve کرتی جاؤ بالکل جیسے اپنے گھر میں کرتی ہو اور اس دوران جب ماحول بہت سازگار ہو چکا ہو تم ان کو اسکیم کے فوائد کے بارے میں بتاؤ لیکن کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے قطعی اصرار نہ کرو۔ صرف قریب ہوتی جاؤ، بیڈ پر لے جاؤ، ساتھ میں سو جاؤ اور پھر ڈیل سائن کرا لو۔ اس سے قبل کہ......''

وہ آدمی بالکل برچھی جیسی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

''یہ ہمارا تجربہ ہے، سو میں نوے معاملات میں کامیابی یقینی ہوتی ہے اور اگر کامیابی نہیں بھی ملتی تو بھی وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں اور اس سے تم اپنے لون کی ادائیگی کر سکتی ہو۔

Do not think and----be practical, we will maintain absolute secrecy."

ذہنی طور پر بے حد منتشر ہونے کے بعد وہ وہاں سے چپ چاپ لوٹ آئی تھی۔
اس آدمی نے اسے اس وقت اور کچھ نہیں کہا لیکن دوسرے دن پھر اس کا فون آیا۔ پہلے تو وہ بہت لگاوٹ کے لہجے میں نرمی سے بات کرتا رہا لیکن بعد میں اس کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔ اور پھر وہ اسے بہت گندی گندی گالیاں دینے لگا اور گالیوں کے دوران ہی اس نے کہا۔۔۔

''اپنے فون کو سوئچ آف رکھنے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم فون کو سوئچ آف کرو گی تو یہ معاملہ وصولی کرنے والا دستہ کے حوالے کر دیا جائے گا وہ تمہارے گھر پر پولس کے

ساتھ جائیں گے اور تمہیں ساتھ میں لے کر آئیں گے۔

اس عورت نے ایک فنکشن میں یہ معلوم ہونے کے بعد کہ خالد صاحب صحافی ہے اس سے تخلیہ میں یہ بات بتائی تھی اور روتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ وہ لوگ اسے کئی لوگوں کے پاس سونے پر مجبور کر چکے ہیں لیکن ابھی بھی لون باقی ہے اور ان لوگوں میں غالباً کوئی بھی لون کی خواہش رکھنے والا تاجر نہیں تھا۔ دراصل اسے خاموشی سے پوری طرح ایک پیشہ ور کال گرل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی یہ کہانی اس کی پہچان کو خفیہ رکھتے ہوئے اخبار میں چھاپ دیا جائے کہ اس سے کم از کم دوسرے لوگوں کو روشنی ملے گی۔
خالد نے یہ کہانی تیار کی تھی لیکن ایڈیٹر نے اسے چھاپنے سے صاف صاف منع کرتے ہوئے اسٹوری اسے واپس کر دی تھی۔

''کیا تمہیں اس کا اندازہ ہے کہ اس میں کتنا بڑا خطرہ ہے۔''

ایڈیٹر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور اسے خاموش لاجواب دیکھ کر حقارت سے قہقہہ لگایا تھا۔

اب جب اس کا فون آیا تھا وہ اس سے کچھ بھی نہیں کہہ پا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اس کا ذہن اس وقت پوری طرح مشغول تھا۔ اس نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ ''کیا ہم بعد میں بات کر لیں؟ عورت نے حامی بھر لی۔ اس نے پھر عورت سے کہا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی آپ کا نام نہیں پوچھا لیکن کیا میں آپ کا اصل نام جان سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں۔ میرا نام سنہری ہے۔''

خالد کو صرف اتنا سا خیال آیا 'کتنی بار تم نے سوچا تھا کہ اگر تم اس زمانے میں

ہوتے تو یہ کرتیں وہ کرتیں نہ جانے کیا کرتے۔ اب تو تم موجود ہو۔

'کیوں، کیا ہوا؟

خالد کی طرف سے مکمل سناٹا ہو گیا۔

یہ تو وہی جانتا تھا کہ کیا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں سنہری کروڑوں سنہریوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ یہ سنہریں ہر جگہ تھیں۔ ہندوستان میں، جاپان میں، پورے ایشیا میں، پورے یورپ میں بلکہ امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کی عظیم ترین عمارتوں تک میں بیشمار گوری گوری سنہریاں بھری پڑی تھیں۔ انسان کی مظلومیت کا درد پوری دنیا میں نائٹروجن کی طرح بھرا ہوا تھا۔

ادھر سے پھر ایک آواز آئی۔ 'میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں compromise کروں گی۔

تو تم نے مجھے فون کیوں کیا؟

یہی بتانے کیلئے کہ جب میں نے compromise کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو Why not you. After all you are my friend. May be you can save me from this constant exploitation..'

اپنی زندگی میں اتنی بڑی گالی اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ خالد نے محسوس کیا۔ لیکن اب وہ چپ چاپ سب کچھ جھیلنے کیلئے تیار ہو چکا تھا۔

مزید کوئی آواز نہ آنے پر عورت نے فون بند کر دیا۔

خالد سہیل کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی یاد آ گئی اور اب جیسے خالد کے پاس اس عورت کے بارے میں سوچنے کے لئے کچھ بچا ہی نہیں تھا کیونکہ یہ کہانی بھی کالا پانی کے سمندر میں گم ہو گئی لیکن خالد کا ذہن پیچھے مسلسل چلتا ہی رہتا تھا۔

اس کی سوچ کا سلسلہ جاری تھا۔

'ایک عام آدمی کی یہ صورتحال ہے کہ اگر اسے ترقی کرنی ہے تو اسے جونک کے پاس جانا ہی ہے۔ ساری کائنات اور دنیا کے راستے انتہائی چالاکی سے اس طرح بند کر دئے گئے ہیں جیسے شیر کو شکار کے لئے ہانکا جاتا ہے۔' یہ سوچتے ہوئے وہ آگے سوچنے لگا۔

جمہوریت کے سورما ایسے واقعات سے اسی طرح نظر بچاتے ہیں جیسے برطانوی پارلیامنٹ میں ڈاکٹر واکر کے فیصلوں کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ یہ جینک والے تو غیر تھے' یہ بھی قطعی ممکن تھا کہ ایک شخص جو کسی عورت کے ساتھ سوتا ہے، جس سے وہ عورت پورے جذبات کے ساتھ بھرپور محبت کرتی ہے اسے وہی شوہر اور اس کے اہل کنبہ پیسے کے لیے جلائیں بھی اور وہ یہ سوچ کر اور سناٹے میں رہ گیا کہ ڈاکٹر واکر کی تو شاید یہ ڈیوٹی تھی۔

''لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اگر آج کے سماج کے اوپری طبقے کے لیے کالا پانی کے واقعات کی کوئی اہمیت نہیں اور ان دانشوروں کے لیے کالا پانی کے ان واقعات کو فراموش کر دینا فطری بات ہے۔''

خالد نے سوچا کالا پانی صرف آگے کے زمانوں میں بڑھتا ہوا اور زیادہ پھیل گیا ہے۔

''تجارتی اور تمدنی دکھاوے کے اس دور میں ہمارے چاروں طرف سماج میں معصوم، خوبصورت جوان ایسی دلہنوں کو جن کے دلوں میں پھولوں کی طرح محبتوں اور شوہر کی

رفاقتوں کے خواب بسے ہوتے ہیں اور جو اپنی سسرال اور سسرال کے چھوٹوں بڑوں کو اپنی خوش دلی اور خدمات کی خوشبو کے جھونکوں سے معطر کر دینا چاہتی ہیں۔ وہ گھر جو ان کے لیے فردوس بریں کا نقشہ ہوتا ہے وہاں اچانک انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ یہاں دے سکتی تھی اس کی کوئی قیمت نہیں کوئی اہمیت نہیں اور اس کے سارے خواب ایک ایسی سازش کو محسوس کر کے پارہ پارہ ہو جاتے ہیں جو بالآخر پیسہ نوچنے کھسوٹنے کا ایک وحشت ناک ہتھیار بن کر ابھرتا ہے۔ لالچ محبت پر غالب، پیسہ انسانوں پر غالب، یہ سب دیکھ کر ان کا خواب ٹوٹ جاتا ہے اور منافع بخش ذریعہ بننے پر لڑکیوں کا دیوتا ڈاکٹر والکر منظر نامے میں گھس آتا ہے اور وہی فیصلہ کرتا ہے کہ اس دلہن کو زندہ رہنا چاہیے یا مرنا چاہیے۔

اور یہاں کوئی Trail نہیں ہوتا۔

سماج کے فلسفی اسے معاشی ترقیات کی ایک پہچان سمجھتے ہیں۔

خالد سہیل کو اب محسوس ہوا کہ اسے صرف نظر انداز ہی نہیں کیا جاتا بلکہ کہیں نہ کہیں ڈاکٹر والکر کے فیصلوں کی طرح جمہوریت کے غازی اسی طرح اس سے آنکھ بچاتے ہیں جیسے برطانوی پارلیامنٹ میں ڈاکٹر والکر کے فیصلوں کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

ہزاروں کی تعداد میں جلی ہوئی عورتوں کی راکھ نے پورے معاشرے کو دھوئیں کے داغ سے بدرنگ کر دیا اور پورا معاشرہ عورتوں کی چیخ سے بھر گیا ہے۔

کالا پانی میں تو اس شیر علی کا بھی ٹرائل ہوا تھا جس نے وائسرائے کو مارا تھا۔

لیکن یہاں کس طرح معصوم عورتوں اور لڑکیوں کا شکار کر کے انہیں جسم فروشی کے پیشے میں ڈالا جاتا ہے اور آخر کار ان کے وجود سے سرسوں کے تیل نکالنے کے عمل تیل کی طرح ہر اہم چیز چھیننے کے بعد انہیں پھینک دیا جاتا ہے۔ پورا معاشرہ انہیں استعمال بھی کرتا

ہے اور ان سے نفرت بھی کرتا ہے۔ ان عورتوں کو کہیں بھی لے جایا جاتا ہے۔ طاقتوروں اور عام انسانوں دونوں کے ذریعے استعمال کیا جاتا ہے اور بلیک میل ہونے کا ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرنے پر انہیں جڑ سے ختم کر دیا جاتا ہے۔ جنس کے لیے استعمال کرنا اور موت کے ذریعہ ختم کرنا، جہیز کے لیے جلائے جانے کا عمل یہ سب ایک ایسے جنسی عمل کی طرف اشارہ کر رہی تھیں جہاں انسان بھیڑ بکریوں سے زیادہ کچھ نہیں۔

ان دہشت زدہ لڑکیوں اور عورتوں سے پوچھو جن کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی ہے۔ اپنی طرف سے کچھ مان کر مت چلو۔ ان سے پوچھو کہ ان لڑکیوں کے دلوں میں کیا پلتا ہے جنہیں ایک دن دلہن بننا ہے۔ میں ابھی تک احمقوں کی دنیا میں تھا میں جہیز کے لیے قتل کے بارے میں جانتا تھا لیکن میں نے آج جانا ہے کہ عورتوں کا دل انہیں دنوں سے جہنم میں تبدیل ہونے لگتا ہے جب وہ اپنی شادیوں کے بارے میں سوچتی ہیں۔ اور ہونے والے والدین کیوں لڑکا یا لڑکی بتانے والے کلنک کی طرف بھاگتے ہیں۔ عورت پیدا نہیں ہوگی۔ ہاں آج کے حقائق کے درمیان عورت کو پیدا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ وہ پیدائش کے بعد کیا مریں گی وہ حمل سے پہلے ہی مر چکی ہیں۔

تو عورت اپنی آزادی سے ڈرتی ہے۔ ان رسم و رواج سے باہر آنے سے ڈرتی ہے جو اس کے پورے اوقات کے اوپر مذہبی اور سماجی ذمے داریوں کی ڈوریوں سے بنے ہوئے جال کی طرح بچھے ہوئے ہیں۔ سنہری' آج بھی سنہری'

سنہری'

سنہری'

سنہری' سنہری' سنہری ہو کر رہ گئی ہے۔

اوراس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون اپنا ہے؟ دیسی یا بدیسی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مغربی تہذیب اچھی ہے یا مشرقی یا تہذیب کہیں بھی نہیں ہے اور انسان آج بھی اندر سے جنگلی ہے۔

نہیں خالد ایسا مت کہو۔ یہ تو تم وہ بات کر رہے ہو جو بھی بغیر سوچے سمجھے کہتے آئے ہیں اور یہ جھوٹے عقائد کے ساتھ جینے والی بات ہے۔ کالا پانی کے جنگلی کیا گوپی سے یا انگریزوں سے بدتر تھے۔ وہ ڈاکٹر والکر سے بہتر تھے کہ انہوں نے کم از کم ایک فراری قیدی کو رحم کی بنیاد پر زندہ چھوڑ دیا تھا۔ جن لوگوں نے سنہری کو آج بھی سنہری بنا کر رکھا ہے ان کے اندر ڈاکٹر والکر جیسا ہی کچھ تھا۔ ڈاکٹر والکر اتنا بدیشی نہیں تھا جتنا ہمیں محسوس ہوتا ہے۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اگر آج کے ہندوستانی سماج کے اوپری طبقے کے لئے کالا پانی کے واقعات کی کوئی اہمیت نہیں اور آج کے ان دانشوروں کے لیے کالا پانی کے ان واقعات کو فراموش کر دینا فطری بات ہے۔ کیونکہ عالموں کے سیمناروں میں اس نے درد کے موضوع پر کبھی کوئی گفتگو نہیں سنی۔ اور بہت سے خشک دل ادیبوں کا تیور بھی عالموں جیسا ہوتا ہے۔

یہ منظر تو کالا پانی کے خوفناک ملیریا سے بھی زیادہ وحشت ناک ہے۔ یہاں تو کمزور، بوڑھے اور بچے تک اس نئے سورج کی انسان کش کرنوں سے بچنے کے لیے Human Rights Commission کی پناہ لینے پر کچھ اس طرح مجبور ہیں جیسے جلتی ہوئی ریت پر چھوڑا گیا کوئی چوہا کسی پودے کے سائے کی طرف بھاگے اور پودوں کی شکل میں بھوکی بلیاں کھڑی ہوں۔ بیٹے، بھائی باپ سب شکاری بن چکے ہیں تبھی تو اخباروں میں ڈاکٹر والکر کی شخصیت کا شراب پئے ہوئے بھائیوں اور باپوں کے ذریعے بے حیا جنسی استحصال کی خبریں چھپتی ہیں۔

اس خیال نے خالد کو انتہائی نا امید اور اداس کر دیا۔

خالد کا درد بھرا دل اندر سے لبریز ہو گیا۔

یہاں تو جو ایک جگہ مظلوم ہے وہی دوسری جگہ ظالم بھی ہے۔

اسے شدید تنہائی کا احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ شید اس زمین پر اس کا کوئی بھی ہمنوا نہ ہو۔ شاید اس کے جیسے لوگوں کو قدرت ایسی ہی خوفناک تنہائیوں کے ساتھ پیدا کرتی ہے۔ شاید وہ ایسے لوگوں کی صحتیابی کا خواہاں ہے جنہیں بیماری میں لذت ملنے لگی ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں ایک انجانا سا ڈر پیدا ہو گیا۔ اسے اپنی ہمت کچھ کچھ کھوکھلی سی محسوس ہونے لگی لیکن وہ اس احساس کو ماننے پر اپنے کو آمادہ نہیں کر سکا اور خالد کے وجود پر کالا پانی اپنے آگے کے زمانوں میں امنڈتے بادلوں کی طرح اور بڑھتا ہی چلا گیا ہے اور بڑھتے بڑھتے پورے آسمان پر چھا گیا ہے۔

انسان شاید ذرا سا بھی بدلا نہیں ہے۔ تبھی تو تمام دعووں اور وعدوں کے باوجود جب بھی موقع ملتا ہے انسانویسا ہی ہو جاتا ہی جیسا پہلے کبھی دکھ چکا ہوتا ہے۔ انسان ہمیشہ من مانی قوانین بناتا آیا ہے اور عورتوں کو مقید رکھنے کے لیے اس نے رسم و رواج گڑھے ہیں اور خود ان کے لئے دوسروں نے ویسے ہی قانون بنائے۔

❖❖

تبھی اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی یاد آ گئی۔ سیاست داں تاجر اور دانشور سبھی اس کے جادو کی زد میں ہیں۔ اور اسی کا کلمہ رٹ رہے ہیں۔ ایک لرزہ خیز بڑھتا ہوا معاشی سیلاب ہے اور سبھی اوپر آنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے جادوئی جال میں سب کو ایسے لپیٹا ہے کہ کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔ جب مغل شہنشاہ اس کے جادو سے نہیں بچ سکے تو یہ کیا ہیں۔ ایک بار پھر وہی مہاجال ہے وہی شکاری' وہی شکار اور وہی شکارگاہ اور وہی لوٹ مار۔ انسانی اور قدرتی وسائل میں چھپی ہوئی وہی بے پناہ دولت جس کے استحصال کی سرد جنگ میں قید کی زنجیریں نہیں ہیں' معاشی حربوں کا دباؤ ہے۔ ایک ایسی جنگ جس میں آدمی مرتا نہیں' پیدا ہوتا ہے۔ یہ منظر کالا پانی کی طرح سیاہ نہیں بلکہ برف کی طرح سفید ہے۔ اس میں آدمی کٹتا نہیں' منجمد ہو جاتا ہے یا گھل جاتا ہے۔ چیخنے پر سمندر میں نہیں پھینکا جاتا صرف اپنی جگہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کوٹھریوں میں نہیں بند کیا جاتا بلکہ چھوٹے چھوٹے دائروں میں چکر لگا لگا کر خود ہی ہمت ہار جانے کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ معاشی مقابلے کا وہ کھیل ہے جو اس زمین پر جنم لینے والے مضبوط اور کمزور سب کے اوپر نافذ کر دیا گیا ہے۔

کمپٹیشن کے نام پر کمزور لوگوں کی جائز توقعات میں محرومی یعنی جمہوریت کی جگہ ڈاکٹرن آف کمپٹیشن۔

اس وقت بھی تو یہی تھا اور اس وقت بھی یہی ہے۔

اس وقت میدان جنگ میں مقابلہ ہوتا تھا اور کمزور قوموں پر برتری حاصل کر انہیں لوٹا جاتا تھا اور جانوروں کی طرح انہیں ذبح کیا جاتا تھا۔

آج بھی پوری زمین پر مقابلہ ہے۔

ہمیں ماننا ہی پڑے گا کہ مقابلہ آج کے تناظر میں ایک گندا اور ناقابل قبول لفظ ہے کہ جہاں ایک یا دو جگہوں کے لیے سیکڑوں امیدوار ہوں وہاں مقابلہ کیسا؟ اپنی صلاحیت اور محنت کے استعمال کے لئے کام کرنے کا موقع فراہم کرنا جمہوری سماج کا نصب العین ہونا چاہئے۔

سماج کے سارے اختیارات صرف چند لوگوں میں سمیٹ دینا، ان کے ہاتھوں میں باقی تمام لوگوں کی تقدیریں دے دینا۔

ان بیکار نوجوانوں کو دیکھئے جو ٹرین میں ریزرو سیٹوں کے کونوں پر یا بیچ والی سیٹ کے نیچے فرش پر اکڑوں بیٹھے سفر کرتے ہیں۔ یہ سماج کے لیے مسئلہ گردانے جاتے ہیں۔ کوئی بھی انہیں برا بھلا کہہ سکتا ہے اور ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ وہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی وہ کنڈیکٹر کو دیکھ کر اٹھ بھاگتے ہیں اور باہر ٹائلٹ کے پاس دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ جب باہر کی عظیم تنہائی انہیں اپنی زندگی کی حقیقت کا آئینہ دکھانے لگتی ہے تو اپنے کو غیر ضروری سمجھ کر ٹرین سے کود جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ دروازے پر کھڑے شخص کو دھکا مار کر گرا دیتا ہے اور خود اس کے برتھ پر جا کر سو جاتا ہے جیسا ایک بار دو ڈھائی سال قبل اس ڈبے میں ہوا تھا جس میں میں سفر کر رہا تھا اور جب کنڈیکٹر نے اس سے ٹکٹ مانگا تو اس نے جواب دیا تھا کہ ٹکٹ اس کے ہاتھوں سے اڑ کر نیچے گر گیا تھا۔ ایک دن جب میں ٹرین سے دلّی جا رہا تھا تو ایک طالب علم بہت جھنجلایا ہوا سا مجھ سے بولا۔ ''میرے مسئلے کو کون سنے گا؟'' ایک دوسرا مسافر بول اٹھا تمہیں اپنے مسئلے کا حل خود ڈھونڈنا ہوگا۔

کیوں؟

اس لیے کہ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔

تب اس لڑکے نے جواب دیا تھا۔ اس کی باتیں آج بھی اس دور کے نغموں کی طرح میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔

سماج کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کا خیال رکھے ان کی خوراک، تعلیم، علاج اور سفر کی ذمہ داری لیکن جن لوگوں پر یہ ذمہ داری ہے وہ کسی اور کام میں مشغول ہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے۔ لارڈ میو نے کم از کم ان لوگوں کی صحت پر دھیان دیا تھا۔ جن سے وہ کام لیتا تھا لیکن یہ بچے ان کو سہارا دینے کے بجائے ان کی ذمہ داری اٹھانے کے بجائے انہیں سکھایا جاتا ہے کہ فساد کرو، دوسروں کو قتل کرو اور بے رحم بنو۔ اور وہ یہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر ان کا امیدوار کامیاب ہو گیا تو ان کے ووٹوں کے لیے ان کو انعام ملے گا اور وہ ایسا کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو خود ان کے ضمیر کے گوشت پر زندہ رکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ان سے کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ کوئی انہیں جان سے بھی مار سکتا ہے، ان کا استحصال کر سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں سب کا یہی حال ہے۔ کسی کو ان کی فکر نہیں۔ یہ سب کچھ جدید معاشیات اور سیاست کا لازمی جز ہے۔ یہاں کوئی کسی کی فکر کرنے والا نہیں۔ لوگ گویا دشمنوں یا شکاریوں کے بیچ میں رہتے ہیں۔ میرے کنبے کے لوگوں کا یہ خیال درست ہے کہ سرکار کو سرپرست یا خیر اندیش نہیں سمجھنا چاہیے۔ تو پھر ایک ایسی سرکار قائم کرنے کی ضرورت ہے جو ہماری اپنی ہو۔ کیا میری سوچ رک گئی ہے؟ جمہوریت کے اندر ایک جمہوری نظام جب قائم ہے تو پھر اس میں ایک اپنی حکومت قائم کرنے کی بات کیوں اٹھ رہی ہے۔ میں تو ایک جمہوری ملک کا باشندہ ہوں۔ لیکن برطانیہ بھی ایک جمہوری ملک تھا۔ تو وہ کس طرح جمہوری اور غیر جمہوری علاقوں میں تقسیم تھا۔ ایک وہ علاقہ جہاں خاتون کی حکومت تھی اور دوسرا وہ علاقہ جہاں خاتون کی حکومت کو صلاحیت کی کمی، مجبوری، دوری اور لاعلمی کے بنا پر ڈاکٹر والکر کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ انصاف پرست حکومتوں کے زمانے گزر گئے تھے پرانی ندیاں سوکھ گئی تھیں اور ان کی جگہ کانٹوں بھرے ریگستان آ گئے تھے۔ زندگی کو مقابلے کا میدان سمجھنے والے اور Killing instinct کو قدر اعلیٰ تسلیم کرنے والا فلسفہ نہ تو

بودھ مت میں تھا نہ گیتا میں نہ بائبل میں نہ قرآن میں۔ یہ فلسفہ تو ان کے بعد کے زمانوں میں کہیں سے ابھر کر آیا ہے اور اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ ہم اسے اپنے بچوں کو کامیابی کے نسخے کے طور پر پڑھاتے ہیں۔ یہ چاہے جہاں سے بھی نکل کر آیا ہو لیکن آج یہ زندگی کے پورے سمندر میں زہر کی طرح پھیل چکا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو صرف اس کی تعلیم ہی نہیں دیتے بلکہ ان کو ان کی آزادی اور بچپن کی مسرت اور خوشیوں کی قیمت پر انہیں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے مقابلے کی جنگ میں جھونک دیتے ہیں۔ کالا پانی میں نابالغ بچوں کو نہیں بھیجا جاتا تھا لیکن آج کا بچہ اپنے نازک بدن پر کتابوں کا کرتوزبستہ اس لیے ڈھوتا ہے کہ اسے مستقبل میں کمانا ہے۔ اس مقابلے نے بڑوں کی زندگی کو بھی کثیر الجہادی میدان جنگ بنا دیا ہے۔ لوگ ہر جگہ لمبی لمبی سانسوں میں الجھے ہوئے اور مکمل طور پر بھٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تعلیم نہ جانے کہاں چلی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ مذہب اور طبقے کے امتیاز کے بغیر تمہارے پڑوس میں کسی بھی شخص کو بھوکا نہیں سونا چاہیے اور اگر تم ایسے لوگوں کے بیچ پیٹ بھر کر خراٹے لیتے ہو تو تم دوزخی ہو۔ اس ذمہ داری کو نبھانے کے عمل میں کسی بھی طرح کے بھید بھاؤ اور تعصب کی اجازت نہیں۔ جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا معنی صرف پیٹ بھرنے تک محدود نہیں بلکہ وسیع تر معنوں میں لوگوں کو روزی حاصل کرنے میں مدد کرنا اور معاشی اور سماجی زندگی میں ایک ساتھ مل کر جد و جہد کرنا اور اس کے لیے پیسے اور اپنے ذہن کی طاقت کو مشترکہ طور پر استعمال کرنا اس کے وسیع معنوں میں شامل ہے۔ یقیناً بے رحم اور خود غرض مقابلہ کسی تعلیم کے بنیادی جذبے کو فنا کرتا ہے۔ سوچتے سوچتے خالد کو اپنے آپ پہ تعجب ہوا کہ وہ کس دنیا میں نکل آیا ہے کہ میر علی کے زمانے کے بارے میں سوچتے ہوئے اور عدالت سے جو نوٹس آیا تھا اس کی فکر کرتے ہوئے۔

❖❖

دسمبر یا جنوری کے مہینے کی تیز سرد برفیلی ہواؤں میں کانپتے ہوئے اداس پودوں کی مانند خالد اپنے ذہن پر بھاری بوجھ لیے ہوئے ان بادلوں کی طرح جو کڑ کنے اور چمکنے کے لیے تیار ہوتے ہیں وہ اپنے کمرے کی طرف مڑا۔ وہ اپنے ذہن کو اس بوجھ سے نجات دلانا چاہتا تھا جو اس کے دل و دماغ پر کسی اندھیری رات کے بادلوں کی طرح چھا گئے تھے۔ کمرے تک جانے والے بائیں باغ کے راستے کے ارد گرد کھڑے گل مہر کے پیڑوں پر نظر ڈالے بغیر وہ اپنے اسٹڈی روم تک پہنچا۔ پرانی لکڑیوں سے بنا ہوا دروازے کا وہ کواڑ کھولا جس پر جیومیٹری کے ڈیزائن اور پھول پتے بنے ہوئے تھے اور سیدھے اپنے اسٹڈی ٹیبل تک پہنچا۔

پھر وہ کتابوں میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔

اسے نہیں معلوم تھا وہ کیا ڈھونڈ رہا ہے۔

لیکن اس کے ذہن میں کوئی چیز موجود تھی جو اسے کتابوں میں جھانکنے پر مجبور کر رہی تھی۔

پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ شاید ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بارے میں کچھ پڑھنا چاہتا ہے۔ کیا پڑھنا چاہتا ہے یہ بھی واضح نہیں تھا۔ لیکن اس نے ان کتابوں کے لیے ایک کشش محسوس کی جیسے وہ جو کچھ ڈھونڈ رہا تھا اس کا سرا ان کتابوں میں کہیں نہ کہیں موجود تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس نے آج کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بارے میں مطالعہ کیا تو تھا لیکن یہ مطالعہ اطمینان بخش نہیں تھا۔

آج کا بھرپور مطالعہ کل مستقبل میں اس وقت کم پڑنے لگتا ہے جب انسان اپنے ماحول سے نئے حقائق، خیالات اور سوالات اخذ کر لیتا ہے اچانک محسوس ہوتا ہے کہ اسے سب کچھ ٹھیک سے نہیں معلوم۔ اس نئے ابھرتے ہوئے تاریک پہلو کے اندر داخل ہونے کے لیے اس نے یوں ہی ایک ایسا میگزین نکالا جس میں ایک بہت ماہر صحافی کا لکھا ہوا مفصل مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا کہ اپنی منشا اور اپنی نیت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے معاشیات، سیاست کو ایک پردے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔

اسے ایسے اشارے ملے کہ اس کو لگا کہ ان کمپنیوں کے وجود میں آنے کی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ وہ ان کے ماضی میں پہنچا تو ان کے کردار کو سمجھنے میں اسے کالا پانی کے وجود سے مدد ملنے لگی۔ دھیرے دھیرے اسے محسوس ہوا کہ کالا پانی کے حوالے سے ان کو دیکھنے سے یہ زیادہ واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں کیونکہ کالا پانی ایک ایسا واقعہ تھا جو ماضی میں وجود میں آ چکا تھا اور وہ کالا پانی کے وجود میں اتنی گہرائی تک پیوست ہو چکا تھا کہ یہ اس کے لیے ماضی کا ایک دور دراز نقطے پر موجود واقعہ نہیں رہ گیا تھا بلکہ وہ جذباتی اور ذہنی مشاہدے اور تجربے، وابستگی اور سروکار ہر اعتبار سے اپنے حال سے کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ وابستہ تھا۔

جب وہ کالا پانی کی دنیا میں جاتا تھا تو یہی نہیں کہ اسے خیال تک نہیں رہتا تھا کہ وہ ۲۱ ویں صدی میں ہے بلکہ اگر اسے خیال بھی آتا اور دیکھتا بھی کہ اس کے چاروں طرف ۲۱ ویں صدی ہے پھر بھی وہاں سے اتر کر نیچے آنے کا اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔

اس کے تجربات نے اسے ایک ایسا بلند مقام عطا کر دیا تھا جہاں سے وہ پوری دنیا کو اس کے وسیع زمانی اور مکانی تناظر میں دیکھ سکتا تھا۔ اپنے عہد سے صدیوں پیچھے آ کر مستقبل کے وجود میں آنے کے منظر کو دیکھنا ایک نئی چیز تھی۔ زندگی کو دیکھنے کا ایک نیا طریقہ جس میں یہ تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا تھا جیسے کمپیوٹر کے اسکرین کو وِنڈو اسپلٹ کر کے دو مختلف دور

دراز کے صفحات کو ایک ساتھ دیکھا جا سکتا تھا۔ اور یہ دیکھا جا سکتا تھا کہ اس وقت لوگ مستقبل کو کس دیکھ رہے تھے اور دراصل مستقبل میں کیا ابھر کر آیا۔

اس نے محسوس کیا کہ دنیا کا زیادہ صاف اور حقیقی رنگ میں دیکھنے کا یہ ایک انتہائی طاقتور آلہ تھا۔ کالا پانی ایسے اونچے پہاڑ کی طرح تھا جس کی چوٹی سے وہ اپنے زمانے کے بحران اور جذباتی لہروں سے اوپر اٹھ کر بھرپور طریقے سے دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔ یہاں سے وہ دنیا کو ماضی، حال، مستقبل تینوں تناظر میں ایک ساتھ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے تاریخ کے ذریعے بھی اس منظر کو سمجھنے کی کوشش کی تھی لیکن تاریخ اسے اپنے زمانے کی پکڑ سے باہر نہیں نکال پائی تھی اور ماضی کے واقعات کو زمانہ حال کے آئینے میں نہیں دکھا پائی تھی اور سچائی کا تقاضا ہوتے ہی وہ "تاریخ اپنے کو دہراتی ہے" اور "تاریخ اپنے کو کبھی نہیں دہراتی" کی گلیوں سے رفو چکر ہو جاتی تھی۔

لیکن اس چوٹی پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے جو منظر دکھائی دے رہا تھا اس میں ایک تخلیقی سچائی تھی جو چمکدار تھی اور دائمی تھی اور دیکھنے کا ایک قابل اعتبار دروازہ کھول رہی تھی۔ یہ روشنی کچھ ایسی ہی تھی جیسی روشنی تاریخ کے عظیم ترین مفکروں کے ذہنوں میں اتری تھی۔ پیغمبروں اور سائنسدانوں کے ذہنوں میں اتری تھی۔ اس کے ذہن کا وہ تناؤ جوان دنوں سے بڑھتا ہی جا رہا تھا جب اس نے اپنے پردادا کے بارے میں جاننے کے لیے کالا پانی کے بارے میں مطالعہ شروع کیا تھا اور کالا پانی جا رہا تھا۔ یہ تناؤ کچھ ویسا ہی تھا جیسا تناؤ ان عظیم انسانوں کے ذہنوں میں آہستہ آہستہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب قدرت نے ذہنی پختگی ایک خاص سطح تک اٹھانے کے بعد انھیں اس قابل پایا تھا کہ ان کے سامنے مسلسل بصیرت کی آسمانوں کی کھڑکیاں کھولتے ہوئے، زندگی کے نئی جہات سے آشنا کراتے ہوئے ان کی بصیرت کو ایک آتش فشاں عطا کر دے۔ ایسی تازہ بصیرت جو انھیں انسانیت کی نجات کے نئے راستے دکھائے اور انھیں اس بصیرت کو کے سمندر میں بنا کر بھیجے اور انسانیت نئے آب حیات کی طرح خیر مقدم کے ساتھ استقبال کرے یعنی کالا پانی اس کے لیے ایک اعلیٰ وارفع

پہاڑ کی چوٹی بھی تھا اور ایک ایسا پتا بھی جو اس کے اندر روشنی چمکانے والا تھا۔

یہی تو ہوا تھا جب راون رام کی سیتا کو اغوا کر کے لے گیا۔

نیوٹن کے ساتھ ایسا ہی ہوا جب اس کے سر پر ایک سیب پیڑ سے ٹوٹ کر گرا۔

یہی آرکمیڈس کے ساتھ ہوا تھا جب وہ تالاب میں غوطہ لگا رہا تھا۔

جو ہوتا ہے کوئی اپنے ساتھ دانستہ طور پر ایسا نہیں کرتا بلکہ یہ خود بہ خود ہوتا ہے۔

اور یہی اس کے ساتھ ہوا تھا۔

یعنی ایک عرفان کا نقطہ تھا۔

اسے اس حقیقت کو قبول کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوئی اس نے اپنے ذہن کو اس وسیع دروازے کے لیے کھول دیا اور جو کچھ اس کے اوپر نازل ہو رہا تھا اسے وہ دامن پھیلا کر قبول کرتا جا رہا تھا۔

ذہنوں کا منجمد ہو جانا ایک بیماری ہے۔ افراد اور ان سے بنی حکومتیں جب اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے حصار بناتی ہیں اور اس کے لئے دیواروں کی تعمیر کرتی ہیں تو اس میں اکثر وہ یا تو دوسروں کے راستوں پر دخل اندازی کرتے ہیں یا ان راستوں کو اپنے حصار میں لے کر انہیں بند کر دیتے ہیں۔ وہ دوسرے افراد کو اپنے مفاد کا حصہ اور کبھی کبھی بندھوا مزدور یا غلام تک بنا لیتے ہیں اور انہیں غلام بنانے کے لئے وہ طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ شیر علی اور لارڈ میو یا اس کے ملازم ڈاکٹر رواکر کے درمیان بھی جھگڑا تھا۔ وہاں لارڈ میو نے ایک ایسا رشتہ بنا دیا تھا جس میں شیر علی کی پوری ذات اور زندگی لارڈ میو کے لئے استعمال ہو رہی تھی۔ اور شیر علی کی وہ

انسانی خودمختاری جو اس کی ذاتی ارتقا اور تمناؤں کی تکمیل کی امین تھی پوری طرح ختم ہو گئی تھی۔ کسی انسان کو حالات کے شکنجے میں باندھ کر اس کو اپنی مرضی کے خلاف استعمال کرنے کا عمل بھی جیسے سنبری کے ساتھ ہوا تھا، اسی زمرے میں آتا ہے۔ دنیا کے اوپر جنگ یا تجارت کے ذریعہ قبضہ کرنا اور پھر اپنی فتوحات کو نجی کر لینا اور دوسروں کے لئے اس کے راستے بند کر دینا یا اس کو اتنا مشکل بنا دینا کہ دوسرے وہاں تک نہیں پہنچ پائیں اسی عمل کی ایک شکل ہے۔ پھر اس کے اوپر پہرے لگا دینا فوجیں کھڑی کر دینا اسی کاروائی کی توسیع ہیں۔ لیکن یہ سب ایک ایسے ذہن کی بھی عکاسی کرتے ہیں جو توسیع اور کھلے پن کے امکانات کو بند کر کے اپنی خود غرضانہ بصیرت کے اندر انجماد کا شکار ہو جاتا ہے اور یہیں سے اس گھٹن اور قید و بند اور تشدد اور دہشت گردی اور خونریزی وغیرہ کے دروازے کھلتے ہیں جن سے انسانوں کی زندگی میں خلفشار پیدا ہوتا ہے۔

یہ غیر جمہوری طرز حیات اس قدر ہمارے دل و دماغ پر چھا گیا ہے کہ ہم اسے پسند کرنے لگے ہیں حتی کہ صدیوں کے تجربے کے ساتھ یہ ہمارے ادب کی شکل بھی اپنے مطابق ڈھال چکا ہے۔ تبھی تو ٹکراؤ کے ڈائیلاگس میں ہمیں اپنی زندگی کا سچا رزمیہ دکھائی دیتا ہے۔

اس کے ذہن کو اب بھی چین نہیں تھا۔ کچھ تھا جو اسے تکلیف دے رہا تھا۔ اور وہ کچھ ایسا تھا جو بہت وسیع اور بڑا تھا۔ اور اس کی جڑیں بہت گہرائی میں پیوست تھیں۔ اور کسی انجانی سمت میں پوشیدہ تھیں۔ اس نے حال ہی میں ایک ناول پڑھا تھا جو اندرونی مکالمے سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں کردار انسانی ٹکراؤ سے بہت الگ تھلگ جا کر سچائیوں کو قدرت کی ساخت کے اندر تلاش کر رہا تھا۔ اس سے اسے ادب کی لئے نئے آسمانوں کا پتہ ملا تھا۔ اور یہ تھا وہ مفکر جو انسانی نسل کو باہمی تناؤ سے نکلنے کا راستہ دکھا سکتا تھا۔ انسانی ذہن کو آپسی ٹکراؤ سے نکالنے کی ضرورت ہے۔

'کہانیاں جو انسانی ذہن اور سوچ کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہیں، کہانی جو ہر

جگہ ہے، ماں کی گود سے لیکر ٹی۔ وی۔ چینلوں تک، اور روزانہ ہی کرداروں کے آپسی ٹکراؤ کی تصویروں سے بھرتی رہتی ہے، وہ ناول جو دوسرے کرداروں کے خلاف ہیرو یا ولن کی کہانیوں سے انسانی معاشرے میں آگ میں ایندھن ڈالتے رہتے ہیں، ایسے کردار دیتے ہیں جن کو یقین ہوتا ہے کہ صرف آپسی ٹکراؤ سے راستے نکلتے ہیں، ایسی کہانیاں انسانی سماج کو کسی انجام تک نہیں پہنچاتیں۔

آخر یہی تو وہ باتیں تھیں جن سے وہ دکھی تھا۔ اس کا ذہن موجودہ فکشن کے ذخیروں پر مرکوز ہو گیا۔ اور وہ ادب میں موجود کرداروں کی نظرِ ثانی کرنے لگا۔

عام طور سے ڈائلاگ کرداروں کے مابین ٹکراؤ کی بنیاد پر ہوتی ہے اس نے سوچا۔

'اور اس کی جڑ کرداروں کے بیچ مفاد کے ٹکراؤ یا تفرقہ ہوتا ہے۔'

کیوں ہمارے فکشن نگار یہ نہیں سوچتے کہ اس ٹکراؤ کو پیدا کرنے کا اصل ذمے دار قدرت ہے، اور اصل مسئلہ انسان اور قدرت کے بیچ کا ہے۔ اگر بھوکے لوگوں کے بیچ روٹی کا ٹکڑا پھینکا جائے گا تو وہ آپس میں ضرور لڑیں گے۔ تو کیا ہمارے فکشن نگار انھیں لڑتے ہوئے لوگوں کے ڈائلاگ نہیں لکھتے ہیں۔ اصل ٹکراؤ تو فرد اور نیچر کے بیچ ہوتا ہے۔ صرف افراد کو مکمل طور پر ان کے رویے یا جرائم کے لیے ذمے دار قرار دینے کی روایت میں کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے۔ افرد کے اعمال کے پیچھے ان کی وہ فطرت ہی تو ہوتی ہے جسے قدرت نے ہی بنایا ہے جس سے وہ کنٹرول ہوتا ہے اور بسا اوقات اگر وہ چاہے بھی کہ ان کمزوریوں سے اوپر آئے تو اس کو اس کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا دونوں صورت حال میں وہ اپنی کم مائگی اور کوتاہی کا شکار رہ جاتا ہے، اس صورت میں ایک رائٹر کا فرض ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے

انسان بنام قدرت کے رشتے میں انسان کے مقام کو مظبوط کرے۔ جواب انسانوں کی بیچ کی ٹکراؤ میں قدرت کو تیسرا فریق ہونے کے ڈائمنس سے خالی ہوا ایسے ادب تو انسانی ارتقاء کے ابتدائی دور کا ادب ہے۔ بڑے ادیبوں کی یہ فنی ذمے داری ہونی چاہیے کہ وہ ظالم انسانوں کے تئیں محتاط رویہ اختیار کرکے اور ان کو مکمل طور پر ویلن بنانے کے بجائے ان کی کینگی میں شامل قدرت کی طرف سے ان کے اوپر مسلط کیے ہوئے مقدر کو بھی سامنے رکھیں اور ان سے خیر اور قربانی کی توقع رکھنے کے ساتھ جس طرح سائنس دانوں نے قدرت کے اسرار اور ساخت کو واضح کرکے دولت کو صرف بانٹنے کے جھگڑے سے ذرا اوپر کے سے انتہا دولت اور وائل پیدا کرنے کے راستے واضح کیے اسی طرح سماج اور افراد میں ایسی تبدیلی کے امکانات بھی روشن کرے۔ جس کا سہارا لے کر انسان اجتماعی طور پر آپسی جھگڑوں سے نجات حاصل کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح کسی سائنداں کے کردار سے ہم ڈائلاگ کی توقع نہیں رکھتے کیونکہ نسل انسان کے سامنے چیلنج کے اٹھ کھڑے ہونے کے بعد اس کی ذہنی کشمکش پوری طرح اپنی پوری شدت کے ساتھ ٹکراتے ہوئے اندورنی مونولاگ میں ڈھیل جاتی ہے اور اس کے ذہن کی اصل لڑائی اپنے ہی ذہن کے حدود اور سرحدوں ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی سماجی ٹکراؤ میں کرداروں کے اپنی ذہنی سرحدوں کے ادراک وعرفان ہونے کے ساتھ ہی یہ کردار مونولاگ کے عمل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ناولوں میں سماجی ٹکراؤ صرف ایسے مسئلے کے طور پر آتا ہے جو سوچنے والے کرداروں کے لیے چیلنج کھڑا کرتے ہیں۔ ناول کا فن انسانی ذہن کی وسعتوں کو وسیع تر کرنے کا فن ہے اور ناول کے فن کا یہ بنیادی خاصہ ہے کہ وہ انسان کی دوراندیشی میں اضافہ کرے۔

ہم زندگی کی توسیع کے امکانات کو کھنگال کر سب کے لئے جگہ بنانے کے بجائے بند دائرے میں لڑنا زیادہ پسند کرے ہیں۔ سائنسدانوں کی طرح قدرت کے خزانوں

کو دریافت کرکے سب کو اس سے مالا مال کرنے کے بجائے ہم ان خزانوں کے راستے بند کرنے میں کوئی تردد نہیں محسوس کرتے۔ اس کوتاہ نظری میں ہم معاشرے کے ان افراد کو بھی لپیٹ لیتے ہیں جو کھلی سوچ رکھتے ہیں اور آزادانہ طور پر کائنات کے ذخیروں سے اپنے اور اپنے معاشرے کو مالا مال کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی خودغرضانہ پالیسیوں کے تحت ہم نے اپنے معاشرے میں کروڑوں ایسے ذہنوں کو سڑا کر رکھ دیا جو اپنی ذہنی مہمات سے کائنات کے اتھاہ خزانوں کا دروازہ کھول سکتے تھے۔ ہم ان کے لئے راستے صاف کرنے اور ان کی آزادی میں مخل نہیں ہونے کے بجائے ان کو اپنے مطابق چلانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم نے حکومت کے حاکمانہ حقوق کی کی سرحدوں کو افراد کی ذہنی کاوشوں تک پہنچا دیا ہے۔ یہ جمہوری معاشرے کا گلا گھونٹنے کے برابر ہے۔ لیکن ہم اس گلا گھونٹنے کو ایک دفاعی عمل سمجھتے ہیں بلکہ ہمارے حاکموں کو تو یہاں تک خیال آتا ہے کہ جب وہ اس معاشرے کے خودمختار فرماں روا ہیں تو ان کی مرضی کے بغیر اور ان کے اختیار اور اقتدار کو سجدوں سے تسلیم کیے بغیر معاشرے کا کوئی فرد اپنی زندگی کی توسیع کیسے کرسکتا ہے۔ افراد کی اپنی زندگی کی توسیع کرنے کی آزادی انہیں اپنے اقتدار کے منافی لگتی ہے اور ان کی پولیٹکل تھیوری ان سے یہ کہتی ہے کہ اس طرح کی آزادی بالکل ایسے ہے جیسے کوئی کسی کی حکومت میں رہتا ہو اور لگان نہیں دیتا ہو۔ فرد کی خود مختاری کے اظہار کو وہ سرکشی قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھولے بیٹھے ہیں کہ ہم جمہوری معاشرے میں جی رہے ہیں اور کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں اپنی اپنی ذات کی توسیع کرنے کا ہر شخص کو اختیار ہے اور وہ اس سلسلے میں فطرت کی طرف سے خودمختار پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے ہر شخص کو اس توسیع کی آزادی ہونی چاہئے۔ آزادی کے اس تصور کا اطلاق فرد پر بھی ہوتا ہے اور افراد کے اجتماعی گروہ یعنی معاشرے پر بھی ہوتا ہے۔ دوسروں کی آزادی میں غیر مشروط رکاوٹ یا دخل اندازی کا کسی کو حق نہیں۔ چاہے یہ دخل اندازی خودغرضی کی وجہ سے ہو یا کوتاہ نظری کی وجہ سے ہو۔ اس میں گڑبڑی سے پیدا ہونے والی ساری بیماریوں کی جڑ حکومتوں اور برسر اقتدار لوگوں اور دولت مندوں کی کوتاہ نظری میں ہوتی ہے جو اپنی کوتاہ نظری کو ہٹ دھرمی میں تبدیل کر لیتے ہیں اور اپنے منشا پر قائم رہنے کے لئے طاقت کا سہارا لیتے ہیں۔ حکومتیں ا

س سلسلے میں مطلق لعنان ہونا چاہتی ہیں اور یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کی کوتاہ نظری کی خامیوں کو اس بنا پر نظر انداز کیا جانا چاہیے کہ وہ معاشرے کی اجتماعی خود مختاری کی نمائندہ ہیں۔ حکومتوں کی خود مختاری غیر مشروط نہیں ہو سکتی اور کوتاہ نظری کو اس میں ڈھانچے کی آزادی اس خود مختاری کا حصہ قطعی نہیں ہے۔ ایک فرد کو یہ پورا حق ہے کہ کوتاہ نظری کی بنا پر ڈالی گئی رکاوٹ یا کی گئی دخل اندازی کو وہ مسترد کر دے چاہے یہ دخل اندازی کسی ایک فرد کی طرف سے ہو یا اجتماعی طور پر حکومت کی طرف سے ہو کیونکہ معاشرہ قدرت سے عظیم تر نہیں ہے اور جو چیزیں قدرت نے دی ہیں ان کو چھیننے کا معاشرے کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کائنات کے اندر پھلنے پھولنے کا ہر شخص کو پورا حق ہے۔ یہی جمہوری سوچ کی روح ہے۔ پولس اور عدالتیں اگر اپنی یا قانون سازی کی کوتاہیوں کو دور کرنے کے بجائے کسی short cut کا استعمال کرتی ہیں تو یہ جمہوریت کے منافی ہے۔ جو حکومت یا معاشرہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اجتماعی شعور اور سوچ ایک فرد کی سوچ سے برتر ہو سکتی ہے وہ خود یہ ثابت کرے کہ وہ اپنی کوتاہ نظری پر قابو پانے کی اہل ہے۔ جو معاشرہ اپنی توسیع نہ کر کے اپنے کسی فرد کے ارتقا پر روک لگا کر اسے اپنے طور طریقے پر جینے پر مجبور کرتا ہے وہ دراصل اپنے افراد کا گوشت کھاتا ہے۔ جو معاشرہ اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتا جس کے تئیں وہ اپنے افراد سے مختارنامے لے چکا ہے وہ معاشرہ اپنی حق خود مختاری کی بنا پر اپنی کوتاہیوں سے بری ذمہ نہیں ہو سکتا اور اگر وہ اپنا منصف خود ہی نہیں بن سکتا چاہے وہ حکومت ہو یا عدالت ہو اور معاشرہ اور اس کا ہر فرد اس سلسلے میں ہمہ وقت اپنے نتائج پر پہنچنے اور اور اس کا اعلان کرنے کا حق رکھتا ہے۔ جو لوگ ان بنیادی باتوں سے متفق نہیں وہ دراصل معاشرے میں خلفشار پیدا کرنے والے لوگ ہیں۔ وہ جمہوریت کی راہ کا روڑہ ہیں۔
اور یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے معاشرے میں بے پناہ گھٹن پیدا کر رکھی ہے۔ اور جب یہ لوگ اجتماعی طور پر اپنی اس سوچ کو کو عملی جامہ پہنا کر اس کی توسیع کرتے ہیں تو یہ غیر جمہوری زندگی کے فرماں روا بن جاتے ہیں جو مافیا کی ایک شکل ہے۔ آج یہ مافیائی سوچ بہت ہی چینی سے جمہوری سوچ کے قید و بند کے لئے ڈھانچے بنانے میں مصروف ہے۔ اور اگر عوام نے چوکنا ہو کر اس کے قدموں کو روکنے کی کوشش نہیں کی تو یہ دھواں جس میں ہماری سانس گھٹ رہی ہے یہ اور بڑھے گا۔ یہ مافیا قوتیں ہمارے اوپر ایسے جال پھیلا رہی ہیں جو خود دکھائی نہیں دیتے ہیں لیکن ان کے نتائج ایک مخصوص سماجی ڈھانچے اور اس کی برائیوں کی شکل میں ہمیں صاف دکھائی دیتے ہیں۔

مافیا کا جال اس کے خیالات کے بادلوں کی طرح چھا گیا تھا۔ جس سے چاروں طرف بڑے بڑے خوفناک سانپ جھول رہے تھے۔ اسے کیسے مٹائیں۔ ہر فرد کو اپنے آزاد ذہن اور رائے کے ساتھ رویہ عمل ہونا ہوگا۔ اس اذیت ناک مافیا کے خلاف انقلاب کرنے کے لیے ہر فرد کے لیے لازمی ہے کہ شیر علی کی طرح اسے اپنی ذاتی رائے اور ذاتی فیصلے کی اہمیت کا احساس ہو کیونکہ جیسے ہی انسان اپنی ذاتی رائے اور ذاتی فیصلے کو چھوڑ کر دوسروں کے فیصلوں پر چلنا شروع کرتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب انسان دوسروں کی رائے کو اپنی رائے پر برتری دینے لگتا ہے کہ وہ اس سے متفق نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر انسان دوسرے کی رائے سے متفق ہو تب تو یہ خود اس کی اپنی رائے بنتی ہے اور وہ اسے جھٹلا بھی نہیں سکتا لیکن جب ایسا نہیں ہوتا تو آغاز ہوتا ہے اس کے استحصال کا، اور غلامی کا انسان کی اپنی رائے بنانے کی صلاحیت ہی اس کے مفاد کی واحد پہرے دار ہوتی ہے اور اس پر عمل کرنا اور دنیا کی کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر عمل کرنا چاہیے وہ کوئی رشتہ ہو یا مقام کو، انسان کے تحفظ کے لیے اور اس کے ارتقاء اور آزادی کے لیے لازمی شے ہے۔

ممکن ہے انسان کا یہ فیصلہ کچھ لینے کے بجائے دینے کا فیصلہ ہو کچھ قربان کرنے کا فیصلہ ہو لیکن یہ بھی اگر انسان کی اپنی رائے کے مخالف ہو تو یہ ایک ایسا گناہ ہے، یہ اپنے ہی روح کو قتل کرنے کے مشابہ ہے۔ انسان کی اپنی رائے اس کے سامنے آئے ہوئے دو اعمال کے تجویزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا فیصلہ دیتا ہے۔ عمل اور بے عملی کے درمیان فیصلہ کرنے کا اہل بناتا ہے اور اگر انسان فیصلہ کن نہیں ہے تو اسے فیصلے تک پہنچنے کی اپنے اندر

صلاحیت پیدا کرنی چاہیے۔

یہ اپنی روح کے تئیں ذمے داری کا وہ بوجھ ہے جو اسے اٹھانا ہی ہے اگر انسان پہلے سے غلامی کی حالت میں ہے اور وہ غلامانہ عمل پر مجبور کیا جاتا رہا ہے یا مجبور ہے اور وہ کسی اور کے احکامات کا پابند رہا ہے تو وہ ایک ایسے انسان کی طرح ہے جو کسی ناگزیر بیماری کا شکار ہے۔ اور یہ اس کی اپنی روح کے تئیں ذمے داری ہے کہ وہ سنجیدگی سے اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچے اور اپنے ذہن کو صاف اور روشن کرے کہ یہی روشنی اسے اندر سے تندرست بنائے گی اور جس لمحے انسان اپنی رائے پر سوچنے اور عمل کرنے کے لائق ہوجاتا ہے اسے چاہیے کہ اس پر کامیابی کے ساتھ عمل کرنے کے راستے ڈھونڈے اسے چاہیے کہ جیسے ہی اس پر عمل کرے چاہے اسے قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ آخرکار جو چیزیں وہ قربان کرے گا وہ چیزیں ویسے بھی اس کے لیے بیکار ہیں اگر ان چیزوں سے اس کی اپنی زندگی کی تعمیر نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر اس کی رائے صاف اور روشن ہے تو اسے اس پر عمل کرنا چاہیے انسان کے اعمال کے بارے جواز یہیں سے آتے ہیں، چاہے پوری دنیا آج یا کل اس کے بارے میں کچھ بھی کہے۔

اسے شیر علی کی یاد آئی۔ 'اس نے عمل کیا'

پہلی بار خالد سہیل کو شیر علی کے بارے میں خود اپنی رائے پر شک ہوا۔

ممکن ہے شیر علی نے خود اپنی رائے پر عمل کیا ہو۔

تو اگر اس نے خود اپنی رائے پر عمل کیا تو پھر وہ غلط کیوں کرتا۔

اس کا عمل ایک فیصلہ کن ذہنی کوشش کا نتیجہ تھا۔

یہ کوئی ایسا لمحاتی عمل نہیں تھا جو کہ کسی شیر علی صحیح تھا۔

یہ بات خالد کے ان خیالات کے اوپر ایک ٹوٹتے ہوئے پہاڑ کی طرح گری جو اس نے شیر علی کے بارے میں قائم کر رکھی تھے۔ شیر علی کا قد اچانک اس کے سامنے ایک عظیم پہاڑ کی طرح دوبارہ نمودار ہونے لگا۔ آسمان تک بلند قامت، سنجیدہ، پیغمبرانہ عظمت لیے ہوئے۔

کیا یہ وہی انسان نہیں تھا جیسا اس نے ایک پسندیدہ شہری کے لیے تصور کیا تھا۔

❖❖

خالد کے لیے اب یہ مشکل درپیش آ گئی تھی کہ وہ لارڈ میو کے قتل کی تصویر کو کہ ایک قیدی نے کس طرح پراسرار طریقے سے حملہ کر کے قانون شکنی کرتے ہوئے اور تاریخی اعتبار سے حکمرانوں کی برتری کے تسلیم شدہ اصول کو توڑتے ہوئے شیر علی نے لارڈ میو کا قتل کیا تھا۔

لیکن اس کے پاس اس خیال کو جو شیر علی کے بارے میں اس کے ذہن میں ابھرا تھا مسترد کرنے کی کوئی منطق بھی نہیں تھی۔ اپنی رائے پر عمل کرنا ایک ایسا مسئلہ اصول تھا جسے خود خالد مسترد کر ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس اصول کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کسی فرد کی رائے میں خرابی ہو سکتی ہے لیکن جس شخص نے اپنی رائے پر عمل کیا ہو اس شخص کو نظروں سے نہیں گرایا جا سکتا کیونکہ اسی اصول میں انسان کی عظمت پنہاں ہے۔ اس میں انسان کی خود مختاری کی جڑیں ہیں۔ انسان کو اس بنیاد پر غلام نہیں بنایا جا سکتا کہ اس کا دماغ چھوٹا، ناپختہ اور لاعلم ہے۔ اور وہ اپنے بارے میں یا سوسائٹی کے بارے میں خود کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کیونکہ ان کے حالات ان کے دنیاوی علم کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ ان خیالات کی جڑیں ان کی ارتقاء کی ضرورتوں کے اندر شروع ہوتی ہیں اور دوسروں کے لیے لازمی ہے کہ اس بات کا پورا دھیان رکھیں۔ یہ دوسروں کا فرض ہے کہ وہ شخص کو پوری طرح مطمئن کریں کہ کیسے کوئی چیز اس کے لیے مفید ہے۔ اگر اس سے کسی قربانی کی امید کی جاتی ہے تو وہ قربانی ہی اس کی مرضی کے اور فیصلے کی پیداوار ہونی چاہیے۔ قربانیاں چربی کی طرح کسی کے وجود سے نکالی نہیں جا سکتیں۔

خالد نے محسوس کیا کہ حکومت کے سارے اجزاء بہت گہرائی سے سماج کے عوام کے اندر پیوست ہوتے ہیں اور اپنے وجود کے لیے انہی کے اوپر قائم و دائم ہوتی ہیں۔

انہی افراد کو شہری کہتے ہیں۔

شیر علی اب بھی اس کے سامنے بہت عظیم بن کر ایک پہاڑ کی طرح اس کے سامنے موجود تھا جیسے وہ اسے اور زیادہ سوچنے کی دعوت دے رہا ہو۔

خالد کے وہ تمام اعلیٰ و ارفع خیالات جن کو اس نے وائپر آئی لینڈ کے پھانسی گھر کی زیارت کے بعد مسلسل غور و فکر کے ذریعے کئی دنوں میں حاصل کیے تھا' وہ اب ٹوٹ کر گر رہے تھے اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

انسان کے لیے اپنی رائے کی بنا پر ہی عمل کرنے کا اصول اب اس کے نزدیک اتنا بنیادی بن گیا تھا کہ اس کے سامنے ساری دوسری چیزیں جیسے بڑی بڑی امیدیں اور مستقبل کے پلان گھاس پھوس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

'یہی وہ مقام ہے جہاں سے اس مافیا سے نجات کا راستہ نکلتا ہے جس کی سرپرستی دنیا کے عظیم ترین دماغ پیسے، طاقت، قوانین اور اداروں جیسے ہتھیاروں سے لیس ہو کر کرتے ہیں۔

جو کچھ یہاں کیا جائے گا اور ہوگا یعنی جو کچھ اس آزاد شہری کے دل و دماغ میں ہوگا وہی کل پورے عالم کے آفاق پر نمایا ہوگا۔'

جس طرح ہر شخص سورج اور چاند کے درمیان فرق کر سکتا ہے اسی طرح ہر شخص یہ پہچان سکتا ہے کہ کون سی طاقتیں ہیں اور اگر وہ اپنی جگہ انفرادی طور پر اپنے اندر پہچاننے کی صلاحیت پیدا کر لیں تو نتیجتاً اور آخر کار وہ درحقیقت ایک ساتھ اجتماعی طور پر مافیا طرز فکر کے خیال کے خلاف کام کر رہے ہوں گے۔

اس طرح وہ آپس میں بغیر اپنے خیالات اور نظریئے کا تبادلہ کئے ایک طرح سے ایک متفق اور اجتماعی کوشش میں شریک کار ہوں گے۔

اگر ہم اس زمین پر مافیا طرز فکر اور مافیا قوتوں سے مکمل آزاد کوئی دن دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس بصیرت کو، اس طرز فکر کو ایک روشن چراغ کی طرح اپنے ذہنوں اور دلوں میں روشن کرنا چاہیے اور اسے مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے رہنا چاہیے کہ یہ وہ واحد طریقہ کار ہے جس کے ذریعے پوری دنیا کے کمزور نحیف افراد دنیا کو تبدیل کر کے اپنے خوابوں کی دنیا کو وجود میں لا سکتے ہیں۔

ہمیں انفرادی طور پر اپنی اپنی جگہ مافیا کے چھوٹے مرض کے جراثیم کو اپنے آس پاس کے علاقوں میں ختم کرنا ہوگا۔

جو بھی جراثیم ہمارے جسموں کے قریب آتا ہے وہ دراصل ہمیں اپنا اگلا شکار بنانے جا رہا ہے۔ اور یہ ہمارا فرض ہے، اور ہمارے اوپر لازم کہ ہم اس کے خلاف مزاحمت کریں اور ہمارے اندر لڑنے کی جتنی طاقت ہے اپنے کو محفوظ رکھنے کے جتنے سامان اور صلاحیت ہیں اور ان کے ساتھ اس سے لڑیں۔

اس لیے اٹھو، مخالفت کرو، لڑو، اور مستقل مزاجی سے چوکنا اور متحرک رہو۔

خود اپنی جگہ لڑنے کا حربہ تیار کرو، حملہ کرنے، پیچھے ہٹنے، شور مچانے، چپ ہونے، عمل کرنے، انتظار کرنے، مظاہرہ کرنے، چھپانے کے حربے پر تم غور فکر اور عمل کرو۔ طریقہ چاہے جو بھی ہو لیکن زندگی کے ان دشمنوں کے خلاف جنگ جاری رکھو۔

اپنے جسم کے اعضاء کو بچاؤ۔ ان کی حفاظت کرو اپنے جسم کی حفاظت اور اپنی روح کی حفاظت کرو۔

تم نے ہمیشہ یہ سوال کیا۔

کہاں سے اس عالم گیر مافیا کے خلاف جنگ کا آغاز ہو۔ تم اس پر سب سے پہلے خود اپنی رائے قائم کرو۔ پھر اپنی رائے کو اوروں تک ترسیل کرو۔ اس سے انھیں بھی اپنے طور پر رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی اور ان ذہنوں میں خیالات جنم لیں گے اس طرح تمھاری یہ رائے جنگل کی آگ کی طرح پھیل سکتی ہے۔

ایک انسان کی چنگاری جیسی ایک ایجاد کروڑوں انسان کے لیے ہاتھوں میں مشعل بن سکتی ہے۔

جب دوسرے اسے کارآمد پائیں گے وہ اسے تریاق کی طرح اپنے جسم میں داخل ہوئے مافیائی زہر کے خلاف اپنے جسم و روح کو بچانے کے لیے ضرور استعمال کریں گے۔

یہ وہ شئے ہے جو بغیر قیمت تقسیم کی جاتی ہے یہی وہ دوا ہے جسے مفلس لوگ بھی جڑی بوٹیوں کی طرح اپنے اردگرد سے لے کر اپنی زندگی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

وہ احترام جو تمھاری سوچ کے عمل، تمھاری آواز یا تمھارے شکوک کی قربانی مانگ رہا ہے یہ احترام کا شوہر کا ہو، سرکار کا ہو، باپ کا ہو، عدالت کا ہو یا گرو یا مذہبی رہبر کا ہی کیوں نہ ہو وہ احترام تمھاری آنکھوں پر پڑے ہوئے خطرناک چلمن کی طرح ہے اسے ہٹانا چاہیے۔'

اس نے سوچا اور مسلسل سوچتا چلا گیا۔

'کسی صبح کو اس کی اصل صورت دیکھنے سے پہلے ہی سمجھ لینا بہتر ہے تا کہ ان ہولناک تجربوں اذیتوں سے نہیں گزرنا پڑے جنکا سامنا بالآخر ایک تیر لگے شکار کی طرح

تڑپ تڑپ کر کرنا پڑتا ہے۔

مرض کا پوری طرح سے شکار ہونے سے پہلے ہی جراثیم جسم میں اس کے گھسنے کے راستے، اس کی افزائش اور مسکن کی جگہوں کے بارے میں اپنے ذہن کو روشن کرنا بہتر ہے۔

بڑی ہوئی چیزوں، گندگی نالیوں اور ملاوٹوں کے خلاف آواز اٹھانا سختی سے ان کی مخالفت کرنا اپنے اور اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے مسلسل ان کے خلاف محاذ جنگ قائم رکھنا، ان کے وجود کی پہچان کرنا سیکھنا زندگی کی اہم ترین ضرورت میں سے ایک ہے۔

جراثیم کے خلاف جس طرح جسم کے اندر موجود سفید خلئے بغیر کسی سے حکم لیے خود بہ خود لڑتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ دوسرے سفید خلئے بھی لڑ رہے ہیں یا نہیں اسی طرح ہر شخص کو لڑنا ہوگا۔

اس جنگ میں ان سفید خلیوں کی موت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی جنگ میں مرتے ہوئے سپاہیوں کی طرح ان کی قربانی کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ کبھی کبھی نہیں ہوتا ہے، لیکن وہ لڑتے ہیں کیونکہ لڑنا ان کی فرض ہے۔ اور شیر علی بھی ایسا ہی سفید خلیہ تھا کہ وہ اپنے ماحول پر چھائے ہوئے داد کے خلاف لڑا تھا۔

خالد جیسے جیسے زندگی کی ان سچائیوں میں اترتا گیا جن میں وہ گھرا ہوا تھا ویسے۔ ویسے وہ اس ہولناک حقیقت سے آشنا ہوتا گیا کہ وہ چاروں طرف سے مافیا قوتوں کی پیدا کردہ جال کے شکنجے میں مکمل طور پر گھرا ہوا ہے، اس قدر کہ اب ایک خوش حال اور پر امن دنیا پیدا کرنا ایک انتہائی مشکل کام بن گیا ہے۔

❖ ❖

کالا پانی کے عظیم آئینے اور پچھلے ایک سو پچاس برسوں کے اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں سوچنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہی وہ طریقہ تھا جو اسے اس بلندی پر اور اس ممتاز مقام پر لایا جہاں سے وہ حقیقت کو بہت واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کا معائنہ کر سکتا تھا۔ اور اپنی سوچ کو ایک ٹھوس بنیاد دے سکتا تھا اور یہ قدرت کا ایک کرشمہ تھا کہ اس نے اسے کس مقام فکر سے آشنا کرایا تھا۔

اور اب جیسے کسی نے اس کے اندر سے اسے پیغام دیا اور محسوس کروایا کہ یہ ادراک و عرفان یوں ہی کوئی کھلواڑ نہیں بلکہ یہ بہ حیثیت انسان اس کے اوپر ایک فرض عائد کرنے کے لیے نازل ہوا ہے وہ چلائے یا عوام کو آوازدے اس انسان کی طرح جو گھر کے اندر خطرناک سانپ کو دیکھنے کے بعد چلا اٹھتا ہے۔

لیکن امریکیوں کو تو اچانک، بلاوجہ چوٹ پہنچائی گئی تھی پھر وہ اسے کیسے برداشت کرتے اور چپ رہتے، اس لیے دوسرا ایٹم بم تو انھوں نے اپنی بقا کے گرایا تھا۔ ان جنونی مہمات میں شامل سانحات کی حقیقت کو پوری طرح منظر عام پر لانے کے لیے کچھ انسانی جانوروں کی تباہی ہونی ہی تھی۔

یہ صورت حال نیو یورک کے ان میناروں کی بھی تھی۔ ان امریکی میناروں پر حملہ تاریخ کو شاہ راہ سے کود کر الگ جا کر کیا گیا تھا۔ کچھ انسانوں میں یہ رجحان ہوتا ہے کہ وہ، ہیرو شپ حاصل کرنے کے لیے کسی طاقت ور ہستی کو کہیں نہ کہیں سے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور وہ ہاتھ بھی جو تالیاں بجاتے ہیں وہ مجرمانہ جذبات سے خالی نہیں ہوتے۔

لیکن یہیں تو اس عظیم صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے جو دنیا کو مزید بھیانک تباہیوں سے بچاتی ہے۔

اپنے اور اپنے ملک کے عوام کے طوفانی درد کو قابو میں رکھتے ہوئے انسانیت کے جہاز کو آگے بڑھا سکتی ہے اور یہی تو کیپٹن کی شخصیت کی عظمت کا امتحان ہوتا ہے۔

نادر شاہ نے دو چار سپاہیوں کے قتل کے انتقام میں دلی کے بظاہر سرد پڑے ہوئے شہریوں کے قتل و ہلاکت کے لیے تین دنوں کی جو چھوٹ دی تھی اس نے اس کو بہ حیثیت ایک بادشاہ اس کے جلال میں اضافہ ضرور کیا ہوگا لیکن تاریخ کی دیواروں پر اس کا قد ضرور چھوٹا ہو گیا کہ معصوم انسانوں کے قتل سے بادشاہوں کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوتا۔

حاکموں اور بادشاہوں کی عظمت میں اضافہ معصوم انسانوں کی عزت اور تحفظ سے ہوتا ہے۔ جو ایک ایسی ذمے داری ہے جہاں بڑے بڑے بادشاہوں کو ناکامی ہوئی ہے۔

جو بادشاہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی عظمت اس بنا پر بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنی فکر اور اعمال کے ذریعے انسانیت کو بلند تر قدریں دے کر عظیم تر مثالیں اور بادشاہی کو نئے عظیم تر معانی پہنا جاتے ہیں۔ قومیں ایسے بادشاہوں کی تاریخ سے انسانیت کا سبق سیکھتی ہیں کیونکہ عظمت اپنے آپ میں ایک بامعنی اور پروقار شے ہے جس کی دنیا تعظیم کرتی ہے اور جو تاریخ کی پیشانی پر کوہ نور کی طرح چمکتا ہے۔

کاش وہ دوسرا بم نہیں گرا ہوتا۔ یہ دوسرا بم امریکہ کی پیشانی پر داغ نہ سہی لیکن یقیناً یہ وہ سانحہ تھا جسے امریکہ ٹال سکتا تھا۔

خالد نے سوچا۔

اپنے وقت کے کئی واقعات اسے اس وقت یاد آ گئے۔ دہلی ہائی کورٹ کا جج جس کے فیصلے نامے مقدمہ لڑنے والوں کے وکیل لکھا کرتے تھے۔

پنجاب کا وہ گورنر جس کا بیلی کاپٹر گرا تھا تو پوری وادی میں نوٹوں کی بارش ہو گئی تھی۔ جب گورنر نے بدعنوانی سے اتنا کمایا تھا تو جنھوں نے اسے گورنر بنایا تھا وہ کیا کرتے ہوں گے۔ اسے لارڈ میو اور اس وقت برطانوی حکومت یاد آ گیے۔ پیسہ پہلے عہدوں کو پکڑتا ہے پھر عہدوں کے ذریعے خود اور پیسہ کماتا ہے اور کسی کی کیا مجال کہ اس پر انگلی اٹھا دے۔ یہ طاقتور عہدے سرکاری مشینوں کو جس بے رحمی سے استعمال کر سکتی ہیں اس کا تصور بھی محال ہے۔

کالا پانی تو صرف اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

ایک عام آدمی ان کے منھ کے نوالے کے سوا اور کچھ نہیں۔ انسانی تاریخ کے اس پہلو نے اس نظم کو اس کے ذہن میں دہرا دیا جو وہ تھوڑی دیر پہلے وارد ہوئی تھی۔

بام گردوں پہ یہ لٹکا ہوا انساں کب سے

❖ ❖

آج عام آدمی نے اخبار اور ٹی وی پر اتنا بھروسہ کرلیا ہے کہ اپنے محلے میں ہو رہے واقعہ کو بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر دیکھتا ہے۔

اور عام آدمی کی زندگی ماضی کے چھوٹے چھوٹے دائروں سے باہر نکل کر اتنی وسیع ہوگئی ہے کہ اب اپنی زندگی سے متعلق خبریں رکھنے کے لیے ٹی وی اور اخبار اس کی مجبوری بن گیے ہیں۔

ایسے میں میڈیا کا ایک ایسا ٹھیکیدار بن جانا کہ پوری سچائی کو نہیں دکھانا پورے عوام کو کالا پانی جیسی تنہائی کرنے جیسا ہے۔

کتنی عجیب بات تھی، کالا پانی اپنے ہزاروں جہات کے ساتھ اس کے ذہن میں ایسے آبسا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑے پیڑ کے بیج سے نکلی ہوئی دیوار ہو جو بڑھتی ہی جارہی ہو۔

خالد سہیل نے سوچا۔

کیا یہ پیڑ اس وقت تک مجھے اپنی کوشش کی طاقت سے نجات نہیں دے گا جب تک آج کا پورا دور، اس دور کی مکمل شکل، اس کے متواتر ہو رہے ہولناک واقعات، اس میں رائج پورا نظام، کالا پانی کی طرح ہی دکھائی نہ دینے لگے۔

یہ کوئی خوف کی بیماری تو نہیں جو اسے ہوگیا ہے! وہ کہیں جذباتی طور پر ایسی سکتے ورینت کا شکار تو نہیں ہوگیا ہے جس نے اس کے ذہن کو مجہول کردیا ہے''

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور وہ جھنجھلا کر ایک بار پھر اس سے باہر نکل آیا لیکن اس کی سانسیں تیز ہوگئی تھیں۔

٥٥

اس کی میز پر آج کا اخبار پڑا ہوا تھا۔ بہت دنوں سے اس نے اخبار پڑھنا بند کردیا تھا۔ اخبار کی خبریں تو اسے کسی جنگل سے ٹوٹ کر اڑی ہوئی پتیوں کی طرح تھیں۔ جو کبھی کبھی کہیں کہیں سے آکر آج کی دنیا میں گرتی تھیں۔ لیکن ان دنوں تو وہ بیچ جنگل میں تھا۔

اسے اچانک خیال آیا تھا کہ لوگ تو صرف پتوں کو ہی دیکھتے تھے، وہ درختوں سے اکثر ناواقف ہی ہوتے تھے۔ اس نے اخبار کو اٹھا کر اس کی خبروں کو ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کیا تو اسے لگا کہ وہ خبریں جو کبھی اسے دھوکہ دیتی آئی تھیں اچانک بڑی بڑی روشنیوں کے حصار میں آکر اپنے پیچھے چھپے ہوئے اپنے پورے جسم کو ننگا کررہی ہیں۔

وہ خود صحافی تھا اور جانتا تھا کہ بڑے بڑے چہروں، بڑے بڑے اداروں اور بڑے بڑے واقعات کے پیچھے چھپی ہوئی ہزاروں ایسی سچائیاں موجود ہوتی ہیں جنھیں لوگ ان اخباروں کی نظر میں لاتے ہیں یا جو گہری تفتیش اور چھان بین کے دوران پردۂ افشاں سے باہر آتی ہیں۔ لیکن اخبار کے ایڈیٹر کی منوعہ پالیسی کو مصلحتوں کی دیواروں کے پیچھے ایسے رک جاتی ہیں جیسے جانور کانٹوں دار گھروں کے پیچھے رک جاتے ہیں۔ سچائی کا سب سے بڑا نقیب ہونے کا دعویٰ کرنے والا میڈیا خود کس طرح خوف اور دہشت سے مرعوب ہوتی ہے کہ خاموش رہنے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس خاموشی کو جھوٹ نہیں مانتی۔

اگر کوئی ایسا شخص جو ہر دکھائی دینے والی چیز کو بتانے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس وعدے کی بنیاد پر پیسہ لیتا ہے وہ اگر دیکھی ہوئی چیزوں کو نہیں لکھتا تو یہ نہ صرف جھوٹ ہے بلکہ

وہ سوچے ہی جا رہا تھا۔ کہاں انگریزوں کا وہ زمانہ اور کہاں آج کا ہمارا جمہوری نظام! یہ سفر تو ہمارے اجداد نے نہ جانے جنگ آزادی کے کتنے جاں کش قربانیوں کے بعد طے کیا ہے، آزادی ملی تھی تو اتنی خوشی پیدا ہوئی تھی کہ اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ہم نے یوم آزادی اور یومِ جمہوریت کو سالانہ تیوہار بنا ڈالا۔ اتنی خوشی بلا وجہ تو نہیں ہوئی ہوگی۔

پھر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟

کالا پانی سے زیادہ بے رحمی اور بے بسی۔ کالا پانی سے زیادہ لاقانونیت۔

اس نے نظریں گھما کر جیسے چاروں طرف اپنے ماحول کو دیکھا۔ لوگ ہنس بول رہے تھے، اپنی مرضی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کسی کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں تھیں، لوگ حکومتوں کو گرا دیتے تھے۔ سڑکوں پر جلوس نکال سکتے تھے۔ نعرے لگا سکتے تھے۔ متحد ہو کر اپنی سیاسی پارٹی بنا سکتے تھے۔ الیکشن لڑ کر خود حکومت کرنے جا سکتے تھے۔

سوچتے سوچتے اسے لگا کہ وہ غلط تھا کہ اچانک پھر اس کے ذہن کو جھٹکا لگا اور وہ سہم گیا جیسے وہ بہت بڑا دھوکہ کھاتے کھاتے بچ گیا ہو۔

''چلمن۔'' وہ اس پہلو کو کیوں بھول گیا تھا۔

آزاد تو شیر علی بھی تھا'' پھر وہی ہوا، کالا پانی کا بھوت پھر اس کے ذہن کو چکن دے رہا تھا۔ وہ پھر جیسے گرا پڑا تھا۔

اس کی نظر پھر چلمن پر پڑی۔

اس کا جی چاہا وہ اس چلمن کو ہی چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ صرف اسی طرح اس الجھن سے باہر آ سکتا ہے۔

چلمن کی منافقانہ وجود نے ہی یہ سارا بکھیڑا کھڑا کیا تھا۔

اسی کو میڈیا نہیں پڑھ رہی تھی۔

یہیں تو اندھیرا تھا۔

شاید وہ اپنی زندگی میں یہ کام کر سکے۔ اپنے پیشے کا حق ادا کر سکے گا۔ اسے لگا کہ اس نے ایک ایسی چیز دریافت کر لی ہے جو اس کی زندگی کو با معنی بنا سکتی ہے۔

شیر علی کی طرح۔

پھر شیر علی۔

شیر علی کا مجسمہ اب بھی ایک بیٹھے ہوئے شیر ببر کی طرح کسی پہاڑ کی جسامت کے ساتھ سامنے آ گیا تھا۔

اس نے شیر علی کے مجسمے سے نظر بچانے کے لیے نظریں نیچی کر لیں جیسے نظر چرا رہا ہو۔ ایک لمحے کے بعد ایک مشفقانہ آواز آئی۔

''نندی گرام کے باسیوں سے پوچھو''

خالد سہیل نے مجبوراً نظر اٹھا لیں اور شیر علی سے نظریں ملا کر اس کی آنکھوں میں

دیکھنے لگا جیسے اب کوئی اجنبیت باقی نہیں رہ گئی تھی، بالکل ایسے جیسے کوئی نوجوان اپنے بزرگ سے مکمل یکسوئی کے ساتھ نصیحت لے رہا ہو۔ پھر اسے خیال آیا شیر علی کالا پانی میں اس کے دادا کا ہم عصر تھا اور ان کے ساتھیوں میں رہا ہوگا۔ ممکن ہے دونوں کے خیالات ملتے ہوں۔

اس کے ذہن کو اب بھی چین نہیں تھا۔ کچھ تھا جو اسے تکلیف دے رہا تھا۔ اور وہ کچھ ایسا تھا جو بہت وسیع اور بڑا تھا۔ اور اس کی جڑیں بہت گہرائی میں پیوست تھیں۔ اور کسی انجانے سمت میں پوشیدہ تھیں۔

ادب کا چشمہ حیات کہاں سوکھ گیا

ناول کا فن انسانی ذہن کی وسعتوں کو وسیع تر کرنے کا فن ہے اور ناول کے فن کا یہ بنیادی خاصہ ہے کہ وہ انسان کی دور اندیشی میں اضافہ کرے۔

لیکن خود ادب کے میدان میں عام آدمی کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا ہے؟

اچانک اسے کچھ یاد آیا اور اس کی برق رفتار سوچ لڑکھڑا سی گئی۔

ایک بار جب وہ ادب میں جدیدیت کی تحریک کے بارے میں کتابیں پڑھ رہا تھا تو Carey John کی کتاب The Intellectuals and the Masses کے کچھ جملوں پر چونکا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"The intellectuals could not, of course, actually prevent the masses from attaining literacy. But they could prevent them reading literature by making it too difficult for them to understand—and this is what they did. The early twentieth century saw a determined effort, on the part of the

European intelligentsia, to exclude the masses from culture. In England this movement has become known as modernism.

--John Carey, , p. 16-17

ادیبوں نے خود اپنے لوگوں کو دھوکا دیا ہے۔ ادیبوں کہ بارے میں پتہ نہیں کیسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ اور ان پر اس نے 'شیطان' کے عنوان سے کبھی ایک نظم بھی لکھی تھی۔

ادیبوں کو یا تو تفریح کا سامان بنا دیا گیا ہے یا پھر انہیں انعامات سے نواز کر اقتدار کے چشم وابرو کے اشاروں پر لکھنے والے منشیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ دنیا کے انسانوں کے لئے دور اندیشی کی تربیت دینے والا ادب کہاں چلا گیا؟ انسانیت کو روشنیوں کے حصار میں گھیر کر سیہ تحریروں سے بے خبر کر دیا گیا ہے۔ ان کے ذہنوں کی تعمیر ایسے کی جا رہی ہے جیسے کمپیوٹر میں پروگرام لگائے جاتے ہیں۔ وہ ادیب جو ذہن و عقل کی کھڑکیاں آسمانوں تک کھول دیتے وہ کہاں ہیں؟ کسی عہد میں عظیم ادیبوں کے عنقا ہونے کا مطلب ہے عظیم انسانوں کا پیدا ہونا بند ہو جانا۔ بغیر بڑی سوچ کے عظیم انسان پیدا نہیں ہوتے اور عظیم انسانوں کے پاس سوچنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ سچے ادیب عوام کے دوست ہوتے ہیں لیکن مافیائی طاقتیں عوام کے دوستوں کی ہی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔

جان کیری کے مطابق عوام کے دوستوں کی کرسی پر عوام کے دشمن دوستوں کے بھیس میں بیٹھے رہے۔

عظیم ذہن پیدا ہونا بند ہو گئے۔

برطانوی حکومت کا ایک دن سورج ڈوبنے والا تھا لیکن کیا یہ کسی کو دکھائی دے رہا تھا۔

جاپان پر ایٹم بم گرنے والا تھا لیکن کیا کسی کو دکھائی دے رہا تھا۔

روس ٹوٹنے والا تھا لیکن کیا کسی کو دکھائی دے رہا تھا؟

کیسے بڑے بڑے دماغ محیر رتماشائیوں کی طرح ہندوستان کی تقسیم کے بعد کروڑوں انسانوں کی جاں سوز ہجرت کے وقت جو قتل ہوئے انسانوں کا منظر دیکھ رہے تھے۔

کیا خاموشی سے یہ مان لینا چاہیے کہ وہ جو کچھ کر رہے تھے وہ ان کی پسند کے مطابق تھا اور اس میں کیسی ان کے بصیرت کی کمزوری شامل نہیں تھی؟

یہ سوچنا کہ حکمراں ذہنی اعتبار سے مکمل ہوتے ہیں اپنے آپ میں آنکھوں پر پردہ ڈالنے جیسی بات ہے۔ یہ سارے لوگ وقت کے پیدا کیے ہوئے ایسے نامکمل لوگ ہوتے ہیں جن کے شعور کو تزئین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پھوڑوں کی تکلیف سے ہم تبھی نجات پا سکتے ہیں جب ہم ایسے مفکر پیدا کریں جو ان ذمے داریوں کو سنبھال سکیں۔۔

انسانی تہذیب نے مذاہب اور سماجیات کے ذریعے انسانی زندگی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیروں میں مشعل در مشعل روشن کیے ہیں۔ لیکن اس مہم کو مذہب گہرائیوں میں اتارنے کی ضرورت ہے۔

انسان کی کوتاہ نظروں کو دور کرنے کی اور اس کے دل میں کشادگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

مذاہب اور سماجیات نے جن روشنیوں کا انکشاف کیا ہے ان انسان کی بصیرت، تجربے اور حوصلے کا حصہ بنانے کی ضرورت باقی ہے۔

اس کو فطرت کی جانب سے اپنی گرفتاری میں رکھنے کے لئے مسلط کی گئی غصہ،

نفرت، لالچی خوف انتقام عنا اور بے بسی جیسے (غصہ نفرت لالچ) کیے گئے عوامل سے لڑنے اور ان پر قابو پانے کے لئے میدان فکر مہیا کرنے کی ضروت ہے۔

آج کے دور میں جب انسان کے ہاتھوں میں ایٹم بم جیسے تباہ کن ہتھیار آگے ہیں یہ بات امن عالم کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے کردار اسے لے کر جو جمہوری نظام میں حکمرانوں کے ذہن پر دباؤ بناتے ہیں، بڑے کرداروں تک کے جو پوری دنیا کو متاثر کر دینے والے فیصلے کر دیتے ہیں سب کرداروں کا ناولوں میں اس طرح تجزیہ کیا جائے کہ ان کرداروں کو اندرونی کشمکش، لغزشوں کے امکانات روشن ہوں۔

ادب کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ہدایت نہیں بلکہ بصیرت کے ذریعے ان تمام کرداروں کے ذہین کو روشن کرے۔

ادب کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان تمام کرداروں کو اپنے اندر دور اندیشی کی صفات پیدا کرنے کا سامان مہیا کرے۔

زمانہ قدیم سے ہی اہل بصیرت لوگ اپنے زمانے کے حکمرانوں کی تربیت کرتے رہے ہیں۔ دنیا کا ادب ایسی کہانیوں سے بھرا پڑا ہے جن کا نشانہ اوباب حل کی عقد کے ذہنوں کو انسانی قدروں سے مامور کرنا ہے۔

مقبولیت اور طاقت کی بنیاد پر اقتدار میں آنے کے بعد حکمرانوں کو دیرپا حکومتیں قائم کرنے کے لئے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔

اور دور اندیشی اس علم کا مرکزی حصہ ہے۔

ویلن ہوں یا ارباب حل وعقد ہوں سے کے لئے راہ نجات دینا ضروری ہے۔

آج کی دنیا میں ادیبوں خصوصاً ناول نگاروں کی اہمیت تاریخ کے بڑے بڑے سائنس دانوں سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔

لیکن یہی وہ میدان ہے۔جس میں تخلیقی ادب نے اپنا حق ادا نہیں کیا ہے۔

ہمارے ادیب اس منصب اپنے کا حق ادا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

کہیں وہ اس لئے کہ انھوں نے اپنی ذمے داریوں کو نہیں سمجھا کہیں اس لیے کہ سچائی کو بیان کرنے میں انھوں نے وہ جراءت نہیں دکھائی جوان سائنسدانوں میں تھی جنھیں سچ بولنے کے عوض زندہ آگ میں جلادیا گیا۔

لیکن جن لوگوں کو قدرت نے یہ توفیق دی ہے کہ وہ سچائی کو دیکھ سکیں اور اس کو بیان کرسکیں ان سے انسانیت یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ قدرت کی اس دین کا حق ادا کریں۔

ہمیں اس ادیب کی ذمے داری کا پتہ ملتا ہے لیکن خوفناک جنگلوں، ریگستانوں، کوہستانوں اور سمندروں کی طرف جانے والا یہی راستہ تو بند تھا، بالکل ویسے جیسے شیر علی کے لیے کالاپانی میں سارے راستوں کے دروازے بند تھے۔

ہم ابھی تک تہذیبوں کے ٹکراؤ کی دنیا میں گھرے ہوئے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ہمارا اصل ٹکراؤ خود اپنے ذہن کے اندھیروں سے ہے۔

ڈاکٹر والکر کا ذہن بھی انھیں چلمنوں میں گھرا ہوا تھا۔اگر ایسا نہ ہوتا تو لارڈ میو کیوں مارا جاتا۔

خالد سہیل نے شیر علی کے لیے خیالی مجسمے کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔

اس کنویں سے نکلنا ہے تو صرف ایک رسی پکڑو۔

آتش فشاں بھی باہر نکلنے کے لئے صرف ایک راستہ ڈھونڈتا ہے۔

حاکم ومحکوم کا رشتہ ہی ہمارے گلے کے پھندے کی وہ گانٹھ ہے جو ہمارے آباو اجداد سے لیکر اب تک ہمیں جکڑے ہوئے ہے اور اگر اسے نہیں کھولا تو یہ گانٹھ ہمارے بچوں کے گلے میں منتقل ہو جائے گی۔

یہ گانٹھ ہمارے گلے کے باہر نہیں بلکہ ہمارے دلوں کے اندر ہے۔

یہ ہمارے اس خیال کے اندر ہے کہ اس گانٹھ کا وجود ہمارے اس سماج کو چلانے کیلئے ضروری ہے جس میں ہم رہتے ہیں ورنہ لوگ ہمیں لوٹ لیں گے۔لٹیروں کو قابو میں رکھنے کے لئے ڈنڈا ضروری ہے لیکن اس کیلئے محافظوں کو، جن کی تقرر ہوئی ہے ایسے نہاں خانے بنانے کی کیا ضرورت ہے جن کے اندر جھانکنے کی خود ہمیں بھی اجازت نہیں، خود اپنے دکھوں کی وجہ جاننے کیلئے بھی اس میں جھانکنے کی اجازت نہیں۔

ہم لوگوں کی جن برائیوں سے ڈرتے ہیں ان کا تدارک تو قانون کے ڈنڈوں سے ہوسکتا ہے۔حکومت قانون کی ہونی چاہئے۔لیکن قانون کی حکومت تو نہیں ہے کیونکہ جابجا وہی لٹیرے اندرون خانہ محافظوں کے دستوں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ان چھوٹے لٹیروں کو بھی ان نہاں خانوں میں پچھلے راستوں سے جانے کی بھرپور اجازت ہے۔اگر کسی کو اجازت نہیں ہے تو ایماندار شہریوں کو اجازت نہیں ہے۔اور ایماندار شہری باہر بے بسی کے عالم میں بے دست و پا کھڑے ہیں۔

ایک بار چلمن اٹھے تو پورا منظر صاف دکھائی دے۔

یہ نسخہ ہے جسے کبھی آزمایا نہیں گیا۔ اور اس نسخے کی ہمیشہ مخالفت کی گئی۔ لیکن جن بنیادوں پر ان کی مخالفت کی گئی وہ فریب ثابت ہوئیں۔ یہ بنیادیں تھیں کہ حاکم ایماندار لوگوں کو ہونا چاہئے اور وہ ایماندار ہوتے ہیں اور وہ تنہائی میں انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ عوام کی بھلائی میں ڈوبے رہتے ہیں۔

یہ بنیادیں تھیں کہ لٹیروں کے خلاف حربے بنانے کیلئے رازتنہائی کا قلعہ چاہئے۔

لیکن یہ غلط ثابت ہوئیں کیونکہ انسان بنیادی طور پر خود غرض ہے۔ حاکمانہ جبلت رکھتا ہے۔ اختیار کا بھوکا ہے۔ اور اس کے لئے اس کے ایمان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔

انسان پیسوں کے لالچ میں اپنے باپ اور بھائیوں کو دھوکا دیتا ہے۔ اپنی محبت کرنے والی بیوی کو جلا دیتا ہے۔ پھر اپنی متاع زندگی کے بارے میں گہرے فیصلے لینے کے عمل کو خطرناک تخلیہ میں کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ یہ صرف ہماری تساہلی کا نتیجہ ہے۔ اور ہمارے دکھ اس تساہلی اور سادہ لوحی کا نتیجہ ہیں۔ ہماری تساہلی ہی ہماری گردن میں پڑی گانٹھ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یہ گانٹھ ایک بیماری ہے جس کا کھلنا ضروری ہے اور یہیں سے ہماری آزادی کی جوالا مکھی باہر نکلے گی۔

اس گانٹھ کی رسی ہم نے اپنی گردنوں میں خود ہی ڈال رکھی ہے۔ دوسروں نے صرف چالاکی سے اس میں گانٹھ ڈال دی ہے اور اب وہ اس گانٹھ کے فوائد پر اصرار کرتے ہیں۔ اسے مختلف دلیلوں سے فطری ضرورت بتاتے ہیں۔ دراصل انہیں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان کے پاس قانون کے مطابق کام نہ کرنے اور بدعنوان ہونے کی صورت میں حکومت ان کی حفاظت نہ کر سکے، قانون سے ان کو کوئی چھوٹ نہ ہو، نہ لمبی کارروائیوں کے وقت کھانے والے ضابطوں کی شکل میں، نہ ان کارروائیوں کا اختیار صرف ان کے آقاؤں کے پاس ہونے کی شکل میں۔

جب سوچ بدلتی ہے تو حکومتیں بدل جاتی ہیں۔

جب عقیدے بدلتے ہیں تو حکومتیں بدل جاتی ہیں۔

جب نظر بدلتی ہے تو نگاہِ انتخاب بدل جاتی ہے۔

جب لاوا پگھلتا ہی اور اس سے دھواں خارج ہوتا ہے تو آتش فشاں کے منھ خود بخود وا ہو جاتے ہیں۔

ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں ٹن بھاری چٹانیں ٹوٹ جاتی ہیں۔

جب تم غذا اپنا بند کر دو گے تو جراثیم خود بخود مٹ جائیں گے۔

جب زمین کی آب وہوا بدلتی ہے تو بڑے بڑے ڈائینا سور فنا ہو جاتے ہیں۔

اس دھوکے میں مت آؤ کہ معاشیات بدلتی ہے تبھی طبقات بدلتے ہیں۔ سیاسی نظام کی بنیادیں انسانی سوچ پر قائم ہیں۔

ذہنی راہ عمل کے انتخاب کے اس لمحے میں اسے رازداری کی چند مثالیں یاد آنے لگیں۔ جب وہ ڈرائیونگ لائیسنس بنوانے گیا تھا تو کھڑکی پر کتنی لمبی لائن لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس میں بیشتر لوگ کئی دنوں سے لائن میں کھڑے ہو رہے ہیں اور ان کے کاغذات میں روزانہ کچھ نہ کچھ کمی نکلتی ہے جبکہ اس دفتر کے پاس بیٹھے ٹائپسٹوں کے بیچ بش شرٹ اور پینٹ پہنے جو چوکنا نگاہوں والے کئی لوگ جو وہاں بظاہر بلا کسی وجہ کے وہاں ہوتے ہیں وہ پانچ سو

روپے لیکر اندر جاتے ہیں اور ایک گھنٹے میں فوٹو کھنچوا کر لائسنس دے دیتے ہیں۔

یہ تو خیر سبھی جانتے ہیں لیکن تعجب خیز منظر وہ تھا جو اسے اب یاد آرہا تھا۔ ہوا یہ کہ کچھ بلڈرس نے ایک جنگل کے علاقے میں دھڑا دھڑ بڑی بڑی زمینیں کسانوں سے یہ کہ کر خرید لیں کہ وہ وہاں کچھ خاص طرح کی کھیتی کرنا چاہتے ہیں۔ پھر انہوں نے وہاں تک کے لئے کچھ معمولی سڑکیں بنائیں اور پھر تو وہاں جو منظر تھا وہ دیکھنے کی لائق تھا۔ اینٹیں گرنے لگیں، بھاری بھاری مشینیں آنے لگیں اور اس لق و دق جگہ پر کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہونے لگیں۔ کوئی پوچھے بھلا یہاں کون رہے گا۔ لیکن جو پوچھے سو احمق۔ اور احمقوں کی دنیا میں کمی نہیں۔

اس کے بعد اخباروں میں خبر آئی کہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں سے ملک کی ایک بڑی شاہراہ گزرے گی۔

اسے اپنا ہی واقعہ یاد آیا۔

وہ مقابلے کے امتحان میں ناکام ہونے کے اعلان کے بعد ملک کی بڑی عدالت میں پہنچا تھا اور چیلنج کیا تھا کہ اس کے نمبر کامیاب ہونے والے امیدواروں سے زیادہ تھے۔ کمیشن نے اس سے انکار نہیں کیا لیکن کہا کہ دراصل نمبر گھٹائے بڑھائے بھی جاتے ہیں۔ سوال کیا گیا کہ ایسا کن بنیادوں پر ہوتا ہے تو کمیشن نے کہا کہ عوام کو یہ بات بتائی نہیں جاسکتی کیونکہ یہ ایک فن ہے جو سرکار کی نجی دولت ہے۔

یعنی عوام کو رازداری کے نام پر اپنے اصل حاکموں کے انتخاب سے بھی بے دخل کیا جا چکا تھا۔

یہ معاملہ آمریت سے کتنی دور رہ گیا تھا۔

جمہوریت اپنے آپ میں کوئی مکمل طور پر جنت نہیں ہوتی۔ اس میں اگر جنت

پیدا ہو سکتی ہے تو دوزخ کی آگ پیدا کرنے کی بھی اس میں مکمل گنجائش ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بھی سن لو کہ یہ حکمرانی سے زیادہ مکاری کا کھیل ہے۔

جمہوریت ایک عبوری دور ہے،

جمہوریت میں کوئی حکمراں نہیں ہوتا۔

جمہوریت نام ہے دھوکے میں رکھ کر لوٹنے کا۔

بھروسہ دلا کر لوٹنے کا۔

یہ تاجروں کا فن ہے اور اسی سے تجارت کے عروج کے ساتھ یہ دنیا میں غالب آئی ہے۔

تاجر ہر طرح کے جذبے سے مبرّا ہوتا ہے کیونکہ وہ ترازو کے ایک پلڑے پر کھڑا ہوتا ہے۔

جمہوریت میں حکمراں حکومت نہیں کرتا بلکہ ہمراہ بن کر پیٹھ میں چھرا بھونکتا ہے۔

ہم تب تک محفوظ نہیں جب تک حکمراں اور محکوم کے تصورات سے باہر نہ نکل آئیں۔

جمہوریت میں تاجر حکمرانوں کی شرح منافع ہماری، حکمراں کی ضرورت محسوس کرنے میں مضمر ہے۔ تاجر حکمراں جانتا ہے کہ ہم خود حکومت نہیں کر سکتے اور وہ ہماری اس کمزوری کا حتی الامکان فائدہ اٹھاتا ہے۔

اس نظام میں وہی کامیاب ہوگا جو تاجرانہ ذہن رکھتا ہوگا۔اور تاجرانہ ذہن کو سمجھتا ہوگا۔

اور تاجر بھی کیسا؟

انتہائی مکار اور چالاک۔

جمہوریت حکمرانی اور تجارت کا ایک انتہائی عجیب وغریب حلول ہے۔

جمہوری نظام میں حاکموں سے روایتی حاکموں جیسی توقع رکھنا بیجا ہے۔

اور سارا دھوکہ اسی میں ہے کہ جمہوریت کہ نظام میں حکومت پر روایتی حکومتوں جیسا بھروسہ رکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور پردوں اور پہروں کے وہی دبیز چلمن قایم رکھے جاتے ہیں۔

بھلا تاجرانہ رشتے میں چلمن کیسی؟

دشمنوں کے نام پر رازداری۔

لیکن جمہوریت میں سب سے زیادہ خطرہ تو خود حاکم سے ہوتا ہے کہ وہ نظام کو چلانے کی ذمہ داری ہی تاجرانہ شرائط پر لیتا ہے۔ ہر الیکشن کا ایک ٹھیکہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد تو صرف ثمن آتے ہیں۔

جمہوریت کے عہدیدار بیرونی طور پر حاکم اور اندرونی طور پر ماہر تاجر ہوتے ہیں۔

جمہوریت میں کوئی حاکم یا محافظ نہیں ہوتا، یہاں سبھی شکاری یا شکار ہوتے ہیں۔ جو اس بات کو سمجھتا ہے وہ شکاری بن کر رہتا ہے، جو نہیں سمجھتا وہ شکار بن کر رہتا ہے، اور شکاریوں سے رحم کی امید رکھتا ہے۔ان سے بے رحمی کے گلے کرتا ہے۔اور اپنے لئے ایسے شکاری کی تلاش میں رہتا ہے جو اس سے وفا کرے۔ کچھ شکاری ایسے وفادار جانوروں کو پالتو مویشی بنالیتے ہیں، اور انہیں بوقت ضرورت ذبح کرتے رہتے یا پھر ان کا دودھ دوہتے رہتے ہیں۔اور زیادہ دودھ حاصل کرنے کے لئے ان کے بچوں کو مکاری کے ساتھ مار دیتے ہیں۔ بڑی بڑی سیاسی جماعتیں محض گوشت خور پیڑ ہوتی ہیں۔ان کی مسکراہٹیں، ان کے وعدے، ان کی میٹھی آوازیں، سب ٹھگی کے ہتھیار ہوتے ہیں۔

روایتی حکومتوں سے تجارتی جمہوریت میں انتقال دراصل لوگوں کو محفوظ گھروں سے بازی گاہ میں لانے کا عمل ہوتا ہے۔لہٰذا جمہوریت میں آزادی کے ساتھ انفرادی خود مختاری، اور خود مختاری کے ساتھ اس خود مختاری کو بچانے کی صلاحیت اور قوت اس خطرناک کھیل کے میدان کا لازمی تقاضا ہے۔

ہم تاریخ کی ایک اہم تبدیلی کے تحت اس نظام میں داخل ہوئے ہیں اور اس کے لے دوسرا کوئی ذمہ دار نہیں۔ یہ ہماری تقدیر ہے اور ہمیں اس کو سمجھنا ہے۔ شکار کے اس میدان میں فرد کا خیر اس میں ہے کہ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں اور گروہ بندیوں کے ذریعہ اپنی بقا اور تحفظ کا انتظام کرے۔

یاد رکھو کہ جمہوریت ایک بے ایماں جنگل ہے۔

اور جو شخص اس حقیقت کا منکر ہے وہ یا تو بیوقوف دوست ہے یا تمہارا مکار دشمن شکاری۔

جمہوریت کی دلکشی بس اتنی سی ہے کہ تم اس میں اپنی تقدیر بغیر تلوار اٹھائے ہوئے بدل سکتے ہو کہ جمہوریت میں یقین رکھنے والے خونی جنگ نہیں چاہتے۔ لہٰذا جمہوریت مکمل اس دن ہوگی جب ہر شخص اپنی خودمختاری کی ذمہ داری کو اٹھانے کا اہل اور اس کے لے تیار ہو جائے گا۔

اور اس کے علاوہ نجات کا اور کوئی راستہ نہیں۔

کہ اگر اس کی جگہ کوئی آمرانہ حکومت آ گئی تو اس خودمختاری کی ہی موت ہو جائے گی جس میں تمہاری مکمل فلاح و بہبود پنہاں ہے اور تم مکمل غلامی میں قید ہو جاؤ گے اور پھر ڈاکٹر والکر کی حکومت ہوگی اور تم ہو گے۔

تمہاری نجات تمہاری اس جرات میں پنہاں ہے کہ تم اپنی سلامتی کی ذمہ داری خود اٹھاؤ۔

اور تمہاری مکمل تباہی اس تساہلی میں پنہاں ہے کہ تم اس میں غفلت برتو۔

تمہیں اپنے اندر ایک مکمل تاجرانہ ذہن کو فروغ دینا ہوگا۔

اور پھر انسانی قدروں سے اپنے کو روشن کرنا ہوگا۔

تاکہ تمہارے اندر کوئی کالاپانی وجود میں نہ آئے۔

تاکہ تم تاجر کے بجائے لٹیرے نہ بن جاؤ۔

اور زمین پر انسانیت کے چراغ روشن کر سکو۔

اور کائنات کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ قربانی کے جزبے کا لطف اٹھاؤ۔

کہ قربانی سے زیادہ لذیز اور کوئی جذبہ نہیں

اور یہ بڑے انسانوں کی پہچان ہے۔

یہ عظمتِ انسانی کا پرچم ہے۔

اور یہ پرچم آج کی دنیا میں جھکا ہوا ہے۔

بلکہ زمیں بوس ہو چکا ہے۔

اس پرچم کو زمین پر سرفراز کرو۔

کہ تاریخ میں فتح انسانی کے نشان قائم ہوں۔

اور مافیا طرزِ فکر کا زوال ہو۔

کہ روشنی اور اندھیرے میں فرق ہے،

اور روشنی سے مینارۂ نور بنتے ہیں۔

کہ یہ نفسِ امارہ پر حاوی ہونے کی نشانی ہے،

بڑے موزی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا

نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

وہ گنگنانے لگا

بڑے موذی کو۔

نہنگ واژدہا۔۔۔

خود غرض لوگ تو دراصل ایک خاص طرح کی بزدلی اور احساسِ عدم تحفظ کے قیدی ہوتے ہیں۔

اور ایسے ہی لوگوں نے زمین کو عظمت انسانی سے محروم کر دیا ہے۔

OO

اس نے کچھ چیزیں بلوگ کی شکل میں لکھیں لیکن ابھی بھیجا نہیں تھا۔

وہ کون ہے جو ابھی تک بے فکری سے ہمارے اوپر حکومت کر رہا ہے۔

حاکم و محکوم کا فرسودہ تصور ہی

کھجلی کا وہ جالا ہے جسے شیر علی نے بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔

ہماری ساری رسوائیاں انہی درباروں اور چلمنوں اور ڈیوڑھیوں کے دم سے ہیں۔ یہ چلمن، یہ ڈیوڑھیاں اور اس میں کام کرنے والے کارندے۔ یہ سب مشین ہیں کسی اور کے ہاتھ کی، ان کے ہاتھ کے جن کی تحفظ کے لئے یہ ضروری ہیں، کس سے بچنے کے لیے، ان عوام سے جن کا یہ اس مشین کے پیچھے بیٹھ کر خفیہ نلیوں سے خون چوستے ہیں۔ حاکم و محکوم کے رشتے والا یہ غیر جمہوری سماجی ڈھانچہ ہی بنیادی طور پر آقا و غلام کے رشتے پر قائم وہ خون چوسنے والی مشین ہے جو ہر طرح کی حکومت میں جاری رہتی ہے۔

چاہے وہ بادشاہت ہو، آمریت ہو یا جمہوریت ہو، اس رشتے کو قائم رکھنے والی قوتوں کی دلچسپی صرف اس ڈھانچے میں ہوتی ہے، جب تک یہ رشتہ موجود ہے، ان کی تجارت محفوظ ہے، باقی یہ کہ انقلابات تو انسانوں کی فطرت میں ہے اور انقلابات تو آتے ہی رہتے ہیں، اور حکومتوں کی شکل بدلنا انسان کی انقلابی جبلت کو رام کرنے کی پینترابازی ہی تو ہے۔

اور عیاری کا یہی وہ آسیب ہے جس نے ہزاروں سال سے ہمارے خوابوں کو ہمارے جسموں سمیت آسمان میں لٹکا رکھا ہے۔

یہی وہ بیماری ہے جو ہمیں نہیں چھوڑتی۔

یہی وہ بیماری ہے جس کا علاج ہمارے دانشور کبھی نہیں لا پائے کہ وہ کبھی خیالوں اور مفروضوں میں الجھے رہے اور انسان کی سرشت میں پوشیدہ ان عیاریوں سے ناواقف رہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے اور اقتدار کی خوراک ملتے ہی پنپنے لگتی ہے اور عیارانہ طریقوں اور بہانوں سے پردوں میں لپٹے تخلیے کی تعمیر کر کے رفتہ رفتہ اسے ایک مضبوط قلعہ میں تبدیل کر لیتی ہے۔

خوفناک ہتھیاروں سے لیس یہ تخلیہ ہی وہ لیبارٹری ہے جہاں عام آدمی کے جہنم کی آگ سلگائے رکھنے والا مادہ تیار کیا جاتا ہے۔

اور اس تخلیہ کی تعمیر بھی خاموشی سے اور ناقابل تردید دلیلوں اور بہانوں کی بنیاد پر ہوتی ہے اور اس تعمیر کے فیصلے کا یہی لمحہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب جمہوریت کے گلے پر چھری چل جاتی ہے اور بیچاری جمہوریت کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

اور پھر یہاں آنے والا ہر بکرا شیر بنتے ہی سب سے پہلے اس قتل گاہ جمہوریت کا سب سے بڑا محافظ بننے کا حلف لیتا ہے اور بصد شوق محافظ بن بیٹھتا ہے۔ اور پھر اس کے

اور عوام کے بیچ ہزاروں من بھاری چلمن گرا دیے جاتے ہیں۔ وہ وہاں عوام کی نہیں قانون کی حفاظت کی قسمیں کھاتا ہے، اور یہ بھول جاتا ہے کہ جو قانون عوام کی حفاظت نہیں کر سکا اس کی حفاظت کی قسمیں کھانے کی ایسی عجلت کیا ہے، اور یہ کہ وہ جانے مانے قوانین کے ساتھ ان قوانین کی حفاظت کی قسمیں بھی کھالیتا ہے جن کی بنیاد پر عوام کو معاملات حکومت سے دور رکھنے والا قلعہ پہلے سے کھڑا ہوتا ہے۔ کیسے کیسے ایک ہمدرد اور محافظ خطرناک اور بدترین دشمن میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اس کا فن صرف کہنہ مشق معمار حکومت، بادشاہ گر، حکومت ساز لومڑیاں جانتی ہیں جو دراصل انسان کی ابدی محرومی کے جراثیم ہیں جن کو مارنے والی دوا کم از کم ابھی تک انسان نہیں ایجاد کر پایا کہ وہ ہمیشہ حاکموں کو ہی اصل حاکم سمجھتا رہا جبکہ سارے حاکم چاہے وہ بادشاہ ہوں، آمر ہوں یا جمہوریت کے نمائندے، سبھی دراصل اس حسینہ کے جادو کے تابع ہوتے ہیں لیکن اپنے کو مالک و مختار سمجھتے ہیں۔

سوائے ان لمحوں کے جب انہیں اس حسینہ کے اشارے پر اپنی ماں کو قتل کرنے سے بھی انکار کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی۔

کیا یہ باتیں میرے پڑھنے والوں کے ذہن میں اتریں گی؟ خالد سہیل نے سوچا۔

میں بھی کتنی مشکل بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ عوام سے پہلے تو یہ لومڑیاں چوکس ہو جائیں گی۔

وہ لوگوں کو کائنات کی بہترین مشروبات پلا پلا کر محکوم بنے رہنے کے فائدے سمجھائیں گے۔

اور جب وہ سمجھائیں گے تو دیکھنا ان لوگوں کو جن کے کندھوں پر سر رکھ کر تم ان سے انسانی تاریخ کے لمبے دکھوں کے اسرار پر گفتگو کرنا چاہتے ہو‘ان کی بات کتنی آسانی سے سمجھ میں آئیگی۔

برسوں سے وہ لوگوں کو گھروں میں، نکڑوں پر، ٹرینوں میں عوام کی بدحالی اور ملک کی انتہائی خراب صورت حال پر بحثیں کرتے سنتا آیا تھا۔ لوگ ہر زاویے سے بحث کرتے لیکن آخر میں اس بات پر ٹھنڈے پڑ جاتے کہ کریں کیا۔ جواب کسی کے پاس نہیں تھا کہ کریں کیا اور کچھ کریں تو شروع کہاں سے کریں۔

آج اسے اس سوال کا مکمل جواب ملا تھا۔

آج اسے شاہراہ دکھائی دے رہی تھی۔

کیا اتنے بڑے ملک میں صرف اسے ہی یہ شاہراہ پہلی بار دکھائی دے رہی تھی۔

یقین کرنا تو مشکل تھا لیکن پھر اس نے سوچا اور ایک نتیجے تک پہنچا۔

'ایسا ہی ہوتا ہے۔'

'لاکھوں کروڑوں انسانوں میں کسی ایک کے ذہن میں یہ بات اٹھتی ہے کہ ابلتے پانی کی کیتلی کی بھاپ میں انجن چلانے کی طاقت ہو سکتی ہے۔ ابتدا میں ایسا سوچنے والے بہت معمولی لوگ ہی ہوتے ہیں البتہ یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو کسی بےچینی کے شکار ہوتے ہیں۔'

اسے لوگوں کے اوپر بہت گہرا شک ہے۔

اور وہ اس شک سے نکل نہیں پاتا۔

جن کو وہ اپنے ہی جیسا مظلوم سمجھتا ہے ان کے ارادے کیا ہیں یہ وہ نہیں جانتا۔

لوگ اپنے فائدے کی باتیں تو دھیان سے سنتے ہیں لیکن جب عمل کی دعوت دی جاتی ہے تو ان کے دلوں میں نہ جانے اور کیا کیا آتا ہے جس پر وہ باتیں بھی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ انقلاب کی دعوت دینے والوں کو صرف اپنا خیر خواہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کو ان کے فرقے، طبقے اور نہ جانے کن کن چیزوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ان کی نظریں دانشمندی سے چھلکنے لگتی ہیں۔

ان کے دلوں میں یہ خیال اٹھنے لگتا ہے کہ یہ آدمی جو آج ہمارے برابر ہے کل کوئی عظیم رہنما نہ بن جائے۔

یہ لوگ سچ مچ کوڑھی اور قیدی ہیں۔

انسانوں کی یہ دنیا جو مظلومیت کے اس جیل میں قید تھی، یہ خود ہی بے حد

چالاک، منافق، پراسرار اور ناقابل اعتبار تھی۔

اور پھر یہ کہ وہ اپنی دانشوری کو تمہاری سوچ سے زیادہ اہمیت دیں گے۔

تم لاکھ ان کی لئے سوچو، وہ یہی سوچیں گے کہ تم نیتا گیری کے چکر میں یہ سب کچھ کر رہے ہو۔ تمہارے خیالات کو وہ خوبصورت شاعری کی طرح سن یا پڑھ لیں گے۔ اس کے بعد دیکھنا۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ چپ چاپ کچھ دے دلا کر اپنے مقدمے کو نپٹا لو اور سکون کی زندگی جیو۔ وہ جو سمن آیا ہے اسے لے کر عدالت سے تحقیقات کرو۔ کسی وکیل کو لگاؤ۔ جواب لکھواؤ۔

ڈیڑھ سو سال سے یہی تو ہو رہا ہے۔

کچہری سے لیکر ایوان حکومت تک کے چکر۔

اس نے سوچا۔

ان سب باتوں نے ایک ساتھ ملکر سہیل کے حوصلے کو بری طرح پست کر دیا۔

❖❖

لوگوں کو اس کی ذات میں گہری دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ سب جاننا چاہتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں لگ بھگ روز ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ کئی لوگ کبھی کبھی اس کی نظموں کے ٹکڑے بھی آپس میں سنتے سناتے تھے جو ان کو یاد ہوگئی تھیں۔

لوگوں کو انتظار تھا کہ وہ کوئی اچھی سی کتاب لکھ کر نکلے گا۔

لوگ اسے صوفی کہنے لگے تھے۔ والد نے ہی ایک دن اسے بتایا تھا کہ کس طرح صوفی فاقہ کرتے ہیں اور ترک دنیا کرتے ہیں' یہ بھی بتایا تھا کہ ترک دنیا کا مطلب دنیا کی ذمہ داریوں یا اس کے لطف کو ترک کرنا قطعی نہیں ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہے کہ اپنے اعمال اور کوششوں کی رہنمائی وہ روشنی کر رہی ہو جو روحانی بلندی عطا کرتی ہے اور انسان میں یہ قوت بھر پور طور پر اوج کر آئے کہ اگر کوئی چیز اصولاً غلط ہو تو محض خواہش کے اثر میں آ کر وہ کام نہیں کیا جائے۔ اور دراصل اسی صلاحیت کو حاصل کرنے کے لئے تربیت کے زمانے میں سختی کے ساتھ کئی جائز خواہشوں پر بھی قابو پانے کا مادہ پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ خالد کی کوششوں کو بھٹکا ہوا بتاتے رہے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اصل علم تک پہنچنے کے لئے مولانا روم کو بھی اپنی بھاری بھاری کتابوں کو کنارے کرنا پڑا۔ لیکن خالد تو دنیا کی باتیں کرتا ہے۔

صوفی دنیا کے جھمیلوں میں مثلاً سیاسی نوعیت کی باتوں میں نہیں پڑتے۔

❖❖

اس کے ذہن میں تناؤ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔

مان لو کہ تمہارے خیالات سے آگ لگ بھی گئی تو اس کا کیا ٹھکانہ کہ راکھ سے کیا نکلے گا۔ کیا ایک بار پھر وہی نہیں ہوگا جو ہر انقلاب کے بعد ہوتا ہے۔ کچھ ایسا جادو چلے گا کہ آنے والا انقلاب تمہیں پھانسی چڑھا جائے گا اور یہی لوگ تالیاں بجائیں گے۔

اس کے ذہن میں تاریکیوں کے بڑی بڑی لہروں والے طوفان اٹھنے لگے۔ اور وہ جو ایک عظیم پیڑ کی طرح اگ آیا تھا، ان طوفانوں کا سامنا کرتے کرتے ہلنے لگا۔ اس نے بے بسی سے ادھر دیکھا جدھر سے ہوا آ رہی تھی، اور اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا، ہواؤں کے دباؤ کا اپنی انتہائی قوت سے مقابلہ کرتا رہا لیکن پھر اس زمین نے ہی اس کا ساتھ نہیں دیا اور تب اسے محسوس ہوا کہ وہ جڑ سے اکھڑ رہا ہے، وہ جان گیا کہ کیا ہو رہا ہے، اور پھر طوفان کے بوچھار اس کی آنکھوں میں آ گئے۔ اور اس بوچھار کے ساتھ ہی اک نظم یاد آ گئی جو اس نے نہ جانے کیسے لمحوں میں اخبار میں ایک دل شکن خبر پر ایک کالم پڑھ کر تین چار برس پہلے لکھ دی تھی۔

یادوں کا مجرم

میرا چوکیداری

اب میرا دشمن بن گیا ہے

وہ کہتا ہے کہ اب وہ میری چوکیداری سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔

وہ مجھے دنیا کی ہر چیز سے محفوظ رکھے گا۔

یہاں تک کہ میری سوچ سے بھی۔

پھر اس نے ایک دن میرے ہاتھ مانگے کہ وہ اسے محفوظ رکھ دے گا۔

اور میرے ہاتھ کاٹ لئے۔

سو اس طرح

پہلے اس نے میرے ہاتھ مانگے

میں نے دے دیے

پھر اس نے میری آنکھیں مانگیں، میں نے دے دیں

پھر پاؤں کاٹ لیے

چند قدم آگے بڑھنے کے بعد وہ واپس آیا

اور اس نے حکم دیا کہ

کہ میں اسے یقین دلاؤں کہ میں چلاؤں گا نہیں

پھر اس نے میری زبان مانگی

میں نے دے دی

چلتے چلتے وہ پھر واپس آیا

اب وہ بڑا مرجھایا ہوا تھا

اس نے میرے درد پہ اپنے اندیشہ کا اظہار کیا

میں نے درد بھی دے دیے

لیکن اس کے تیور بدل گئے

وہ مجھے خاموش، شک بھری نظروں سے دیکھنے لگے

میں اس کے اگلے حکم کا منتظر تھا

کہ اسے بے پناہ غصہ آ گیا

وہ بے قابو ہو گیا

اور مجھے زور کا طمانچہ مارا

میں لکڑی کے بت کی طرح کھڑا رہا

پھر اس نے کہا

تم ضرور کچھ کرو گے

اور وہ وہیں ٹہل ٹہل کر

میری نگہبانی کرنے لگا

اب وہ مجھ سے خوفزدہ ہے

اور میں چپ ہوں کہ راہِ فرار کدھر ہے۔

کہ میں پوری طرح اس کی زد میں ہوں

اسے وائپر آئیلنڈ کا جلاد وہاں ٹہلتا دکھائی دینے لگا۔

یہ چوکیدار کون تھا؟

کبھی عوامی کپڑے پہنتا تھا، کبھی کھدر، کبھی مغربی لباس، اور کبھی یونیفارم اور کبھی ڈاکٹر کے لباس میں آتا تھا۔

یہ چوکیدار کون تھا ؟

عوام؟

حکومت؟

اس کے عزیز و اقارب اور پڑوسی وغیرہ؟

یہ لوگ سچ مچ کوڑھی اور قیدی ہیں۔

تو اصل مجرم یہ عوام ہیں جن کی مظلومیت پر میں اسقدر دکھی تھا اور جن کے

دکھوں کو میں اپنے دکھوں اپنا مشترکہ دکھ سمجھتا تھا۔

اس کا پورا کا پورا انقلابی طوفان ایک عبرتناک اور ہولناک تباہی کے ساتھ کسی ریگستان کی طرح پھیلے وسیع دلدل میں دھنسنے لگا۔ اور دھنستے دھنستے اس نے ابتک جو کچھ سوچا تھا وہ اس دلدل میں منہ کے بل جا گرا ہوا۔ نجات انسانی کی تلاش کرتے کرتے اس کے سامنے اچانک ہی ایک ایسی حقیقت ابھر آئی جس کا سامنا کرنے کیلئے اب اس کے اندر طاقت نہیں بچی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اور سر میں ڈوبتے جہازوں کے ہچکولوں سے چاروں طرف ابھرتی ہوئی اونچی اونچی لہروں نے واپس لوٹ کر سب کچھ برابر کر دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہاں فکر و فلسفے کے جہاز کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

صرف کروڑوں عجیب و غریب اور شک آمیز آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔

اس کے والد رات میں ایک بار آئے تھے۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ ان کو بیٹے کے بارے میں تشویش تھی کیونکہ وہ جنگل میں اکیلا تھا۔ اور اتنی دور۔ کوئی بھی نامعلوم بات اسے نقصان پہنچ سکتی تھی۔ بارش کی وجہ سے اپنے گھر کے باہری دالان میں کھڑے وہ کافی دیر تک جنگلوں کی طرف دیکھتے رہے پھر اندر چلے گئے تھے۔

اس کا دماغ بری طرح تھک گیا تھا اور اس کے اعصاب اب کام نہیں کر رہے تھے۔ اس کی وہ آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئی تھیں جن سے وہ دنیا میں جھانک رہا تھا۔ اس کی نظروں میں انڈمان کے آسمان پر اڑتے ہوئے گدھ ابھر آئے اور پھر نیچے سمندر میں تیرتی کٹی لاشوں کے بیچ میر علی کی لاش دکھائی دی۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ رو پڑا۔ اس کے عارض پر آنسوؤں کی ایک لڑی چلنے لگی۔ اور کافی دیر تک چلتی رہی۔ اس کا پورا سفر ایک کہانی بن چکا تھا اور یہ پوری کہانی اس کے ذہن میں دوبارہ چل پڑی۔ کہانی کے ختم ہونے تک اس کے کپڑے آنسوؤں میں تربتر ہو چکے تھے۔ بے پناہ نقاہت کے سبب اس پر نیند کی غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اس نے کتاب کا آخری صفحہ تحریر کیا۔

لوگو، تمہارے یہ ظالم آقا آسمان سے نہیں آتے۔

یہ کوئی اور نہیں یہ تم خود ہو۔

یہ جو اونچے اونچے پیڑ تم دیکھتے ہو ان کا بیج تم خود ہو۔

یہ ویسے ہی ہیں جیسے تم ہو۔

اگر تم اندر سے بدلتے تو یہ بدل گئے ہوتے۔

کہ ان کی اصل تم ہو۔

یہ صرف تمہارا سایہ ہیں۔

مجرم و ظالم کوئی اور نہیں،

تمہارے اندر کا شہری ہی مجرم ہے۔

وہ ملک کے تعزیرات

کے

دفعہ

غفلت مجرمانہ

کا

اس عہد کا سب سے

گھناؤنا مجرم ہے جس نے اپنی غفلت کے ذریعہ معاشرے کے ہر شخص کو سنگین خطروں اور مصیبتوں میں ڈال دیا ہے۔

یا تو تم اعلان کرو کہ تم اس ذمہ داری کو نہیں سنبھال سکتے اور اپنی زندگی کے بوجھ سے دست بردار ہو جاؤ یا پھر اپنی ذمہ داری کو سنبھالو

ورنہ

اس آخری پیغام کے بعد میں اپنی روح کی زبان سے خود بددعا کرونگا کہ تم اپنے جرائم کی پاداش میں ابدآلآباد تک یوں ہی غلامی کی ذلتوں میں ڈوبے رہو۔ اور چور اچکے تمہارے بچوں کو اپنی غذا بناتے رہیں۔ اگر تم کو میری بات پر شک ہو تو پچھلی آدھی صدی سے زیادہ لمبے عرصے کا اپنا یہ اعمال نامہ دیکھ لو۔

اگر تم ان تمام خرابیوں کے ذمہ دار نہیں ہو تو مجھے صرف یہ بتا دو کہ کون ذمے دار ہے۔ اور اگر تم ذمہ دار ہو تو پھر بہت ہو گیا کہ اب پانی ناک میں داخل ہو رہا ہے۔

ایسے شہری دیکھ کہ تمہاری غلط رائے دہندگی کے نتیجے میں کتنے قتل ہوئے، کتنی زندگیاں تباہ ہوئیں، مجھے بتا کہ میں کس کا دامن پکڑوں؟

کہاں اپنے آنسو گراؤں؟ بتا، مجھے ٹھکانہ بتا

کہ

rekhta

میں رونا چاہتا ہوں۔

مجھے دکھا کہ مجرم کدھر ہے کہ مری زبان کی طرح میری آنکھوں میں بھی لکنت ہے کہ کئی پشتوں سے میرے اجداد نے بھی سچائی کو نہیں دیکھا اور یہ کمی اب میری فطرت بن گئی ہے۔

بتا کہ میری زندگی سنگین خطروں اور اندھیروں میں گھری ہوئی ہے اور میں اس کو بچانا چاہتا ہوں اور دشمن بڑا ہے اور اس کو ختم کرنا ہے اور یہ کام مجھ سے اکیلے نہیں ہوگا۔

بتا۔

بتا۔

بتا۔

تو خاموش کیوں ہے؟

تو خاموش کیوں ہے؟؟؟

تو نہیں بتائے گا۔

تو نہیں بتائے گا۔

تو نہیں بتائے گا۔

نہیں بتائے گا۔

نہیں۔

تو بتائے گا۔

بتائے گا۔

بتاؤ۔

نہیں بتائے گا۔

لا الاہ ال لاہ

لا الاہ

لا

اس کے منہ سے خون آ گیا۔ اور فرش پر جمع ہونے لگا۔

اسی بیچ اس کے ذہن میں کچھ خیالات ٹوٹے چھپر سے برسات میں گرنے والے پانی کے قطروں کی طرح ٹپکنے لگے۔

'عوام نے دنیا کے بڑے بڑے رہنماؤں کو دھوکا دیا ہے تو تم ابھی کیا ہو؟ عوام نے اپنے ملک اور اپنی حکومتوں کی ٹانگ کھینچی ہے۔ اس کی رفتار اور ترقی کے تقاضوں کے تئیں بے حسی اور خود غرضی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ عوام سچے رہنماؤں کو چھوڑ کر بہکانے والے لوگوں کے پیچھے پیچھے زیادہ چلے ہیں۔ ان کے دکھوں پر مت جاؤ۔ یہ دکھی اسی لئے ہیں کہ یہ سچے رہنماؤں کو نہیں پہچانتے لیکن اپنے کو انتہائی دور اندیش سمجھتے ہیں' جب یہ مصیبتوں میں پڑتے ہیں تو تمہارے پاس روتے ہوئے آتے ہیں لیکن جب تم ان کو راستہ دکھاتے ہو تو یہ اپنے آپ کے بجائے تمہیں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تب ان کے آنسو اندر سنک جاتے ہیں

اور ان کی انانیت سامنے آجاتی ہے۔ یہ حد درجہ کوتاہ اندیش ہیں۔ یہ جان کی بازی لگانے والے رہنماؤں پر بدچلنی اور بدعنوانی کا الزام لگانے میں ایک وقفہ نہیں لگاتے۔ جس کمینگی عوام نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقی کے لئے اٹھائے گئے اقدامات کے تئیں ثبوت دیا ہے اس کا تصور کر کے قربانی دینے کا عزم رکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عوام میں نہ اپنے عہد و پیماں کا پاس ہوتا ہے نہ وہ وفادار ہوتے ہیں۔ یہ اگر حتمی و ختمی طور پر کسی زبان کو سمجھتے ہیں تو وہ ہے طاقت کی زبان۔ ان کی بھلائی بھی کرنی ہو تو انہیں بے ہوشی کی دوا دیکر آپریشن کرنا پڑتا ہے اور اگر یہ اس بیچ میں جاگ گئے تو یہ تمہارے اوپر ہی جان لیوا حملہ کر دیں گے اور اگر بعد میں جاگے اور انہیں محسوس ہوا کہ اس آپریشن کے بارے میں ان کا ذہن صاف نہیں ہے تو یہ تمہارے دشمن بن جائیں گے اور ان بدنیت اور خودغرض لوگوں کو تمہارے مقابلے کرسیوں پر لا بٹھائیں گے جو دراصل ان کے دشمن ہیں۔ اس لیے وہ قطعی طور یہ نہیں سوچیں گے کہ انہیں تمہاری نیک نیتی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ جو لوگ حکومت کرتے ہیں وہ اسی لئے عوام کی طرف سے محتاط رہتے ہیں اور اپنے مقاصد اور تحفظ کے لئے دوسری چیزوں کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس لئے ان سے قطعی امید مت رکھنا کہ یہ تمہارے آواز دینے پر تمہارے ساتھ آئیں گے۔

یہ تمہاری مدد کے لئے بھی تمہاری سچائی کا ثبوت مانگیں گے۔

اور اگر تمہارے مخالفین تم پر الزام لگا دیں گے تو یہ تم سے پہلے ان الزامات کی تردید کر کے دکھانے کے لئے کہیں گے۔ یہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔

جیسے انہوں نے امتحان والے معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دیا۔

یہ وہ بھکاری ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ انقلاب ان کو بھیک میں ملے۔ یہ جو کچھ

کہتے ہیں اس کا بھروسہ مت کر لینا۔

وقت آنے پر یہ ایسے بدلیں گے کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔

ان رہنماؤں کو محض خودغرض نہ سمجھ لینا جو ان کو بیوقوف سمجھتے ہیں یا ان کو دھوکا دیتے ہیں۔ انہیں نے بڑے گہرے تجربوں کے بعد ان کو پہچانا ہے۔ بڑی ناامیدیوں کے بعد ان کو چھوڑ کر اپنی دنیاؤں میں گم ہو گئے ہیں۔ تم پہلے آدمی نہیں ہو جو ان کے خیرخواہ ہو۔ تم سے پہلے بہت سے لوگ ان کا خیرخواہ ہونے کا نتیجہ بھگت چکے ہیں۔

یاد رکھو کہ تم بہت مشکل اور دشوار لوگوں کے درمیان پیدا ہوئے ہو۔

تم اپنی بے لوثی کے آئینے میں ان کو مت دیکھو۔

یہ انتہائی خودغرض اور خودبیں ہیں۔

سوچتے سوچتے اس کی سوچ کی رگ کہیں بے جان ہو گئی۔ اور وہ دراصل بے ہوش ہو گیا۔

❖❖

اچانک اس کی آنکھ کھلی تو جیسے وہ کوئی خواب سا دیکھنے لگا حالانکہ یہ خواب نہیں تھا۔

وہ ایک کمرے میں بند تھا اور اس میں بڑی تیزی سے ایک اژدہا کہیں نیچے سے نکل آیا جیسے وہ اسی لمحے کا انتظار کر رہا ہو اور اطمینان سے اپنا سر اس کی طرف موڑ کر حملہ کرنے کے انداز میں اس کی طرف سرکتے ہوئے بڑھنے لگا۔ اس نے گھبراہٹ میں چاروں طرف دیکھا لیکن اس کے سامنے اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک پھانسی کی رسی لٹک رہی تھی۔ کمرے میں نہ کوئی دروازہ تھا نہ کوئی لاٹھی تھی۔ اس نے کود کر وہ رسی پکڑ لی اور اوپر چڑھ کر اس کے پھندے میں اپنا ایک پاؤں ڈال لیا اور رسی کو پکڑے ہوئے اس سے چمٹا ہوا جھولتا رہا۔

کمرے میں ایک روزن تھا جس سے ڈوبتا ہوا سورج باہر دکھائی دے رہا تھا۔ دھیرے دھیرے کمرہ میں تاریکی بڑھتی گئی اور پھر کمرہ مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا۔ صرف دیر رات گئے تک اژدھا کے مسلسل پھنکارنے کی اور اژدھا سے اس کے کچھ کہے جانے کی آواز آتی رہی۔ پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ وہ رسی سے نیچے گر چکا تھا۔ مرنے سے پہلے خالد سہیل نے اپنی انگلی دیوار پر گھس کر کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن صرف اتنا لکھ پایا تھا۔

شیر علی۔

سانپ جا چکا تھا۔

نہ جانے خالد سہیل کیا لکھنا چاہتا تھا؟

شاید وہ شیر علی کا قائل ہو چکا تھا۔

اس نے تکلیف کی اتنی شدت کو برداشت کرتے ہوئے اپنی انگلی رگڑ کر صرف یہ دو لفظ کیوں لکھے تھے۔ یہ راز ابھی تک پراسراریت میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ اس نے یہ الفاظ کس کے لئے لکھے تھے؟ اور کن حالات میں لکھے تھے؟ سوال یہ ہے کہ کیا اس نے کمرے میں شیر علی کا چہرہ دیکھا تھا؟ اگر یہ سچ ہے تو مرتے وقت اس نے شیر علی میں ایسا کیا دیکھا تھا؟

کیا وہ کہنا چاہتا تھا کہ شیر علی کی طرح مرنے سے پہلے اس نے بھی کسی کو خنجر مار دیا تھا۔ یعنی کوئی جنگ شروع ہو گئی تھی۔

کیا شیر علی نے اس کو کوئی پیغام دیا تھا؟ اور اس پیغام میں اس نے سچائی دیکھی تھی کمرے کے وسط میں ٹیبل پر ایک کتاب روشن تھی لیکن یہ بات وہ کتاب میں نہیں لکھ پایا تھا کہ عالم غنودگی میں نہ وہ میز نظر آ سکی تھی نہ کتاب اور اب تو لکھتے رہنے کی جگہ جنگ شروع ہو گئی تھی۔

مجاور کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ آگے بتاتا جا رہا تھا۔

'صبح تک یہ کتاب کے علاوہ اس میں نہ لکھی جا سکنے والی تحریر کمرے میں فاسفورس سے بھی زیادہ تابناکی سے چمکتی رہی اور پورا کمرہ یوں روشن رہا جیسے کمرے کی دیواروں پر، چھت پر اور فرش پر چودھویں کی چاندنی گر رہی ہو'

باہر چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اس رات شام سے ہی تمام رات موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور اس کی پرانی کوٹھی اور وہ لان اور وہ آسمان جس پر اس نے لٹکے ہوئے آدمی کو دیکھا تھا، سب بارش میں مسلسل بھیگتے رہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اس رات بارش ہوئی تھی جس رات عیسیٰ مسیح کو سولی پر چڑھایا گیا تھا۔ وہ رات کوئی معمولی رات نہ تھی۔ یہ رات کائنات

کی طرح بے پایاں اور وسیع تھی۔ کہتے ہیں کہ اس رات، جس رات خالد کی موت ہوئی، لوگوں نے ہندوستان کے ساحلوں سے ایک انسانی چہرہ کو مشرق میں جزائر انڈمان کی طرف سے نکل کر آہستہ آہستہ مغرب کی طرف آسمان کی بلندیوں میں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور آسمان اور پورا بحرِ ہند ایک پراسرار روشنی سے منور ہو اٹھا تھا۔

❖❖

ایٹمی توانائی سے بھرپور ایک گولا اس کتاب میں بند جو اس کی تحریر میں میز پر پڑی تھی اور جو خالد کے ذہن کا مکمل عکس تھی۔ اور اس گولے کا پلیتہ دلوں کے تنہا خانوں میں تھا۔ وہ انقلاب جسے بیوقوف بنا بنا کر ہزاروں سال سے سڑکوں اور گلیوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر اتنا رسوا کیا گیا تھا کہ وہ مذاق کا موضوع بن گیا تھا وہ اب گلیوں سے اٹھ کر دلوں میں داخل ہو چکا تھا جہاں اسے پھلنے پھولنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ نہ اس پر نظر بد پڑ سکتی تھی نہ اسے کوئی کاٹ سکتا تھا۔ بام گردوں پر لٹکا ہوا انسان اپنی زمین پر اتر چکا تھا۔ وہ کوئی مسیح نہیں، مسیح سے بڑھ کر انسان تھا۔ لوگ اپنے آپ میں اس انسان کو تلاش کرنے لگے تھے جو مسیح تھا۔

زندگی کے گھنے اندھیرے میں
آدمی خود چراغ بنتا ہوا

'وہ ایک جنگ لڑ رہا تھا۔ اور اپنا چراغ اس نے خود پیدا کیا تھا۔'

'تو یہ جنگ تو ختم ہو گئی۔ وہ مر گیا۔'

مجاور کے چہرہ جلال سے دمک اٹھا۔ 'وہ مر نہیں گیا۔ وہ میدانِ جنگ میں کام آ گیا۔'

'جنگ تو اس کی شہادت سے شروع ہوئی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

صبح سے شام ہوئی' رات مری باقی ہے

ابھی دنیا سے 'ملاقات مری باقی ہے'

اس کے خون سے لکھی تحریریں اب بھی دیواروں پر موجود تھیں جنہیں لوگوں نے محفوظ کرنے کے انتظامات کر دئے تھے۔اس کی موت بہت بری حالت میں ہوئی تھی۔ بالکل اورنگ زیب کے اس بھتیجے کی طرح جسے موت کی سزا کے طور پر افیم کھلا کھلا کر مارا گیا تھا۔

اب خالد تو مر چکا ہے لیکن اس کی یہ قبر ایک مستقل سوال بنی ہوئی ہے۔

اب آپ چاہیں تو یہ مان لیں کہ اس کے اندر بڑے اور کامیاب لوگوں والا مضبوط دل نہیں تھا اور کمزوری کا الزام اسی کے اوپر ڈال دیں کہ وہ مر کیوں گیا اور عوام کو ہر طرح کی تنقید سے مبرّا تسلیم کر لیں تو اس میں زیادہ کچھ کہنے کو نہیں رہ جاتا ہے لیکن کیا عوام کو بحیثیت مجموعی تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا صرف اس لئے کہ ہمیں ان کو خوش رکھ کر تبدیلیوں کے لئے ان کی مدد چاہئے۔یعنی یہیں پر ہم ایک سیاستداں کی طرح سوچنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمارے اندر کی پیغمبرانہ آن ماند پڑنے لگتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس وقت تک انسانیت اپنی موجودہ صورتحال سے ایک جست آگے نہیں لگا سکتی جب تک ہم پیغمبرانہ جرأت سے عوام کی کھلی اور بھرپور نکتہ چینی پر آمادہ نہ ہو جائیں لیکن اس کے لئے ایک بے لوث دور اندیشی چاہئے جو ہمارے عہد میں عنقا ہے۔اور خالد میں یہ بے لوث دور اندیشی تو تھی لیکن اس کے اندر اتنا طاقتور دل نہیں تھا جو اور وہ عوام سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کی اس کمزوری میں اس کا ساتھ دیں گے اور اس کو کم از کم اپنے بارے میں کسی ایسی آزمائش میں نہیں ڈالیں گے جس کی تاب لانے کی اس میں سکت نہیں تھی اور چونکہ وہ ان کا ہمدرد تھا اس لئے اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ جو لوگ تخلیقی ذہنوں سے مدد کی توقع رکھتے ہیں وہی لوگ بجائے ہاتھ بٹانے کے ایسی آزمائشوں کا تماشہ کیوں کھڑا کرنا چاہتے ہیں جیسے دوسروں کی طرح اس میں بھی کوئی ذاتی مفاد پنہاں ہے۔اپنے اوپر یقین نہ کئے جانے کے اسی خطرہ نے کے اندیشہ

نے اس کی جان لے لی۔وہ حق بجانب تھا کہ نہیں یہ بات ہی اب باقی نہیں رہی۔اس کا ایسا محسوس کرنا اپنے آپ میں ایک بڑی سچائی ہے جس کا ہم آج سامنا کر رہے ہیں۔اور یہی سچائی اپنے آپ میں ہمارے بارے میں ایک سوال کھڑا کرتی ہے اور اس کی کتاب اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے۔اور لوگوں کی سوچ اس کتاب کا ایسے حصہ بن گئی ہے جیسے شاخیں کسی پیڑ کا حصہ ہوتی ہیں۔

لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ موت خالد کی کمزوری سے نہیں بلکہ ان کی اپنی کمزوری سے ہوئی ہے اور لوگوں کو اسی بات کا گہرا ملال ہے۔اور اس سوال میں کہیں بہت گہرائی میں کوئی طوفانی آتش فشاں پوشیدہ ہے۔

❖❖

13

جیلانی اوراس کے دوستوں کا ذہن اب کسی نتیجے تک پہنچنے لگا تھا جیسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔ کھلی فضا کی تلاش میں شام کے وقت وہ کھلے کھیتوں میں چلے گئے۔ افق پر قدرت اپنے انتہائی حسن و جمال کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ مغرب میں رنگین بادلوں کے ٹکڑے چھپارہے تھے۔ ان کے نیچے دور کھیتوں میں کچھ عورتیں اپنے گھروں کی طرف جاتی ہوئی بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں جیسے ان وادیوں میں زندگی کی علامت وہی ہوں۔ ندی کے آگے کسی بستی سے شام کے وقت کھانا پکانے کی تیاری اور مویشیوں کے بدن کو مچھروں اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لئے جلائی گئی آگ کا دھواں ہولے ہولے آسمان میں اٹھ رہا تھا۔

انہیں اپنی بستیاں یاد آ گئیں۔

اس مقام کی پوری وسعت تنہائی کا ایک ایسا سماں باندھ رہی تھیں کہ انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ زندگی کے کسی طویل تنہا سفر پر گامزن ہوں۔ خالد سے متعلق باتیں اوراس کی جزائر انڈمان کی یادیں اس وقت ان کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی حیرت کدے میں آ گئے ہوں جہاں انسان تن تنہا کائنات کی وسعتوں کا سامنا کر رہا ہو۔ انہیں نے اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں کیں جواب اپنی دھوری بدل رہا تھا۔ انہوں نے اپنی ان گرل فرینڈس کو یاد کیا جو دلی میں تھیں۔ ان کی زندگی میں نئے افق اور نئے امکانات کے دروازے کھل رہے تھے۔ دنیا کو کچھ عظیم انسانوں کی ضرورت تھی۔ کچھ ایسے بہادروں کی جو خالد کے پرچم کو لے کر آگے پوری دنیا میں جا سکتے ہوں۔

انہوں نے اپنے شہر کو یاد کیا۔ روزمرّہ میں ہزاروں وکیل کچہریوں میں جاتے ہوئے، ہزاروں ٹیچر اور پروفیسر اپنے کالجوں اوراسکولوں میں جاتے ہوئے، سیاست داں سیاست کرتے ہوئے، دلال ٹھیکے دلانے کو کوششوں میں منہمک، جرائم پیشہ لوگوں کو ٹھگنے کی اسکیم بناتے ہوئے، صحافی خبروں اور چلتی تصویروں کے لئے دوڑ بھاگ کرتے ہوئے اور لاکھوں لوگ کارخانوں میں کام کرنے جاتے ہوئے۔ ابھی تک ان کا اپنا ارادہ بھی تو کچھ ایسا ہی تھا، ان سب کا کہیں نہ کہیں ایک حصہ بن جانا لیکن اب جیسے ان کی آنکھوں کے اوپر سے کوئی پردہ ہٹ گیا تھا۔ ان سب چیزوں سے آگے بھی کرنے لائق کچھ تھا۔ اس دنیا کو کچھ ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو اس کو بہتر رنگ سے مزین کریں، اسے تبدیل کریں، لوگوں کی دبی ہوئی روح کو مزید کشادگی کے لئے جگہ پیدا کریں۔ انہیں سوچنے اور وہ سب کرنے کے لئے وقت چاہئے۔ دنیا کوئی مشین نہیں ہے کہ آپ اس کا ایک حصہ بن کر رہ جائیں۔ انسانی روح پھولوں اور پھلوں کے پودوں اور پیڑوں کی طرح ہے۔ انہیں اپنی مخصوص خوشبو دینی چاہئے۔

اس جنگل کے کھلے کھلے راستوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے ان تمام باتوں پر گفتگو کی۔ ان کو اب سمجھ میں آیا کہ خالد کہیں جنگلوں کی اس تنہائی میں آ بسا تھا۔ اور یہاں کی یہی عظیم تنہائی ہی چاروں طرف سے لوگوں کو اس جنگل میں کھینچ کر لا رہی تھی۔ وہ لوگ کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ ان کو کسی چیز کی ضرورت ہے۔ یہ چیز ان کو کون دے گا؟ ان کو ہماری ضرورت ہے۔ ہم نے اعلیٰ تعلیم اور تربیت حاصل کی ہے۔ ہم کچھ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں فطری طور پر توقعات ان لوگوں سے وابستہ کی جاتی ہیں جن کے اندران کو پورا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہیں سے ذمہ داریاں جنم لیتی ہیں۔ یہ انسانی سماج کا قانون ہے۔ اوراس وقت اس طرح کی ناگزیر ضرورت سامنے آ چکی ہے جس کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے۔

کیا ایسی کھلی جگہیں انسان کو اپنے آپ کو پانے میں مدد کرتی ہیں؟

ہاں۔

اور یہی تو چیز ہے جو آج کے گھنے شہروں میں لگاتار کم ہوتی جارہی ہے۔ کیونکہ شہر ہر اعتبار سے کاروباری کارخانوں میں تبدیل ہوتے جارہے ہیں۔

سامانوں کی پیداوار ہو یا سیاست' ڈاکٹری ہو یا میوزک' تفریح ہو یا قانون سازی۔ سب کارخانے بن گئے ہیں۔ اسی لئے تو آدمی کو ان شہروں میں رہنے کے لئے ہر چیز کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہر لمحہ کمانا پڑتا ہے۔ یہ وجہ یقیناً تھی تبھی خالد اپنے دوستوں کے پاس لوٹ جانے کے بجائے جو اسے بے حد چاہتے تھے' اس ویران' تنہا جگہ پر آ گیا تھا جہاں سستی قیمت پر زندہ رہا جاسکتا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے۔ اس بات کو محسوس کرنے کیلئے جو صرف اس جگہ میں تھی۔

' آؤ یہاں کچھ دیر بیٹھیں۔ میرے ذہن میں کچھ ہو رہا ہے اور میں مکمل ہونا چاہتا ہوں۔' ان میں سے ایک نے کہا۔

وہ سب وہیں کچھ دیر رکے رہے۔

ادھر ادھر کی وسعتوں کو گھورتے رہے۔

سورج نیچے جاچکا تھا۔

اب اندھیرا ہو رہا تھا۔

ہوا کچھ اس طرح گزر رہی تھی کہ ان میں دور دور کی بستیوں' شہروں اور ملکوں سے آتے ہوئے انسانی پیغامات سنائی دے رہے تھے۔ اس کی پراسرار آوازیں ان تمام باتوں کا مرکب محسوس ہو رہی تھیں جو دنیا میں ہو رہا تھا۔ یہ ہوا بھی تاریخ کی طرح زمان ومکاں کی بندشوں سے آزاد تھی۔ اس کی آواز میں ہر چیز شامل تھی۔ زندہ خالد اور مرے ہوئے خالد میں کوئی فرق نہیں تھا۔ انہوں نے خالد کی قبر کی سمت میں دیکھا۔ کچھ لوگوں نے وہاں روشنی کر

رکھی تھی اور خود بھی وہیں موجود تھے۔ وہ کسی چیز کی متلاشی تھے۔

'وہ ایک سفر کرنا چاہتے تھے۔' انہوں نے سوچا۔

دوسرے دن وہ واپس چلے جائیں گے۔

تو خالد کی موت کے بارے میں ان کی دریافت کیا ہے؟

وہ یا تو اپنے دیے گئے مشن میں ناکام ہو گئے ہیں یا پھر کامیاب ہوئے ہیں۔

انہیں اپنی دریافت کو الفاظ میں بیان کرنا ہے۔

یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا۔

یہ کام دلی شہر میں ایک طوفان لیکر داخل ہونے جیسا تھا۔

لیکن یہ کام وہ کس طرح کریں گے؟

وہ رات کے سناٹوں میں جب پورا شہر زندگی کو بھول کر سوجاتا ہے اس شہر کی سڑکوں پر گھومو گے اور محسوس کرو گے کہ لوگوں کو نیند کس طرح آجاتی ہے۔

انہیں خود بھی جاگتے۔ رہنے کا تجربہ کرنا ہوگا اور پھر جاگنے والوں کا ایک پورا قبیلہ پیدا کرنا ہوگا۔

انہیں اپنے کام کے لئے اپنے اور اس کے بعد لوگوں کی زندگی میں ذہنوں اور اوقات میں جگہ پیدا کرنی ہوگی تاکہ اس مشن کو آگے بڑھا سکیں۔

انہیں اچانک محسوس ہوا کہ ان کو اپنے جانچ کی رپورٹ مل گئی ہے۔

'خالد کی موت انسانیت کے شدید درد کی تاب نہ لا سکنے کی وجہ سے ہوئی۔ اپنی انسانی برادری کی زندگی میں موجود جسمانی اور ذہنی تکالیف کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانوں کی اس صورتحال کی روحانی تکلیف کو محسوس کرے کہ وہ جو کچھ ہیں یہ وہ نہیں ہیں جو انہیں ہونا چاہئے یا جو وہ درحقیقت ہیں بلکہ ان کی اصل ذات زندہ درگور ہے اور وہ کوئی اور زندگی جی رہے ہیں جو ان پر لادی گئی ہے' جو ان کے لئے کسی اور نے بنا کر ان پر لاد دی ہے۔ اور وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بھی یہ زندگی جینے پر مجبور ہیں ورنہ اگر یہ بندشیں نہیں ہوتیں تو ان کی دنیا اور زندگی کچھ اور ہی ہوتی۔ یہ بالکل وہی صورتحال تھی جو شیر علی نے اپنی نوٹ بک میں لکھی تھی۔ اور مزید یہ کہ اس درد کو شیر علی کی نوٹ بک کی تحریر کو پڑھ کر بہتر طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔'

وہ یہی رپورٹ لیکر جائیں گے اور رپورٹ لکھ کر شیر علی کی تحریر کا اقتباس خالد سہیل کی کتاب 'چلمن' سے لیکر پورا کا پورا اس رپورٹ میں ڈالیں گے۔

انہوں نے ایک بار پھر خالد کی کتاب کھول کر اس میں سے شیر علی کے نوٹ کے ایک ایک جملے کو آواز بلند پڑھا اور سنا۔ رات کے اندھیرے میں بھی الفاظ جیسے چمک رہے تھے۔

دوسری دن وہ خالد کی موت کی وجہ کے بارے میں حتمی و ختمی بات کرنا چاہتے تھے۔

مجاور نے بہت سوچ کر کہا۔

'ساری باتیں اپنی جگہ لیکن میرے قیاس کے مطابق تو خالد کی موت کا سبب بنی ایک تحریر۔ خالد کی موت کا سبب تھا عوام کی طرف سے ناامیدی کی انتہا۔ وہ تھی اخبار میں چھپی ہوئی ایک خبر۔ وہ اپنے یقین میں صحیح تھا یا غلط اس کا فیصلہ اس خبر کا تجزیہ کر کے کیا جا سکتا ہے

جو ملک کے ایک بہت بڑے اخبار ہندوستان ٹائمز میں چھپی تھی۔ لارڈ میو کے قتل کے تاریخی واقعے سے شروع ہونے والی یہ کہانی جو اس اخبار میں اس خبر کے چھپے تھے کہ واقعے تک پر مکمل سچائی پر محیط ہے ہمارے تجزیاتی ذہن کے لئے ایک طوفان انگیز چیلنج ہے۔ یہ ایک ایسا مقدمہ ہے جو خالد کی کتاب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے ذہنوں میں دھیرے دھیرے قائم ہو رہے ہیں۔ یہ مقدمہ ہماری یادداشت کی اس عمومی کمزوری سے باہر لانے کا ایک بڑا ذریعہ بن کر آیا ہے۔ جس کمزوری کی وجہ سے ہم بار بار دھوکا کھاتے ہیں۔ ایک بڑی کہانی جو بار بار سنائی جاتی ہے ایک روشن مینارۂ نور کی طرح ہماری رہنمائی کرتی ہی ہے اور یہ یادداشت کی کمزوریوں سے بار بار چھا جانے والے اندھیرے سے اس کے آسیب سے ہمیں نجات دلائے گی۔ اگر ہم نے اس کہانی کو اپنی دوربین بنا لیا تو ہمارا مستقبل روشن ہے کیونکہ ہمیں راستہ صاف دکھائی دیتا رہے گا۔

میں آپ کو اخبار میں چھپی خبر کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تو اس سلسلے میں ابھی تک مختلف اور کئی متضاد رائے قائم ہیں اور کوئی بھی کسی حتمی ختمی نتیجہ پر نہیں پہنچ پایا ہے کہ خالد کی موت اسی خبر کی وجہ سے ہوئی ہے لیکن میری ذاتی رائے یہی ہے کہ خالد کی موت اسی خبر سے اس پر پڑنے والے دباؤ سے ہوئی اور یہ جو میں بتا رہا ہوں اس کی بنیاد یہ ہے کہ جس دن خالد مرا ہے یہ خبر اسی دن کے صبح کے اخبار میں تھی اور اسے تراش کر اس نے فائل میں ڈالا تھا جبکہ وہ ان دنوں اخباروں کے تراشے نکال کر بہت کم رکھتا تھا اور اس نے اپنی ڈیجیٹل ڈائری میں چند ہی روز پہلے لکھا بھی تھا کہ 'ان دنوں مجھے اخبار کی خبریں حقیقت کی بالکل ایسی عام سطح معلوم ہوتی ہیں جن کو پڑھنے سے ذہن کے پراگندہ ہونے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اخبار کی یہ خبر کسی بھی انقلابی شخصیت کو کس طرح بے حوصلہ کر سکتی ہے اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

مجاور نے اس خبر کی ایک فوٹو کاپی پڑھنے کے لئے آگے بڑھایا۔ ان طالب

علموں نے غور سے پڑھا۔

مہاتما گاندھی کی جان بچانے والا کا کنبہ انتہائی بدحالی کا شکار

وجے موریتی۔ ہندوستان ٹائمز۔ بتک میاں نہیں ہوتے تو آج ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ ناتھورام گوڈسے سب کو یاد ہے کیونکہ اس نے گاندھی جی کو قتل کیا تھا لیکن لوگ اس باورچی کے بارے میں کم جانتے ہیں جس نے مہاتما گاندھی کی جان بچائی تھی۔ بہار کے موتیہاری ضلعے کے اس باشندہ نے گاندھی جی کو ۱۹۱۷ میں زہر دیکر قتل کئے جانے سے بچایا تھا۔ اس وقت گاندھی جی کو نسبتاً کم لوگ جانتے تھے۔ اس وقت گاندھی نیل کمپنی کے مزدوروں کی خستہ حالی اور ان پر ہونے والے مظالم کے بارے میں معلومات کرنے اور ان مظالم کے خلاف تحریک چلانے کی غرض سے وہاں گئے تھے۔ یہ گاندھی جی کی پہلی تحریک تھی۔ 'چمپارن کے مجاہدین آزادی' نام کی کتاب کے مطابق ایک نیل کمپنی کے اروین نامی منیجر نے گاندھی جی کو اپنے یہاں رات کے کھانے کی دعوت دی اور اپنے باورچی بتک میاں سے ان کو زہر ملا ہوا دودھ لے جا کر گاندھی جی کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ بتک میاں نے دودھ کا پیالہ گاندھی جی کے سامنے رکھتے ہوئے چپکے سے انہیں خطرے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، جو بعد میں جمہوریہ ہند کے پہلے صدر ہوئے، اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے۔ بتک میاں کو اپنی اس حب الوطنی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ منیجر نے انہیں روح فرسا اذیتیں دیں، ان کو قید میں ڈالا، ان کے گھر کو قبرستان میں تبدیل کر دیا اور ان کے کنبے کو گاؤں سے نکال دیا۔ ۱۹۵۰ میں ایک بار ڈاکٹر راجندر پرساد وہاں گئے تو انہوں نے حکم دیا کہ بتک میاں کے خاندان کو ۱۲۴ ایکڑ زمین دی جائے۔ ان کے پوتے علاء الدین انصاری نے بتایا کہ وہ ابھی تک در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ بتک میاں کی ۱۹۵۷ میں وفات ہو گئی تھی۔ آدھی صدی بعد بھی، جبکہ بتک میاں کی اولاد اپنی بے دخلی کے اثر سے باہر نہیں نکل پائی ہے، ان کی درخواستوں کی صرف فائلیں موٹی ہوتی جا رہی ہیں لیکن انتظامیہ یا سیاست میں کسی کو دلچسپی نہیں کہ ان

کی مدد کرے۔

ان میں سے ایک نے اس خبر کا عکس اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا۔

وہ اس موذبختر کے عکس کو بھی شیر علی کے نوٹ کے پہلو بہ پہلو اپنی رپورٹ میں ڈالیں گے۔

وہ مجاور کی رائے سے متفق تھے کہ خالد سہیل کی جان دراصل اس خبر نے ہی لی۔

مجاور نے آگے کہا۔

میری رائے میں خالد کے سامنے بتک میاں کی اولاد کی وہ آنکھیں ابھر آئیں جنہوں نے اسی سچائی کو دھیرے دھیرے دیکھنا شروع کر دیا تھا جسے وہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بے حسی کی وہ کھائی تھی، انسان کی کمینگی کی وہ تصویر تھی جسے دیکھ کر وہ لرز جاتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس بے حسی کو توڑنے کی کوئی ترکیب نکالے گا لیکن رفتہ رفتہ ناامید ہوتے ہوتے اس نے اچانک ایک دن یقین کھو دیا۔ بالکل ویسے جیسے کوئی ڈوبتا ہوا جہاز لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے ایک دم سے نیچے زیرِ آب جا بیٹھے۔

وہ جانتا تھا کہ اس سے نکلنا ممکن ہی لیکن اس میں اتنی سکت نہیں تھی اور نہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے اتنی خواہش رہی اور تھی بھی تب اس نے جان بوجھ کر اسے مار ڈالا کہ یہ اسے بے حد اذیت دے رہی تھی۔ یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کے اعصاب مجروح ہو کر کمزور ہو چکے تھے۔ وہ تو صرف اگلے خوش کن انکشاف کی امید پر زندہ تھا، بالکل اس ناؤ کی طرح جو مچھلیوں کے شکار کی امید پر بغیر وافر مقدار میں کھانا ساتھ میں رکھے سمندروں کی عمیق وسعتوں میں کبھی نہ واپس آنے کی غرض سے گھس گیا ہو، اور مچھلیاں نہیں مل رہی ہوں، اور وہ مچھلیوں کی تلاش میں مزید گہرائیوں میں اترتا چلا گیا ہو، اور پھر اسے معلوم ہوا ہو کہ وہ غلط موسم

کی روشنی اور کرنیں نعریں اقوالِ زریں، تقریریں اور نہ جانے کیا کیا بن کر چاروں طرف پھیل رہی ہیں۔ یقیناً یہ کسی معمولی ذہن یا خوشامدی مصنف کی لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ تو نہیں کہ ہمارے بیچ پہلی بار ایک ایسی کتاب آ گئی ہے جسے پڑھ کر لوگ اپنے آپ کو گالیاں دے رہے ہیں۔ جس نے ہم سب کو نہ صرف مجرم بلکہ ذلیل و خوار اور غلام اور کوڑھی قرار دے رکھا ہے لیکن اسے ہم سینے سے لگا کر رونے پر مجبور ہیں۔ اور اس کے مصنف کو شہید کا درجہ دینے پر مجبور ہیں۔

ویسے شہید کا معنی کیا ہوتا ہے؟

مجاور یہ سوال سن کر سنجیدہ ہو گیا۔

آپ کا سوال بجا اور معنی خیز ہے کیونکہ عام طور سے شہید کا معنی لوگوں کے ذہن میں واضح نہیں ہوتا۔ شہید لفظ کا معنی ہے 'جس نے دیکھا ہو۔ اسی سے شہادت لفظ بنا ہے یعنی گواہی۔ تو شہید کا معنی ہے گواہ۔ اب گواہی دینے میں گواہی کی سچائی کے لئے قسم کھائی جاتی ہے۔ عام طور سے لوگ اپنے بچوں کی یا ایمان کی قسم کھاتے ہیں کہ وہ جو کچھ دیکھا ہوا بتا رہے ہیں وہ سچ ہے یا یہ کہ وہ جو بھی کہ رہے ہیں تہِ دل سے کہ رہے ہیں اور کسی ذاتی مفاد کی بنا پر وہ جھوٹ نہیں بول رہے ہیں یعنی یہ ان کی سچائی کی گارنٹی ہوتی ہے۔ یہ گارنٹی دینے پر لوگ اس کی بات کو نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ تو شہید اس کو کہتے ہیں جو کسی انسانی مفاد کی بات کی اہمیت اور ضرورت میں یقین رکھتا ہے اور اس میں اتنا اٹل ہوتا ہے کہ اس میں اپنی جان کو گنوا دیتا ہے یعنی وہ اپنی جان کی قربانی دے کر اس بات کی گواہی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جو بات کہہ رہا ہے اس میں واقعی سچائی ہے۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ کم از کم اس آدمی کی حد تک یہ بات سچ ہے کہ اس نے کچھ دیکھا تھا اس کی یہ گواہی لوگوں کے ضمیر کو عمیق ترین گہرائی سے جھنجھوڑنے کی طاقت رکھتی ہے، اور جھنجھوڑتی رہتی ہے۔ ایسے ہی انسانوں کو انسانی تہذیب کے سفر میں سنگِ میل کی طرح موجود رہنے والے شہید کا درجہ دیا جاتا ہے۔ شہادت کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے اور مرنے والے کی

میں ادھر آ گیا ہے اور اس عظیم تنہائی اور وسیع سمندر میں سمندر اور موسم کی یہ جانکاری ہی ملک الموت کی طرح بھوک کی نقاہت سے کمزور اس کے بدن کے اندر سے اس کی جان ہتھیلی میں اٹھا کر چل دے۔

لیکن اس نے جو کچھ دیکھا تھا اسے لکھ ڈالا تھا۔

اور آخری تحریر اس نے اپنی دیوار پر رگڑی ہوئی انگلی کے خون سے لکھی تھی یعنی وہ ہارا نہیں تھا' اس نے ہتھیار بھی نہیں ڈالا تھا' بلکہ اس نے غنودگی کے غیر متوقع غلاف کا بھی مقابلہ کرتے ہوئے اپنی انگلیوں کو ہی ہتھیار بنا لیا تھا۔ وہ لوگوں کی بے حسی کے مایوس کن اور غیر ذمے دارانہ استعمال شہریت کے خلاف' اور اس کے پیچھے کھڑی بدعنوانیوں کی انتہائی فعال اور چوکنہ فوجوں سے انسانیت کی طرف سے جنگ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا لیکن پیچھے نہیں ہٹا تھا اور اپنی سچائی کے اوپر اس کو جو یقین تھا وہ متزلزل نہیں ہوا تھا کیونکہ اس نے وہ حربہ اور اس حربے کے استعمال کے لئے ایک ایسا میدانِ جنگ دیکھ لیا تھا جہاں ازلی مافیا کے خلاف جنگ کو جیتنا ممکن تھا۔

وہ اس مقام پر آیا تو پھر واپس نہیں گیا نہ اس نے اپنے کو اسی سوچ میں مٹا لیا، نہ وہ باہر آیا ہم یہاں آئے نہ اس نے اس سوچ کو مکمل کرنے میں اپنی جان ختم کی جو آج ہمارے لئے روشنی بنی ہوئی ہے۔ انسانیت کی فکر کا لٹیرا ہی تو اسے کھا گیا' لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جس چیز نے اس کی جان ہی لے لی وہ کیا تھی۔ وہ کون سی بات تھی جو اس خبر میں تھی جس کی وہ تاب نہیں لا سکا۔ وہی چہرے۔ وہی نہ۔ وہی اپنے ہی لوگوں کے چہرے۔ اپنے ووٹوں سے حکومت بھی کرتے ہیں اور اپنی غیر ذمہ داریوں کا اعتراف بھی نہیں کرتے۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ ان کا ووٹ صرف ان کو نہیں دوسروں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ وہ جمہوریت اور انسانی نظام کا ستون ہیں اور ایک ستون کی ذمہ داری کو نبھانا ان کا دھرم بھی ہے اور ان کی دانشمندی کا بھی تقاضا ہے۔ اور اسی شعور سے وہ جوالا مکھی یہاں سے پھوٹتا ہے جس

بات کی سچائی پر انگلی اٹھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔اس پر انتہائی سنجیدگی سے غور کرنا پڑتا ہے۔یہ تو کم از کم ماننا ہی پڑتا ہے کہ اس نے کچھ دیکھا تھا۔انسانی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچتے ہوئے'اس کے لئے کام کرتے ہوئے اور اس پر اصرار کرتے ہوئے ان جان کی قربانی دینے والوں کا مقام تمام انسانوں میں بلند ترین ہوتا ہے۔

❖❖

یہ ہے وہ تحریر۔

مجاوران دو دیواروں پر لکھی تحریر دکھا رہا تھا۔

لکھا تھا۔

'ابا میں نے بہت کوشش کی لیکن میں ناکام ہو گیا۔وہ نسخہ میرے ہاتھ نہیں آ سکا جس سے میں اس طرح کے مردہ عوام میں روح پھونک سکوں جس طرح کے عوام سے ہمارا معاشرہ بنا ہے۔اب' میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔اب میرے اندر طاقت کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں۔میں مر رہا ہوں' اب' میں مر رہا ہوں۔

میں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکا۔

اور اب کیا۔اب تو میں مر رہا ہوں۔'

سرخ سیاہی حروف میں لکھے یہ الفاظ چمک رہے تھے۔

’پولیس آئی تھی۔‘

مجاور نے بتایا۔

’ایس پی موت کی وجہ معلوم کرنے کے لئے ڈاکٹر سے لاش کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہتا تھا۔ اس کے والد ایس۔ پی۔ کو ہکا بکا ہو کر دیکھتے رہ گئے تھے۔ والد نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ان کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ پھر انہوں نے سوچا اس کو کیا معلوم۔‘

انہوں نے بیان دے دیا کہ میرے بیٹے سے کسی کی دشمنی نہیں تھی۔‘

پھر بھی آپ کو کسی پر شک ہے تو ہم سے بتا دیجئے۔ ہم انکوائری کر کے تسلی کر لیں گے۔‘

’مجھے کسی پر شک نہیں۔‘

پولیس کے کہنے پر گاؤں کے دشمن بھی وہیں گئے تھے۔ ان کے سر ندامت سے جھک گئے۔ وہ ڈرے ہوئے تھے کہ ان پر جھوٹا مقدمہ بننے جا رہا ہے۔

پولیس کے جانے کے بعد وہ خالد کے والد کے سامنے لکڑی کی طرح بالکل خاموش سر جھکا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

والد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہیں ان کے منہ سے صرف اتنا نکلا

’اللہ اکبر۔‘

اور پھر بیٹے کی لاش کی طرف مڑ گئے تھے۔

وہ کمرے سے باہر نکل آئے۔ مجاور نے زنجیر چڑھا کر تالا لگا دیا۔

’بچے چھو چھو کر محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ورنہ یہ جگہ تو کھلی رہنی چاہئے۔‘ مجاور نے کہا۔ اور پھر ان کے ساتھ ہی باہر گولر کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی اسے گھیرے رہے۔

خالد کی کتاب کا اصل مسودے کہاں ہے۔

وہ تو اس وقت لوگوں کے دل و دماغ میں ہے۔

یہ بھی ایک عجیب کہانی ہے۔ خالد نے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھی تھی اس کو لوگوں نے کئی بار پڑھا اور سنا۔ پھر ایک دن یہ فیصلہ ہوا کہ اس کتاب کو چھپوایا جائے۔ جب اس کتاب کے بارے میں پبلشر نے سنا کہ اس کتاب کو بلند آواز سے بعض پڑھتے جاتے وقت لوگ آ کر جمع ہو جاتے ہیں اور کئی حصوں کو بار بار سننے پر اصرار کرتے ہیں تو وہ فوراً چھاپنے پر تیار ہو گیا اور بضد ہو کر اس نے مسودہ اپنے پاس ہی رکھ لیا کہ وہ اس کی کتابت فوراً ہی شروع کرا دینا چاہتا۔ اس پبلشر نے مشورہ کے لئے ایک کمیٹی بنا رکھی تھی جس میں کچھ نامور لوگ ممبر تھے۔ یہ ممبر دراصل مشورہ تو دیتے ہی تھے کمیشن لیکر اپنے رسوخ کا استعمال کر کے کتابوں کی نکاس میں پبلشر کی مدد بھی کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گروپ کے لوگوں کی مدد کرتے تھے اور جو کتابیں ان کے نظریوں سے ٹکراتی تھیں ان کو زبردستی رد بھی کر دیتے تھے۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ جس دن لوگ مسودہ پبلشر کو دیکر آئے تھے اسی دن وہ ممبر جو ان سب میں دبنگ تھا وہاں آ گیا۔ پبلشر نے وہ مسودہ اسے دکھایا۔ مسودے کے چند صفحات پڑھنے

کے بعد وہ اس سے بالکل چپک گیا اور جاتے وقت یہ کہہ کر مسودہ ساتھ لے گیا کہ وہ اسے فوراً پڑھ کر اپنی رائے دینا چاہتا ہے۔ پبلشر نے بہت منع کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ جانے کے بعد اس نے پبلشر سے کہہ دیا کہ وہ مسودہ ٹرین میں بیگ کے ساتھ چھوٹ گیا۔ اس پر بڑا کہرام مچا۔ پھر یہ طے ہوا کہ لوگوں کو جو کچھ یاد ہے وہ قلم بند کیا جائے۔ سو جو کتاب پہلی بار مارکیٹ میں آئی یہ وہی کتاب ہے۔ اس میں یا تو وہ باتیں ہیں جو اس کتاب میں خالد کے الفاظ میں تھیں یا پھر وہ باتیں ہیں جو ان لوگوں نے اپنی زبان میں بتائیں لیکن جو باتیں لوگوں نے اپنی زبان میں بتائیں ان میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو خالد نے نہیں کہی تھیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ لوگ وہ تھے جن کا دل خالد سے ملا ہوا تھا یعنی آپ یہ سمجھئے کہ اگر ایک پودا ہے اور اس میں سے کچھ شاخیں کٹ بھی جائیں تو جو شاخیں نئی نکلیں گی وہ بھی تو وہی ہوں گی۔

لیکن یہ کتاب تو پھر اصل نہیں ہوئی نا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس بنیاد پر تھوڑے ہی ہے کہ یہ خالد کی کتاب ہے۔ اس کتاب کی اصل اہمیت یہ ہے کہ یہ انسانیت کی کتاب ہے اور یہ وہ کتاب ہے جو انسان کی رگوں اور خون میں موجود ہے۔ یہ کتاب انسانوں کے ذہن اور دل میں موجود روشنی کا نچوڑ ہے۔ اور اسی بات میں اس کتاب کی عظمت اور سچائی پنہاں ہے۔ یہ تو وہ کتاب ہے میاں جو نہ مٹ سکتی ہے نہ اس کے بدلنے کا کوئی خطرہ ہے اور اس کی سچائی کی تصدیق کوئی بھی کر سکتا ہے کیونکہ اگر اس میں کوئی ایسی بات ملے گی جو انسانیت کے خلاف ہوگی تو اسے نکالنا پڑے گا۔

اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن آ چکا ہے اور اس میں بہت سی نئی باتیں شامل ہو چکی ہیں لیکن یہ سب اس کتاب کا حصہ مانی جائیں گی کیونکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو گھٹتی بڑھتی رہے گی۔

اس کتاب کے وجود میں آنے کے بعد انسان کو ایک ایسی کتاب مل گئی ہے' جو نہ کوئی حکم دیتی ہے نہ اپنے سچ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ وہ صرف انسان کی اندرونی روشنی کی

سچائی پر اصرار کرتی ہے۔ اس کتاب نے پہلی بار انسان کو اس کے مقام کا احساس دلایا ہے' پہلی بار انسان پر بھروسہ کیا ہے۔ اور اسے اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا شعور عطا کیا ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو انسان کے اندر سے نازل ہوئی ہے اور مسلسل نازل ہو رہی ہے۔ یہ کتاب ہمیں تمام کتابوں کو غور سے پڑھنے کا شعور دیتی ہے۔

❖❖

14

وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہاں سے چلنے سے پہلے وہ یہاں کے بہت سارے فوٹو لے لینا چاہتے تھے جو وہ ابھی تک نہیں کر پائے تھے۔ اسی کے لئے وہ ادھر ادھر گھوم رہے۔ اگلے دن صبح زرین سے ان کو جانا تھا۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ یہاں ادھر ادھر بہت سے لوگ دھیرے دھیرے جمع ہو رہے تھے۔ کسی بھی جگہ لوگوں کے جمع ہونے کا کوئی موقعہ ہوتا ہے۔ انہوں نے سمجھنے کی کوشش کی لیکن یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن پھر انہیں محسوس ہوا کہ یہ ایک خالی پن کا احساس تھا جو لوگوں کو یہاں کھینچے لا رہا تھا۔

اچانک آج اتوار کے دن یہ جانے بغیر کہ وہ کیوں جمع ہو رہے ہیں وہاں جمع ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی ذہنی حالت قابلِ توجہ تھی۔ وہ اس مزار کے قریب آتے اور آچانک خالد کو یاد کر کے رونے لگتے جیسے کچھ ہونا چاہئے جو نہیں ہوا ہو۔

کئی لوگوں نے آچانک ماتم سا کرنا شروع کر دیا۔

ایک نوجوان نے پاگلوں کی طرح لوگوں کو دیکھا اور پھر روندھی ہوئی آواز میں کہنے لگا 'اس نے ہمیں کیوں نہیں یاد کیا۔ کیا میں تمہارے بھروسے کے لائق بھی نہیں رہ گیا۔'

وہ یہی بات بار بار کہہ کہہ کر روئے جا رہا تھا۔ ایک بزرگ سا آدمی جو اس کی بغل میں بیٹھا تھا اس نے اسے تسلی دی 'اب رونے کا کیا فائدہ۔ اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہیں آ جائے گا۔'

'اس نے ہمیں ناکارہ کیوں سمجھا۔'

'اس نے تمہیں ناکارہ نہیں سمجھا۔ ناکارہ سمجھتا تو یہ کتاب **نہیں لکھتا**۔'

ایک عورت الگ شکوہ کر رہی تھی۔

'بچے نے کسی سے کچھ کہا کیوں نہیں۔ ایک بار زبان کھول دیتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ لوگ اپنی جان نچھاور کر دیتے۔ اتنا پیار تھا اس سے لوگوں کو۔'

اسی پہلے والے بزرگ نما آدمی نے اسے بھی سمجھایا۔

'اب تم کیا جانتی ہو کہ اس نے زبان کیوں نہیں کھولی۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ جو کرنا ہے اب کرو۔'

اب کیا کریں؟

اس کے جیسا بننے کی کوشش کرو۔

اس کے جیسا کون بن سکتا ہے؟ وہ تو انمول تھا۔

اچھا اب اپنا دل مت دکھاؤ۔ اس سے اس کی روح کو تکلیف ہوگی۔

قوالی شروع ہو گئی۔

ادھر کچھ لوگ مزار پر جا کر خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے' خالد کی موت کئی مہینہ پہلے نہیں ہوئی ہو بلکہ ابھی ہوئی ہو اور گریہ باقی ہو۔ اور ایسا ہی تھا۔ جیسے جیسے یہ معلوم ہوتا جا رہا تھا کہ خالد کی موت یہ سوچ کر ہوئی تھی کہ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے گا لوگوں کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا اور ایک شدید بے بسی آنکھوں میں آنسو انڈیل دیتی تھی۔

شروع میں تو خالد کے مرنے کے بعد اکے دُکے ہی کوئی ادھر آجاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ تعداد بڑھتی گئی تھی' حالانکہ کہ لوگ یوں ہی آتے تھے اور یوں ہی ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر چلے جاتے تھے لیکن اس خالی پن میں بھی ایک معنی ابھرنے لگا تھا اور دراصل یہ خالی پن ہی معنی خیز بن کر دکھائی دینے لگا تھا۔ اور لوگ اب صرف اس لئے آتے تھے کہ اس میں سے نتیجہ برآمد ہو۔

خالد کی کتاب بھی اسی طرح کے خالی پن کو بیدار کر رہی تھی۔ لوگ اس کتاب پر جس قدر زیادہ باتیں کرتے جا رہے تھے یہ خالی پن اسے قدر ایک بھنور کی طرح طاقتور ہوتا جا رہا تھا۔ اور لوگ اس خالی پن میں ہی اپنے دکھوں کا علاج تلاش کرنے لگے تھے کیونکہ انہیں یقین سا ہونے لگا تھا کہ ان کے دکھوں کی جڑ کہیں اور نہیں اسی خالی پن میں ہے۔

اس خالی پن کو لوگ طرح طرح سے اُبھرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اکثر لوگ گھومتے پھرتے ادھر ہی آکر بیٹھ جاتے۔ جب سے لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ دلّی سے ایک ٹیم آئی ہے' وہ ادھر اور بھی آنے لگے تھے۔ کسی کو خیال آیا کہ اس موقع سے ایک مشاعرہ کر ڈالیں تاکہ باہر سے آنے والے ان کے خیالات سے بھی واقف ہوں۔

انہوں نے تو یونہی ایک چھوٹی سی نشست رکھی لیکن دیکھتے دیکھتے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اس سے پہلے ایسی محفلوں میں بہت کم لوگ آتے تھے۔ موسم بھی بہت خوشگوار

ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا تیز چلتی تو درختوں کی پتیوں کی آواز آنے لگتی۔ شام کے دھندلکے میں آسمان پر رنگین بادل جادو کا ساماں پیدا کر رہے تھے۔ سبھی اچھے موڈ میں تھے۔ دیکھتے دیکھتے مشاعرہ بغیر کسی تکلف کے شروع ہو گیا۔ نہ کوئی صدارت نہ کوئی منتظم بس سنانے والے اور سننے والے لوگ تھے جس سے مشاعرہ اور بھی بے تکلف ہو گیا۔

اسی دوران اس گاؤں کے ایک ٹینٹ لگانے والا اپنی مائیک اور لاؤڈ اسپیکر سسٹم کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ مائیک سے آواز دور دور کے گاؤں تک پہنچی تو لوگوں میں تجسس پیدا ہوا کہ وہاں آج کیا ہو رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک جم غفیر وہاں جمع ہونے لگا۔

دلّی سے گئے ہوئے طلباء بھی وہاں آکر بیٹھ گئے۔

سب سے پہلے آگے آکر ایک دبلے کرتا پاجامہ پہنے نوجوان نے بے حد سنجیدہ اور اُکھڑے لہجہ میں ایک نظم سنانی شروع کی اور اسی نے اس پلیتے کا کام کیا جس نے ایک ذہنی انقلاب کو جنم دیا۔ اپنی نظم سنانے سے پہلے اس نے کہا۔

میں نے جب سے خالد سہیل کی کتاب پڑھی ہے میری راتوں کی نیند جیسے غائب سی ہو گئی ہے۔ مجھے یہ پوری دنیا کسی اور طرح کی دکھائی دینے لگی ہے۔ مجھی تو اسی بات پر حیرت ہوتی ہے کہ پہلے مجھے نیند آتی کیسے تھی۔ میں سوچنے لگا ہوں کہ میں جس دنیا میں پیدا ہوا ہوں کہ یہ دنیا اسی طرح خوف' کوفت' دباؤ اور انسان کی اپنی بنائی ہوئی تکلیف دہ حالت میں جینے کے لئے بنی ہے یا یہ دنیا بے حد خوبصورت بھی دکھائی دے سکتی ہے۔ مجھے لگتا ہی کہ یہ ایک زندگی جو ہمیں ملی ہے یہ بہت ہی سکون اور بے دھڑک اور بے روک ٹوک ہنسی خوشی کے ساتھ بھی جی جا سکتی تھی اگر کچھ لوگوں نے اس پر غالب آکر اس کو خراب نہ کر دیا ہوتا۔ آخر ہماری اس زندگی کو مشکل بنانے والے یہ لوگ ہوتے کون ہیں۔

ہمارا پورا سماج

آج

مافیا اور مظلومین میں تقسیم ہے

خالد سہیل کی یہ کتاب اسی مافیا کے خلاف کشمکش کا آغاز ہے

یہ کتاب ہمیں سماج میں ہو رہے عہد رواں کے واقعات کے تئیں ایک واضح نقطۂ نگاہ قائم کرنے میں تعاون کرتی ہے اور ایک روشن مستقبل کے قیام کے تئیں ہماری ذمہ داریوں کو واضح کرتے ہوئے یہ پیغام دیتی ہے کہ تہذیب کے قیام نو کے لیے یہ ضروری ہے کہ زندگی کی ہر سطح پر مسلط مافیا کے خلاف بغاوت ہو اور اس شخص کو جو ایمان دار ہے اور مافیا جس کی زندگی کے ساتھ زنا بالجبر کر رہا ہے اسے مقدم بنایا جائے اور اس فلسفے کو ہم اپنے لیے سیاسی مشعل راہ بنالیں۔ اور حکومت کی طاقت اور مشینری کا استعمال کرتے ہوئے مافیا سے اس لوٹی ہوئی دولت کا حساب لیا جائے جو وہ غصب کر گیا ہے کیوں کہ وہ جو کچھ کھا گیا ہے یا دور دراز کے تہہ خانوں میں چھپا رکھا ہے وہ ملک کی دولت ہے اور اس پر سب کا حق ہے۔

میری نظم کا عنوان ہے

مافیا

مافیا کی ناقابل برداشت شدت سے نجات کے لیے

ضروری ہے کہ

اندھیرے اور اجالے کے مابین جنگ ہو

اور اس جنگ کو

نوکیلا اور تیز تر بنانے

اور دکھی اور ایمان دار لوگوں کو ذہنی سطح پر اس جنگ میں شامل ہونے

اور جمہوریت کے ذریعے اندھیروں کے ٹھیکیداروں کا انتہا تک صفایا

جمہوریت کی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے

مافیا کے درندوں کو جنھوں نے ہمارے گوشت اور خون کو نوچ کر

اور اپنے اندر جذب کر کے، اپنے کو

بھینسوں اور گینڈوں کی طرح موٹا

یا پھر باگھوں اور لومڑیوں کی طرح تیز و طرار بنایا ہے ان کو

ایک مضبوط قانون کے ذریعے

ایک ایسے قانون کے ذریعے

جو دنیا کے بھیانک ترین دہشت گرد کو بھی تلاش کر لیتا ہے

اور اس کے پچھلے برسہا برس کے حساب قانون کی کتاب پر درج کر کے

دکھا دیتا ہے

ان درندوں کو عوام کے سامنے لائیں

اور ان کی چربی

کا حساب کتاب ہو

اور

وہ آنکھیں جنہیں دیکھنے کی ذمہ داری دی گئی ہے

لیکن جنہوں نے اپنے آپ کو بے حسی، مکاری، خودغرضی اور غرور کے

زہریلے خمیر سے

پتھریلا بنالیا ہے لیکن جو محض لطف اُٹھانے کے لیے

ان لوگوں کو مسلسل دھوکا دے رہے ہیں

جنہوں نے ان پر بھروسہ کیا ہے

اور جنھوں نے اپنے کو بادشاہ وقت سمجھ کر

مکاری، پردہ پوشی اور داؤ پیچ کے ذریعے

جمہوریت کے بچوں کو غلامی کی زنجیروں میں باندھ رکھا ہے

ان کی آنکھوں کی چربی کو چراغ کی لو سے ٹپکایا جائے

تاکہ انہیں جدوجہد کی دائمی قندیل کی گرمی کا علم ہو

اس نظم نے نظموں اور غزلوں کے انتخاب کی جیسے ڈگر بنادی۔ لوگوں کے اوپر

درد وغم کا ماحول طاری ہوگیا۔ ایک دوسرے نوجوان نے ترنم میں غزل سنانی شروع کی تو ایسا لگا جیسے اس کی بلا کی درد بھری آواز میں پوری وادی ڈوب گئی۔ خالد کے نام الوداعیہ بتاتے ہوئے اس نے جب یہ چھوٹی سی غزل سنائی تو لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں۔

تمنا اگر ہے تو میں کیا کروں

جہاں بے جگر ہے تو میں کیا کروں

چلے جارہے ہو بیاباں کے سمت

یہ شب بے سحر ہے تو میں کیا کروں

تفکر میں ڈوبے درختوں کے بیچ

تری رہگزر ہے تو میں کیا کروں

آخری مصرع پر جب اس نے خالد کی قبر کی طرف دیکھا تو سب ادھر ہی دیکھنے لگے۔ پھر جب مایوسی بھری نظریں سامنے لوٹیں تو ایک داڑھی والے نے گرجدار آواز میں اپنی نظم شروع کی۔

شیطان

ہاتھوں کی برکت

اور جسم کی حرکت لے گیا کون چھین کر، شیطان

گرتے پڑتے جھکتے، مرتے، سسکتے ہوئے انسانوں کو

انسانوں سے جسے کوئی دلچسپی نہیں، پیار سے تسلی دیتا ہوا

کون ہے...... شیطان

شیطان،

کافی پیتا ہوا شیطان

سگار پیتا ہوا شیطان

خدا کے کمزور بندوں

کی گردنوں پر مضبوط بیٹھا ہوا

کتوں کی طرح جھبرتے بالوں والا

ہاتھ میں قلم

زبان میں آگ

کینوس پر اپنی تصویریں تخلیق کرتا ہوا

اپنی باتیں بڑبڑاتا ہوا کون ہے؟

شیطان

سانپوں کی طرح مضبوط

فلسفے کے دبیز زرہ بکتر میں ڈھکا ہوا

حقارت کے بھاری قدموں تلے

انسانوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح روندتا ہوا، کون ہے؟

شیطان

یہ شیطان

آسمان پہ شیطان، زمین پہ شیطان

ہوا میں شیطان، خلا میں شیطان

ایسا لگ رہا تھا جیسے فضا میں ہر طرف شیطان ہی شیطان اڑتے پھر رہے ہوں اور شاعران کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتا جاتا تھا۔ پھر ایک پتلا دبلا، کمزور سا نوجوان جینس میں ملبوس اپنی ٹوٹی پھوٹی نظم لیکر سامنے آیا۔ 'میں شاعر نہیں ہوں' اس نے تمہید باندھنے کی کوشش کی۔ 'لیکن غموں نے بنا دیا ہوگا' کسی نے لقمہ دیا۔

ہزاروں ٹن سے بھاری Competition کی کتابیں

کیریر؟

میں میں کیا کروں؟

ہزاروں بار اپنے آپ کو دھتکار کر

خاموش ہوں

وہ چلا کر نظم سنا رہا تھا۔

شاید

خود اپنے آپ سے ڈرنے لگا ہوں

جب نظم ختم ہوئی تو لوگوں پر ایک گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ اس نے ایک دوسری نظم سنائی۔ یہ نظم خالد کی ہے۔ ان دنوں کی جب وہ یہاں رہتے تھے۔ اور ادھر ادھر تنہا گھومتے تھے۔

کیسے کھینچوں تری تصویر تو گم ہے اب تک

تجھ کو اے جانِ جہاں میں نے تو دیکھا بھی نہیں

اس مصرع پر بھیڑ میں ایک شور سا برپا ہوا۔

جب کبھی ابر شب مہ میں اڑے جاتے ہیں

آبشاروں سے صدا آتی ہے چھن چھن کے کہیں

یا کبھی شام کی تاریکی میں، تنہائی میں

جب کبھی جلوہ جھلکتا ہے تیری یادوں کا

میں سجاتا ہوں خیالوں میں حسیں خواب کئی

اس نظم سے ابھرنے والی تصویر کے ساتھ ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری وادی خوابوں سے بھر گئی ہو۔

سامنے آتی ہے دو پل کے لیے تو اے دوست

اور اے پردہ نشیں تیرا جو چلمن ہے حسیں

میں بڑھاتا ہوں قدم اس کو ہٹانے کے لیے

ناگہاں دور کی آواز کوئی آتی ہے،

کانپ جاتا ہے، دھڑکتا ہے میرا شیشۂ دل

اور پھر دھندلی فضاؤں میں تو کھو جاتی ہے،

دیکھتا ہوں جو سہم کر کہ پس پشت ہے کون،

یاس کے بحر سیہ پوش پہ رقصاں رقصاں،

زہر آلود تبسم کی کناریں لے کر

کوئی لہراتا ہوا سایہ نظر آتا ہے!

ماحول یکایک انتہائی سنجیدہ ہوگیا۔ اور ان ہی کی یہ دوسری نظم بھی سنئے جس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے بالکل نہیں لیکن ہمارے لئے کتنے دکھی رہتے تھے۔ ہمیں رنج ہے کہ وہ عظیم انسان آج ہمارے بیچ نہیں ہے۔ ان کو عوام کے مستقبل کی کتنی فکر تھی، سنئے۔

وقت آنے سے اس قدر پہلے

رات کے تین بج چکے ہیں دوست
سارا عالم ہے نیند سے مدہوش
ایک شاعر ہے آپ کا لیکن
وادئ فکر و غم میں خانہ بدوش
اس کو نیند آئے کس طرح آخر
سوچتا ہوں کہ صبح دم اٹھ کر
جاؤں گا سوئے شہر میں جس دم
مجھ سے پوچھیں گے غمزدہ انساں
ہے ہمارے دکھوں کا کچھ درماں
کچھ تو اے شاعر عزیز کہو!
کیا بتاؤں گا ان غریبوں کو،
زندگی جن کی ایک حسرت ہے

جن کی یہ ایک امید ایک فریب
جن کے سر پر ہیں موت کے سائے
جن کا ہر اک قدم غموں سے نڈھال
ان کے اشکوں کو کون خشک کرے
صرف میں ہی نہیں،
یہ ساری قوم،
قوم کی آنے والی نسلیں تک،
اک نوالہ کی طرح ہیں شاید!
رات کے تین بج چکے ہیں دوست
کچھ بتاؤ تو تم بتا جو سکو،
ان سوالات کے جواب ذرا،
اٹھ رہے ہیں جو ذہن میں میرے
وقت آنے سے اس قدر پہلے

اور جب وہ لکھتے تھے تو کیا عالم ہوتا تھا، دیکھئے۔ نظم ہے۔

شاخ زباں

جب ریت کا صحرا دیکھ کے ڈر جاتا ہے ادیب کا سینہ بھی

وہ لمحے اکثر آتے ہیں

جب ذہن کے سارے پردے انکے انکے سے رہ جاتے ہیں

جب شور مچاتی شاخ زباں سے سارے پرندے مرمر کے گر جاتے ہیں

وہ لمحے اکثر آتے ہیں

جب آوازوں کے پنجر

اپنے سوکھے ہاتھ لئے

میرے سر پہ چھا جاتے ہیں

اور میں گھبرا سا جاتا ہوں

اک قبرستان کی تنہائی

اک بے معنی خالی رستہ

اور دو پاؤں کی خالی خالی تھکی تھکی سی چاپ

تو اپنے آپ سے بھی ڈر جاتا ہوں

جب ریت کا صحرا دیکھ کے ڈر جاتا ہے قلم کا سینہ بھی

وہ لمحے اکثر آتے ہیں۔

اس سے سراغ ملتا ہی کہ ان کی موت کیوں ہوئی۔ جو ٹیم ان کی یونیورسٹی سے یہاں ان کی موت کے بارے میں تحقیق کرنے آئی ہے ان سے میری گذارش ہے کہ وہ اس نظم کو شاعری نہیں عصرِ حاضر کا سنگین ترین مسئلہ سمجھیں۔

وہاں کے اسکول کے ٹیچر آئے۔ میری نظم ترقی پسند ہے۔ ترقی پسندی کو دبانے کی بہت کوششیں ہوئی ہیں لیکن جب تک انسان کی صورتحال نہیں بدلے گی ترقی پسند شاعری ہوتی رہے گی۔ میری نظم کا موضوع ایک رکشے والا ہے لیکن انداز نیا ہے۔

رکشہ والا

سن کے نیتا کی تقریر

وہ

ایک میلی سی دھوتی میں لپٹا ہوا جانور

گنگنانے لگا

میں تو آزاد پیدا ہوا،

اور آزاد ہوں،

جشنِ تقریر کے بعد نیتا جو رکشے کے اُس جانور پر چلا

راہ میں روک کر اپنا رکشہ وہ آرام کرنے لگا

اور پھر اک جھنکار کے ساتھ

زنجیروں کا ایک جال

اس پہ آ کر گرا

اور پھر اس نے جانا کہ وہ تو گرفتار تھا۔

جانور کی طرح ایک بھاری سے انسان کو

جسم کی نرم و نازک رگوں پر اٹھائے

دوبارہ چلا جا رہا تھا

کڑی دھوپ تھی

اور خوابوں کا رستا ہوا زخم

سانسوں میں تھا

دوسری نظم طلبا کے اوپر ہے۔ آج طالب علم مزدور بنا کر مزدور منڈی میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ عنوان ہے۔

کنووکیشن

کیریر ڈھونڈتے ہوئے کچھ ذہن

اُمڈ آئے ہیں بھیڑ کی صورت

کچھ امیدوں کی کاغذی شمعیں

ٹمٹماتی ہیں، جگمگاتی ہیں

اپنے ہاتھوں میں

ڈگریاں لے کر

چند لمحوں کی مسکراہٹ میں

چند معصوم ڈوب جاتے ہیں

اور وہ پنڈال

وقت

کا جادو

پھر کسی سازشی کے ہاتھوں سے، چپکے سے

توڑ ڈالا جاتا ہے

چند دن ہو گئے اور آج وہاں

جہاں پنڈال میں ہزاروں لوگ

تالیوں سے جگا رہے تھے کچھ

تالیوں سے دکھا رہے تھے کچھ

خالی خالی سی کچھ ہوائیں ہیں

اور آواز کا سمندر وہ

ایک لمبے سراب کی مانند

کچھ نہیں

صرف ایک صحرا ہے

جس پہ ریتوں کی

گرم بانہوں میں

بادبانوں کا اک نظارہ ہے۔

شکریہ جناب شکریہ۔

ایک صاحب شیروانی میں پرانے وضع قطع میں آئے تھے۔ آنکھوں میں عینک جس کے شیشے بہت موٹے تھے۔ آواز پتلی تھی۔

اک پردہ کو اٹھ جانا تھا اک چہرہ کا آنا تھا

کتنی حسیں تھی کتنی حسیں تھی شرمائی، شرمائی رات

ہر شاخ گل میں تھی یہ نری، غنچہ تک گر جاتے تھے

آج ہر اک ٹہنی پتھر ہے، کیسی آندھی لائی رات

شام کا سایہ رات میں گہرا صبح میں اور بھی گہرا تھا

پھر بھی جانے سوچ کے کیا کچھ پل بھر کو مسکائی رات

ایک کرشمہ اک دھوکا تھا ایک تحیر سازی تھی

لیکن اک عالم نے یہ سمجھا کہ دن سے ٹکرائی رات

ایک نیا در ایک نیا گھر ایک نیا ہنگامہ ہے

ایک نئے رہزن کے گھر ایک نیا برہمن لائی رات

یہ جو میں سنانے جا رہا ہوں غور سے سنیں آپ کی کہانی ہے۔

اک حبس کا عالم ہے اک نام کا قیدی ہوں

آوارہ نہیں آخر، نکلا تو وجود اپنا

بے خوف ہوا آخر انجام سفر آیا
خوش حال میں ٹوٹا ہے خوابوں کا جمود اپنا
جس قبر سے بھاگے تھے، لوٹ آئے وہیں آخر
اس قبر میں پنہاں ہے اب نام ونمود اپنا
ان تیز ہواؤں میں کچھ بات تو ہے لیکن
گھلتا ہے خلاؤں میں بے کام سرود اپنا
ہیرے کی کنی سی اک بے چین ہے سینے میں
مٹی میں ملے گا اب خاموش وجود اپنا

آنکھوں پہ کوئی پردۂ سیمیں نہیں رہا
وہ دن گئے کہ آپ کہیں دل کہیں رہا
انصاف ہوسکا نہ جو بانٹا وجود کو
حصے میں اپنے وہ مہ کامل نہیں رہا
اتنی طویل راہ مگر جانے کس طرح

میں گنبد سفر میں جہاں تھا وہیں رہا
ضائع ہوئیں نمازیں، دعائیں تو کیا حرج
وہ سنگ بے مثال تو زیر جبیں رہا
باقی ہوں آج تک تو یہ حیرت کی بات ہے
کہتے ہیں جو بھی آیا یہاں تک نہیں رہا
الجھی ہوئی فضاؤں میں جلتا رہا لہو
بے داغ اس وجہ سے مرا آستیں رہا

یہ غزل خالد مرحوم کی ہے۔

خالد کہیے خالد مرحوم مت کہیے۔ مرحوم وہ ہوتے ہیں جو خود اہم ہوتے ہیں۔ جن کے خیالات ہی ان کی زندگی اور روح ہوتے ہیں وہ زندہ شہید ہوتے ہیں۔ خالد مکمل طور پر زندہ ہے۔

یہ میں بھی مانتا ہوں۔ ان ہی کی نظم سناتا ہوں۔

خوابوں کے لشکر لے کر میں تنہا تنہا رہتا تھا
سوکھا تھا جذبات کا صحرا، ابر کا سایہ بھی نہ ملا
پھول مری راہوں میں اگا تا یہ تو دور کی باتیں تھیں

کانٹے پر چلنے کو جو کہتا کوئی ایسا بھی نہ ملا

میرا وجود اک ایسا معمہ، جیسے قفس ہو پنچھی کا

ہر ارماں کا سورج چمکا، مجھ کو تارا بھی نہ ملا

جنت میری راہ میں آ کر بدل گئی ویرانے میں

جس نے سہارا مجھ کو دیا، خود اس کا سہارا بھی نہ ملا

لوگ سفینے میں جاتے تھے میں چلتا تھا موجوں پر

میرے جیسے راہی کو، کوئی اور سفینہ بھی نہ ملا

کیوں دل دکھا رہے ہو میرے دل میں ڈوب کر

پتھروں نے اسے اجنبی جانا

یہ نہ پوچھو کہ رونے لگا کیسے

زندگی جس کی برف تھی خون سیاہ

بوجھ رنگوں کا ڈھونے لگا کیسے

جیسے بادل ہواؤں میں گھلتے ہیں

میں نے لمحوں کو یوں کھو دیا کیسے

زخم فرسودہ تھا اور بدن رسوا

وقت نے ہم کو دھو دیا کیسے

ایک نظم ہے جس کا آخری شعر ہے کہ

شعاعِ حق کی گرانی کبھی نہیں ہوتی

یہ شئے ہے وہ کہ پرانی کبھی نہیں ہوتی

عنوان ہے

صداقت کا انتظار کرو

سنا ہے مصر میں اک دور ایسا آیا تھا

کہ سارے ملک پہ ظلم وستم کا سایہ تھا

ہر ایک سمت صداقت کی بجھ چکی تھی کرن

چمن چمن پہ مسلط تھا تیرگی کا فن

دلوں پہ سطوت و قوت کا بول بالا تھا
خدا کے حکم سے انساں کا حکم عالی تھا

کہیں دکھائی نہ دیتی تھی شمع نور دوام
بھٹک رہا تھا اندھیرے میں کاروان عوام

ترس رہی تھی ہراک دید روشنی کے لیے
تو کوہ طور پہ چمکے جمال حق کے دیئے

سحر کا ابر بہت دیر تک ٹھہر نہ سکا
مٹی وہ تیرگی ہر سمت چھا گیا جلوہ

جہان ظلمت و حسرت میں انقلاب آیا
خدا کا نور اندھیرے میں بے نقاب آیا

ہوئی زمانے میں فرعونیت کی رسوائی
دیار مصر میں پھر شمع طور لہرائی

ہوا اکھڑ گئی اک لخت چیرہ دستوں کی
چراغاں ہو اٹھی محفل خدا پرستوں کی

وہی نظام مشیت ہے کائنات وہی
وہی ہیں شمس و قمر دن وہی ہیں رات وہی

زمانے والو، صداقت کا انتظار کرو
جمال طور کو سینے میں استوار کرو

ہے یہ وہ شمع درخشاں نہیں فنا جس کو
بجھا سکی نہ کبھی گردش ہوا جس کو

جمال طور ہے موجود اب بھی سینا میں
کبھی ہے مسجد اقصیٰ کبھی مدینہ میں

کبھی اتر گیا مظلوم کے سفینہ میں
کہیں ہے جلوہ فشاں اب بھی چشم بینا میں

شعاع حق کی گرانی کبھی نہیں ہوتی
یہ شئے ہے وہ کہ پرانی کبھی نہیں ہوتی

بدلے ہوئے موسم کی ایک نظم۔ جب بادل اُمڈتے ہیں تو کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔

گردشوں کے بادل سے قطرہ قطرہ ٹپکی ہے۔ لالہ زار کی سرخی

موسموں کی تبدیلی، ناگزیر ہوتی ہے۔ جل اٹھا ویرانہ

آج تک بھٹکتے ہیں، خواب جو صداؤں میں ان کو سامنے لاؤ

اے مصور اعظم عظمتیں ہیں، ماضی کی صرف حرف افسانہ

شمار ہے ہیں اب وہ دیے جو جلتے تھے رات کے سمندر میں

آ رہے ہیں طوفاں بھی، اور صبح کاذب بھی، دراوہ بھی بے انجانہ

ہاتھ میں ہیں تلواریں، پاؤں میں ہیں زنجیریں، آنکھ رزم گاہوں پر

بے قرار ہے عالم بند جس کے سینے میں، جاگ اٹھا وہ دیوانہ

الگ راہ پر چلنے کی نظم ہے۔

میرا عزم

دنیا جہاں پہ آ کے ٹھہرتی رہی سدا

اس انتہا سے آج بڑھا جا رہا ہوں میں

کچھ نقش پا یہاں بھی مگر پا رہا ہوں میں

اس گردش نظام بہار و خزاں سے دور

بڑھتے ہی جاؤ دل کو یہ سمجھا رہا ہوں میں

معلوم ہے مجھ ہی کو کہاں جا رہا ہوں میں

مجھ کو امید ہے مری منزل قریب ہے

دل خوش ہے گو کہ زخم بہت کھا رہا ہوں میں

پیہم فصیل مشکل و غم ڈھا رہا ہوں میں

اک آئینہ حیات کو دکھلا رہا ہوں میں

میری غزل بالکل آج کی صورتحال پر ہے۔

آج کی صورتحال پر یا آپ کی صورتحال پر؟

وہی سمجھ لیجئے۔

ارشاد۔

کیا مقتل پہ قاتل نے تماشہ اس قدر پیدا
کہ رہرو کی نظر میں ہوگیا ذوق نظر پیدا

خالد کے اوپر پوری طرح صادق آتا ہے

زمانہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ حسرت کے آنسو ہیں
برستی ہیں مری آنکھیں تو ہوتے ہیں گہر پیدا

سبھی سر ہلانے لگے۔

گرا ہے خیمہ گردوں، یہ کب امید تھی اے دل
ترے نالوں سے ہوجائے گی جنبش اس قدر پیدا

ابھی گرا کہاں ہے لیکن اب گرے گا۔

سکھاتی ہیں زمانے کی ہوائیں شعلہ افشانی
جو ہوتا ہے کبھی اقوام کے اندر شرر پیدا

صحیح بات ہے۔صحیح بات کیا ہے۔اب تو یہاں وہ بھی نہیں رہا۔چنگاری نکلے گی کہاں سے؟ایک آدمی نے ہتھیلی پر تمباکو ملتے ہوئے کہا۔

ان کو چھوڑو آپ آگے سناؤ۔

اگلا شعر ہے۔

صداقت کے علم کا رنگ جب بھی مٹنے لگتا ہے
تو ہوجاتا ہے حیدر کا کوئی لخت جگر پیدا

کیا بات ہے۔اور کسی نے اسی خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے کیا شعر باندھا ہے

یہ انتہا ہے وہ آغاز تھا محبت کا
نہ آیا دمبہ کوئی سامنے برائے حسین

مجھے اندازہ ہوتا تو ماں قسم' میں خالد کی جگہ جان دے دیتا۔

غزل رکنے کے بعد پھر آگے بڑھی۔

یہی آئین فطرت ہے یہی دستور گلشن ہے
کہ پھولوں کیلئے ہوتے ہیں کانٹے ہمسفر پیدا

یہ تو ہم سب کی زندگی کا حصہ ہے۔

عروج قوم کا ہر راز مخفی زیر خنجر ہے
کہ ہوتا ہے ہمیشہ دوج کی صورت قمر پیدا

خنجر کی بات بھی کیا خوب کہی ہے۔

ذم کا پہلو نکلتا ہے۔

نکلتا ہے تو نکلے میں کب منع کر رہا ہوں۔

'یہ ذم کا پہلو کیا ہوتا ہے؟'

پرانے زمانے میں جب اردو تہذیب پروان چڑھ رہی تھی اس وقت پردے کا خبط لوگوں کے اوپر اتنا چڑھا ہوا تھا کہ لوگ جسموں کے علاوہ جسم کے اعضا کی بھی پردہ پوشی کرتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ پردے کی شدت سے نگاہیں مردوں عورتوں کو دیکھنے سے بھی قاصر تھیں جبکہ جنسی ادبیات کا وہی عالم ہوتا تھا لہٰذا لوگوں کو جسمانی اعضا کا نام سن کر تو کیا' اس سے ملتے جلتے والے لفظ کو بھی سن کر جسموں کا خیال آ جاتا تھا۔ اس کے اثر سے بچنے کے لئے شاعری میں اس بات کا لحاظ رکھا جانے لگا کہ کسی بھی اسم یا مصدر کے استعمال سے قاری کا ذہن کسی جنسی عضو یا عمل کی طرف نہ جائے لہٰذا لفظوں یا مصرعوں کے ایسے استعمال کو شعر کا نقص قرار دیا گیا۔ وہی روایت ابھی تک چلی آتی ہے۔

ادھر توجہ چاہتا ہوں۔

ہاں' ہاں فرمائیے' ارشاد۔

عرض ہے کہ

جہاں تیرگی کو دور کرنے کے لیے یارب

دیارِ ہند سے کردے نئے شمس و قمر پیدا

اس کو انسان پیدا کرنا تھا کر دیئے۔ چاند سورج بھی بنا دئے۔ اب نئے شمس وقمر کی کیا ضرورت پڑ گئی۔

ضرورت ہے۔ اگلا اور آخری شعر ملاحظہ ہو۔

خردمندوں کو صحرا میں کوئی رستہ نہیں ملتا

چلے مجنوں تو ہوجاتی ہیں لاکھوں رہ گزر پیدا

واہ' واہ' واہ۔

مکرر' مکرر۔

خردمندوں کو؟

خرد مندوں کو صحرا میں کوئی رستہ نہیں ملتا

چلے مجنوں تو ہوجاتی ہیں لاکھوں رہ گزر پیدا

'لاکھوں رہ گزر پیدا' کئی لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔

دلی سے آئے ہوئے ماس کوم کے اس طالب علم نے پوچھا جو میزو قبیلے کا تھا۔ وہ مجاور کو چھوڑ کر کافی دیر سے ادھر ہی آ بیٹھا تھا۔ وہ دراصل کئی دنوں سے ادھر ادھر لوگوں میں ہی بیٹھنے لگا تھا اور ان کی باتوں کو بہت دھیان سے سنتا تھا۔

وحاٹ از 'خردمند' ؟

اینڈ 'رہ گزر' ؟

اور مجنوں کہتے ہیں

دیٹ آئی نو۔

وہ کچھ سوچتا رہا پھر اچانک چونکا۔

گریٹ مینگ۔

وہاٹ یو ہیو سیڈ۔ گریٹ مینگ۔

گریٹ مینگ۔

نوجوان جیسے مراقبہ میں چلا گیا تھا اور سوچ کے بوجھ میں پھنسا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ کسی مایوسی کے زیر اثر عجیب سا ہو گیا تھا۔

وہ اس بوجھ سے نجات پانے کے لئے بے چین تھا۔ یہ وہی کیفیت تھی جو خالد پر طاری تھی۔ لیکن وہ بیمار نہیں تھا۔

وہ نوجوان اچانک پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے پاگل ہو گیا ہو اور اس کا ذہن ایک ٹوٹی ہوئی مشین کی طرح کہیں اٹک گیا ہو۔ پھر وہ تڑپنے لگا جیسے اسے مرگی ہو رہی ہو یا اس پر اندر سے الہام ہو رہا ہو۔

خردمندوں کو صحرا میں کوئی رستہ نہیں ملتا

چلے مجنوں تو ہو جاتے ہیں لاکھوں رہ گزر پیدا

اس کے چہرے پر ایک روشنی سی ابھرنے لگی لیکن ساتھ ساتھ اس پر کرب کے آثار بھی طاری تھے۔ اس نے اس درد سے آزاد ہونے کے لئے اپنے سر کو بار بار زور سے جھٹکا

دیا۔ پھر ایسے دوڑا جیسے دیوار میں سر مار دینا چاہتا ہو اور پھر اچانک ایسے مطمئن ہو گیا جیسے اسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہو۔ کوئی ایسی بات جو وہ کہہ نہیں سکتا ہو بلکہ جس کا ہونے سے تعلق ہو جیسے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ کے لئے آگ کی کشش ہاتھ کو ادھر پھیلانے پر آمادہ کرتی ہے۔

جو دلیلوں سے اوپر ہو۔ جو صرف ہونے کا متقاضی ہو۔

جیسے ساری سوچ بیکار اور بکواس ہو۔ جیسے اصل چیز کچھ اور ہو۔ جیسے کسی عالم نے اصل علم کے ذریعہ کا عرفان ہوتے ہی اپنی ان تمام کتابوں کا بوجھ اتار پھینکا تھا جنہیں وہ اونٹوں پر لاد کر چلتے تھے۔

مشاعرہ جیسے ہی ختم ہوا لوگوں پر ایک اداسی سی چھا گئی جیسے یہاں ابھی کچھ اور بھی ہونا چاہئے تھا جیسے خالد کی شخصیت کے بارے میں بات ہونی چاہئے تھی۔ لوگ دراصل یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔

کون سلسلے کو آگے بڑھائے؟

مولوی صاحب کو بلاؤ ان سے کچھ سنتے ہیں۔

کچھ لوگ جا کر مجاور کو جنہیں وہ داڑھی رکھنے کے بعد مولوی صاحب کہا کرتے تھے بلا لائے۔

اور انہیں وہاں بولنے کیلئے کھڑا کر دیا۔

وہ سوچنے لگے کہ کیا بولیں۔ پھر انہوں نے تھوڑی سی مہلت مانگی۔ اپنی پھوس کی

کٹیا میں گئے اور وہاں سے اپنے ہاتھ میں ایک کتاب لیکر آئے۔

یہ کتاب وہی کتاب تھی۔

انہوں نے کتاب کھولی اور کتاب کے اندر ایک ورق کو خاص طور سے کھولتے ہوئے بغیر سامنے دیکھے ہوئے بولے۔

'آپ میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اردو نہیں پڑھ سکتے اور اس لئے انہوں نے یہ کتاب اب تک نہیں پڑھی ہوگی لیکن آپ نے یہ سنا ہوگا کہ بہت سے لوگ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔

میں آپ کو وہ حصہ سناؤں گا جو خالد نے اپنی موت سے کچھ ہی پہلے لکھا تھا کیونکہ مجھے یاد ہے یہ اس کی کتاب کا آخری صفحہ تھا۔ اور میں نے خاص طور سے اس کی کتاب کے اوریجنل مسودے سے اپنے ہاتھ سے نقل کر لیا تھا کیونکہ اس میں ایک طرح سے میرے لئے بھی ایک براہ راست پیغام تھا۔

تو لیجئے' سنئے۔

مجاور نے ایک نظر اس بھیڑ پر ڈالی جو دور دور تک کھیتوں میں پھیلی ہوئی تھی اور پیچھے جا کر لگ بھگ ان کھیتوں میں گم سی ہو گئی تھی جن کا سلسلہ آگے دور تک پھیلی ہوئی وادیوں سے لیکر دھندلے ہوتے ہوئے آسمان کے آفاق تک پھیلا ہوا تھا' کچھ اس طرح جیسے پورا آسمان ہی کسی اسٹیڈیم کی چھت بن گیا ہو اور پوری دنیا اس اسٹیج سے اٹھنے والی آواز کو سننے کے لئے تیار ہو۔

اس نے ہلکے سے مائک کی آواز کو شٹ کیا اور اطمینان کرنے کی بعد پڑھنا شروع کیا۔

'تم محض ووٹ دیکر اپنی حکومت کو چلانے کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ نہیں ہو جاتے۔ ووٹ دیکر کسی کو منتخب کر کے حکومت کی ذمہ داریوں سے کہ وہ شہریوں کی حفاظت کرے اور امانت میں خیانت نہ کرے' سے بری الذمہ نہیں ہو جاتے۔ اور اپنے نوکر مقرر کر کے ان کی حرکتوں کی ذمہ داریوں سے بھی بری الذمہ نہیں ہو جاتے' اور اگر وہ بے ایمانی کی نیت سے کوئی لوپ ہول بناتے ہیں تو اس کے لئے بھی تم ہی ذمہ دار ہو۔

یہ مت سوچ لو کہ جمہوریت میں بہتر ذہنوں کا انتخاب کرتے ہو' بہتر ذہن تو تم خود ہو' تمہیں بہتر ذہن کی نہیں' وفادار ذہن کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ملکی اور اجتماعی اور سیاسی نوعیت کے کام تم ان کے ذمہ سونپ سکو کہ اس کے لئے تم کو کارندے کی ضرورت ہوتی ہے تم حکومتیں پارلیمنٹ اور عدالتیں سب اسی ضرورت کہ تحت بناتے ہو۔

یہ بات جو تمہارے اندر گھٹی میں بیٹھی ہوئی ہے کہ حکومت کرنے کیلئے سماج کے بہترین ذہن کا انتخاب کیا جاتا ہے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ سماج میں لاکھوں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ان حکمرانوں سے بہتر ذہن رکھتے ہیں جو حکومت کے کام کو نبھانے پر مقرر کئے جاتے ہیں' فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں۔ ووٹ دینا ہی صرف حکومت کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ ووٹ دیکر کسی کو سیٹ پر بٹھانے کے بعد ایک فیکٹری کے مالک کی طرح مسلسل دیکھتے رہنا' چوکنا رہنا اور مختلف ذریعوں سے سپروائز کرنا بھی سیفٹی کے لئے ضروری ہے کہ یہ ملازم تمہاری دولت زندگی میں خرد برد کر کے دولت اپنے گھر نہ لے جا رہے ہوں' اگر تم میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اپنی فیکٹری کو سنبھال سکو' مسلسل اپنی مالکانہ ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہو تو تم برباد ہو جاؤ گے' برباد ہوتے رہو گے' اور تم اپنی اسی بربادی کا سامنا کر رہے ہو۔۔ تم یہ بھول جاتے ہو کہ جس دن ملک آزاد ہوا اور ملک میں جمہوریت آئی اس دن تم اچانک فیکٹری کے مزدور کے بجائے فیکٹری کے مالک بن

گئے اور اپنے اس منصب کی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے کی لئے تمہارے کردار میں بہت زبردست بنیادی تبدیلی کی ضرورت آن پڑی۔ اگر تم اپنے سونے جواہرات اپنے مزدوروں کے ہاتھ میں چھوڑ کر سو جاتے ہو تو خطرہ خود مول لے رہے ہو، انہیں بے ایمان ہونے کو دعوت خود دے رہے ہو انہیں خود بگاڑ رہے ہو۔ مزدوروں کو بے ایمان کہنے سے کام نہیں چلتا، اپنے کو ناکارہ، کاہل، بے وقوف، غیر ذمہ دار کہنا ضروری ہے۔ اپنی دولت کی حفاظت کی ذمہ داری تو وہ چیز ہے جس سے تم بری الذمہ ہو ہی نہیں سکتے لیکن تمہاری یہ حالت ہے کہ تم اس بوجھ سے خود گھبراتے ہو کیونکہ اس کے لئے تمہیں اپنے ذہن کو تیار کرنا پڑے گا، اس میں احساس ذمہ داری کوٹ کوٹ کر بھرنی پڑی گی۔ مختلف طریقوں سے اس بات کو پکا کرنا ہوگا کہ ووٹ کے بعد بھی ٹھیک اسی طرح تم مالک ٹریٹ کئے جاؤ جس طرح اس ذمہ داری کے لئے ملازم کا انتخاب کرنے میں ووٹ دیتے وقت تم مالک ہوتے ہو اور یہ سیاست دان تمہارے سامنے امیدوار کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ یہ گھپلا نہیں ہونا چاہئے کہ ووٹ دیتے ہی وہ اپنے کو مالک سمجھنے لگیں کہ اسی پہلو بدلنے کے کھیل میں ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ اسی گھپلے کی وجہ سے تمہارا ہی ملازم تم سے یہ کہتا ہے کہ تم کو یہ جاننے کا حق نہیں ہے کہ کس امیدوار کے نمبر کتنے تھے یا کاغذ پر نمبر بدلے نہ جائیں اس کا کیا انتظام ہے یا جہاں مجبوری نہ ہو وہاں شفافیت کیوں نہ رکھی جائے اور تمہارا ہی مزدور یہ بڑی بات تم سے کہہ کر نکل جاتا ہے کہ امیدواروں کے نمبر کم یا بیش بھی کئے جاسکتے ہیں تاکہ مناسب امیدوار کا انتخاب ہو سکے اور اس انتخاب کے اصول اور معیار کیا ہوں گے اس کو جاننے کا حق تم کو نہیں ہے کیونکہ یہ اس کی ذہنی پراپرٹی ہے۔

دراصل تم نے اپنا خون دیکر جنگ کر کے جو آزادی حاصل کی تھی اور اپنی زندگی اور دولت کے مالک بن بیٹھے تھے اور انگریزوں کو ہٹا دیا تھا اس کی جگہ اب منیجر مالک بن بیٹھے ہیں اور تمہاری فیکٹری منیجر چلا رہے ہیں اور تمہاری نااہلی کے سبب نہ صرف وہ خرد برد اور بے ایمانی کرتے ہیں بلکہ تمہیں کتے کی طرح دھتکار بھی دیتے ہیں اور تمہاری پٹائی کرنے کیلئے بلکہ تمہیں جان تک سے مار دینے کیلئے انہوں نے پیسے کی طاقت سے غنڈے بھی پال رکھے ہیں۔ اب شریف اور قابل امیدواروں کی وہاں پہنچ ممکن نہیں کیونکہ انہوں نے انتخاب کے

وقت تمہاری خوشامدیں کر کے، تم کو اپنے گلیمر سے متاثر کر کے تم کو دارو پلا کر، تمہیں الو بنا کر یہاں تک کہ تم کو ڈرا کر تم سے ووٹ لینے کا فن سیکھ لیا ہے۔ اور سب سے بڑی کمی یہ رہی ہے کہ جمہوریت ملنے کے بعد حکومت چلانے والوں کا انتخاب کرنے کا طریقہ تو مضبوطی سے لاگو ہوا لیکن انتخاب ہونے کے بعد اپنے ان ملازموں اور کاروبار حکومت کی دیکھ ریکھ کے طریقے کو قطعی مضبوط نہیں ہونے دیا گیا بلکہ جا بجا رازداری کے قانون بنا کر اس کو کمزور کیا گیا۔ اور یہی ہر بیماری کی جڑ ہے۔ یعنی حکمرانی کی خواہش اور اس کو مس یوز کرنے کا ارادہ رکھنے والے طبقے نے یہ تو مان لیا کہ ان میں کون حاکم رہے گا اس کا فیصلہ الکشن کے اکھاڑے میں ہوگا لیکن اس میں بھی وہ متحد رہے کہ انتخاب کے بعد لوٹنے کھسوٹنے کی پوری مشین وہی رہے گی جو انگریزوں کے زمانے میں تھی اور عدالتوں موں قاضیوں کو عوام مائی لارڈ شپ ہی کہتے رہیں گے اور منسٹروں کو محفلوں میں ملازموں کا نہیں مالکوں کا درجہ ملے گا اور عوام کو اپنے ملازموں کے دفتر میں میں گھسنے کی اجازت نہیں ہوگی اور سرکاری باتوں میں ان کو جواب طلبی کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ اور سرکاریں خود مختار ہوں گی لیکن عوام خود مختار نہیں ہوں گے اور دراصل یہاں کہیں زبردست فلسفیانہ کمی ہے اور ایک مضبوط سیاسی فلسفے کی ضرورت ہے جو اس کمی کو پورا کر سکے۔ یعنی ایک ایسا فلسفہ جو ضرورت کی حد تک ملازموں کو اطمینان اور خود مختاری دے تاکہ وہ اپنا کام کر سکیں لیکن ان کے طبقے کو عوام پر کسی بھی حال میں برتری نہ دے اور سپروائز کرنے کے وہ سارے طریقے مہیا ہوں جن میں وہ ان ملازموں کی بے ایمانی یا اپنے نکمے پن کی وجہ سے کسی شہری کی زندگی کو اجیرن کرنے والی حرکتوں کی روک تھام کر سکیں چاہے وہ حکومت ہو یا عدالت ہو۔ اور حکومت میں بٹھائے گئے لوگ اپنی اوقات میں رہیں اور سول سوسائٹی کو اپنی محکوم نہیں بنالیں اور ان کو عوام کا عملا اور قانونا احترام کرنے کی تربیت دی جائے۔

لہٰذا ہماری موجودہ حالت ایسی اس لئے ہے کہ ہم مجاہدین آزادی کے ناکارہ وارث ہیں جو ان کی وراثت کی ذمہ داریوں کو نبھانے کی زحمت سے بھی گھبراتے ہیں اور جب اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے کبھی ہاتھ پاؤں ہلانے کی بات آتی ہے تو اس کو ایک مصیبت سمجھتے ہیں۔ اور ایسا کرنے میں ہم نہ صرف خود کو بلکہ اوروں کو بھی تباہ و رسوا

کرتے ہیں:-

خالد نے آخری پیراگراف انگریزی میں لکھی تھی۔شاید وہ یہ الفاظ E-mail سے کہیں بھیجنا چاہتا تھا یا اپنی بات زمین کے کونے کونے تک پہنچانا چاہتا تھا۔

'THIS BOOK SHOULD BE THE NEW CONSTITUTION, A CONSTITUTION FOR ESTABLISHING A SOVEREIGN CIVIL SOCIETY, REPLACING THE EXISTING ONE IN WHICH LOOPHOLES FROM THE TIMES OF SHER ALI HAVE CREPT INTO, WHICH NEEDS TO BE REPLACED, NO MORE A GOVERNMENT SHOULD BE A DANDA THAT THE 'BUSINESSMAN' WANTS FOR KEEPING THE PEOPLE BEING EXPLOITED BY WICKED MONEY MAKING PROCESS AND TRICKS AND KEEPING AWAY FROM REACTING OR SHOWING 'NON-COPERATION'. THE SPIRIT OF SHER ALI NEEDS TO BE LIBERATED. BUT THE FIRST REQUIREMENT FOR ESTABLISHING A SOVEREIGN CIVIL SOCIETY WILL BE THE SOVEREIGN CITIZEN, FREE FROM HIS OWN POISENOUS SUBMISSIVENESS, SHORT SIGHTEDNESS AND SELFISHNESS - THE 'NAFSE-AMMARAH'. BUT FATHER, I AM SO INTENSELY ALONE AND EXHAUSTED, I AM FEELING GIDDINESS. I HAVE SPENT ENERGY BEYOND MY LIMITS, I HAVE OVERSPENT MYSELF, OVER STRESSED PERHAPS WHICH MY HEALTH DID NOT PERMIT. BUT, I HAVE REACHED THE TARGET AND WRITTEN. I AM DYING.I AM DYING BUT I HAVE WRITTEN BEFORE I DIE. PAPA, I HAVE COMPLETED IT BUT COMPLETED AT THIS COST. I

KNOW YOU DID NOT MEAN IT. BUT IT WAS MY DECISION TO PLUNGE INTO THE CLUTCHES OF THIS DEATH WHICH IS NOW APPEARING BEFORE ME. BEFORE I DIE I ONLY WANT TO SAY.

اس تحریر کے آخری حصہ میں اس کا خطاب اچانک اپنے والد کی طرف مڑ جاتا ہے۔یہ تحریر انگریزی میں ہے۔

اور اس کے بعد کے الفاظ اس کی انگلی سے اس کے کمرے کی دیواروں پر لکھے گئے۔

میں یہ نہیں کہ سکتا کہ وہ پیغمبر تھا' اور تھا بھی نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کے اندر دردِ انسانی کی شدت پیغمبروں سے زیادہ تھی۔وہ انسانی برادری کا پیدا کیا ہوا روح انسانیت کا پیغمبر تھا۔ایسے پیغمبر تو بہت دیکھے جن پر آسمانوں سے کتابیں نازل ہوئیں' لیکن ایسا اسی کو دیکھا جس پر کوئی الہام نازل نہیں ہوا بلکہ خود اس کے دل کے اندر سے درد کے وہ چشمے پھوٹے تھے جنہوں نے اس کے ذہن کو منور کر دیا تھا۔اور اسی لئے اپنی سوچ کے معاملے میں اس نے کسی بھی طرح کی آقائیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔وہ مشیت ایزدی کو بھی آقا نہیں' خالق مانتا تھا۔جس طرح اوروں کو پہاڑیوں میں' یا کسی پیپل کے پیڑ کے نیچے روشنی ملی تھی اسی طرح خالد کو جزائر انڈمان میں روشنی ملی تھی جہاں اس کا دل کالا پانی کی روشنیوں سے منور ہوا تھا۔

وہ نوجوان جو مشاعرے میں کچھ سنانے کیلئے بیتاب ہو رہا تھا اور جس نے اپنے ساتھ والے سے خردمندوں کا معنی پوچھا تھا۔

بار بار اسی شعر کو زیر لب بڑبڑا رہا تھا کہ

خردمندوں کو صحرا میں کوئی رستہ نہیں ملتا

چلے مجنوں تو ہو جاتی ہیں لاکھوں رہ گزر پیدا

اور بہت توجہ سے ساتھ ہی ساتھ مجاور کے ذریعے سنائی جانے والی تحریر کو بھی سنتا جارہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس تحریر اور اس شعر کے بیچ کوئی ربط سا ہے کیونکہ اس کے ذہن کے اندر اس کا خیال بار بار اس تحریر کے الفاظ کے ساتھ اس شعر کی طرف بھی جارہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کچھ اپنے طور پر محسوس کی ہوئی باتوں کی وجہ سے اس کے ذہن میں ایک دباؤ سا پیدا ہونے لگا تھا۔

اس کے ذہن پر دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔

'اور اب تو ہمیں صرف سپرویژن کرنے کی ذمہ داریوں سے ہی آراستہ نہیں ہونا ہے بلکہ باقاعدہ اور بہت گہرائی میں اتر کر اور تادیر کوششوں سے منیجروں کی گٹھ بندی سے بھی نبٹنا اور لڑنا ہوگا جس نے ہر حال میں ہمیں لبھا کر یا بیوقوف بنا کر یا پھر ہمارے نمائندوں کو لبھا کر یا بیوقوف بنا کر یا ڈرا کر اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا ہے اور اس فن میں مشاقی پیدا کر لی ہے لہذا صرف ایک ایسی کتاب جو مسلسل مینارہ نور کی طرح ہمیں اس مہم میں راہ راست پر رکھے' اس کی بنیادی ضرورت ہے اور یہی اس کتاب کا مقصد ہے جو میں لکھ رہا ہوں جو آپ کے موجودہ عہد کے ساتھ ساتھ اس عہد کی جڑوں میں بھی کافی دور لیجا کر پوری شاہراہ کو روشن رکھے۔

حکومت میں بٹھائے جانے والے لوگ تمہارے باپ کی طرح نہیں تمہارے بھائیوں جیسے ہیں جو تمہارے ساتھ بے ایمانی بھی کر سکتے ہیں اور ایسے بھائی بہت کم ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی جواز کی بنیاد پر ایسا نہ کریں اس لئے یہ تمہاری اپنی ذمہ داری ہے کہ ایک بالغ شخص کے طور پر اپنی جائیداد کی حفاظت کا ذمہ خود اٹھاؤ۔

یہ کتاب تمہیں اپنے آس پاس کے حالات اور اپنی صورتحال کو سامنے رکھ کر دوراندیشی کے ساتھ فیصلے لینے کی تربیت دی گی' اس پیمانے کی سوچ کیلئے کینوس دیگی اور وقت بوقت فیصلے لیتے رہنے کے لئے اپنے ملازموں کے اصلی کردار کو پہچاننے میں تمہاری مدد کرے گی۔

میں ان دنوں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر اس میں ڈال رہا ہوں اور میں اتنا متفکر اور غمزدہ ہوں کہ مجھے بھوک بھی نہیں لگتی' ممکن ہے کہ اس کمزوری کی وجہ سے میری موت بھی ہو جائے' لیکن اگر صرف میری ایک جان کے صرف ہونے سے ایک ایسی کتاب تیار ہو سکتی ہے جو کروڑوں لوگوں کی زندگی کی شاہراہ کو روشن کر سکے تو اس زندگی کو اس کام آنا چاہئے اور چونکہ میرے ذہن میں ایسی باتیں آتی ہیں اس لئے مجھ ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے مجھے یہی ذمہ داری سونپی ہے اور اگر میں نے اس کو نہیں نبھایا تو مجھ سے پوچھ تاچھ بھی صرف اسی کے بارے میں ہوگی کہ امانت داروں سے پوچھ تاچھ تو اسی چیز کے بارے میں ہونی چاہئے جو چیز اسے دی گئی ہے۔

میں نے بچپن سے جمہوریت کے خواب اور جمہوریت کے موجودہ نظام میں جو تضاد دیکھا ہے اس نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ مجھے اب وہ دریچہ دکھائی دیا ہے جہاں اس اندھیرے کو دور کرنے والی روشنیوں کی بھرمار ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میں اتنا لاغر ہو گیا ہوں کہ مرنے کے قریب ہوں۔ کوئی چھوٹا سا صدمہ کبھی بھی میری جان لے سکتا ہے۔ لیکن اگر میں مرجاؤں تو بھی اپنے معاشرہ سے متعلق میری صرف ایک آرزو ہے کہ جس طرح میں نے اپنی وہ ذمہ داری پوری کی ہے جس کی مجھ سے توقع کی جا سکتی تھی اسی طرح آپ اپنی اس ذمہ داری کو نبھائیں جس کی توقع اس کتاب کے لکھنے کے بعد مجھے آپ سے ہے۔ آپ میں سے ہر شخص کا کام انفرادی طور پر اتنا ہی اہم ہوگا جتنی اہمیت یہ کتاب رکھتی ہے بالکل ایسے جیسے کسی ایک درخت کے بیجوں سے پیدا

ہونے والا ہر درخت اتنا ہی اہم ہوتا جاتا ہے جتنا وہ درخت جس کا وہ بیج ہوتے ہیں۔ آپ کو اپنی زندگی کو مکمل کرنے کیلئے صرف اپنے ذہنوں کو روشن کرنا ہے۔ باقی کام قدرت خود کرے گی۔'

لوگ انتہائی سنجیدہ ہو گئے تھے جیسے کسی چیز نے ان کو اندر سے جکڑ لیا تھا۔

وہ نوجوان اب بھی وہی شعر دہرا رہا تھا۔

خردمندوں کو صحرا میں کوئی رستہ نہیں ملتا

چلے مجنوں تو ہو جاتی ہیں لاکھوں رہ گزر پیدا

تحریر کی قرات کے ختم ہوتے ہی اسے جیسے پسینہ سا آ گیا۔ اچانک وہ اوروں سے باہر نکل گیا اور اس نے زمین پر لات ماری۔

اور چلا کر بلند آواز میں اپنے اردگرد کے لوگوں کے مزاج سے بے خبر انگریزی میں گالی کے ممنوعہ لفظ کے ساتھ چلا پڑا جبکہ اس کے ذہن میں گالی جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

' -----

the mind,

bloody -------- up my mind.

I am a duffer. I will ------- up my mind.

ارے ایسے مت چلاؤ۔ یہ گندہ لفظ ہے۔ لوگ برا مانیں گے۔

No. No. It is not about others. Not about others, you see. I am not accusing any one.

اس نے چاروں طرف لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

My own mind.This mind.

اس نے اپنی انگلیاں اپنی کنپٹی پر رکھ لیں۔

چند لوگ جو انگریزی کچھ کچھ ہی سمجھتے تھے' عام طور پر گالی کے طور پر استعمال ہونے والے ان الفاظ کو چلاتے ہوئے سن کر سکتے میں آ گئے تھے۔

اس کی چیخ میں بے پناہ درد کی ایسی شدت اور بے چینی تھی کہ وہ ایک بھدی سی گالی سر عام دے رہا تھا۔ وہاں پورا غیر انگریزی داں طبقہ تھا لیکن اس گالی کو وہ بھی کچھ کچھ سمجھتے تھے۔ اس گالی کا معانی انہیں انگریزوں نے ہی پچھلی صدیوں کے دوران سکھایا تھا اور شاید کہیں اس لڑکے کا مخاطب بھی وہی تھے جنہوں نے یہاں کے لوگوں کی ماں بہنوں کے حوالے سے انہیں اس گالی کا مطلب سکھایا تھا اور یہ چپ چاپ صرف اس کا معنی سیکھتے رہے تھے لیکن کبھی اس کے استعمال کی عادت نہیں پڑی کہ ان کی یہ حیثیت ہی نہ تھی۔

پھر وہ انتہائی بےچینی کے عالم میں کہتا رہا اور دوسروں کو دیکھتا رہا۔

' ----------------the mind

ارے یہ کیا کر رہا ہے' یہاں ہر طرح کے لوگ ہیں۔

چاروں طرف سے ہنگامہ ہونے لگا کہ اسی بیچ مجاور نے سب کی طرف دیکھا

اور ایک اونچی جگہ پر آ کر بولا۔

سنئے' میری بات دھیان سے سنئے۔ اس لڑکے کی آواز کسی پہاڑی چشمہ کی طرح پاکیزہ ہے۔

اور یہ جو کسی نے کہا کہ یہاں ہر طرح کے لوگ ہیں تو سنئے'

وہاں بھی ہر طرح کے لوگ تھے جب احمد آباد میں جعفری کے پورے کنبہ کے اکیس لوگوں کو گھر سے باہر نکال کر ان کے بڑوں اور چھوٹوں، بچوں اور بچیوں، سب کو ایک دوسرے کے سامنے ننگا کر کے ان کو مارا گیا تھا۔

ہاں' وہاں بھی ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں جہاں جنگی قیدیوں کو ننگا کر کے ان کے اوپر کتے چھوڑے جاتے ہیں'

جہاں عورتوں کو ننگا کر کے گلیوں میں ننگا گھمایا جاتا ہے اور ان کی ویڈیو فلم بنائی جاتی ہے۔

وہاں بھی لاشیں ننگی پڑی تھیں جب ممبئی میں بم بلاسٹ ہوئے تھے۔ وہاں بھی لوگوں کی ننگی لاشیں پڑی تھیں جب ٹریڈ ٹاور گرے تھے۔

۱۹۷۱ میں وہاں بھی ہر طرح کے لوگ تھے جب فوج مشرقی پاکستان میں زنا بالجبر کر رہی تھی۔

وہاں بھی سب لوگ تھے جب کشمیری پنڈتوں کے خاندانوں کو لٹتے لٹاتے بھاگ کر اپنی جائے پیدائش چھوڑنی پڑی تھی۔

سب لوگ ہوتے ہیں لیکن ایسے سب لوگوں کا کیا فائدہ۔

جو اپنی عورتوں کی عصمتوں اور جانوں کی حفاظت نہیں کر سکتے وہ پریشان کن آوازوں سے ان کا کیوں پردہ کرانا چاہتے ہیں۔

ہمارے لوگوں میں گالیوں کی آوازوں کو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونی چاہئے۔ ممکن ہے ہمارے دکھوں کا علاج گالیوں میں ہی ہو۔

آنکھیں موند لینے سے دنیا نہیں بدل جاتی۔

جب انسانیت مر جاتی ہے تو انسان اسی طرح بے چین ہوتا ہے۔

وہ اینٹوں کی بارش میں نہانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

احمد آباد کے فساد سے متاثر ہو کر کسی نے ایک نظم کہی تھی جس کا ایک بند یوں ہے کہ

بچے ماں باپ سے چھٹتے ہوئے
علماء بکتے ہوئے شہادت سے
زندگی کے گھنے اندھیرے میں
آدمی خود چراغ بنتا ہوا

اور جب آدمی خود چراغ بنے گا تو روشنی کے ساتھ دھواں نکلے گا۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جو بول رہی ہے۔ بلکہ چیخ رہی ہے، وہ قوت جو تلوار کی طرح ننگی،

کاٹ دار اور بے جھجک ہے۔

شرط صرف یہ ہے کہ وہ چراغ ہو آگ نہیں۔ دھواں تو دونوں میں ہوگا۔

یہ لفظ علی الاعلان بولنے کے لئے تو مروج نہیں ہے لیکن چیخنے کے لئے اس کا کوئی بدل بھی نہیں ہے۔

جیسے خلوت کے عالم تخلیق میں انسان پوری قوت کے ساتھ اپنی بقا کے لئے اپنی انتہائی قوت اور بے چینی کا اظہار مکمل بے تکلفی سے کرتا ہے نوجوانوں کا یہ گروہ بقا کی اس جنگ کو اجتماعی عمل میں بدل چکا تھا۔

اچانک جیسے نوجوانوں کی اس سے آنکھ کھل گئی ہو اور وہ جان گئے ہوں کہ اصل کنجی کہاں ہے۔

اس لفظ کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر طرح کی دلیل کی گنجائش کو رد کر دیتا ہے' انسانی وجود کی تمام تر طاقتوں کو بغیر سوچے سمجھے استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے' اور اس کے اندر اپنے عمل کے صالحس' ضروری' اور ناگزیر ہونے کا بے تکلف اعلان ہوتا ہے' پوری دنیا کو ایک طرف ہٹا کر موت اور زندگی کے کھیل کا بگل بجانے کی پیش قدمی ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک جنس آلود لفظ نہیں' اس کا معنی ہوتا ہے چوٹ کرنا' کھولنا۔ لیکن اس میں یہ معنی بھی شامل ہوتا ہے کہ اب کسی کا حکم' کسی کا دباؤ' کسی کا خوف' کوئی تکلف۔ یہ کچھ بھی نہیں چلے گا۔ یہ لفظ سوچ کی تمام بندشوں سے آزادی کا اعلان کرتا ہے اور اس بات کا اشارہ بھی ہوتا ہے کہ اب سوچنے اور خصوصاً سمجھنے سمجھانے کی ساری گنجائشیں ختم ہو چکیں۔ یہ سمجھنے سمجھانے کی ناکامی کے بعد لئے گئے فیصلے کا اعلان کرتا ہے۔ اس لفظ کے ساتھ ایک جنسی عمل کی تصویر ضرور ابھرتی ہے لیکن یہ اس لئے کہ ان تمام خصوصیات کے ساتھ یہ جنسی عمل کے ساتھ ہی مکمل طور پر چپکتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام خصوصیات جنسی عمل کے دوران انسان میں مکمل طور پر ابھر کر آتی ہیں۔ لیکن یہ بات بھی

غور طلب ہی کہ یہ جبلت انسان میں کیوں موجود ہے۔ وہ اس لئے کہ انسانی نسل کی بقا کا سب سے گہرا تعلق جنسی عمل سے ہی ہے۔ یہ لڑکا اس جبلت کو آواز دے رہا ہے اور اپنے ذہن سے اس منصب پر آ کر نتائج حاصل کرنے کا تقاضا کر رہا ہے۔ اس کے ذہن میں جنسی تلذذ کا سایہ تک نہیں۔ یہ خالص معنوں میں اپنی جنسی قوت کو اپنے ذہن کی طرف موڑنا چاہتا ہے۔ یہ بتانا چاہتا ہے کہ صرف اولاد پیدا کرنا ہی ضروری نہیں' اولاد کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے۔

وہ کیا کہہ رہا ہے؟ the mind. ---------- ۔وہ اعضائے تناسل کی بات ہی نہیں کر رہا ہے۔ وہ اس مردانہ قوت کی بات کر رہا ہے جس کے اوپر نسل کو آگے بڑھانے اور اس کی بھرپور ترقی کی وہ ذمہ داری ہے جس سے وہ کسی بھی حال میں بری الذمہ نہیں ہو سکتا اور وہ سمجھ گیا ہے کہ اس طاقت کے کھلے استعمال کا وقت آ گیا ہے اور ہماری ساری رسوائیوں کی وجہ اسی طاقت کے دبے ہونے کی وجہ سے ہے کہ ہم نے اپنی سوچ کو اپنی اس طاقت پر اس طرح حاوی کر لیا ہے گویا یہ طاقت compromisable ہے۔ یہ لڑکا اسی بات کو رد کرنے کا تقاضا کر رہا ہے اور چیخ کر اور پوری طاقت کے ساتھ کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذہن کے جمود اور اس کی غلامی کی زنجیروں کو اپنی قوتِ بقا کے ہتھوڑوں سے توڑنے کی جدوجہد کر رہا ہے یاد رکھئے کہ عورت سے مباشرت کے بعد نیا بچہ پیدا ہوتا ہے لیکن ذہن سے مباشرت کے بعد نئی دنیا پیدا ہوتی ہے۔ یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انسان کی جنسی قوت اس کے ذہن سے عظیم تر قوت ہے۔ یہ قوت جب ذہن کی طرف عمل پیرا ہوتی ہے تو عظیم قومیں پیدا ہوتی ہیں' جب اعضائے تناسل کی طرف قید ہو جاتی ہے تو صرف غلاموں کی آبادی پیدا ہوتی ہے۔ یہ جنس ہی تخلیق کی روح ہے۔ اور اس قوت کا باہری قوتوں کے سامنے برسرِ پیکار رہنا روح کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔

خالد کی موت اسی قوت کے پوری طرح ذہن کی طرف مراجعت کر جانے کا نتیجہ تھا۔ لیکن اس نے جو دنیا بتائی ہے اس کے لئے متوازن کرداروں کی ضرورت ہے۔ لیکن محض شرافت متوازن کردار نہیں پیدا کرتی۔ اور جو لوگ ذلیل کئے جاتے رہے ہوں ان کے لئے

شرافت ہی بے لباس ہونے جیسا ہے۔ انہیں تو رسوائیوں کے گڈھے سے نکلنے کے لئے ہر ممکن ہتھیار کو استعمال کرنا چاہئے اور یہ لڑکا یہی کر رہا ہے۔ اور پھر جیسے اس لفظ کی غلاظت کا احساس ہی ساری بیماریوں کی جڑ ہو اور اس کا سب کو حقیقت کے طور پر اعتراف ہو گیا ہو جیسے اس غلاظت کا کھلا اظہار غلاظت سمجھی جانے والی چیزوں کو کھلے عام قبول کرنے کی جسارت اور اسے کھلے عام قبول کرنے کی ضرورت کا احساس ایک طوفانی قوت کے طور پر بغاوت کرنے پر آمادہ ہو گیا ہو۔ پورا مجمع ایک جٹ ہو کر اپنی اس جسارت کا اظہار کرنے لگا۔

یہ لفظ علامت ہے اس بات کی کہ اپنے ننگے پن سے شرمانا چھوڑ دو۔ کہ اپنے ننگے پن کو روبہ عمل لاؤ۔ سمجھ لو کہ تم ایسے ہی ہو اور تمہاری بقا اسی میں مضمر ہے۔

اور جب عالمی سطح پر گالی دینی ہو تو انگریزی میں گالی دو۔

Fuck the mind کے الفاظ میں جیسے وہ قوت سما گئی تھی جو جنگ آزادی کے زمانے میں انقلاب زندہ باد میں تھی' ان الفاظ کے اندر سے ایک جوالا مکھی پھوٹ پڑا تھا' لوگ اپنی ذات اور سرشت کی عمیق گہرائیوں میں پنہاں ان دیکھی قوتوں کو جیسے اپنے کو چیر پھاڑ کر پوری طرح باہر لانا چاہتے تھے اور اپنے اردگرد کے لوگوں سے کہنا چاہتے تھے کہ وہ سوچ کی شرافت کے جس حصار میں گرفتار ہیں وہی ان کی نامردی کی جڑ ہے' اور جیسے مردانگی کے کھلے عام اظہار میں تکلف کی کوئی ضرورت نہیں' خصوصاً جب ان کی عورتوں کو سرِ عام افسروں کے سامنے سر نیچا کر کے جانا پڑتا ہو اور وہ خود بے بس تماشائی بنے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ ہزاروں باتیں ان کے اندر ابل رہی تھیں اور ان کا اظہار صرف ان الفاظ میں ہو رہا تھا جسے آج تک وہ صرف گالی سمجھتے آ رہے تھے۔

وہ خالد کی کتاب پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو گالیاں تو بہت دے چکے تھے لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ دراصل ان کے عمل کا راستہ بھی یہیں سے ہو کر جاتا تھا کہ ان کی بقا کے سارے راستوں کو اسی نظام نے بند کر رکھا تھا جس کا وہ اتنا احترام کرتے تھے کہ اپنے جوڑے

سے مباشرت کرنا تو دور کی بات' اس کو ہاتھ سے چھونے تک میں تکلف کرتے آئے تھے' اور اس ذہن نے بند کر رکھا تھا جسے انہوں نے تکلفات اور پرہیز کے پردوں میں لپیٹ رکھا تھا۔ تہذیب نے کس گہرائی سے ان کو غلام بنایا تھا اس کا انہیں اچانک احساس ہوا تھا اور اچانک وہ اپنے کو قیدی محسوس کرنے لگے تھے۔

ان کے اوپر اچانک یہ منکشف ہوا تھا کہ شدید جنسی عمل دراصل زرخیزی کا جارحانہ اصرار ہوتا ہے اور اس کی ساری ہیجانی اس کو مانگنے کی شدت کا اظہار ہوتا ہے' اور اس کو لینے کے اصرار میں اپنی محبوب ذات سے بھی غصے کا اظہار کرنا پڑتا ہے اور جارحانہ ہونا پڑتا ہے تاکہ کوئی شک وشبہ یا انکار کی گنجائش باقی نہ رہے کیونکہ جو کچھ مانگا جا رہا ہوتا ہے وہ کوئی معمولی چیز یا ایسی چیز نہیں ہوتی جس میں حیل وحجت یا انکار کی گنجائش ہو کیونکہ بقا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہوتی ہے اور بقا کا راستہ اسی گلی سے ہو کر جاتا ہے جو عموماً تکلفات کے حصار میں گھری رہتی ہے۔ جو کچھ جہاں سے ملتا ہے اسے وہیں سے لینا ہوگا۔

نعروں میں اب عورتیں بھی شامل ہو چکی تھیں۔

تھوڑی دیر میں چھوٹے چھوٹے بچے بچیاں بھی اس میں شامل ہو گئے اور بڑے ان کو دیکھتے رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ ان کا جاننا بھی ضروری ہے کہ اس دنیا کا سامنا تو انہیں بھی کرنا ہی ہے پھر کائنات کے اسرار سے انہیں کیوں نہ واقف کرایا جائے کہ وہ بھی اپنے اعضائے تناسل کو دیکھ کر سوچتے تو ہوں گے کہ یہ کس لئے ہیں۔

ذہن کو مباشرت پر آمادہ کرنے کیلئے ہمیں اس کے حسن سے واقف تو ہونا پڑے گا۔ اس سے عشق تو کرنا پڑے گا۔ اس کے قریب جانا تو ہوگا اور پھر اس راستے سے گزرنا ہوگا جہاں اپنے عمل کے تعین کے لئے ہمیں اپنی نجی خود اعتمادی سے کام لینا ہوگا۔ وہاں کوئی باہری تربیت کام نہیں آتی نہ آنی چاہئے کہ جنسی ہیجان تربیت سے آزادی کا دوسرا نام ہے۔ اور بقا کے سارے راستے اسی سے کھلتے ہیں۔

ذہنوں پر تکلفات کے جو چلمن لٹکائے جاتے ہیں وہ ہمیں روکنے کے لئے نہیں بلکہ رکاوٹوں کو ہٹائے جانے کے لئے ہوتے ہیں اور اگر وہ راستہ روکنے لگیں تو پہلے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کی دھجی اڑا دی جائے۔

ایک آدمی کو یہ بات سمجھ میں آئی اور اس نے اچانک بیحد اونچی آواز میں چیخ کر اس کا اظہار کیا۔

When mind does not work, --------- it. When system does not work -------- it.

مجاور کا چہرہ اچانک اداس ہو گیا تھا۔

ایک بات اور۔

اس نے ایک بار اپنی نظریں نیچی کیں اور چند لمحوں کے بعد اس نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔

'گالیوں کے کلچر کو برداشت کرنا ہمارا مقدر بن گیا ہے۔ جب ہمارے بچے اپنے کو اتنا مجبور اور بے بس محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کی جبلت میں موت اپنا چہرہ دکھانے لگتی ہے تو وہ جنس کے ہتھیار سے موت کو للکارتے ہیں۔'

اس نے خاموش ہو کر کھلی نظروں سے سب کو دیکھا۔ کسی کے منھ میں زبان نہیں تھی۔ مجاور لگ بھگ رو پڑا۔

'اپنے آپ کو گالی دینا مجبور انسان کی وہ اندرونی لڑائی ہوتی ہے جس سے اس کو کوئی منع نہیں کر سکتا۔ یہ مشت زنی ہے لیکن مجبور آدمی یہ نہیں کرے تو اور کیا کرے۔'

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

مجاور جہاندیدہ آدمی تھا۔ وہ تقریر کرتے کرتے اچانک اندر سے کہیں ٹوٹ گیا تھا۔ اسے اپنے علاقے کے ان نوجوانوں کی یاد آ گئی تھی جو اپنے آپ کو گالیاں دینے کے بجائے ہتھیار اٹھا کر جرائم کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور انکاؤنٹرس میں مارے گئے۔

سارا مجمع موت جیسی اداسی میں ڈوب گیا۔

وہ آگے کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اس کا گلا رندھ گیا۔ اس کے چہرے پر آنسو لڑھک آئے تھے۔ اس نے اپنے گمچھے سے اپنے آنسو پونچھے اور نیچے اتر آیا۔ کئی لوگ اس کے پاس آئے اور اس کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر بہت روئے۔

وہاں کہیں سے ایک ٹی۔ وی۔ چینل والا بھی اتفاق سے آ گیا تھا اور اس پورے منظر کو کسی عالمی چینل پر براہ راست ٹیلی کاسٹ کرنے لگا تھا۔

BREAKING NEWS

'No more. No more.

THE DEAD MAN SHOUTS

FROM THE TOP OF THE KALAPANI MOUNTAINS

No more. No more

اس نے مائکروفون لگا کیمرہ اسی میزو پر نکا رکھا تھا جو گالیاں بک رہا تھا۔

ادھر شاید پوری دنیا کی سول سوسائٹی ہکا بکا ہو کر ان آوازوں کو سن رہی تھی۔

ذہن پر پڑے پردوں کی دھجیاں اڑا دو۔'

ایک نوجوان چلایا۔

اور میزو قبائلی انگریزی میں چلائے جا رہا تھا۔

Hit hard every obstacle that has handicapped you.

Fuck the eyes. Fuck the eyes of the mind.

And let us bloody fuck our own self which has become a den of vices and weaknesses.

Bloody this world has been fucking us for centuries and we have not been able to do anything.

اس کے منھ سے غصے میں تھوک نکل رہی تھی۔

جن لوگوں نے خالد کی کتاب پڑھ رکھی تھی ان کو اس میزو کی آواز جروا قبائلیوں کی یاد دلا رہی تھی۔

میزو انتہائی نفرت انگیز موڈ میں اپنا گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اور اس کی آواز

خاموش وادی کو چیرتی ہوئی چاروں طرف گونج رہی تھی جیسے عہد جدید کی سفاکی سے ڈرے سہمے پیڑ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

چیختے چیختے وہ اچانک بیہوش ہو کر گر گیا۔

چاروں طرف اچانک ایک خاموشی چھا گئی۔ لوگ دوڑ کر اس کے قریب جمع ہو گئے۔ اس کے منھ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

میزو قبائلی کو دیکھتے ہوئے رفتہ رفتہ لوگ بے حد بے چین ہونے لگے۔ پھر اچانک یہ بےچینی آندھی کی طرح پھیلنے لگی۔ لوگ کبھی آسمان کی طرف دیکھتے اور کبھی زمین کی طرف۔ ہر شخص اپنے اعصاب کے اندر ایک ہلکا ہلکا زلزلہ سا محسوس کر رہا تھا۔ اور ہر ایک کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس میزو قبائلی کی طرح بے ہوش ہو کر گرنے والا ہے۔ ان کے ذہنوں میں کچھ ایسا لاوا ابل رہا تھا جس پر ان کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ایک آگ سی تھی جو ان کی رگوں میں گردش کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین کی ایک ایک چیز اڑ کر آسمان میں پہنچ جائیگی۔ اور چاروں طرف ایک قیامت برپا ہو جائیگی۔

لوگ ایک زبردست تناؤ کا شکار تھے جیسے ان کے وجود کے اندر سے ایک نئی ان دیکھی دنیا پیدا ہونے کے عمل سے گزر رہی تھی اور لوگوں کے پاس اس کے درد سے دوچار ہونے اور انتظار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ موجودہ دنیا اب ان کے لئے مکمل طور پر ناقابل قبول ہو چکی تھی۔

'شاید اسی شدت نے خالد کو اپنی جان دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔' یہ عرفان اس وقت ان گنت ذہنوں کو ہو رہا تھا۔ خالد کے وجود میں چمکنے والی چنگاری ہزاروں لاکھوں دلوں اور دماغوں میں موجود بارود کے لئے پلیتہ کا کام کر رہی تھی۔

چلے مجنوں تو ہو جاتی ہیں لاکھوں رہ گزر پیدا

چلے مجنوں تو ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔

چلے مجنوں تو ہو جاتی ہیں لاکھوں رہ گزر۔۔

چلے مجنوں تو۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

چلے مجنوں تو۔۔۔ ۔۔ رہ گزر پیدا

چلے مجنوں تو۔۔۔ ۔۔ ۔۔۔ لاکھوں رہ گزر پیدا

چلے مجنوں

چلے مجنوں

چلے ے ے ے ے ے مجنوں مجنوں مجنوں

لوگ چیختے جا رہے تھے اور زمین پر بے سمت پاؤں پٹکتے جا رہے تھے۔ اور چیخوں اور پاؤں پٹکنے کی آواز پریڈ میں جاتی ہوئی فوج کی مارچ کی آواز کی طرح دور دور تک کی بستیوں میں سنائی دے رہی تھی۔ اور لوگوں پر اپنے قدموں کی آواز کی اس طاقت کا نشہ سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔

اور لوگوں کے ذہن کسی خواب سے بھرے غباروں کی طرح فضا میں اڑے جا رہے تھے۔

مجاور اب نارمل ہو چکا تھا۔ اس کو یاد آیا اس کے بچپن کے دنوں میں محرم کے

اکھاڑوں کے وقت بڑے بڑے بوریوں کے برابر رنگین کاغذوں کے غبارے بنتے تھے جن میں نیچے گول سا تار لگا ہوتا تھا۔ جب ان تاروں میں بندھے کپڑوں کے گولے میں آگ لگائی جاتی تھی تو غبارہ پوری طرح پھول کر اوپر اٹھنے لگتا تھا اور آسمان چھونے لگتا تھا۔ گاؤں کے بچے اسکو دیکھ کر تالیاں بجاتے اور بڑے اسے مسلسل اوپر جاتے خاموشی سے دیکھتے رہتے۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

انہی لمحوں میں جیلانی پر، جو دلی سے آئے وفد کا سربراہ تھا، برجستہ ایک نظم وارد ہونے لگی تھی۔ اسی کہرام کے بیچ اس نے اپنے سیلفون میں ہی یہ نظم لکھ کر محفوظ کر لی۔

میر دانش کی یہ روشنی،

زندگی کے اندھیرے،

یہ گھمسان کی جنگ،

یہ خون، یہ لاش پہ لاش،

کوئی کھڑا مرثیہ لکھ رہا ہے،

کوئی رزمیہ لکھ رہا ہے،

میں حیران ہوں،

کیا لکھوں، کیا لکھوں۔

چہل پہل بڑھتی ہی جارہی تھی بہت سے لوگ چادریں پھیلا پھیلا کر بیٹھنے لگے تھے۔

شام ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے رات ہو گئی۔ لوگ یہاں وہاں کسی انجانی اور ان دیکھی چیز کے انتظار میں کھڑے ان واقعات پر باتیں کرتے رہے۔ ایک گوشے میں چند لڑکے دھان کا پوال بچھا کر بیٹھے اور نیم دراز لیٹے ہوئے کچھ گاتے اور شور بھی مچاتے جا رہے تھے۔ شہیدوں کے مزاروں پر لگیں گے ہر برس میلے۔ جب دوسرا مصرع یاد نہیں آیا تو وہ اسی مصرع کو تال دے دے کر اوٹ پٹانگ انداز میں زور زور سے گاتے جا رہے تھے۔ کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ دلی سے آئے وفد کو رات میں واپس جانے والی ٹرین سے ریزرویشن ملی تھی۔ جیلانی اور اس کے ساتھی مجاور سے ملنے آئے۔ جیلانی نے رخصت ہونے سے پہلے مجاور سے کہا۔

ہمیں رخصت کی اجازت دیجئے۔ ہم دن نکلنے سے پہلے دلی پہنچنا چاہتے ہیں۔

رات اتنی صاف ہو گئی تھی جیسے اس میں کہیں دن چھپا ہوا ہو۔ مجاور نے گھڑی دیکھی۔ ابھی تو صرف تین بج رہے تھے۔

اب ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ جو آپ نے کہا تھا کہ خالد جس دن مرا تھا اس دن دیکھا گیا تھا کہ بحیرۂ ہند روشن ہو گیا تھا' وہ واقعہ سچا ہے۔ وہ روشنی ہمیں اس وقت برصغیر کے آسمان پر بکھری ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف بحیرۂ ہند میں ہی نہیں دنیا کے سارے براعظموں کے لئے ایک نئی روشنی نمودار ہو چکی ہے۔ ایک ایسے انسان کی پیدائش اور زندگی سے جو نوع انساں کے لئے ایک بہتر زندگی کے امکانات کا چہرہ ڈھونڈ کر انسانوں کے آگے بڑھنے کا راستہ کھول دے، دنیا کے اسی طرح روشن ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہی آگے بڑھ کر ہماری mythological کہانیوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان صدیوں میں نمودار ہونے والے comets کی طرح ہزاروں سال کے انتظار کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دیتے کچھ نہیں، لیکن یہ ایک پلیتے کی طرح ہوتے ہیں جو زمانے سے

رگڑ کھانے پر گھستے نہیں بلکہ روشنی کی ایسی چنگاریاں پیدا کرتے ہیں جو انسانوں کے جامد دل و دماغ میں یقین اور عرفان کی ایک نہ بجھنے والی آگ روشن کر دیتی ہیں۔

اس نے سر جھکایا اور کچھ سوچ کر پھر آگے کہا۔

اکثر یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جنہیں دنیا وحشی' ان پڑھ اور خلفشار زدہ سمجھتی ہے۔ لیکن یہ آگ ایسے ہی لوگوں میں شدت سے پنپتی ہے کیونکہ یہ لوگ سوکھی لکڑیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ مجھے اس دیہات کے لوگوں میں زندگی کی ایسی ہی لکڑی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ لوگ جن کے پیچھے ایک عظیم تاریخ ہے لیکن جو لوگ آج سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے اور ناکارہ سمجھے جا رہے ہیں ان سے شاید قدرت بھی، عظیم تاریخی کام لینا چاہتی ہے۔ اس مٹی کو تاریخ نے طرح طرح سے پیس کر زرخیز بنا دیا ہے اور سیلاب کے پانیوں میں ڈبو ڈبو کر اتنا گوندھ دیا ہے کہ یہ مٹی ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لئے تیار پڑی ہے۔ اور اب اس کے اوپر دنیا کی ایک نئی تصویر گھوم رہی ہے۔

یہ کہتے ہوئے جیلانی نے دور دور تک پھیلے لوگوں اور ان کے پیچھے کی بستیوں کو دیکھا۔

جیلانی کو اچانک خالد سہیل کی عظیم بے چینی کا عرفان ہوا اور اسے محسوس ہوا جیسے اسے حال آ گیا ہو۔ اس کا پورا وجود چشمۂ حیات کی زد میں ہلتا ڈولتا اپنے محور پر ڈگمگا رہا تھا اور کائنات اس کے ذہن میں آتش فشاں بن کر روشنی بکھیر رہی تھی۔

یہ سب کیا ہے؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اور پھر اس کے ذہن نے کھلی آواز میں اس سے کہا۔

'اس زرخیز زمین پر جب نئے موسم آتے ہیں تو نئے پودے ان بیجوں کے اندر سے جنم لیتے ہیں جو خاموش پڑے رہتے ہیں۔ ان پودوں کے اگنے کے ساتھ ہی زمین کی شکل

بدل جاتی ہے۔ انسانی ذہن لامتناہی بیجوں کا ذخیرہ ہے اور یہ دنیا مسلسل ارتقا پذیر ایک باغ ہے۔ اور تم اس باغ میں نئی تیز ہواؤں کے درمیان کھڑے ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کا جاننے والا تہذیبِ انسانی کی رہنمائی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اور جو اس راز سے جتنا دور رہتا ہے وہ اسی قدر بے بسی کی اذیت میں لپٹا رہتا ہے۔ تبدیلی کائنات کے اس راز کی لگام اپنے ہاتھ میں لو اور انسان ہونے کا حق ادا کرو۔ یہ دنیا تمہاری کھیتی ہے اور تم اس کے دہقان ہو۔ اور یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔' اسے یہ بات صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔

جیلانی کو خیال آیا۔

'ہر چند کہ بیان کے لئے ہمیں ابھی الفاظ نہیں مل پائے ہیں لیکن ہم نے جو کچھ دریافت کرنے کے لئے یہاں کے سفر کا قصد کیا تھا وہ کھل کر ہمارے ذہن اور دل میں آ چکا ہے۔ ہمارے ذہنوں پر یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ خالد کی موت اور اس کی کتاب نے ہر انسان کو سوچنے کا حق ادا کرنے کا احساس دلایا ہے اور ہمارا یہ یقین پختہ ہو گیا ہے کہ روشنیوں کے منارے ٹوٹتے اور بنتے رہیں گے لیکن تباہ کن وادیوں کے بیچ سے ہو کر انسانی تہذیب رواں دواں اس منزل کی طرف آگے بڑھتی رہے گی جہاں پہنچ کر ایک دن اسے احکامات اور خوف و دہشت کے ڈنڈوں سے نہیں ہانکا جا سکے گا۔ یہی انسان کی شخصیت، اس کی زندگی اور اس کی تہذیب کا معراج ہو گا۔'

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے کی ڈگمگاتی ہوئی زمین کو قرار آ گیا۔
اب تاخیر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھی پہلے ہی جا چکے تھے۔ وہ تو یہاں تنہائی میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اب وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ سامنے خالد سہیل کی قبر تھی۔ چاروں طرف میدانوں میں پروانوں کی طرح بکھرے بیقرار لوگ تھے۔ اس نے ان سب پر ایک نظر ڈالی اور وہاں سے چل پڑا۔

پوری وادی میں پاؤں پٹکتے لوگوں کے قدموں کی آواز رات کے سناٹے میں اب اور بھی صاف صاف سنائی دے رہی تھی اور ان کے پیچھے پیچھے صبح کاذب کی گاڑی آتی

دکھائی دے رہی تھی۔

رات کے اس آخری پہر میں اب مرغوں کی بانگ نے اس منظر میں مزید رنگ بھر دیا تھا۔

جیلانی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا بستی کی طرف جا رہا تھا جہاں سے ایک گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹیشن پہنچنے کے لئے شہر جانا تھا۔ رات کا منظر حسب معمول ویران سا تھا۔ اس کا دل ایک عجیب غم اور اداسی سے بھاری ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ سامنے کے درختوں اور سبزہ زار میں کچھ عجیب طرح سے چمک بڑھ گئی ہے۔ وہ ابھی چند ہی قدم اور آگے بڑھا تھا کہ اس کو پیچھے سے لوگوں کی ایک چونکانے والی چیخ و پکار سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تمام لوگ رک کر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہاں ایک انتہائی تابناک چہرہ دمک رہا تھا۔

لوگ اس انسانی چہرے کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر سہیل سہیل کہہ رہے تھے۔
جیلانی نے سہیل کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ انتہائی غور سے دیکھنے لگا۔ خالد سہیل مکمل ماہتاب بن کر وادی میں پھیلی پوری رات کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ پگڈنڈی کی اونچائی سے ندی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی لہریں بھی چمک رہی تھیں۔ جا بجا بکھرے لوگوں کے دل و دماغ جوش و خروش سے لبریز ہو گئے تھے۔ جو جہاں تھا وہیں چکور ہو گیا تھا۔

جیلانی کا ذہن دور دور کے علاقوں تک پھیل گیا۔ جہاں جہاں خالد کی کتاب پہنچ رہی تھی ان سب کی نظریں خالد سہیل کو یونہی دیکھیں گی جیسے میزو نے دیکھی تھی' جیسا وہ دیکھ رہا تھا یا جیسا لوگ دیکھ رہے تھے اور یہ کتاب تو سلگتی آگ کی طرح پھیلتی ہی جا رہی تھی'

اور دنیا کے ہر اس شخص کے دل و دماغ میں، جس کے اندر زندگی سوکھ کر لکڑی ہوئی جا رہی ہو گی، وہی ہوگا جو اس وقت یہاں ہو رہا تھا۔ یہ ماہتاب سا چہرہ وقت کے ساتھ پوری دنیا میں یہاں وہاں سے دکھائی دینے لگے گا۔ خالد کی کتاب جہاں جہاں چمکے گی وہاں روشنی پیدا ہو گی۔ ایک سرعت کے ساتھ جیلانی کے چاروں طرف زمین سے آسمان تک روشنی ہی روشنی بھر گئی۔ وہ روشنیوں میں جیسے ڈوب سا گیا تھا۔ انسانی تاریخ اس کے سامنے ایک سمندر کی طرح پھیل گئی تھی اور وہ جیسے اونچی اونچی لہروں کی طغیانی سے بھرے سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔ اور اس کے اندر کچھ تپ رہا تھا۔ یہ کیسی گرمی تھی جس میں پانی اور آگ کا فرق مٹ گیا تھا۔ زندگی کی طرح یہ دونوں ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔

اسے خیال آیا کہ وہ تو چل رہا تھا اور چلتے چلتے ٹھہر گیا تھا۔

وہ پھر تیز تیز قدموں سے بستی کی جانب چلنے لگا۔ وہ جلد از جلد اپنے ساتھیوں تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہ بتا سکے کہ ویران جنگلوں سے وقت تہجد اس نے کیا دیکھا تھا۔ نیند کا خمار اس کی آنکھوں میں اس قدر بھرا ہوا تھا کہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس لمحے وہ کہاں ہے۔ وہ عالم خواب میں ہے یا وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ حقیقی دنیا ہے۔ مگر وہ اتنا سمجھ رہا تھا کہ وہ زندگی کی ان وادیوں سے گزر رہا تھا اور اس جانب تیز تیز چل رہا تھا جدھر کوئی کشش اسے

اس طرح مسلسل کھینچ رہی تھی جیسے وہ کسی گرداب کی زد میں آ گیا ہو۔

وہ مڑ مڑ کر آسمان میں چمکتے اس چہرے کو دیکھتا رہا جس سے سرخی اس طرح نمودار ہو رہی تھی جیسے کسی دودھ سے بھرے پیالے میں گلاب کے پھول کی پتیاں ڈبوئی ہوئی ہوں سحر زدہ جیلانی کبھی رکتا اور کبھی چلتا آگے بڑھتا رہا۔

جیلانی جلد سے جلد بستی میں پہنچ کر اپنے دل کی دھڑکنوں کو روک کر اپنے دوستوں سے کہنا چاہتا تھا "دیکھو، یہ کیا ہو رہا ہے۔"

اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔

خالد سہیل کی روشن آنکھوں سے خون کے آنسو چنگاریوں کی طرح جھڑ رہے تھے۔

وہ اور بھی جلدی جلدی اپنے قدم بڑھانے لگا۔

خالد کا چہرہ مسلسل چاند کی طرح اس کے اوپر پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

اگر دنیا کے ہر انسان کے ساتھ وہ ہو جائے جو اس میز والڑ کے ساتھ ہوا ہے اور جو مجھے ہو رہا ہے اور جو ان بستیوں کے تمام لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے تو تبدیلی یقینی طور پر ممکن ہے۔ اس نے ایک بار پھر خالد کے چہرے کو دیکھا اور کہا۔

'O.K.۔ تم مر گئے ہو لیکن ہم لوگ زندہ ہیں۔ ہم نہیں مریں گے اور ہم لوگ زندگی کو مکمل آزادی کی شاندار منزل کی راہ پر آگے بڑھائیں گے۔ خالد زندہ باد۔ انسانیت زندہ باد۔'

اور اس کے ساتھ ہی اس کی راہ میں مسلسل پھوٹنے والے پٹاخوں کے گچھوں کی طرح اس کی راہ میں دور تک مشعلوں کی ایک ایسی قطار روشن ہوتی چلی گئی جو آگے بڑھ کر پھیلتی ہوئی مختلف لکیروں میں تبدیل ہو کر آفاق تک پہنچ گئی۔ اور ان لکیروں نے ہر چیز کو روشنیوں اور کرنوں میں تبدیل کر دیا۔

'اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اس کے منھ سے یہ الفاظ ایسے نکلے جیسے خود بخود اندر سے آ رہے ہوں۔

'آدمی خود چراغ بنتا ہوا'

اصل میں اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی روشنیوں نے اس کی سوچ کو جکڑ لیا تھا۔اس کا پورا وجود سکتے میں آ گیا تھا کہ یہ کیا ہوا تھا۔اس کے بعد اس کی حرکتِ قلب دوبارہ بیدار ہوئی اور اس بار اس نے خود سوچ کر یہ الفاظ کہے۔

آدمی خود چراغ بنتا ہوا

زندگی کے گھنے اندھیرے میں

آدمی خود چراغ بنتا ہوا

اس نے ان الفاظ کے معنی کو اپنے چاروں طرف دور تک پھیلے ہوئے ایک ریگستان کی وسعتوں کے ساتھ محسوس کیا۔

جب اسے کچھ اور ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ

اس کے پاؤں ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

وہ جل کر راکھ نہیں ہوا تھا۔

وہ زندہ تھا۔

وہ بجلیوں کی نہیں صرف روشنیوں کی زد میں آیا تھا۔

اس نے اپنی یادداشت پر زور دیا تو اسے خیال آیا کہ زندگی میں اس سے پہلے کسی بھی دن یا لمحے میں اس نے اپنے کو اتنا محفوظ اور مضبوط محسوس نہیں کیا تھا۔اس نے آسمان

کی وسعتوں میں ایک بار پھر دیکھا۔اب آسمان خالی تھا۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے وہ بلند آواز میں چلاتے ہوئے بے خبر سوئی ہوئی پوری دنیا کو خالد کی قبر دکھائے۔وہ اس وقت جو کچھ محسوس کر رہا تھا وہ اسی طرح کا عرفان تھا جو عظیم فلسفیوں اور پیغمبروں کو صدیوں میں کبھی کبھی ہوتا ہے۔ایسا عرفان جو انہیں اپنی شدت اور متانت سے چیخنے، چلانے اور لوگوں کو بیدار کرنے کیلئے جھنجھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اپنے پیچھے بیشمار صدیوں کو چھوڑتی ہوئی، دنیا ابھی ابھی اکیسویں صدی میں داخل ہوئی تھی اور اس کو آگے کا سفر طے کرتے ہوئے مزید صدیوں سے گزرنا تھا۔اس کے لئے اسے ہر قدم پر بہترین راستے کا انتخاب کرتے جانا تھا۔جیلانی نے محسوس کیا کہ اس سلسلے میں اس کے پاس دنیا کو دینے کے لئے ایک پیغام ہے۔

❖❖

15

جب سے جیلانی یہاں آیا تھا وہ یہاں اتنا منہمک ہو گیا تھا اور اس کی ذہنی دنیا ایسے بھونچال میں آ گئی تھی کہ وہ ایک بھی بلاگ ارسال نہیں کر سکا تھا۔ اس کے قارئین شدت سے اس کے بلاگ کے منتظر تھے۔ وہ متعجب تھے کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ جیلانی نے اپنا بلاگ اکاؤنٹ کھولا تو ہزاروں چھوٹے چھوٹے میسج آئے پڑے تھے جو اس سے اگلے بلاگ کا تقاضہ کر رہے تھے لیکن ادھر جیلانی نے لیپ ٹاپ کھولا ہی تھا اپنا نیا بلاگ بھیجنے کیلئے کیونکہ اس کے پاس دنیا کو دینے کی لئے ایک بامعنی خبر تھی۔

اس نے بلاگ لکھا اور پبلش کا وہ بٹن دبا دیا جس کے دبتے ہی اس کے قارئین کے موبائل فونوں تک بلاگ کے پبلش ہونے کا میسج پہنچ جاتا تھا۔

بلاگ کا عنوان وہی تھا جو پہلے ٹی۔ وی۔ چینلوں پر جا چکا تھا۔

THE DEAD MAN
SHOUTS
FROM THE TOP OF
THE KALAPANI MOUNTAINS

No more, No more.

آگے جیلانی نے لکھا۔

Shall we stop being always busy in our darkness and come out and above that to look at the scenario from a height - at least in some full moon night - submitting our hearts and minds to the cause of the progress of our society - be above blaming the Sher Ali's and rather hearing his voice - may be he was wrong in his method but may be he was right in his 'agony'. Shall we contribute to a bloodless revolution - an evolution, a metamorphosis - unfurling flag of a tension free society. Shall we fight out the tension that killed Khalid Suhail ?

END.

❖❖❖

PALEETA

(Novel)

by: Paigham Afaqui



EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

No more, No more.

آگے جیلانی نے لکھا۔

Shall we stop being always busy in our darkness and come out and above that to look at the scenario from a height - at least in some full moon night - submitting our hearts and minds to the cause of the progress of our society - be above blaming the Sher Ali's and rather hearing his voice - may be he was wrong in his method but may be he was right in his 'agony'. Shall we contribute to a bloodless revolution - an evolution, a metamorphosis - unfurling flag of a tension free society. Shall we fight out the tension that killed Khalid Suhail ?

END.